بسم اللہ الرحمن الرحیم

آزادئ اظہار
کے نام پر

مغرب جو آزادی اظہار، آزادی رائے، آزادی تقریر و تحریر، حقوق انسانی، امن و آشتی، روشن خیالی، علم و شعور، وسعت نظر، تحمل، برداشت، عدم تشدد، مذہبی رواداری، شہری آزادی، فہم و تدبر، جمہوریت، حقوق نسواں اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ مہذب ہونے کا پرچارک اور بلاشرکت غیرے چیمپئن بننے کا دعویدار ہے۔ یہاں ہر رنگ، ہر نسل، ہر قوم اور ہر مذہب کے افراد رہتے ہیں جنہیں یکساں حقوق حاصل ہیں مگر مسلمانوں کے ساتھ اسلام دشمنی کی آڑ میں نفرت انگیز اور متعصبانہ رویہ رکھا جاتا ہے۔ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ، مغرب میں شراب خانوں کو مدینہ اور نائٹ کلبوں کو مکہ کا نام دیا جاتا ہے، کبھی جوتیوں پر قرآنی آیات منقش کر دی جاتی ہیں، کبھی زیر جامہ اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والی تحریریں لکھ دی جاتی ہیں، مسلمانوں کی مسجدوں پر حملے اور ان کی بے حرمتی معمول کی بات ہے، گنبد اور مینار بنانے پر پابندی ہے۔ برقع اور سکارف کو اپنی تہذیب کے خلاف قرار دے کر پابندی لگا دیتے ہیں۔ راہ چلتی برقع پہنے خواتین پر تھوکا جاتا ہے۔ حالانکہ وہاں مردوں اور عورتوں کے سرعام ننگے ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ ڈاڑھی اور پگڑی کو نفرت کی علامت بنا دیا گیا ہے، ایسے مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند ہیں۔ اسامہ بن لادن کی ڈاڑھی اور پگڑی والی تصویریں جوتوں اور انڈر ویئر پر شائع کر کے فروخت کی جاتی ہیں۔ خواتین کے ملبوسات پر مقدس قرآنی آیات چھاپنا، پھر ان ملبوسات کی نمائش کے لیے خواتین کی کیٹ واک کرنا، شراب کی بوتلوں کے ڈھکنوں، کوکا کولا کے کین، فٹ بال اور جوتوں پر کلمہ طیبہ، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لکھنا، اسلام کی مقدس شخصیات کے کرداروں پر فلمیں بنانا، مسجد اقصیٰ میں سور کا سر رکھنے کے شر انگیز واقعات، پرنٹ میڈیا میں اسلامی مقدس شخصیات کی خیالی تصاویر شائع کرنا اور ان کے خیالی مجسمے بنانا، اسم محمد کو انگریزی میں بگاڑ کر لکھنا، رسائل و جرائد اور کتابوں میں توہین کرنا، انٹرنیٹ پر قرآنی آیات میں تحریف کرنا، فرشتوں، پیغمبروں، رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی فرضی تصاویر اور غلط فرضی معلومات فراہم کرنا تو مغرب کا روزہ مرہ کا معمول ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سب کچھ آزادی مذہب اور آزادئ اظہار کے نام پر کیا جاتا ہے۔

آزادیٔ اظہار کے نام پر

اِسلام اور ناموسِ رسالت ﷺ کے خلاف مغرب کے تعصب،
دوہرے معیار اور بھیانک سازشوں پر مبنی تحقیقی دستاویز

ناقابلِ تردید حقائق، تہلکہ خیز واقعات، ہوش رُبا انکشافات

ترتیب و تحقیق

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ 40-اردو بازار، لاہور، فون: 37232336-37352332

* نام کتاب .... آزادئ اظہار کے نام پر
* ترتیب وتحقیق .... محمد متین خالد
* ناشر .... علم وعرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
* کمپوزنگ .... رفاقت علی/ تاج کمپوزنگ سنٹر، لاہور
* اشاعت اوّل 2013ء
* تعداد 1100
* قیمت .... -/600 روپے
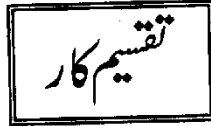
علم وعرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

فہرست

اِنتساب!

میڈیکل کی دنیا میں بیشتر افراد ایسے ہیں جنہیں قدرت نے تحفظِ ختم نبوت کے لیے بطور خاص چنا ہے۔ ان خوش نصیبوں میں محترم ڈاکٹر صولت نواز (فیصل آباد)، محترم ڈاکٹر عبدالقیوم (لاہور)، ڈاکٹر نصراللہ خاں (لاہور)، ڈاکٹر حافظ محمد اسلم (وزیر آباد)، ڈاکٹر عبدالباسط (لاہور)، ڈاکٹر انجم عبدالرزاق (لاہور)، ڈاکٹر محمد فیاض (فیصل آباد)، ڈاکٹر محمد انور (ننکانہ صاحب) اور ڈاکٹر محمد سلیمان (لاہور) سرفہرست ہیں۔ ان حضرات کا شمار ملک عزیز پاکستان کے ان تجربہ کار ڈاکٹروں میں ہوتا ہے جن کی خداداد صلاحیتوں پر سب رشک کرتے ہیں۔ تحفظِ ختم نبوت کے محاذ پر ان اصحاب کی گرانقدر خدمات محتاج بیان نہیں۔ یہ محبت رسول ﷺ کے آسمان پر جگمگاتے ستارے ہیں۔ ان احباب کی محنت شاقہ سے مجاہدین ختم نبوت کو نہ صرف ایک تازہ ولولہ، جوش اور جذبہ ملتا ہے بلکہ ایمان کو ایک نئی جلا اور روح کو آسودگی ملتی ہے۔ بلاشبہ یہ ملت اسلامیہ کا ایک عظیم اثاثہ ہیں۔ میں بصد احترام اس کتاب کا انتساب ان مسیحاؤں کے نام کرتے ہوئے دلی فخر و انبساط محسوس کر رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف!

لا رہا ہوں انہیں تصور میں
اپنے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں

مولف کے نام............

آپ کی تازہ علمی تالیف اشاعت سے قبل اس عاجز کی نظر سے گزری ہے، سو، ایک بے ساختہ تاثر ذہن میں ابھرا ہے بلکہ یہ کہنا انسب ہوگا کیف وسرور سے بھرپور اک لہری قلب سے اپنے آپ اُٹھی ہے، جو اظہار کے لیے بے قرار ہے۔ اس لیے کہ یہ گراں قدر فکری سرمایہ یکجا ہو کر توانائی کا ایسا مخزن بن گیا ہے، جو سوچوں کی سمتوں کو راستی کے راستے پر گامزن کر سکتا ہے، جو اعتقاد کے صادق مرکزے تک رسائی کے لیے قبلہ نما کا، کام دے سکتا ہے۔ ہر مضمون نگار نے نیوکلیس کی صداقت کے ساتھ وابستہ رہ کر نادر نکات کی منور کہکشاں مزین کر ڈالی ہے۔ راقم دورانِ مطالعہ اس لطیف پہلو سے پیہم لطف اندوز ہوتا رہا کہ ہر تحریر مشترک قدر سے یوں جُڑی ہوئی ہے، جیسے شجر جڑ سے، مگر ہر آرٹیکل اس طرح منفرد ہے، جیسے ہر پتہ اپنی جداگانہ اکائی بلکہ معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ ایک مصدر سے پختہ استواری، ایک منبع سے کامل تعلق، ایک سرچشمہ سے نامیاتی ناتا، ایک اصل سے غیر مشروط لگاؤ.......... اور وحدت کسے کہتے ہیں!!!

حیف! ہمارے بعض چشم تنگ کے مالک دانشور، انتشار اور کثرت میں فرق نہ کرسکے۔ ایسے اصحاب کے لیے آپ کا یہ علمی شاہکار، ایک نشان ہے، اگر

"Good out of evil"

کے الفاظ استعمال کرنے میں، کوئی قباحت نہ ہو، تو کہا جا سکتا ہے کہ شاتمان رسولؐ نے اختلاف کو تحلیل کر کے اتفاق کے منطقے میں مفکرین دین کو جمع کر دیا ہے۔ یہ امریکی اسکالرز، یہ مغربی اہل علم، جب بھی کرتے ہیں، خسارے کا سودا ہی کرتے ہیں۔ برسوں سوچ کر نیا ہتھکنڈا بروئے کار لاتے ہیں، قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے خلاف اپنے طور پر نئے انداز سے دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی یہ مذموم حرکت بے عمل مسلمانوں کو

خوابِ گراں سے دفعتاً جگا دیتی ہے۔ فروعی مسائل میں الجھے ہوئے علمائے امت کو ایک دم جھنجوڑ کر مسمط کر دیتی ہے۔ اس طرح عالم اسلام اس لیزر بیم کی عملی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس کی متصورہ صورت سے کفر لرزہ براندام رہا ہے۔ ایسے سانحات دلخراش ہونے کے باوصف انبوہِ کثیر کو ملت بیضا سے بار دگر معتون کر دیتے ہیں۔ یہ شورش، یہ ستیزہ کاری امت محمدیہ کو، اس کی زمینی و آسمانی ذمہ داریوں کا احساس دلا دیتی ہے۔ رگوں میں منجمد ہونے والا خون کھولتے ہوئے لہو میں تبدیل ہو کر، موجیں مارنے لگتا ہے۔

یہ ہنگامہ محض چوراہوں، بازاروں ہی میں برپا نہیں ہوتا، افکار کے قلب القلوب میں بھی ایک تلاطم کو از سرِ نو متحرک کر دیتا ہے۔ یورپ کا تھنک ٹینک اس حقیقت کو جانے کیوں بار بار فراموش کر دیتا ہے کہ طوفان کا جوہر سکون کے مرکز میں پنہاں ہوا کرتا ہے۔ اقوامِ مغرب نے قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ کی خاص ترکیب کو سمجھا ہی نہیں۔ صلیبی جنگ سے تہذیبی جنگ تک، جس یاقوتی ریزے کی مسلمان نے حفاظت کی ہے، وہ ہے، اپنے نبی ﷺ سے والہانہ لگاؤ، ایسی وابستگی، جس پر عاصی سے عاصی اُمتی بھی اپنا ہر اثاثہ داؤ پر لگا دینے کو ہمہ عنوان مستعد رہتا ہے۔ غالباً یہود و نصاریٰ کو یہی جستجو بے کل رکھتی ہے جی ہاں! وہ دلِ مسلم کو گاہے بگاہے ٹٹول کر دیکھتے رہتے ہیں کہ عشق رسول ﷺ کی شمع ہنوز فروزاں ہے یا بجھ گئی ہے؟ افسوس! وہ مسلمانوں کی بے عملیوں سے ہر بار دھوکا کھا گئے۔ انہیں، نہیں خبر قدرت نے یہ چنگاری، خاکستر میں بھی روشن رکھتی ہے۔ آفتاب بے نور ہو سکتا ہے، چاند گہنا سکتا ہے، ستارے اپنی تنویروں سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ لیکن حضور نبی کریم ﷺ کی محبت، وہ شرارہ نہیں، جو کبھی اپنی تابش سے کنارہ کر لے۔ آگ کا یہ پھول راکھ کی سفید تہہ میں وقتی طور پر اوجھل ہو سکتا ہے، مگر اس کی حِدت اور حرارت، بھلا کبھی روبہ زوال ہو سکتی ہے؟ ناممکن! ناممکن! ناممکن! اس لیے کہ یہ محض رمق نہیں، اُلوہی توانائی (Divine Energy) سے فیضیاب وہ چراغ ہے، جس کی لو، سدا قائم رہنی ہے۔ (کوئی غور کرے تو یہی ختم نبوت کا مفہوم ہے)!

علامہ اقبالؒ، جس رہبر فرزانہ کو یہ نکتہ سمجھا رہے تھے کہ یہ راہی بے ذوق نہیں، کم کوش ضرور ہیں، سو نومیدی کی، کوئی بات نہیں۔ اس قائد اعظمؒ نے مسلمان کے قلب سے جھلکنے والے ذوقِ محبت رسول ﷺ ہی کو تو دریافت کر کے، ایک علیحدہ ریاست کا ارمغان بخش دیا تھا۔ یورپ اور امریکہ پر کپکپی اسی لیے تو طاری ہے، کہ اگر یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل بن گیا، تو

قرآنک سٹیٹ اس کے دل کی سلطنت کا روپ اختیار کر لے گی۔ ایسے میں طاغوت کے لیے کیا گنجائش رہ جائے گی؟...... چنانچہ یہ اس کی بقا کا مسئلہ ہے، مگر باقی تو اللہ نے رہنا ہے، اس سچے اللہ نے، جس کا وعدہ ہے، مآل کار غالب مومن ہی نے ہونا ہے، لہٰذا یہ جو کچھ ہوتا ہے، خاکے شائع کیے جاتے ہیں، کتابیں لکھی جاتی ہیں، فلم بنائے جاتے ہیں.......... یہ سب اتنا سادہ نہیں ہے۔ البتہ ان جسارتوں میں ایک زاویہ قابل غور ہے کہ اسلامی تعلیمات، دینی معتقدات کو ہدف تنقید بنانے سے زیادہ نبی اکرم ﷺ کے مقام و مرتبے میں کمی کی عمداً کاوش کی جاتی ہے۔ وجہ ظاہر و باہر ہے کہ کسی طرح مسلمان کے دل سے حضور ﷺ کی محبت مِٹ جائے، مٹتی نہیں تو اس کا گراف ہی نیچے آجائے! (خاکم بدہن)! اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو تعلیمات و معتقدات کیا ہوتے ہیں!...... وہ دیوار اپنے آپ مسمار ہو جائے گی! (معاذ اللہ)! اس لیے اہم فریضہ ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ ہے۔ آپ ﷺ ہیں، تو آپ ﷺ کا عطا فرمودہ دین بھی ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ توہین رسالت ﷺ کرنے والے کو سزا ملنی چاہیے یا نہیں؟ ہمیں اس سوال میں چھپی ہوئی زہریلی عیاری کو پہچاننا چاہیے اور وہ یہ ہے، کیا آپ ﷺ کی توہین، جرم ہے یا نہیں؟ اگر مغربی اخلاقیات کے قواعد و ضوابط سے یہ ثابت ہو جائے کہ عام فرد کی اہانت بھی دنیا کا سب سے قبیح جرم ہے، تو پھر وہ شخصیت جو اربوں انسانوں کے لیے مکرم ترین وجود ہیں، ان کی اہانت، خود سوچ لیں، کتنا بڑا جرم ہے! ایسا جرم، جس پر جتنی بھی سزا دی جائے، کم ہے۔

متین بھائی! اس مرتبہ کتاب کو، میں نے ان تناظرات میں دیکھا، تو مجھ پر کھلا کہ یہ سعی واجب نہیں، فرض تھی۔ آپ نے عرق ریزی کے ساتھ ان مضامین کو اخبارات و جرائد سے تلاش کیا ہے ان اوراق کو تاریخی دستاویز بنا کر، آپ نے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ کیا کروں، میرا دل اس گواہی کو چھپا نہیں سکتا کہ اس ضخیم تصنیف میں، جو تحریر گلِ سرسبد یا GEM کہلائی جانے والی ہے وہ ہے، اس کا وقیع مضمون ''آزادی اظہار، اسلام کے خلاف مغرب کا فکری حربہ''، جو مرتب کے قلم کا اعجاز ہے۔ آپ کے متعلق میرا ہمیشہ سے یہ تاثر رہا ہے Has Broad Shoulders، واقعتاً آپ غیر معمولی استعدادوں کے مالک ہیں، دست فطرت نے آپ کو اعلیٰ سکت سے نوازا ہے، بڑی ذمہ داریوں کو اٹھا سکتے ہیں۔ سو سیکڑوں صفحات کو Synoptical انداز میں پیش کر دینا آپ ہی کا کمال ہے..........

بلاشبہ محولہ مضمون آخری سطر تک! سبحان اللہ! برسوں کی فکری ریاضت اور قرنوں سے محبت رسول ﷺ کی حرارت سے تپیدہ قلب کا رشحہ و ماحصل ہے۔ بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دینے والا یہ مضمون عمر بھر کے مطالعے کا فشردہ ہے۔ دل وجد کی حالت میں ہے۔ یہ 50 سے زائد صفحات ایسی دستاویز ہیں جو ہدایت کے طالب کی دنیا بدل کر رکھ سکتے ہیں۔ ایک ایک لفظ نہایت ذمہ داری کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جذبہ و احساس کے وفور کے باوصف معروضی ثروت مندی کے مظہر اس مقالہ میں وہ تمام منطقات سمٹ آئے ہیں، جو عالمی سطح پر پھیلائے گئے مخصوص بلکہ مذموم موقف کا مکمل اور مسکت جواب ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہی دنیا و عقبیٰ میں اس سعی پر آپ کو اجر عطا فرمائیں گے! علمی دنیا میں یہ کتاب ایک مستقل اور مستند حوالہ بنے گی۔

جمیل احمد عدیل
ایسوسی ایٹ پروفیسر
گورنمنٹ کالج، راوی روڈ
لاہور

دِل کی بات

اب یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پوری دنیا میں آزادی اظہار رائے، حقوق انسانی اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹنے والا مغرب منافقت اور دوغلے پن کے کینسر کا شکار ہے۔ خوشنما اور دل ربا اصطلاحات میں روشن خیالی کا درس دینے والے نام نہاد مصلح کا اصل چہرہ بے نقاب ہو چکا ہے۔ حالیہ برسوں میں اسلام دشمنی کے پے در پے واقعات نے اب ثابت کر دیا ہے کہ مغرب میں آزادی اظہار رائے کا مطلب ہے، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اجتماعی طور پر اسلام اور اس کی مقدس شخصیات کی توہین وتحقیر، اسلامی تعلیمات کا تمسخر اور مسلمانوں کی تذلیل۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہ مذموم حرکات کسی ایک فرد کا ذاتی عمل یا کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ ایسی ناپاک جسارتیں پورے مغربی معاشرے کی اجتماعی سوچ کی مظہر ہیں جو تہذیبوں کے ٹکراؤ اور ایک نئی صلیبی جنگ کا پیش خیمہ ہیں۔ مزید براں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ مغرب میں گستاخانِ اسلام کو حکومتوں کی باقاعدہ سرپرستی حاصل رہتی ہے، ملکی دستور انہیں نہ صرف ایسی رذیل حرکات کی بخوشی اجازت دیتا ہے بلکہ عدالتیں انہیں مکمل تحفظ بھی فراہم کرتی ہیں۔ قانون سے معمولی سی بھی شد بد رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ یورپ میں Law of Tort کی کس قدر اہمیت ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ قانون قرآن مجید کی سورۃ الاحزاب سے اخذ کیا گیا ہے۔ مغرب میں یہ ضابطہ اس قدر طاقتور اور موثر ہے کہ وہاں پریس سمیت کسی کی جرأت نہیں کہ وہ کسی کی تضحیک کرے، کسی سے ناانصافی کرے، کسی کے جذبات مجروح کرے یا کسی کی شہرت کو نقصان پہنچائے۔ خلاف ورزی کی صورت میں متاثرہ فریق اپنے حقوق کے لیے عدالت سے رجوع کر سکتا ہے، استغاثہ ثابت ہونے پر تلافی کے طور پر عدالت دوسرے فریق کو بھاری جرمانہ عائد کر سکتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ پیروکارانِ اسلام کو چھوڑ کر دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے ہے۔ مسلمان اس قانون سے استفادہ نہیں

کر سکتے۔ یاد رہے مغرب میں مسلمانوں سے بالخصوص تعصب برتا جاتا ہے۔ Law of Tort ایسے قوانین کی موجودگی کے باوجود انہیں کسی قسم کا کوئی ریلیف نہیں ملتا۔ الٹا انہیں تنگ نظری اور رجعت پسندی کا طعنہ دے کر برداشت، رواداری اور وسعت نظری کے رٹے رٹائے لیکچر پلائے جاتے ہیں۔ گویا مغرب میں مسلمانوں کے کوئی حقوق نہیں۔ حالانکہ وہاں کتوں، بلیوں سمیت تمام جانوروں کے حقوق ہیں۔ ان کے تحفظ کے لیے بے شمار این جی اوز ہیں جو نہ صرف متحرک بلکہ نہایت اثر و رسوخ کی مالک ہیں۔ مسلمانوں سے مغرب کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ وہ انہیں انسان بھی ماننے سے انکاری ہیں۔

مغرب کی نفسیات یہ ہے کہ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کی مقدس ہستیوں کی توہین کر کے پہلے ان کے دینی جذبات مجروح کرتا ہے جس سے دنیا بھر کے مسلمان اپنی ایمانی حرارت کے پیش نظر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس پر کہیں نہ کہیں اکا دکا تشدد کا کوئی واقعہ بھی رونما ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی آڑ میں مغربی میڈیا مسلمانوں کے خلاف نہایت منفی پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے کہ اسلام تشدد پسند مذہب ہے اور اس کے ماننے والے انتہا پسند ہیں۔ حالانکہ اسلام امن و آشتی کا دین ہے جو نہ صرف اپنے ماننے والوں کو مخلوق خدا سے محبت و مودت کا سبق دیتا ہے بلکہ قیامت تک کے انسانوں کو سلامتی کے محور میں مامون ہونے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مغرب کی نام نہاد آزادی اظہار رائے کے نام پر اس کی اسلام دشمنی کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں بیان کردہ مدلل انکشافات اور جامع اکتشافات نہایت چونکا دینے والے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ مغرب نے بہت سی باتوں کو یونہی فرض کر کے یا آنکھیں بند کر کے اپنی توپوں کا رخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف کر رکھا ہے جو سراسر عالمی اخلاقی قدروں کے خلاف ہے۔ یہی اس کتاب کا حاصل اور منشا ہے۔ امید ہے قارئین کرام اس معمولی کاوش کو پسند کریں گے۔

محمد متین خالد
لاہور
mateenkh@gmail.com

حرفِ سپاس

جناب پروفیسر ڈاکٹر حامد رضا، جناب محمد فرقان، جناب قاضی احسان احمد، جناب عبدالرؤف، جناب محمد احمد ترازی، جناب عقیل انجم، جناب پروفیسر محمد اقبال جاوید، جناب پروفیسر جمیل احمد عدیل، جناب محمد آصف بھلی ایڈووکیٹ، جناب محمد احمد حافظ، جناب محمد زاہر نور البشر، جناب محمد ہاشم جاوید، جناب فیض الرسول اور جناب مولانا عزیزالرحمٰن ثانی کا بے حد شکریہ جنھوں نے کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں بے حد تعاون کیا اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔
میں ان حضرات کی ہر مرحلہ زندگی میں کامیابی کے لیے دعا گو ہوں!

گو اور بھی گل رو ہیں مرقع میں جہاں کے
لیکن تیری صورت کا سبھوں سے ہے جدا رنگ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِکُمْ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّکَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیْرًا. لَعْنَتُ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ. وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ. اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ.

حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین انسان وہ ہے جو کسی مسلمان کے عیوب کو تلاش کرے اور اس کی نیکیوں کو فراموش کر دے۔''

پھول بغیر کانٹے کے نہیں ہوتا۔ آپ کتنا ہی نیک کام کیوں نہ کریں، نکتہ چین اپنی نیش زنی سے باز نہیں آتے۔ کسی کے عیب تلاش کرنے والے کی مثال اُس مکھی جیسی ہے جو سارا خوبصورت جسم چھوڑ کر صرف زخم پر ہی بیٹھتی ہے۔ چاند کو دیکھ کر کتے بھونکا کرتے ہیں اور بھونک بھونک کر یونہی اپنے آپ کو تھکا دیتے ہیں۔ حسد کا کوئی علاج نہیں۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول زریں ہے: ''بارش کا قطرہ سیپ اور سانپ دونوں کے منہ میں گرتا ہے۔ سیپ اس قطرے کو موتی بنا دیتا ہے جبکہ سانپ اسے زہر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسا کسی کا ظرف، ویسی اس کی تخلیق۔'' مزید ارشاد فرمایا: ''حاسد کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جب تم خوش ہوتے ہو تو وہ افسردہ ہو جاتا ہے۔''

حاسد حسد کی آگ میں ہر دم جلا کرے
وہ شمع کیا بجھے، جسے روشن خدا کرے

۞ ۞ ۞

آزادیٔ اظہار
کے نام پر

محمد صلاح الدین

اسلام اور آزادیٔ اظہار رائے

اسلامی ریاست کے شہریوں کو محض یہی حق حاصل نہیں کہ جب ان پر ظلم ہو تو وہ زبان کھولیں، بلکہ انہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ ملک کے معاملات و مسائل سے متعلق اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کریں۔ قرآن مجید میں مومنوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔

"وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔" (آل عمران: 110)

یہ صفت آزادیٔ اظہار خیال کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اس آیت سے نہ صرف اس آزادی کی ضمانت مہیا ہو جاتی ہے بلکہ آزادی کے استعمال کا رُخ بھی متعین ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان اس آزادی کو صرف نیکی کے فروغ کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ برائی کو پھیلانے کے لیے اسے یہ آزادی نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ یہ منافقوں کی صفت ہے جن کے بارے میں فرمایا گیا:

"وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں۔" (التوبہ: 67)

قرآن نے بنی اسرائیل کے تنزل کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے:

"انہوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔" (المائدہ: 79)

مسلمانوں کو اس تساہل سے بچنے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔" (النساء: 135)

یعنی یہاں اگر تم نے حق بات کہنے سے گریز کیا یا کسی دباؤ، دھونس یا لالچ میں آ کر لگی لپٹی بات کہہ کر منافقانہ طرزِ عمل اختیار کیا تو یہ جان رکھو کہ دنیا میں تو تم چاہے سزا سے بچ جاؤ مگر آخرت میں اس جرم کی سزا سے نہ بچ سکو گے۔

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"میرے بعد کچھ لوگ حکمران ہونے والے ہیں، جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔" (نسائی، کتاب البیع)

حضور نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ مختلف معاملات میں صحابہؓ کرام سے رائے لیتے اور اظہار رائے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ جنگ احد کے موقع پر آپ ﷺ اور معمر و جلیل القدر صحابہ کرامؓ کی یہ رائے تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے مگر حضرت حمزہؓ اور نو جوانوں کی رائے یہ ہوئی کہ باہر نکل کر جنگ کی جائے۔ آپ نے دیکھا کہ اکثریت باہر نکل کر جنگ کرنے کے حق میں ہے تو اسی کے مطابق عزم جنگ کیا اور ہتھیار بندی کے لیے اپنے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ اس دوران معمر صحابہؓ نے نوجوانوں کو عار دلائی کہ تم نے پیغمبر خدا کی رائے کا لحاظ کیے بغیر آپ ﷺ کو تکلیف میں ڈالا۔ یہ سن کر نوجوان متاثر ہوئے اور معذرت کے لیے حجرہ کے سامنے جمع ہو گئے۔ آپ ﷺ باہر آئے اور ان کی معذرت سنی تو فرمایا "عزم کے بعد اب نبی کی شان نہیں ہے کہ مقصد کو حاصل کیے بغیر غیر مسلح ہو جائے۔ چلو اب مدینہ سے باہر ہی میدان جنگ قائم ہوگا۔"

ایک بار آپ ﷺ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، کسی نے کہا "تقسیم غنیمت مرضیٔ الٰہی کے خلاف ہوئی ہے۔" بات بہت سخت تھی مگر آپ ﷺ نے معاف کر دیا۔ کسی اور کی آواز آئی۔ "آپ ﷺ نے عدل سے کام نہیں لیا۔ فرمایا، "اگر میں عدل نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟" پھر کہنے والے سے کوئی باز پرس نہ کی۔ حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری کا کوئی معاملہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ انصاری نے غصہ میں آ کر کہا۔ "اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں فیصلہ کر دیا!" آپ ﷺ نے اس گستاخی سے درگزر کیا اور کچھ نہ فرمایا۔

ایک غزوہ میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں اور پڑاؤ ڈالیں۔ ایک صحابی نے دریافت کیا۔ "یہ ارشاد وحی سے ہے یا آپ ﷺ کی ذاتی رائے سے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ میری ذاتی رائے ہے۔" صحابیؓ نے عرض کیا۔ "پھر تو یہ منزل مناسب نہیں۔ اس کے بجائے فلاں فلاں منزل مناسب ہوگی۔" چنانچہ اسی

رائے پر عمل کیا گیا۔ (سیرت النبی ﷺ از شبلی نعمانی)

حضرت ابوبکرؓ نے تو اپنے خطبہ خلافت میں اظہار رائے کی باقاعدہ دعوت دی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل نے انہیں ایک مشترکہ خط لکھا جس میں انہیں خلافت کی ذمہ داریوں اور آخرت کی جوابدہی کا احساس دلایا گیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا۔ ''ہم اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہمارے اس خط کو آپ وہ حیثیت نہ دیں جو اس کی واقعی اور حقیقی حیثیت ہے۔ ہم نے یہ خط خیر خواہی کے جذبہ سے لکھا ہے۔'' حضرت عمرؓ نے ان دونوں حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں اپنے طویل جوابی خط میں لکھا۔ ''تم دونوں کی تحریریں صداقت سے بھرپور ہیں۔ مجھے ان جیسے مکتوبات کی ضرورت ہے۔ لہٰذا تم مجھے خط لکھتے رہا کرو۔''

حضرت سعد بن عبادہ انصاری نے نہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ حضرت عمرؓ کے۔ وہ نہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے نہ ان کی امامت میں جمعہ ادا کرتے اور نہ حج کرتے۔ ابن قتیبہ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

> ''ان کو کچھ مددگار مل جاتے تو وہ ارباب اقتدار پر ہلہ بول دیتے اور اگر کچھ لوگ ان سے جنگ کے لیے بیعت کر لیتے تو وہ ان لوگوں سے جنگ بھی چھیڑ دیتے۔ وہ اپنے اس رویہ پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ ابوبکرؓ نے وفات پائی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو وہ شام چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔''

حضرت سعدؓ بن عبادہ کی اس روش کے باوجود ان سے نہ حضرت ابوبکرؓ نے کوئی تعرض کیا نہ حضرت عمرؓ نے، کیونکہ انہوں نے بیعت نہ کرنے کے باوجود کبھی باغیانہ عمل اختیار کر کے عملاً کوئی مفسدانہ کارروائی نہیں کی۔ حضرت عمرؓ کے دور میں آزادیٔ اظہار رائے کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی راہ چلتے یا بھری مجلس میں برسر منبر جہاں چاہتا آپ کو ٹوک سکتا تھا۔ آپ سے اپنی شکایت بیان کر سکتا تھا۔ آپ کا مواخذہ کر سکتا تھا اور آپ اظہار رائے کی اس روح کو بیدار رکھنے کے لیے ہمیشہ شکایت کنندہ کی بات پر پوری توجہ دیتے، اس کو کوئی دوسرا درمیان میں ٹوکتا تو آپ سخت ناراض ہوتے اور کہنے والے کو پوری بات کہنے کا موقع دیتے۔ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور اس کی شکایت پر فوری کارروائی عمل میں لاتے۔ عمرو بن العاصؓ، مغیرہ

بن شعبہؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور سعد بن وقاصؓ جیسے گورنروں کے خلاف آپ نے برسرعام شکایات سنیں اور ان کا تدارک کیا۔ اپنے جسم کی دو چادروں کا حساب بھرے مجمع میں دیا۔ تحدید مہر کا فیصلہ کھلے اجلاس میں واپس لیا اور معترض خاتون کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے انہیں سیدھی راہ دکھائی۔ مجمع میں اٹھ کر ایک شخص نے کہا کہ تم ٹیڑھی راہ چلے تو ہم تلوار سے تم کو سیدھا کر دیں گے اور آپ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ قوم میں ایسے افراد موجود ہیں کہ اگر میں گمراہ ہونے لگوں تو وہ مجھے راہ راست پر لے آئیں گے۔ غرض آپ کا پورا عہد خلافت آزادیٔ اظہار رائے کے بے شمار واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ ان واقعات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آپ نے کبھی کسی ٹوکنے، احتساب کرنے اور شکایت بیان کرنے والے کی زبان بندی نہیں کی۔ نہ اس کے لب ولہجہ کے بارے میں کبھی تنک کر یہ فرمایا کہ تم نے میری شان میں گستاخی کی ہے آپ کے اس رویہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک شخص نے سرراہ آپ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''عمر! خدا سے ڈرو!'' اس نے یہ جملہ کئی بار دہرایا اس پر کسی نے ٹوکا۔ ''چپ رہ! تو نے امیر المومنین کو بہت کچھ کہہ سنایا۔'' حضرت عمرؓ نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا ''اسے مت روک، یہ لوگ اگر ہم سے ایسی بات کہنا چھوڑ دیں تو پھر ان کا فائدہ ہی کیا؟ اور اگر ہم ان کی باتوں کو نہ قبول کریں تو ہمیں بھلائی سے عاری سمجھنا چاہیے اور بعید نہیں کہ یہ بات اپنے کہنے والے پر ہی چسپاں ہو جائے۔''

ایک شخص نے آ کر عرض کیا ''امیر المومنین! میرے لیے یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہر برائی پر کھل کر تنقید کروں، اور خدا کی راہ میں کسی کو ملامت کرنے والے کی لعن طعن کی پروا نہ کروں یا اپنی تمام تر توجہ اپنے ہی نفس کی اصلاح پر مرکوز رکھوں؟'' آپ نے جواب دیا:

> ''جو فرد کسی درجے میں بھی مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا سربراہ کار بنایا گیا ہو، اسے تو راہ خدا میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرنا چاہیے اور جس کے سر یہ ذمہ داری نہ ہو، اسے چاہیے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرے اور اپنے حکمرانوں کا خیر خواہ رہے۔''

ایک خاتون راہ چلتے آپ پر برس پڑیں اور بولیں ''عمر تمہارے حال پر افسوس ہے، میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے جب تم عمیر کہلاتے تھے اور لاٹھی لیے دن بھر عکاظ میں بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب تم عمر کہلانے لگے

اور اب یہ زمانہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ امیر المومنین بنے پھرتے ہو۔ رعایا کے معاملے میں خدا سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرے گا اور آخرت کے بعید عالم کو اپنے آپ سے بالکل قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہوگا، وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہے گا کہ خدا کی دی ہوئی کوئی فرصت رائیگاں نہ جائے۔"

جارود عبدی، جو حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے، یہ تقریر سن کر بولے، آپ نے امیر المومنین کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں فوراً ٹوکا اور فرمایا "یہ جو کہنا چاہتی ہیں، انہیں کہنے دو تمہیں شاید علم نہیں کہ یہ خولہ بنت حکیم ہیں۔ ان کی بات تو اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے سنی تو عمر کی کیا ہستی ہے کہ وہ ان کی بات نہ سنے۔"

شام کے سفر میں جب آپ نے ایک مجمع میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کی وجہ بیان کی تو ایک شخص نے وہیں اٹھ کر کہا۔ "اے عمر! خدا کی قسم تو نے انصاف نہیں کیا۔ تو نے رسول اللہ کے عامل کو برطرف کر دیا، تو نے رسول اللہ ﷺ کی کھینچی ہوئی تلوار کو نیام میں ڈال دیا۔ تو نے قطع رحم کیا، تو نے اپنے چچیرے بھائی پر حسد کیا۔" حضرت عمرؓ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے اور جب اس شخص نے اپنی بات پوری کر لی تو نرمی سے فرمایا۔ "تم کو اپنے بھائی کی حمایت میں غصہ آ گیا۔"

آپ کا اعلان عام تھا:

> "جس کسی کو کوئی ضرورت پیش آئے یا ظلم کیا جائے یا میری کسی بات پر ناراض ہو تو مجھے اطلاع دے۔ میں بھی تم ہی میں سے ایک فرد ہوں۔"
>
> "میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی اور نہیں ہے۔ اللہ نے پکارنے والوں کی پکار سننا میرے ذمہ کیا ہے۔ لہٰذا اپنی شکایت مجھ تک پہنچاؤ۔ اگر کوئی شخص مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تو ان لوگوں کو اپنی شکایت پہنچاؤ جو مجھ تک پہنچا سکیں۔ ہم اس کا حق بغیر کسی پریشانی کے اسے دلا دیں گے۔"

حضرت عثمانؓ نے تو سیاست اختلاف کے اظہار کی اتنی کھلی چھوٹ دی کہ مخالفین کو طاقت سے کچلنے یا ان کے زبان بند کرنے پر، اپنی جان دینے کو ترجیح دی۔ حضرت علیؓ نے بھی اظہار اختلاف کرنے والوں کو کبھی طاقت کے ذریعے نہیں کچلا۔ بلکہ اس کی پوری اجازت دی۔

بیت المال میں سے ان کا جو حصہ نکلتا تھا وہ انہیں باقاعدگی سے ملتا رہا۔ کسی کی جائیداد ضبط نہیں ہوئی، کسی کا وظیفہ بند نہیں ہوا۔ آپ نے خوارج کو جو تحریری پیغام بھجوایا، اس میں صاف لکھا تھا:

> ''تم کو آزادی حاصل ہے، جہاں چاہے رہو، البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرار داد ہے کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہیں بہاؤ گے، بدامنی پیدا نہیں کرو گے اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی تم سے سرزد ہوئی تو پھر تمہارے خلاف جنگ شروع کر دوں گا۔''

اظہار رائے کی یہ آزادی صرف خلفائے راشدین ہی کے دور تک محدود نہیں رہی، اس کی جھلک ہمیں مسلمانوں کی تاریخ کے ہر دور میں ملتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں حکمرانوں کے اندر اختلاف برداشت کرنے کی وہ روح باقی نہ رہی جو ہمیں خلفائے راشدین کے اندر ملتی ہے لیکن اس معاملہ میں انحطاط کے باوجود جرأت اظہار اور احترام اختلاف رائے کی جو مثالیں ہمارے ہاں ملتی ہیں، وہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ مسلمان اپنے حق سے کبھی کلیتاً دستبردار یا محروم نہیں ہوئے۔

حجاج بن یوسف بنی امیہ کا ظالم ترین حکمران تھا۔ اس نے ایک شخص سے پوچھا: ''کیا تم محمد بن یوسف کو جانتے ہو؟'' وہ کہنے لگا ہاں! کیوں نہیں جانتا۔ ''حجاج نے کہا۔ ''کچھ اس کے چال چلن کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے جواب دیا۔ ''وہ تو بڑا ہی بدآدمی ہے، اللہ اور اس کے احکام کی سرتابی میں یکتا۔'' حجاج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور کرخت آواز میں بولا۔ ''کمبخت تجھے معلوم نہیں، وہ میرا بھائی ہے؟'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ہاں ہاں جانتا ہوں مگر کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ میرا رب ہے اور خدا کی قسم وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب و مطلوب ہے جتنا تجھے تیرا بھائی۔''

ایک مرتبہ ہارون الرشید حج کے لیے گیا۔ دوران طواف عبداللہ عمری کی نظر پڑ گئی، انہوں نے آواز دی۔ ''اے ہارون! ہارون نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ''عم محترم! خاکسار حاضر ہے۔'' عبداللہ عمری نے پوچھا۔ ''بتا سکتے ہو حج کے لیے جو لوگ آئے ہیں ان کی تعداد کیا ہے۔ ہارون بولا ''بے شمار، صحیح تعداد تو خدا ہی جانتا ہے۔'' عبداللہ عمری نے کہا ''اے شخص! اس حقیقت کو نہ بھول کر اس انبوہ خلائق میں سے ہر ایک خدا کے سامنے صرف اپنے لیے جواب دہ ہے اور تو ان سب کا جواب دہ۔ ذرا سوچ، محاسبے کے وقت تجھ پر کیا گزرے گی؟''

ہارون یہ سن کر رونے لگا اور عبداللہ عمری سے کچھ نہ کہا۔

اسی ہارون الرشید کو قاضی ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب الخراج کے مقدمہ میں جو نصیحتیں کی ہیں وہ جرات اظہار رائے کا ایک شاہکار ہے۔ ہارون ایک بار خطبہ دے رہا تھا، ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا "خدا کی قسم! تم نے مال کی تقسیم برابر کی اور نہ عدل و انصاف سے کام لیا۔ بلکہ اس کے بجائے فلاں فلاں برائیاں کیں۔ ہارون نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ نماز کے بعد قاضی ابو یوسف کو طلب کیا گیا۔ ہارون نے ان سے کہا کہ اس شخص نے آج ایسی گفتگو کی ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ وہ اس وقت سخت غصہ میں تھا اور گرفتار ہونے والا شخص جلادوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے نبی ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طرز عمل کی مثالیں پیش کر کے بڑی جرأت سے کہا۔ "آپ اسے سزا نہیں دے سکتے۔" اسوۂ حسنہ کا حوالہ سامنے آتے ہی ہارون کا غصہ جاتا رہا اور اس نے اس شخص کو فوراً چھوڑ دینے کا حکم دیا۔"

ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر، خراسان کا فرمانروا تھا۔ امام غزالیؒ اس سے ملے اور اسے مخاطب کر کے کہا "افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوق ہائے زریں کے بار سے۔"

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کو ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ بادشاہ کی دست بوسی کر لیجیے، قصہ رفع دفع ہو جائے گا اور آپ کو ترقی کے ساتھ عہدہ پر بحال کر دیا جائے گا۔ شیخ نے کہا:

> "اے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں۔ لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو اور میں کسی اور عالم میں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس سے آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔"

انہی شیخ عزالدین نے عین عید کے روز جب کہ جشن منایا جا رہا تھا اور لوگ زمین بوس ہو کر نذرانے پیش کر رہے تھے، بھرے دربار میں بادشاہ کو پکار کر کہا "ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے۔ جب پوچھا جائے گا کیا ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لیے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے؟" بادشاہ نے پوچھا "کیا یہ واقعہ ہے؟" شیخ نے بلند آواز سے کہا

"ہاں، فلاں میخانے میں شراب آزادی سے بک رہی ہے اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں اور تم یہاں داد عیش دے رہے ہو؟" بادشاہ نے فوراً شراب خانہ بند کرنے کا حکم دیا۔

اس طرح کے سینکڑوں واقعات تاریخ اسلام میں موجود ہیں جہاں کلمۂ حق پوری جرأت مندی سے، انتہائی تند و تیز لہجہ میں اور بھری مجلسوں اور درباروں میں بلند کیا گیا۔ مطلق العنان بادشاہوں نے بھی ان کو صبر و تحمل سے سنا اور ایسا کرنے والوں کو کوئی سزا نہیں دی۔

آج کے جمہوری دور میں خود عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے کتنے حکمران ہیں، جو اپنی کھلی کچہریوں اور عام جلسوں میں لوگوں کو یہ انداز تخاطب کرنے اور اپنا بے لاگ محاسبہ کرنے کی اجازت دیں گے؟

اسلام میں آزادی اظہار رائے کی حدود کا تعین کرتے ہوئے علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

"شریعت ان لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی جو امام کے خلاف بغاوت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے اس عقیدے کو عملی شکل دینے کے لیے کوئی جنگ نہ برپا کریں یا اس کے لیے کوئی تیاری نہ شروع کردیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب وہ بغاوت کریں تب ان کو قتل کرو۔"

"اگر کوئی گروہ کسی طرح کی باغیانہ رائے کا اظہار کرے جس طرح کی رائے خوارج رکھتے تھے تو اس کی بنیاد پر اس کا قتل جائز نہیں ہوگا۔ قتل صرف اس صورت میں جائز ہوگا جب ان کی تعداد زیادہ ہو جائے، وہ مسلح ہو جائیں اور لوگوں کے جان و مال سے تعرض شروع کردیں۔"

ان حدود سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلامی ریاست میں محض شکوک و شبہات کی بنا پر شدید سے شدید اختلاف کے برملا اظہار پر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ عملاً کسی باغیانہ سرگرمی کا مظاہرہ نہ ہو۔ اسلامی ریاست میں کوئی حکومت آزادی اظہار رائے پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتی۔ کیونکہ اس کا مطلب خدا کے دیئے ہوئے حق کو سلب کرنا اور خود مقتدر اعلیٰ کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کرنا ہوگا۔
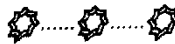
ڈاکٹر محمد امین

توہین رسالت ﷺ اور آزادئ اظہار

مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں ہیومنزم (Humanism)، انڈی وجیولزم (Individualism) سیکولرازم، لبرل ازم، کیپٹل ازم وغیرہ پر استوار ہیں نہ کہ کسی آسمانی مذہب پر۔ ہیومنزم اور انڈی وجیولزم کا مطلب یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار ہے، وہ کسی الٰہ کا عبد نہیں ہے جس کی غیر مشروط اطاعت اس پر واجب ہو بلکہ اس کی حیثیت کائنات میں مرکزی اور اساسی ہے، وہ سب کا آقا اور تقدیس کا حامل ہے۔ وہ خود مختار ہی نہیں مختار مطلق ہے اور زندگی اسے اپنی مرضی کے مطابق گزارنی ہے نہ کہ کسی خدا اور رسول کی ہدایت کے مطابق۔ چنانچہ فرد "آزاد" ہے کہ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے اور کائنات میں کسی ہستی یا نظریے یا مذہب کو (یعنی خدا ورسول کو) یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کی آزادی کو محدود کرے اور اس پر پابندیاں لگائے جب کہ اس کے برعکس آسمانی مذاہب کو ماننے والوں خصوصاً اسلام کے پیروکاروں کا موقف یہ ہے کہ انسان خود مختار اور مختار مطلق نہیں بلکہ مختار مطلق تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور انسان محض اللہ کا عبد اور حقیر بندہ ہے اور وہ لامحدود حد تک آزاد نہیں بلکہ غیر مشروط طور پر اور لامحدود حد تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت کا مکلف ہے اور انسانی عقل و تجربہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ آزادی کبھی لامشروط اور لامحدود نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ بعض قیود سے مشروط ہوتی ہے۔

مغربی تہذیب میں انسان کے لامحدود آزادی کے حامل ہونے کے تصور کا ایک مظہر اہل مغرب کا "بنیادی انسانی حقوق" کا وہ چارٹر ہے جو انہوں نے اقوام متحدہ سے منظور کرا کر ساری دنیا پر لاگو کر رکھا ہے (کیونکہ انہیں اقوام متحدہ میں دوسری اقوام پر ایسی برتری حاصل ہے جس کا کوئی اخلاقی جواز نہیں) اور یہ چارٹر مغربی تہذیب کے اس ورلڈ ویو پر مبنی ہے جس کی اساس ہیومنزم، سیکولرازم وغیرہ ہیں اور جن سے دوسری تہذیبیں اور ممالک اتفاق نہیں

کرتے خصوصاً اسلام جیسے سماوی ادیان جو اس کے برعکس اپنا مخصوص ورلڈ ویو رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ اصولاً ان اساسات سے متفق نہیں جن پر اہل مغرب اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا مدار ہے مثلاً اسلام میں انسانی حقوق و واجبات کا تعین اللہ اور اس کا رسول ﷺ کرتا ہے نہ کہ مسلمان۔ خود جب کہ مغربی فلسفے کی رو سے انسان مختار مطلق ہے اور انسانی حقوق کے بارے میں فیصلے کا اختیار خود اسے حاصل ہے۔ اصول قانون/ اصول فقہ کے اس بنیادی فلسفے کے تضاد کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور اس کے اثرات کہاں تک پہنچتے ہیں؟ اس کے لیے بطور مثال اور نمونہ عورت اور مرد کے حقوق کا جائزہ لے کر دیکھ لیجیے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مرد، عورت کا قوام و نگران ہے اور دونوں کا دائرہ کار الگ ہے۔ اسلام اختلاط کی نفی کرتا ہے اور نکاح کے بغیر جنسی تعلق کو قبیح فعل اور بہت بڑا جرم قرار دیتا ہے جس کی سزا کوڑے اور موت (رجم) مقرر کرتا ہے کیونکہ اس سے معاشرت میں فساد پھیلتا ہے، نسل انسانی محفوظ نہیں رہتی اور نفرت و انتقام کے نتیجے میں قتل و غارت گری کے در وا ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مغرب میں عورت اور مرد ہر لحاظ سے برابر ہیں۔ وہ اگر باہم رضامند ہوں تو بغیر نکاح کے ان کا باہم جنسی تعلق قائم کرنا بھی جائز اور قانونی ہے، وہ نکاح کے بغیر اکٹھے زندگی گزار سکتے اور اولاد پیدا کر سکتے ہیں وہ اگر نکاح کر لیں تو عورت بھی مرد کو طلاق دے سکتی ہے اور مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے بھی نکاح کر سکتی ہیں۔۔۔ غرض مغرب اور اسلام میں حقوق کا پورا نقشہ ہی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مسلمانوں کا فلاں قانون مغرب کے طے کردہ بنیادی انسانی حقوق کے خلاف ہے، بالکل بے معنی اور بے وزن بات ہے کیونکہ حقوق کا تصور دونوں جگہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

اب اہل مغرب کا مقدمہ یہ ہے کہ مغرب میں فرد چونکہ غیر مشروط پر اور لامحدود انداز میں ''آزادی'' (Freedom) کا حامل ہے اور کوئی اس پر قدغن نہیں لگا سکتا، لہٰذا ''آزادی'' کا یہ تصور اسے یہ ''حق'' دیتا ہے کہ وہ جو چاہے، سوچے اور جو کہنا چاہے، اس کا اظہار کر سکے یعنی لامحدود آزادیٔ اظہار کا حق اس کا بنیادی انسانی حق ہے۔ لہٰذا ایک مغربی آرٹسٹ اگر سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر کی تعلیمات انہیں تشدد پر اکساتی ہیں تو وہ اس پیغمبر کے خلاف لکھ سکتا ہے، کارٹون بنا کر اس پر تنقید کر سکتا ہے اور یہ ان کے تصور 'آزادی' اور تصور 'حقوق' کے عین مطابق ہے جب کہ ہم مسلمانوں کا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے ہاں 'آزادی'

اور 'حق' کا یہ تصور سرے سے موجود ہی نہیں۔ اہل مغرب کو اپنے تصورات کو ایک متفقہ اور عالمگیر سچائی فرض کر کے ہم پر نہیں ٹھونسنا چاہیے اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے پونے دو ارب مسلمانوں کی محبوب شخصیت پر تنقید کر کے اور اس کا مضحکہ اڑا کر انہیں ایذا نہیں پہنچانی چاہیے۔

مغرب کے ہیومنزم اور انڈی وجیولزم کے تصورات کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ کائنات میں چونکہ انسان کو مرکزی حیثیت اور تقدس حاصل ہے۔ لہٰذا اگر اس سے کوئی غلطی بھی ہو جاتی ہے تو اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ کوئی چھوٹی موٹی سزا دینی چاہیے لیکن اسے کوئی ایسی سزا نہیں دینی چاہیے جس سے اس کی زندگی ہی ختم ہو جائے یعنی موت کی سزا۔ یہ ہے مغرب میں 'انسان کی تکریم' کا تصور اور فلسفہ اور اس کو بنیاد بناتے ہوئے کئی مغربی ممالک میں سزائے موت کا قانون ختم کر دیا گیا ہے بلکہ اسے اب اہل مغرب ساری دنیا میں نافذ کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کا 'تصور تکریم انسان' یہ ہے کہ انسان کی زندگی بلاشبہ بہت قیمتی ہے اور بلا جواز و ضرورت ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے اور ایک بے گناہ کی زندگی بچانا پوری انسانیت کو بچانا ہے لیکن اس کے باوجود اگر ایک شخص بلا استحقاق دوسرے انسان کی جان لیتا ہے یا انسانی معاشرت کو ایسا زبردست نقصان پہنچاتا اور ایسا فساد پھیلاتا ہے جس کے نتیجے میں بہت سی انسانی جانیں ضائع ہو سکتی ہوں اور باہم نفرت اور جھگڑے پیدا ہوتے اور بڑھتے ہوں تو ایسے شخص کو سزائے موت دی جا سکتی ہے تاکہ انسانی معاشرے کو اس کے ظلم و زیادتی سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا نکتۂ نظر زیادہ متوازن اور قرین عقل و انصاف ہے کیونکہ مغربی فلسفہ فرد کو مقدس قرار دے کر اسے معاشرے پر تعدی سے نہیں روکتا جب کہ اسلام فرد کو اہمیت ضرور دیتا ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ اسے معاشرے پہ تعدی سے نہ روکے۔ یوں اسلام فرد اور معاشرے کے حقوق و واجبات میں ایک خوبصورت اور قابل عمل توازن پیدا کرتا ہے اور مسلمان اپنے عقیدے اور ورلڈ ویو کی بنا پر اسی کے قائل اور اسی پر عامل ہیں لیکن اہل مغرب اپنا فلسفۂ زندگی، اپنی معاشرت اور اپنے قانون کو ہم پر ٹھونسنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی (معاذ اللہ) ہمارے پیغمبر ﷺ کو گالی دے کر ہمارے ایمان اور غیرت کو چیلنج کرے، سوسائٹی میں نفرت اور فساد پھیلائے تو ہم اسے موت کی سزا نہ دیں بلکہ ان کے تصورات کے مطابق توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والے کو محض چند سال کی قید کی سزا دینے پر اکتفا کر لیں۔

یہی حال 'قانون' کا ہے۔ مغرب میں 'قانون' مطلق آزاد اور مختار مطلق فرد یا مجموعۂ افراد یعنی عوام کے نمائندوں کے پارلیمنٹ میں عوام کی خواہش اور ہوائے نفس کے مطابق بناتے ہیں اور قانون سازی کے اس عمل میں سیاسی و قانونی حاکمیت کے مالک عوام کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے پارلیمنٹ اور اس کے ارکان بھی مطلق آزاد اور مختار مطلق ہوتے ہیں چنانچہ وہ جس چیز کو چاہے حلال اور جس کو چاہیں، حرام قرار دے سکتے ہیں اور وہ عملاً شراب نوشی، زنا، جوئے، ہم جنسی تعلقات اور شادی کو جائز اور قانونی قرار دے چکے ہیں اور اسی طرح کی مزید قانون سازی بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس 'قانون' اسلام میں وہ ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہو۔ چنانچہ مغرب میں 'قانون' یہ ہے کہ فرد چونکہ مختار مطلق ہے لہٰذا وہ اگر کسی انسان کو قتل بھی کر دے تو اسے بطور سزا پھانسی نہیں دی جا سکتی (گویا معاشرے کے امن و سکون کو فرد کی تقدیس پر قربان کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں امن و سکون عنقا ہے اور مغربی معاشرے میں قانون شکنی اور فرد کے خلاف جرائم، چوری، ڈاکے، ریپ عام ہیں)۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دیا ہوا 'قانون' یہ ہے کہ یہاں جان، مال، عزت، ایمان کی حفاظت کو انتہائی اہمیت دی گئی ہے اور اس کی خلاف ورزی پر شدید ترین سزائیں شارع نے تجویز کی ہیں اور جہاں بھی ان سزاؤں پر عمل کیا جاتا ہے، وہاں فرد کے خلاف جرائم نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں جیسے سعودی عرب میں۔ گویا اسلام بھی فرد کی جان کو اہمیت دیتا ہے لیکن جہاں فرد معاشرے کے امن و سکون کو برباد کرتا اور فتنہ و فساد کا سبب بنتا ہے وہاں اس کی تقدیس کو تسلیم نہیں کرتا۔ یوں اسلام کا نکتۂ نظر زیادہ متوازن، تعمیری اور سود مند ہے اور فرد اور اجتماع کے حقوق و واجبات کے درمیان ایک ایسا حسین توازن پیدا کرتا ہے جس سے فرد بھی متمتع ہوتا ہے اور معاشرہ بھی امن و سکون سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

جہاں تک حرمتِ رسول ﷺ کے حوالے سے مسلمانوں کے جذباتی ہونے کا تعلق ہے تو یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہر تہذیب، مذہب (دین) اور معاشرہ ان بنیادوں کو مستحکم رکھنے کے لیے ان کی تقدیس کا اور ان سے جذباتی وابستگی کا اعلان و انتظام کرتا ہے جن پر اس تہذیب، مذہب اور معاشرے کی بقاء کا انحصار ہوتا ہے تاکہ لوگ ان کی مخالفت سے احتراز کریں اور انہیں مقدس سمجھتے ہوئے ان سے جذباتی وابستگی اختیار کر لیں اور اس کے تقاضوں پر

عمل کریں۔ اس کے لیے ہر تہذیب اور مذہب مختلف شعائر اختیار کرتا ہے اور انہیں مقدس قرار دیتا ہے جیسے عیسائیوں کے ہاں کرسمس جو ان کے پیغمبر کا یوم پیدائش ہے۔ یہودیوں نے ہولوکاسٹ کو اتنا تقدس عطا کر رکھا ہے کہ اس کے خلاف لکھنے یا بولنے پر بھی سزا مقرر ہے۔ اسی طرح مغربی فکر و تہذیب کے حامل لوگ جمہوریت اور آئین کو مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے ہاں اسے توڑنے کی سزا موت ہے۔ اسی طرح اہل مغرب کے ہاں 'آزادی' اور 'بنیادی انسانی حقوق' کا تقدس موجود ہے جن کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے کیونکہ یہ مغرب کے ہیومنزم، انڈی وجیولزم، سیکولرازم، کیپٹل ازم وغیرہ کی تقدیس اور اہمیت کی بنیادی ضرورت ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں اللہ اور رسول کا تصور مقدس ہے اور چونکہ یہی تصور معاشرے اور ریاست کی تشکیل، بقاء اور استحکام کا سبب ہے، لہٰذا ان تصورات کو قبول کرنے کے بعد ان کی نفی اور تکذیب چونکہ معاشرے اور ریاست کی بقاء کو چیلنج کرنے کے مترادف ہوتی ہے، لہٰذا شارع نے معاشرے اور ریاست کی بقاء اور استحکام کی خاطر اس کی سزا موت مقرر کی ہوئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پیغمبر چونکہ زمین پر خدا کا نمائندہ اور سفیر ہوتا ہے، لہٰذا پیغمبر کی توہین اور گستاخی خدا کی توہین اور گستاخی سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح پیغمبر کی توہین پورے اسلام اور پورے دین اور نظام کی توہین و تکذیب سمجھی جاتی ہے، اسی وجہ سے پہلی شریعتوں میں بھی انبیاء کی توہین کی سزا موت ہی تھی۔ لہٰذا پیغمبر کی حرمت سے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی سمجھ میں آتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب نہرو نے اقبال پر طنز کی کہ تم یورپ کے پڑھے لکھے ہو کر فرقہ پرست مولویوں کی طرح قادیانیت کی مخالفت کر رہے ہو تو اقبال نے اپنے مؤقف کی مدافعت کرتے ہوئے اسے یہ کہہ کر جائز ٹھہرایا کہ چونکہ اس سے امت مسلمہ کی بقا وابستہ ہے لہٰذا اس سے جذباتی وابستگی ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کی اپنے نبی ﷺ سے جذباتی وابستگی ان کی بقاء کی ضامن ہے، لہٰذا جو کوئی اسے چیلنج کرتا ہے۔ وہ گویا ان کے ایمان اور وجود کو چیلنج کرتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ اس کے لیے سزائے موت تجویز کرتے ہیں تو اس کی حکمت صاف ظاہر ہے۔ اسی طرح اسلام کسی بھی معاملے میں مسلمانوں کو اسلامی قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیتا (اور نہ اسلام مسلمانوں کو اسلام کے سوا کسی اور قانون کی پیروی کی اجازت دیتا ہے) سوائے نبی ﷺ کی حرمت کے معاملے میں کہ اگر حکومت غیر اسلامی ہو یا برائے نام اسلامی ہو اور توہین

رسالت ﷺ کے مرتکب کو کما حقہ سزا نہ دے اور کوئی مسلمان جذبات سے مغلوب اور مشتعل ہو کر اسے قتل کر دے تو خود رسول اکرم ﷺ کا عطا کردہ 'قانون' یہ ہے کہ اگر عدالت ایسے شخص کو سچا پائے تو ایسا قتل قابل مواخذہ نہ ہو گا اور عدالت اسے بَری کر دے گی۔ اب یہ بات چونکہ رسول اللہ ﷺ کے عمل مبارک سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں توہین رسالت کرنے والے کئی افراد کو بحیثیت قاضی نہ صرف قتل کی سزا دی اور بطور حاکم اس سزا پر عمل کروایا بلکہ آپ ﷺ کی زندگی میں کئی ایسے واقعات پیش آئے جن میں آپ ﷺ نے ایسے قاتلوں کو معاف کر دیا جنہوں نے توہین رسالت ﷺ کے مرتکبین کو قتل کر دیا تھا۔ لہٰذا یہ اسلام کا قانون ہے اور اس پر عمل کو قانون ہاتھ میں لینا نہیں کہہ سکتے لیکن ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اسلامی قانون سے متعلق ہے اور مغربی قانون سے اس کی کوئی مماثلت اور مطابقت نہیں ہو سکتی اور نہ اہل مغرب اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان کے معاشرے میں خدا اور رسول کو کوئی اہمیت و تقدس حاصل نہیں اور نہ ہی یہ عقیدہ ان کے معاشرے اور ریاست کی بنیاد ہے اس لیے ان کی اس تصور سے جذباتی وابستگی بھی نہیں ہے۔

یہی حال اہل مغرب میں 'رواداری' اور عدم برداشت کے تصورات کا ہے۔ وہ رواداری کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ وہ ہمارے مقدسات کی توہین کرتے رہیں تو ہم بے غیرت اور بے حمیت بن کر چپ سادھے بیٹھے رہیں اور اس کی مذمت اور مزاحمت نہ کریں تو ان کے نزدیک یہ 'رواداری' ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی رواداری نہیں۔ رواداری یہ ہے کہ وہ ہمارے مقدسات کو مقدسات نہ سمجھیں لیکن پھر بھی ان کا احترام کریں۔ اسی طرح مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلمانوں کے مقدسات کا احترام کریں خواہ ان کے نزدیک مقدس نہ بھی ہوں کیونکہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کفار کے جھوٹے خداؤں کو بُرا نہ کہیں ورنہ وہ مسلمانوں کے سچے خدا کو بُرا بھلا کہیں گے۔ اس طرح دیکھا جائے تو مسلمان تو روادار ہیں کہ وہ کفار و مشرکین کے عقائد و اقدار کو صحیح نہ سمجھنے کے باوجود ان کی بے حرمتی نہیں کرتے کیونکہ ان کے خدا و رسول کا حکم یہی ہے۔ اس کے برعکس کفار و مشرکین اور اہل مغرب رواداری سے کام نہیں لیتے اور ہمارے رسول ﷺ کو (معاذ اللہ) بُرا کہتے ہیں اور یوں کروڑوں مسلمانوں کی دل آزاری اور انہیں ایذا دہی کا سبب بنتے ہیں اور الٹا ہمیں عدم رواداری اور عدم برداشت کا الزام دیتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ امریکہ و یورپ نے لاکھوں بے

گناہ مسلمانوں کو عراق و افغانستان میں قتل کر دیا، ان پر ناپام، ڈیزی کٹر اور ایٹم بم برسائے، ان کے کروڑوں مکانات جلائے، لاکھوں کو اپاہج بنایا، ہزاروں عورتوں کی عزت پامال کی، ہزاروں کو جیلوں میں ڈالا لیکن اس کے باوجود وہ دہشت گرد نہیں اور مسلمان ان کی مزاحمت کے لیے در ے کی بنی ہوئی رائفل لے کر کھڑے ہو جائیں یا اپنے جسم سے بم باندھ کر اپنی جان قربان کر دیں تو وہ انتہا پسند اور دہشت گرد قرار پاتے ہیں۔ ؎ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

اس وقت تک ہم نے جو کچھ عرض کیا اس سے واضح ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کے حامل غیر مسلم اہل مغرب کے ہاں 'آزادی'، 'آزادئ اظہار'، 'بنیادی انسانی حقوق'، 'تکریم انسانیت' 'قانون' اور 'رواداری' وغیرہ کے جو مخصوص تصورات پائے جاتے ہیں وہ کسی آسمانی مذہب یا کسی عالم گیر سچائی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ انہوں نے اپنے پاس سے اپنی عقل سے گھڑ رکھے ہیں اور یہ نہ صرف سماوی ادیان اور اسلام کے خلاف ہیں بلکہ اصلاً یہ غیر فطری، غیر منطقی، غیر عقلی اور غیر سائنسی بھی ہیں یہ ان کے نفس، ہوائے نفس (یعنی خواہشات نفسانی) اور پیروئ ابلیس کی پیداوار ہیں اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنی سیاسی اور معاشی برتری اور سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش رفت کے بل بوتے پر ان تصورات کو علم، عقل اور تہذیب کا بہترین نمونہ سمجھتے ہوئے مسلم معاشرے پر بھی زبردستی ٹھونسنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہر طرح کا دباؤ ڈال رہے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مغربی فکر و تہذیب میں جزواً اگر کوئی خیر کا پہلو ہے تو وہ اسلام اور سماوی ادیان کے بالواسطہ اثرات کی وجہ سے ہے اور جو غیر صالح اور غیر تعمیری اثرات اس تہذیب کا نتیجہ ہیں، وہ ان کی ہوائے نفس کی پیروی، خدا سے بغاوت اور اطاعت ابلیس کا نتیجہ ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حرمت رسول کے حوالے سے مغرب کا رویہ محض استدلال پر مبنی نہیں ہے اور اس کی پشت پر صرف فکری اختلاف نہیں ہے کہ ان آزادی، فکری حریت، آزادئ اظہار، بنیادی انسانی حقوق، تکریم انسانیت اور قانون کے تصورات ہم مسلمانوں سے مختلف ہیں بلکہ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرتے اور دشمنی رکھتے ہیں وہ انہیں اپنے رنگ میں رنگنا اور دبا کر رکھنا چاہتے ہیں تا کہ ان کی تہذیب کا بول بالا رہے، وہی دنیا پر حکمرانی کریں اور مسلمان ان سے دب کر رہیں اور ان کے غلام اور زیر دست رہیں۔

مرزا محمد الیاس

آزادیٔ اظہار کی حدود...... لامحدود؟

امریکہ اور یورپ میں تواتر سے ہونے والے واقعات میں اسلام، شعائر اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر رکیک اور توہین آمیز حملے کیے جاتے رہے ہیں۔ ان واقعات کا ارتکاب کرنے اور ان کا دفاع کرنے والے یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ یہ آزادیٔ اظہار کا حق ہے جسے ہر کوئی اپنے انداز میں، کسی بھی وقت اور کسی بھی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ دنیا کے بیشتر باشعور حلقے اور عالم اسلام اس موقف کو مسترد کرتے ہیں اور اسے انسانوں کے ایک بڑے حصے کے حقوق کی نہ صرف پامالی قرار دیتے ہیں بلکہ ایسے واقعات کو براہِ راست حملہ تصور کرتے ہوئے اس کی مذمت کرتے ہیں۔

امریکہ و یورپ کے موقف اور اس کو پیش کرنے کے انداز سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ آزادیٔ اظہار بین الاقوامی کنونشنوں میں ایک طے شدہ معاملہ ہے جسے اب چھیڑا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بیشتر یورپی ممالک اور امریکہ میں ایسے قوانین موجود ہیں جو اس حق کی ضمانت دیتے ہیں اور یہ کہ اب اس پر مزید بحث و مباحثہ بھی ممکن نہیں ہے۔ دستوری مباحث کے مراکز، حلقوں اور دنیا کے مختلف آئینی اور قانونی اداروں اور اعلیٰ عدلیہ میں مختلف قوانین زیر بحث آتے رہتے ہیں۔ یہ بحث ہمہ وقت کسی نہ کسی ملک کی عدلیہ میں بھی جاری رہتی ہے۔ ان مباحث سے بھی اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ انسان کا بنایا ہوا کوئی ضابطہ یا قانون کبھی بھی حتمی نہیں ہوتا۔ خود اہل مغرب کا کہنا ہے کہ سوچ اور منطق ہر لمحہ متحرک رہنے والی حقیقتیں ہیں۔ ان سے ہر وقت نئے اور پرانے کی بحث، صحیح اور غلط کا فلسفہ، نیکی اور بدی کی جنگ کو نئے انداز ملتے رہتے ہیں۔ قانون بنتے اور بگڑتے ہیں۔ انسانی قوانین تبدیلی کے بغیر بے حیثیت ہیں۔ ان ممالک میں بھی آزادی کی حدود و قیود، استعمال اور نوعیت پر مباحث ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ دعویٰ بے معنی اور بے بنیاد ہے کہ آزادیٔ اظہار ایسی قدر ہے جس کی حدود کا کوئی

تعین نہیں کیا جاسکتا۔ امریکہ کے قانون سازوں نے پہلی ترمیم میں یہ طے کر دیا تھا کہ آزادی اظہار پر کسی نوعیت کی ایسی قانون سازی ہی نہیں ہو سکتی جس سے اسے محدود کیا جائے یا اس پر پابندی لگائی جائے۔ یہ اصول خود امریکہ میں بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ ایک ملک کا اصول ہے، پوری دنیا کا اصول نہیں ہے۔ اگر یہ پوری دنیا کا بھی اصول ہو، اقوام متحدہ کے کسی کنونشن کا حصہ ہو، تب بھی اسے انسانیت کے لیے لازمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہم یہاں امریکہ میں گزشتہ سال ہونے والی ایک قانونی بحث کا حوالہ دینا چاہیں گے جس کو وہاں کی سپریم کورٹ میں اٹھایا گیا۔ یہ بحث ایک ایسے مقدمہ میں سامنے آئی ہے جس کو Snyder V. Phelps کہا گیا ہے۔ اس مقدمے کو تجزیہ نگاروں نے ایک ٹسٹ کیس قرار دیا تھا جس میں آزادی اظہار کی حدود کا تعین ہوسکتا تھا۔ وال سٹریٹ جرنل کے ایک تجزیے میں اس مقدمے کی تفصیلات مختصراً بیان ہوئی ہیں۔ ان کے مطابق ایک امریکی میرین فوجی 2006ء میں عراق میں جنگ کے دوران میں مارا گیا۔ اس کا خاندان افسردہ تھا۔ اس کی میت تدفین کے لیے امریکہ لائی گئی اور خاندان کے حوالے کر دی گئی۔ اس فوجی کا نام میتھیو سنائیڈر تھا اور میری لینڈ سے اس کا تعلق تھا۔ اسے قبر کے حوالے کرنے اور اس کے جنازے پر چند مظاہرین قبرستان کے راستے پر جمع ہوئے۔ انہوں نے پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے۔ ان کی کل تعداد سات تھی۔ ان پلے کارڈز پر لکھا تھا ''خداوند! ان فوجیوں کی ہلاکت پر تیرا شکریہ''، ''خداوند کمیوں سے نفرت کرتا ہے''، اور یہ کہ ''امریکہ کے لیے کوئی دعا نہ کرے۔'' مظاہرین یہی نعرے لگا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکہ میں ہونے والی ہم جنس پرستی اور لواطت کا انتقام خداوند عراق اور افغانستان میں اس کے فوجیوں کو ہلاک کر کے لے رہا ہے۔ مظاہرہ کرنے والوں کا تعلق ویسٹ بارو چرچ (West Boro Church) سے تھا۔ میتھیو سنائیڈر کے والد کو اس مظاہرے نے شدید ذہنی اذیت سے دوچار کیا۔ بیٹے کی ہلاکت سے وہ پہلے ہی دل گرفتہ تھے۔ اس مظاہرے نے ان کو مزید پریشان کر دیا۔ انہوں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ مظاہرین کے اس اقدام سے ان کو شدید ذہنی اذیت پہنچی ہے، اس لیے انہیں مظاہرین سے ہرجانہ دلایا جائے۔ ایک جیوری نے مقدمہ کی سماعت کی اور مظاہرین کو 29 لاکھ ڈالر ہرجانہ اور 80 لاکھ ڈالر ازالہ حیثیت عرفی کے طور پر سنائیڈر کے والد کو ادا کرنے کا حکم دے دیا۔ اس فیصلے کو فورتھ سرکٹ کورٹ آف اپیل نے ختم کر دیا۔ اب یہ مقدمہ سپریم کورٹ

میں زیر سماعت ہے جس میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کسی کے جذبات مجروح کرنے والی تقریر بھی آزادیٔ اظہار سمجھی جائے گی یا نہیں؟

اس مقدمے کی سماعت کے مراحل میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان اپنی اس ناپسندیدگی کو پوشیدہ نہ رکھ سکے جو مظاہرین کے طرزِ عمل پر محسوس کی گئی تھی جس کسی کو بھی معلوم ہوا کہ مظاہرین نے کیا طریقہ استعمال کیا ہے، اس نے مذمت کی اور لعنت ملامت کی کہ یہ بالکل غیر مہذب طریقہ تھا۔ کسی کا اپنے نظریات پیش کرنا ایک بات ہے اور اس کے لیے وہ کیا طریقہ اختیار کرتا ہے، یہ دوسری بات ہے۔ امریکی سپریم کورٹ سے پوچھا گیا ہے کہ کیا یہ طریقہ اختیار کرنا اپنے متنازعہ خیالات پیش کرنے کے لیے جائز ہے، کیا کوئی اپنے آئینی حقِ اظہار کا استعمال کرتے ہوئے دوسروں کے حق کو پامال کر سکتا ہے؟

مظاہرین کے کیا نظریات تھے، ان پر امریکہ میں کالم لکھے گئے اور تجزیے کیے گئے۔ ان میں لکھا گیا کہ مظاہرین کے خیالات کو قابلِ نفرت قرار دیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ اگر ان خیالات کو یوں سب کے سامنے بیان نہ کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ چونکہ فرسٹ ترمیم کے تحت ہر امریکی کو آزادیٔ اظہار حاصل ہے، اس لیے اسے یہ تحفظ حاصل ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہے، اس کو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض تجزیہ نگاروں نے یہ بھی لکھا کہ کسی بھی فرد کو ایسی صورت میں کسی قانونی تحفظ کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اسے ہر کوئی سننا چاہتا ہے۔ اگر حکومت بعض خیالات پیش کرنے سے کسی کو روک سکتی ہے کیونکہ وہ اس قدر بے ہودہ ہیں کہ ان کے کہنے کے لیے آئینی تحفظ درکار ہے تو پھر کہاں لکیر کھینچی جائے گی؟ حکومت کو کون روکے گا کہ وہ کب زیادہ سے زیادہ نظریات پر سنسر نہ لگائے؟

سپریم کورٹ میں بھی اسی نوعیت کے سوالات اٹھائے گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں اداریے اور کالم بھی یہی سوال دہراتے نظر آئے۔ اس حوالے سے چند نمایاں باتیں سامنے لائی گئیں۔ مثال کے طور پر:

- جسٹس رتھ بدر گنز برگ کے بارے میں ان کے ریمارکس سے یہ تاثر لیا گیا کہ مظاہرین کے آزادیٔ اظہار کے حق میں افسردہ خاندان کی نجی زندگی میں مداخلت سمجھتے ہوئے اہمیت دی جائے۔ اس پر لوگوں نے مختلف رائے دی۔ امریکی آئین میں نجی زندگی کا کوئی حق متعین نہیں ہے۔ اس حق کو بعد میں آنے والے لبرل

ماہرین قانون نے تشریحات کی صورت میں مسلط کیا۔

- جسٹس گنز برگ کو اس حوالے سے بالکل درست قرار دیا گیا کہ مظاہرین نے اگر کوئی ایسا کام نہیں کیا جو خلاف قانون تھا، تو ان کے خلاف کسی نوعیت کا فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ان مظاہروں نے کسی مقامی حکم یا قانون کو پامال نہیں کیا تو عدالت عظمیٰ کے لیے مشکل ہوگا کہ وہ ان کے خلاف کوئی فیصلہ دے۔ سنائیڈر کے خاندان نے اپنے مقدمے کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی تھی کہ مظاہرین نے ان کو جذباتی ہیجان اور بحران میں مبتلا کیا۔ حقیقت میں یہی کچھ ہوا، لیکن یہ قانون کی خلاف ورزی نہیں تھی۔
- مظاہرین نے اپنے نظریت کے اظہار کے لیے غلط موقع منتخب کیا۔ مظاہرہ کرنے کے لیے جنازے کا انتخاب اشتعال انگیز اقدام تھا۔ مظاہرہ چرچ کے بالکل سامنے نہیں کیا گیا۔ اس لیے مظاہرے نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ سنائیڈر کی فیملی نے اعتراف کیا کہ جہاں مظاہرین کھڑے تھے، انھیں آسانی سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ خود سے جانتے تھے کہ مظاہرین کہاں کھڑے ہیں۔

ان امور کو سامنے رکھ کر دو مزید پہلوؤں پر بات کی گئی:

پہلا: یہ مقدمہ آزادی اظہار کا مقدمہ نہیں ہے۔ کسی نے اس بات سے اختلاف نہیں کیا کہ اپنے نظریات پیش کرنا مظاہرین کا حق تھا، یہ استعمال درست نہیں تھا، یہ بہت واہیات طریقہ تھا یا یہ بہت ہی غیر مسیحی طرز عمل تھا۔ مظاہرین اپنے خیالات کا اظہار اپنے چرچ میں کر سکتے تھے، دوسرے چرچ میں آ کر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کسی عوامی جگہ کا بھی انتخاب کر سکتے تھے۔ سوال یہ نہیں کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی جنازے کا اس مقصد کے لیے انتخاب درست تھا؟ اگر مقامی قانون کے مطابق یہ مظاہرہ قابل دست اندازی پولیس نہیں تھا تو پھر اس پر کوئی بھی اعتراض ممکن نہیں

دوسرا: مظاہرین جان بوجھ کر جذباتی طور پر دل گرفتگی کا ماحول پیدا کرنے آئے تھے۔ ان کے مظاہرے کا مقصد کوئی عقلی بات کرنا نہیں تھا۔ وہ محض ردعمل پیدا کرنے آئے تھے۔ پہلی ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ ناپسندیدہ عوامی رائے کا بھی تحفظ کیا جائے، لیکن

اس سے یہ مراد ہرگز نہیں تھا کہ کسی کی توہین بھی کی جائے۔ مظاہرین کے کام اور طریقہ کار سے واضح ہو رہا تھا کہ وہ ان فوجیوں کی توہین کرنے ہی آئے تھے جو عراق اور افغانستان میں مارے جارہے ہیں۔ وہ سنائیڈر کے خاندان کی توہین کرنے آئے تھے۔ وہ تمام امریکی عوام کی توہین کر رہے تھے جو ایسی فوجی کی خدمت کی حمایت کرتے ہیں۔

گویا ایک فرد یا ایک خاندان کی توہین سنگین ہے، لیکن پوری قوم کی توہین کہیں زیادہ سنگین ہے۔

اس بحث میں ایک اور مقدمے کا حوالہ بھی دیا گیا۔ یہ 1942ء کا ایک مقدمہ تھا جسے Chlaplinsky V. New Hampshire کہا جاتا ہے۔ اس مقدمے میں سپریم کورٹ نے رولنگ دیتے ہوئے قرار دیا تھا کہ:

> "کسی کو گالی دینا، برا بھلا کہنا یا شخصی توہین کرنا کسی بھی طرح مقدمات کے تبادلے یا رائے دینے کے مساوی قرار نہیں دیا جاسکتا جس کی آئین میں ضمانت دی گئی ہے۔ اگر ایسے اقدام پر سزا دی جاتی ہے تو اسے کسی عدالت میں محل نظر بھی ٹھہرایا نہیں جاسکتا۔"

گویا آزادیٔ رائے یا آزادیٔ اظہار الگ بات ہے اور کسی کی توہین کرنا بالکل الگ بات ہے۔ کسی کی توہین قابل سزا جرم ہے جبکہ آزادیٔ اظہار قانون میں جائز ہے۔ جب سپریم کورٹ میں یہ سوال کیا گیا اور یہ سوال جسٹس گنز برگ نے کیا کہ مظاہرین کو ان کے رویے کی وجہ سے کس طرح قابل مواخذہ قرار دیا جاسکتا ہے، اس پر کالموں میں یہ جواب دیا گیا کہ ایک فرد کو اپنا مکہ لہرانے کی پوری آزادی ہے۔ اگر یہ مکہ کسی کے منہ پر جا لگے تو یہ جرم ہے۔ اس سے نہ صرف تصادم ہوگا بلکہ خون بھی نکل سکتا ہے۔ اگر کوئی کسی کو غصہ دلانے کے ارادے سے گالم گلوچ کرے تو مخاطب کو غصہ آئے گا اور ایسا کرنے والا جواب دہ ہوگا۔ سپریم کورٹ نے دوسرے مقدمے میں اس نکتے کو بھی بیان کیا تھا کہ کسی کو اشتعال دلانا، اس کی توہین کرنا بھی جرم ہے۔ قانون خود کہتا ہے کہ ازالہ حیثیت عرفی کے لیے جائز بنیاد ہو تو سزا دی جائے گی، لغویات کا استعمال ہوگا تو قانون حرکت میں آئے گا۔ توہین آمیز الفاظ، اشارے یا کنائے

ہوں یا لڑائی کا سبب بننے والی باتیں ہوں، یہ سب آزادیِ اظہار کی حدود سے باہر اور قابل سزا جرم کے دائرے میں شامل ہوں گی۔

مظاہرین نے جو الفاظ استعمال کیے، وہ لڑائی کا سبب بن سکتے تھے۔ مظاہرین کے بارے میں یہ بھی امریکہ میں کہا گیا کہ یہ مظاہرین کس لیے عوامی مقامات پر جمع ہوتے ہیں، وہ اپنی مخصوص نفرت کا اظہار کرنے میں کس لیے آزاد ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ان کو حوصلہ افزائی ذرائع ابلاغ نے دی ہے۔ ذرائع ابلاغ، نفرت پھیلانے والوں کو اس قدر بڑھا چڑھا کر ہیرو کیوں بنا رہا ہے۔ یہ تو ایسے لبرل بنیاد پرست ہیں جو ایک ہی طرز کے مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مسیحی ہیں، لیکن ان کے اعمال سے محض نفرت پیدا ہوتی ہے۔ غصہ ابھرتا ہے اور معاشرہ تقسیم ہوتا ہے۔

سنائیڈر خاندان کے وکیل نے عدالت کے سامنے سوال اٹھایا کہ یہ مقدمہ اس اشتعال انگیز حرکت کے خلاف ہے جس کے ذریعے ایک افسردہ خاندان کو دکھ اور تکلیف دی گئی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ امریکی آئین اور پہلی ترمیم اس قسم کے اشتعال کو برداشت کرتی ہے جبکہ ایک خاندان کی توہین کی گئی ہے، اسے دکھ دیا گیا ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے: وہ کون سی آزادی اظہار یا ایسا حق ہے جو کسی کو بھی، خواہ وہ فرد ہو، ادارہ یا تنظیم ہو، گروہ یا قوم ہو، ریاست یا حکومت ہو، دیا جا سکتا ہے کہ وہ محض ایک فرد یا قوم کی نہیں بلکہ ایک پوری امت مسلمہ کی، اس زمین پر بسنے والے ایک چوتھائی انسانوں کے خلاف توہین آمیز اشتعال پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ایسا کوئی حق نہیں ہے۔ امریکی سپریم کورٹ اور اس کے ذرائع ابلاغ کی مذکورہ بحث کا یہی پیغام ہے کہ نفرت، اشتعال اور توہین کو کسی طرح سے بھی آزادی اظہار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کوئی لامحدود رویہ نہیں۔ عدالت اس پر قدغن لگا سکتی ہے تو انسانیت کا راگ الاپنے والے اس قدغن کو کیونکر توڑ سکتے ہیں؟

جواب آج کے لبرل اور سیکولر دانشوروں کے ذمہ قرض رہے گا۔

شاہنواز فاروقی

توہینِ رسالت ﷺ اور مغربی دُنیا...... مسئلہ کیا ہے؟

توہینِ رسالت ﷺ مغربی دنیا میں کبھی برسوں میں رونما ہونے والا واقعہ تھا مگر اہل مغرب نے اسے ''معمول'' بنا دیا ہے۔ اہل مغرب کبھی توہین رسالت ﷺ ''علم'' کی آڑ میں کیا کرتے تھے، مگر اب یہاں یہ بھیانک کام ''فلم'' کی اوٹ میں ہو رہا ہے۔ اس طرح اہل مغرب نے توہین رسالت ﷺ کے سلسلے میں اپنے علم اور فلم کو ایک کر دیا ہے۔ فلم بنیادی طور پر تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اہل مغرب کے لیے اب توہین رسالتؐ ایک ''تفریح'' بن گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے حوالے سے مغرب کا مسئلہ کیا ہے؟

رسول اکرم ﷺ خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کی آمد کی اطلاع یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں ہی نہیں، ہندوؤں اور بدھسٹوں کے یہاں بھی موجود ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل اندازہ تھا کہ اب خاتم النبیین ﷺ کا ظہور ہونے ہی والا ہے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم نے ''دعائے خلیل'' اور ''نوید مسیحا'' کا زمانہ پایا تو ہم نہ صرف یہ کہ ان پر ایمان لائیں گے بلکہ ان کے ساتھ مل کر ان کے دشمنوں کے خلاف جہاد کریں گے۔ لیکن جب رسول اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تو صرف کافروں اور مشرکوں نے ہی آپ ﷺ کا اِنکار نہ کیا بلکہ یہودی اور عیسائی بھی آپ ﷺ پر ایمان نہ لائے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ آپ ﷺ کو پہچان نہیں پائے تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں بہت سوں کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ ہی خاتم النبیین ہیں، مگر ان کو اعتراض تھا کہ آپ ﷺ بنی اسرائیل میں کیوں مبعوث نہیں ہوئے، بنی اسماعیل میں کیوں مبعوث ہوئے۔ غور کیا جائے تو یہ صرف رسول اکرم ﷺ کی تکذیب نہ تھی، یہ روش اختیار کر کے یہودی اور عیسائی اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر رہے تھے۔ وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ نے غلط فیصلہ کیا ہے۔

یعنی رسول اکرم ﷺ کو بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں پیدا کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے سلسلے میں یہودیوں اور عیسائیوں کا معاملہ جہل، ضد اور ہٹ دھرمی کا تھا۔ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی یہودیوں اور عیسائیوں کا ایک طبقہ اس جہل، ضد اور ہٹ دھرمی کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔

انسان جہل، ضد اور ہٹ دھرمی پر اصرار کرتا رہتا ہے تو یہ چیزیں گھٹنے کے بجائے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی یہ ہوا۔ چنانچہ عیسائیت کی تاریخ میں چرچ کا ادارہ وجود میں آیا تو چرچ نے رسول اکرم ﷺ کے سلسلے میں یہ پوزیشن اختیار کر لی کہ آپ ﷺ نبی ہی نہیں تھے، بلکہ معاذ اللہ آپ ﷺ نے کچھ یہودیت سے لیا اور کچھ عیسائیت سے لیا اور ان دونوں مذاہب کی تعلیمات کو ملا جلا کر اسلام کے نام سے ایک نیا مذہب "ایجاد" کر لیا۔ ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا، چرچ کی پوزیشن آج بھی رسول اکرم ﷺ کے سلسلے میں یہی ہے۔ آپ عیسائیوں سے کہیں گے کہ رسول اکرم ﷺ دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں سے ہیں، وہ آپ کی بات مان لیں گے۔ آپ کہیں گے کہ رسول اکرم ﷺ نے تاریخ انسانی پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے، وہ آپ کی رائے سے اتفاق کر لیں گے، لیکن آپ کہیں کہ رسول اکرم ﷺ نبی تھے تو وہ کہیں گے کہ آپ ﷺ نبی بہر حال نہیں تھے۔ مطلب یہ کہ اہل مغرب جب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی توہین کرتے ہیں تو وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم جس مذہب کو آسمانی مذہب سمجھتے ہو، وہ ہرگز آسمانی نہیں ہے، اور تم محمد ﷺ کو نبی مانتے ہو، ہم انہیں نبی تسلیم نہیں کرتے۔ مطلب یہ کہ نبی کو غیر نبی ثابت کرنے کی نفسیات شدت سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ توہین بن جاتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے اہل مغرب اس توہین کے لیے "علمی پیرایہ" اختیار کرتے تھے، مگر اب چونکہ ان کے یہاں تہذیب اور علم کی سطح پست ہو گئی ہے، اس لیے وہ اب رسول اکرم ﷺ کے کارٹون بنانے اور ان کے حوالے سے توہین آمیز فلمیں تخلیق کرنے پر مائل ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں اور مغرب کے تعلقات کا ایک مسئلہ صلیبی جنگیں اور ان کی پیدا کردہ نفسیات ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ صلیبی جنگیں عیسائی دنیا کی سب سے بڑی شخصیت پوپ کی ایجاد تھیں۔ سن 1095ء میں پوپ اُربن دوم نے ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ نعوذ باللہ اسلام ایک شیطانی مذہب ہے اور اس کے ماننے والے شیطانی مذہب کے ماننے والے

ہیں۔ پوپ نے عیسائیوں سے کہا کہ تمہارا فرض ہے کہ اس شیطانی مذہب کو فنا کر دو۔ اس نے پوری عیسائی دنیا کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی، اور پوپ کی تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی دنیا 1099ء میں ایک پرچم کے نیچے جمع ہوئی اور ان صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا جو کم وبیش دو سو سال سے جاری رہیں۔ ان جنگوں کا آغاز مسلمانوں کے لیے تباہ کن تھا۔ بیت المقدس سمیت متعدد علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور لاکھوں مسلمان شہید ہو گئے۔ لیکن ان جنگوں کا اختتام مغرب کی خواہشات کے برعکس مسلمانوں کی بے مثال فتوحات پر ہوا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے نہ صرف یہ کہ بیت المقدس کو آزاد کرایا بلکہ مسلمانوں کی فوجیں صلیبیوں کا تعاقب کرتے ہوئے یورپ کے دروازے تک جا پہنچیں۔ اس صورتحال نے یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کا شدید خوف طاری کر دیا، اور شدید خوف اکثر نفرت پیدا کرتا ہے۔ آپ دشمن کا کچھ بگاڑ نہیں پاتے تو اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی اصل قوت قرآن اور رسول اکرم ﷺ کی ذات ہے۔ چنانچہ مغرب نے قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف اپنی نفرت کو بڑھا دیا۔ اس کا اظہار ان لوگوں کی کتابوں اور تحریروں میں شدت سے ہوا جن کو عام طور پر ''مستشرقین'' کہا جاتا ہے۔

یہ حقیقت بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ اسلام اور رسول اکرم ﷺ کے حوالے سے مغرب کا ایک مسئلہ ''حسد'' ہے۔ کہنے کو مغرب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو مسترد کرتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب کی بڑی تعداد اسلام اور رسول اکرم ﷺ سے بدترین حسد کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مذہب کو وہ ''جھوٹا مذہب'' اور ''گھڑا ہوا مذہب'' کہتے ہیں، اس کی کتاب قرآن مجید چودہ سو سال سے ایک ''محفوظ کتاب'' ہے، اس کا ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کتاب یعنی انجیل کو وہ آسمانی کتاب کہتے ہیں اور جو بھی واقعتاً آسمانی کتاب تھی، اس کا ایک لفظ بھی اب "Word of God" نہیں ہے۔ انجیل کے چند فقرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہیں اور باقی پوری انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے اقوال پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید کا ہر لفظ ''کلام الٰہی'' ہے۔ اسی طرح مغرب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ یہ ہے کہ اہل مغرب کی عظیم اکثریت لامذہب ہو گئی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات ان کے لیے ایک ''تاریخی شخصیت'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اہل مغرب اب وہ تقدس وابستہ نہیں کرتے

جو پیغمبروں کا خاصا اور حصہ رہا ہے۔ اس کے برعکس جن پیغمبر کو اہل مغرب معاذ اللہ پیغمبر ہی نہیں مانتے، اُن سے ایک ارب 60 کروڑ مسلمانوں کی عقیدت اور محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے لیے جان دینا اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں میں فکر وعمل کی ہزاروں خامیاں ہوں گی مگر رسول اکرم ﷺ کی محبت اور عقیدت ان کے دلوں میں کبھی کم نہیں ہوئی۔ مغرب میں جو لوگ عالم اسلام پر نظر رکھتے ہیں، ان کے لیے اس صورتحال میں حسد اور تکلیف کا بڑا سامان موجود ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے اہل مغرب کے حسد کا ایک پہلو یہ ہے کہ عیسائیت مسلم دنیا میں "مالی لالچ" سے پھیل رہی ہے اور معاشرے کے پست ترین طبقات کے لوگ مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے عیسائی ہو رہے ہیں، لیکن خود امریکہ اور یورپ میں مقامی لوگ اپنے آزاد ارادے یا "Free Will" سے اسلام قبول کر رہے ہیں، اور اسلام قبول کرنے والوں میں سیاستدان ہیں، دانشور ہیں، سفارتکار ہیں، پیشہ ور افراد ہیں۔ حسد انسان کے اندر نفرت اور انتقام کے جذبات پیدا کرتا ہے، اہل مغرب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے حوالے سے انہی جذبات کا شکار نظر آتے ہیں۔

اہل مغرب کی ایک مشکل یہ ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی ذات کی "کاملیت" یا Perfection کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغرب کے جو لوگ سیکولر ہیں، وہ رسول اکرم ﷺ کی ذات کی کاملیت کو کیا سمجھیں گے، وہ تو ہمارے عام صوفی کی روحانیت کو بھی نہیں سمجھ سکتے، اور مغرب کے جو لوگ عیسائی ہیں، ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسوہ ہے اور اس اسوے میں نہ حکومت ہے، نہ ریاست ہے، نہ جہاد ہے، نہ کثرتِ ازدواج ہے۔ چنانچہ ایسے عیسائی جب رسول اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو دیکھتے ہیں اور انہیں رسول اکرم ﷺ حکومت کرتے ہوئے، جہاد کرتے ہوئے اور شادیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو یہ تمام چیزیں انہیں "غیر پیغمبرانہ" محسوس ہوتی ہیں۔ مگر وہ اپنے فہم کے نقص کو دیکھنے اور اس کا اعتراف کرنے کے بجائے اپنے فہم کے نقص کو حضور اکرم ﷺ منسوب کرتے ہیں اور اس میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی ذات کی تو بات ہی اور ہے، شیکسپیئر اور جان کیٹس کی تفہیم کی بھی صرف دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ انہیں ان کی سطح پر جا کر سمجھا جائے۔ لیکن جو لوگ یہ کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ پھر شیکسپیئر اور جان کیٹس کو "اپنی سطح" پر گھسیٹ لاتے ہیں۔ یہ طریقہ کار شیکسپیئر اور جان کیٹس کے سلسلے میں افسوسناک

اور توہین آمیز ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے سلسلے میں یہ کتنا افسوناک اور توہین آمیز ہوگا۔ مگر اہل مغرب اپنے فہم کے نقص کا اعتراف کرنے کی جرأت رکھتے ہیں نہ صلاحیت۔ چنانچہ انہوں نے توہین رسالت کو "معمول" بنا دیا ہے۔

مغربی دنیا اسلام اور رسول اکرم ﷺ کی توہین کے لیے "آزادیٔ اظہار" کے تصور کا سہارا لیتی ہے۔ لیکن آزادیٔ اظہار کے دائرے میں بھی اہل مغرب کا طرز عمل تضادات سے بھرا ہوا ہے اور ناقابل قبول ہے۔ مغرب میں آزادیٔ اظہار کا جو مفہوم ہے، اس کے دائرے میں آزادیٔ اظہار فرد کو "تنقید" کا حق دیتی ہے، "توہین" اور "تحقیر" کا حق نہیں دیتی اور اہل مغرب اسلام اور رسول اکرم ﷺ پر تنقید نہیں کر رہے ہیں، ان کی "توہین" اور "تحقیر" کر رہے ہیں۔ مسلمان تمام پیغمبروں کو "تنقید" سے بالاتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ انبیا "معصوم" ہوتے ہیں۔ لیکن مغرب کسی کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ مگر تنقید کے دو بنیادی تقاضے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی جس تصور اور جس شخص پر تنقید کرے، پہلے اسے اس کی اپنی روایت کے دائرے میں رکھ کر دیکھے اور سمجھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن اور سیرتِ طیبہ ﷺ کا گہرا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ مسلمانوں نے چودہ سو سال تک اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر ﷺ کے ساتھ کیسا تعلق استوار کیا ہے اور اس تعلق کو کن دلائل پر استوار کیا ہے؟ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مغرب میں قرآن کو نذر آتش کرنے والے، رسول اللہ ﷺ کے کارٹون اور ان پر توہین آمیز فلمیں بنانے والے اس تقاضے سے کروڑوں میل دور کھڑے نظر آتے ہیں۔ یعنی ان کی آزادیٔ اظہار، آزادیٔ اظہار نہیں ہے بلکہ ایک فکری، نفسیاتی اور جذباتی دہشت گردی ہے۔ تنقید کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی تہذیب کے اصولوں کو واضح کریں اور ان کے اطلاقات کے ذریعے کسی دوسری تہذیب یا اس کی شخصیات پر تنقید کریں۔ مسلمانوں نے اپنی پوری تاریخ میں تنقید کے لیے یہی طریقہ کار استعمال کیا ہے۔ مثلاً امام غزالیؒ نے یونانی فکر کو مسترد کیا تو ایک جانب انہوں نے یونانی فکر کے داخلی تضادات کو ظاہر کر کے اسے مسترد کیا اور دوسری جانب اسے اسلامی فکر کے بنیادی تصورات کی روشنی میں مسترد کیا۔ لیکن اہل مغرب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر تنقید کے حوالے سے یہ معیار بھی بروئے کار لا کر نہیں دکھا رہے۔

آزادیٔ اظہار کے تصور کا مزید تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ

آزادیٔ اظہار کے حوالے سے صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ آزادیٔ اظہار کو ''مطلق'' یا Absolute تسلیم کیا جائے، یا پھر کہا جائے کہ آزادیٔ اظہار جزوی یا Partial ہے۔ آزادیٔ اظہار مطلق ہے تو ہر چیز پر تنقید ہوسکتی ہے اور ہر چیز کو مسترد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اہل مغرب خود کہتے ہیں کہ آزادی اظہار مطلق نہیں۔ مثال کے طور پر جمہوریت کا اصول اکثریت ہے لیکن اگر کسی ملک کی اکثریت، اکثریت کی بنیاد پر جمہوریت ہی کو مسترد کردے تو اسے ایسا کرنے کا ''حق'' نہیں دیا جائے گا اور جمہوریت اچانک ''مقدس'' ہو جائے گی اور اسے ''استرداد'' سے محفوظ بنادیا جائے گا۔ اب اگر ایسا ہے اور آزادیٔ اظہار کے دائرے میں استثنائی صورتیں بھی ہوسکتی ہیں تو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کیوں تنقید سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتے؟ اور انہیں ''جمہوریت'' یا امریکہ کے ''قومی مفاد'' کی طرح کیوں ''مقدس'' نہیں سمجھا جاسکتا؟

مغرب میں ''حقوق'' کے تصور کو دیکھا جائے تو مغرب انسانوں کے کیا حیوانوں کے حقوق کا بھی شور مچاتا نظر آتا ہے۔ مغرب میں ہر فرد کی ''عزت'' کے تحفظ کا قانون موجود ہے، لیکن مغرب دنیا کے تین بڑے مذاہب میں سے ایک مذہب، دنیا کی تین بڑی تہذیبوں میں سے ایک بڑی تہذیب اور ایک ارب 60 کروڑ انسانوں کے محبوب ﷺ کی عزت کے تحفظ کی ضمانت دینے کے لیے تیار نہیں۔ امریکہ کی ''قومی سلامتی'' اتنی ''مقدس'' ہے کہ اس کے تحفظ کے لیے محض ''مفروضے'' کی بنیاد پر عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور ایک لاکھ لوگوں کو قتل کردیا گیا۔ لیکن اگر مسلمان ایک ارب 60 کروڑ انسانوں کے محبوب رسول اکرم ﷺ کی توہین پر ذرا سے مشتعل بھی ہوجاتے ہیں تو امریکہ ''برا'' مانتا ہے اور اس کی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن ''دھمکی'' دیتی ہیں کہ ہم اپنے سفارت خانوں کے تحفظ کے لیے امریکہ کی فوجیں مسلم ممالک میں اتار سکتے ہیں۔

مغربی دنیا بین الاقوامیت یا عالمگیریت اور پرامن بقائے باہمی کا راگ تو الاپتی ہے مگر اسے یہ تک معلوم نہیں کہ ایک ارب 60 کروڑ مسلمانوں کا اپنے نبی ﷺ سے کیا تعلق ہے؟ مسلمانوں کا اپنے نبی ﷺ سے یہ تعلق ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے اعلان کے بغیر اذان مکمل نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ پر درود کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے جس کے حوالے سے مسلمانوں کو قرآن ملا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے جنہوں نے اپنے عمل سے

قرآن کی تشریح کی۔ یہ رسول اللہ کی ذات ہے جو زندگی کے ہر دائرے میں مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ کی حرمت اپنی، اپنے والدین، اپنے بیوی بچوں غرض یہ کہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ اسلامی تہذیب میں رسول اللہ کی توہین کی سزا موت ہے اور اس سزا کی چار بنیادیں یا چار بڑے دلائل ہیں:

(1) مسلمانوں کے لیے رسول اکرم باعث تخلیق کائنات ہیں۔ یعنی اگر رسول اکرم نہ ہوتے تو نہ حضرت آدم علیہ السلام ہوتے، نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوتے، نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوتے، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوتے، نہ یہ کائنات ہوتی، نہ خود وہ شخص ہوتا جو رسول اللہ کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے۔ چنانچہ جو شخص رسول اللہ کی توہین کرتا ہے وہ پوری کائنات کی تخلیق کے جواز کو چیلنج کرتا ہے اور ایسے شخص کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔

(2) اللہ ہر چیز کا خالق ہے، مالک ہے، رازق ہے اور وہ تمام انسانوں سے کہتا ہے کہ مجھے ”محبوب“ بناؤ، مگر محمد خود ”محبوب خدا“ ہیں، اور جو شخص شعوری طور پر ”محبوب خدا“ کی توہین کرے۔ اسے کیا حق ہے کہ وہ خدا کی تخلیق کی ہوئی دنیا میں زندہ رہے؟

(3) رسول اکرم صرف مسلمانوں کے پیغمبر نہیں ہیں، وہ پیغمبر انسانیت ہیں اور انہی کی شریعت آج نہیں تو کل دنیا پر غالب ہوگی اور آپ ہی کے توسط سے ”حق“ پوری انسانیت تک پہنچے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو ذات پوری انسانیت کو گمراہی سے نکال کر ”صراط مستقیم“ پر چلانے والی ہو، اس کی توہین کرنے والے کو زندہ رہنے کا ”حق“ کہاں سے فراہم کیا جائے؟

(4) رسول اکرم ”شافع محشر“ ہیں۔ یعنی آپ کی ذات دنیا میں ہی انسانوں کی نجات کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ آخرت میں بھی اربوں انسان آپ کی وجہ سے جہنم سے بچیں گے اور جنت میں جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کسی ایسی ہستی کی توہین کرنے اور توہین کر کے زندہ رہنے کی اجازت کیونکر دی جائے؟ لیکن مغرب کیا خود مسلمانوں کی اکثریت کو یہ معلوم نہیں کہ رسول اللہ کی شعوری توہین ”شخصی مسئلہ“ نہیں ”کائنات گیر مسئلہ“ ہے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر

توہین رسالت ﷺ، آزادی اظہار رائے اور مغرب

اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے جن انبیا و رسل علیہم السلام کو منتخب کیا اور معبوث فرمایا، انہیں ایسی کتب وصحائف بھی عطا کیے گئے جن میں وہ احکام اور تعلیمات پیش کی گئیں، جن پر عمل پیرا ہو کر ایک بندہ مومن اپنے خالق حقیقی کی رضا جوئی کو حاصل کر سکتا ہے اور آخرت کے کڑے احتساب میں فوز وفلاح کی ضمانت حاصل کر سکتا ہے۔ کاروانِ نبوت کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی ختم نبوت تک جاری رہا۔ اس دوران میں جس قدر انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے، وہ سب مختلف نوع کی آزمائشوں کا شکار ہوئے۔ انہیں طرح طرح کی تکالیف پہنچائی گئیں۔ ان پر ناگفتہ بہ الزامات اور اتہامات لگائے گئے۔ انہیں نہایت دردناک طریقے سے قتل کیا گیا، قید و بند میں ڈالا گیا، وطن چھوڑنے اور ہجرت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ ایسے شرمناک سلوک کے واقعات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

انبیائے کرام کو تکالیف پہنچانے اور ان پر الزامات لگانے میں یوں تو ہر عہد کے بدبخت اور شقی القلب لوگ شامل رہے ہیں، مگر یہود و نصاریٰ ان بدبختوں کے سرخیل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ یہودی بادشاہت کا دور ہی تو تھا کہ جس میں ایک رقاصہ کی درخواست پر بادشاہ وقت نے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ پیغمبر کا سر قلم کر کے ایک طشت میں رکھ کر اس حرافہ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ یہ بھی یہودی بادشاہت کا عہد تھا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام جیسے پاک نفس اور نیکوکار پیغمبر کو قید و بند میں رکھا گیا۔ ایک تہوار کے موقع پر جب بادشاہ نے اپنی کیبنٹ سے پوچھا کہ دو خطرناک مجرموں براباڈاکو اور مسیح ناصری میں سے آج کسے رہا کیا جائے تو بدطینت اور بدبخت وزرا کا جواب یہ تھا کہ ”براباڈاکو کی رہائی کے بارے میں تو سوچا جا سکتا ہے مگر مسیح کو رہا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ آپ علیہ السلام پر مقدمہ چلایا گیا اور پھر یہ

فیصلہ ہوا کہ آپ کو صلیب پر لٹکا دیا جائے۔ قید و بند اور صلیب تک لے جانے کے دوران میں اس اللہ کے سچے اور عظیم نبی کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا گیا، اس سے یہود کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی اہانت یہود کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے 315 کتابیں اور صحائف مختلف انبیائے کرام علیہم السلام پر نازل کیں، جن میں بہ تکرار اور مسلسل نبی آخر الزماں محمد ﷺ کی بعثت و نبوت کی پیش گوئیاں درج ہیں اور آج بھی زبور، تورات اور اناجیل کے تحریف شدہ متون میں آپ ﷺ کی مبارک آمد کے حوالے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ صدیوں سے اس آخری پیغمبر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں اس کی علامتیں بھی معلوم تھیں۔ آپ ﷺ کی بعثت کے موقع پر انہی بشارتوں اور پیش گوئیوں کے باعث بہت سے خوش نصیب ربیّن اور پادریوں نے دولت ایمان حاصل کی، مگر بہت سے ایک ایسے تعصب کا شکار ہوئے کہ جس کی رو آج تک جاری ہے۔ ایسی واضح پیش گوئیوں اور بشارتوں کے باوجود ایسا کیوں ہے......؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے ہمارے سیرت نگاروں اور محققین نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ان کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ذات کے ساتھ عناد، مخاصمت اور اہانت آمیز رویوں کا آغاز بھی یہود کی طرف سے ہوا۔ وہ اپنی گفتگوؤں میں ذوالمعنین الفاظ کے استعمال سے آپ ﷺ کی اہانت کا سامان کیسے کرتے تھے۔ قرآن مجید نے اس کی واضح مثال یوں دی ہے:

يايها الذين امنوا لاتقولوا راعنا وقولوا أنظرنا واسمعوا وللكفرين عذاب اليم (البقرہ:104)

ترجمہ: ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، راعِنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہو اور توجہ سے بات کو سنو۔ یہ کافر تو عذاب الیم کے مستحق ہیں۔''

سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی شخص سے انتقام نہیں لیا، بلکہ ہمیشہ عفو و درگزر کی روشن مثالیں قائم کی ہیں۔ صرف ایک جرم ایسا ہے جس پر آپ ﷺ نے کبھی مفاہمت یا درگزر کا رویہ اختیار نہیں کیا اور وہ توہین رسالت کا جرم ہے۔ رسالت و نبوت ایک فریضہ خداوندی ہے، جس کی توہین یا اہانت ناقابل تصور جرم ہے۔ نبی اپنی ذات اور شخصیت کے حوالے سے تو صبر و عزیمت کا کردار انجام دے سکتا

ہے، مگر منصب رسالت یا فریضہ نبوت کے سلسلے میں کسی اہانت کا تسلیم کیا جانا کسی طور پر ممکن نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید میں سابقہ اقوام کے توہین رسالت کے رویے کو یوں پیش کیا گیا ہے:

- يحسرة على العباد ما يأتيهم من رسول الا كانوا به يستهزءون (یٰسٓ:30)

  ترجمہ: ''افسوس بندوں کے حال پر جو رسول بھی ان کے پاس آیا، اس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے۔''

- ولقد استهزئ برسل من قبلك فامليت للذين كفروا ثم اخذتهم فكيف كان عقاب (الرعد:32)

  ترجمہ: ''تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے، مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخر کار ان کو پکڑ لیا۔ پھر دیکھ لو میری سزا کیسی سخت تھی۔''

تاریخ سیرت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مدینہ میں یہود، توہین رسالت کو مختلف پیرائیوں میں جاری رکھے ہوئے تھے۔ اہانت آمیز الفاظ، جملے اور ہجویہ شاعری کے ذریعے وہ اس جرم کا ارتکاب کرتے تھے۔ توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والے بدبختوں میں کعب بن اشرف، نضر بن حارث، عقبہ بن ابی معیط، عصما (ایک ہجو گو شاعرہ)، ابوعفک، ابو رافع، ابوعزہ، جمحی، ابن خطل کی دو ہجو گو لونڈیاں ارتب اور ام سعد اور حارث بن طلال کے نام ملتے ہیں۔ ان سب مجرموں کو دور نبوت میں آپ ﷺ کے حکم یا علم سے قتل کیا گیا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کے دل و دماغ میں قریش کے تمام تر مظالم کا نقشہ موجود تھا، مگر آپ ﷺ نے اس موقع پر عفو عام کا اذن دیا، مگر اس عام معافی میں ایک استثنا روا رکھا گیا اور یہ وہ لوگ تھے جن سے توہین رسالت کے جرم کا ارتکاب ہوا تھا۔ ان کے بارے میں تو یہاں تک فرمایا گیا کہ اگر یہ لوگ غلاف کعبہ میں بھی لپٹے ہوں تو انہیں معاف نہ کیا جائے۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ گستاخ رسول، شاتم رسول اور توہین رسالت کے مرتکب کی سزا موت سے کم نہیں ہے اور عقل سلیم بھی اس کا تقاضا کرتی ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ کعب بن اشرف جو ایک یہودی سردار تھا اور

اہانت رسالت میں اس کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس کے بارے میں آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کعب بن اشرف کا ذمہ کون اٹھاتا ہے؟ اس پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ کیا آپ ﷺ پسند کرتے ہیں کہ میں اسے ٹھکانے لگا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔ انھوں نے آپ ﷺ سے اس کے ساتھ کچھ باتیں کرنے کی اجازت طلب کی جو عطا کر دی گئی۔ بالآخر محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کا کام تمام کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس طرح کے ایک یہودی ابو رافع کو ٹھکانے لگایا۔ اسی طرح وہ نابینا صحابی کی بیوی جو بہت نازیبا الفاظ اور گالیاں بکتی تھی، اس کے شوہر نے اس کا گلا دبا کر اسے موت سے ہمکنار کر دیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دے دیا۔

ریاستی سطح پر اہانت رسول کرنے والوں سے کیا سلوک کیا جائے، اس کی سب سے بڑی مثال خلافت صدیقی میں مسیلمہ کذاب کے حوالے سے دیکھی جا سکتی ہے۔ مسیلمہ، بنی حنیفہ کے سترہ رکنی وفد کے ساتھ دربار نبوت میں حاضر ہوا۔ اس کے علاوہ سب لوگ ایمان لے آئے، مگر یہ اپنی متکبرانہ روش پر قائم رہا اور شراکت نبوت کی تجویز پیش کی اور اس نے واپس وطن جا کر آپ ﷺ کو ایک خط بھی لکھا جس کا جواب مکاتیب نبوی میں محفوظ ہے۔ مسیلمہ کی مکالمت اور مراسلت دونوں کی ناکامی کے بعد اس نے اپنی نبوت کاذبہ کے استحکام کے لیے فوجی قوت بڑھانا شروع کر دی۔ خلافت صدیقی کے بالکل اوائل میں اس فتنے کے خاتمے کے لیے بہت سے صحابہ کو بھیجا گیا، مگر بالآخر حضرت خالدؓ بن ولید تیرہ ہزار صحابہ کے ساتھ مقابلے پر نکلے۔ مسیلمہ کی فوج مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ اور خوب مسلح تھی، مگر حق پرستوں کے مقابلے میں اس کی فوج کے ستر ہزار سورما کھیت رہے۔ صحابہ کے لشکر میں ایک ہزار کے قریب مجاہدین نے رتبہ شہادت حاصل کیا۔ یمامہ کی اس جنگ کی شدت کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ عہد نبوی کے 28 غزوات اور 54 سرایا میں کل 259 صحابہؓ شہید ہوئے مگر اکیلی اس جنگ یمامہ میں شہدائے اسلام کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہانت رسول کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے ایک تاریخ ساز مثال قائم کر دی۔

تاریخ اسلامی کی چودہ صدیاں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ مسلمانوں نے کبھی اہانت

رسالت کے جرم کو برداشت نہیں کیا۔ جہاں تک توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کی شرعی سزا کا مسئلہ ہے، اکابرامت میں اس پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے ''الصارم المسلول علی شاتم الرسول'' میں بہت جامعیت کے ساتھ وہ استدلال پیش کیا ہے جو ایسے مجرموں کو قتل کی سزا دینے کے لیے ضروری ہے۔ یہود اور نصاریٰ کے مذہبی پیشواؤں نے توہین رسالت کا نہ صرف یہ کہ خود مسلسل ارتکاب کیا ہے بلکہ اپنے معتقدین میں بھی اس کی تعلیم وترغیب میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ لوگ جو اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرتے تھے، انہیں ان پادریوں کی اصطلاح میں بنیاد پرست کہا جاتا تھا۔ بنیاد پرستی کی یہ تحریک ہسپانیہ میں یولوجیس نامی راہب کی سرپرستی میں شروع ہوئی، جس نے عیسائی نوجوانوں میں یہ اندھا جذبہ پیدا کیا کہ پیغمبر آخرالزماں ﷺ کے خلاف اہانت کا اظہار کر کے اگر انہیں قتل بھی کیا جائے تو یہ ان کے تقدس اور بلند مرتبے پر فائز ہونے کی علامت ہوگی۔ مذہبی فداکاری اور اندھے جنون کے اس جذبے کی تحریک کے بانی ہسپانیہ کے عیسائی ہیں۔ اس تحریک کا تذکرہ متعدد کتابوں میں کیا گیا ہے۔ یورپ کے علاوہ برصغیر میں بھی توہین رسالت ﷺ کی جو منفی کوششیں کی گئیں، مسلمانوں نے ریاستی اور انفرادی سطح پر اس کا مقابلہ کیا ہے اور محبت رسول ﷺ کے لافانی جذبے کا اظہار کیا ہے۔

توہین رسالت آسمانی مذاہب میں ہمیشہ سے ایک ناقابل معافی جرم رہا ہے۔ قرآن مجید میں بہت صراحت کے ساتھ یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی مسلمان کسی مذہبی پیشوا تو کجا ان کے ان نام لیواؤں کے لیے بھی بدزبانی اختیار نہیں کرسکتا۔ مذاہب کے اکابر اور ان کے شعائر کے احترام کے حوالے سے اسلام کی تعلیمات ہی تکریم انسانیت اور احترام آدمیت کی اقدار کو بحال رکھ سکتی ہیں۔ اسلامی موقف کو جاننے کے لیے قرآن مجید کے اس ارشاد پر توجہ دیجیے:

ولاتسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (الانعام:108)

ترجمہ: ''اور (اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ زیادتی کرتے ہوئے جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔''

پیش نظر رہے کہ ایک مسلمان کے لیے پیغمبر آخرالزماں ﷺ پر ایمان لانے کے

علاوہ، ان عقائد پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، جس کی رو سے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، مقدس الہامی کتابوں اور انبیائے کرام علیہم السلام کی عظمت و تقدیس کا یقین رکھنا ضروری ہے۔ کسی مسلمان کے لیے اس کا تصور بھی ممکن نہیں کہ وہ کسی نبی محترم یا آسمانی کتاب کے بارے میں کسی نوعیت کی گستاخی یا بے ادبی کا احساس تک بھی دل و دماغ میں لائے یا اس سلسلے میں لب کشائی کرے۔ قرآن مجید نے ایمان بالرسل کے ساتھ اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور وحی کے نوشتوں پر ایمان لانے کو کس اسلوب میں پیش کیا ہے، اس کے ایک مقام پر توجہ دیجیے:

امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل امن باللہ وملئکتہ وکتبہ و رسولہ لانفرق بین احد من رسلہ وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر (البقرہ:285)

ترجمہ: ”رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے، جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول کو ماننے والے ہیں، انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سنا اور اس کی اطاعت قبول کی۔ مالک ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔“

کتاب و سنت کی ان تعلیمات کے نتیجے میں ملت اسلامیہ نے گزشتہ چودہ صدیوں میں مذاہب اور ان کے پیشواؤں کی عزت و حرمت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ مسلمان صدیوں تک دنیا کے ایک وسیع و عریض علاقے پر حکمران رہے اور اس دوران میں انہوں نے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ کیا حسن سلوک کیا، اس کے تذکرے اور تفصیلات سے کتابیں بھری ہیں۔ خود غیر مسلموں، بالخصوص یہودیوں کے یہ اعتراف موجود ہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں انہیں احترام اور پناہ دونوں حاصل رہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ حکومت میں وہ خود ایک مستقل اقلیت رہے اور کبھی مسلم آبادی میں ان کی تعداد پندرہ [illegible] فیصد سے زیادہ نہیں رہی۔ مگر مسلمان حکمرانوں نے ان کو برابری کے حقوق عطا کیے، حتیٰ کہ انہیں پورے اختیارات کے ساتھ نظم مملکت میں بھی شامل کیا۔ احترام آدمیت کے لحاظ سے مسلمانوں کا ریکارڈ تاریخی طور پر بہت لائق قدر اور قابل ستائش رہا۔

توہین رسالت کی روایت مغرب میں صدیوں سے موجود ہے اور یہ اہانت کے نت نئے پینترے بدلتی رہی ہے۔ مستشرقین کی تحریریں ریکارڈ کے طور پر موجود ہیں کہ کس طرح انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن مجید پر بے جا اور ناروا الزامات لگائے ہیں۔ مسلم مفکرین نے ان کے الزامات اور اتہامات کا ہمیشہ علمی جواب دیا ہے، مگر افسوس کہ حالیہ چند برسوں میں اہانت کے واقعات کی نوعیت اور کمیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ ان واقعات میں سے ملت اسلامیہ اور فرزندان توحید کے دل زخمی ہیں۔ انہیں اپنے پیغمبر رحمت ﷺ سے جو محبت ہے، اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں کر سکتی۔ آپ ﷺ کی شخصیت اور سیرت میں ایک ایسا وقار اور جلالت موجود ہے، جس کا اعتراف سینکڑوں غیر مسلم مصنفین نے بھی کیا ہے۔ بیسیوں غیر مسلم شعرا کا نعتیہ کلام پڑھیے تو ان کے جذبات کی داد دینا پڑتی ہے۔ دنیا میں حضرت محمد ﷺ کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں جس کے لیے اس کے اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے اس قدر بھرپور احترام کے جذبات ظاہر کیے ہوں۔ مگر افسوس کہ بعض کم نظر، فتنہ جو اور اخلاق باختہ حضرات ایسے بھی ہیں جنہوں نے خلاف واقعہ کتب تحریر کی ہیں یا ایسی فلمیں تیار کی ہیں جن کا حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں اور اسے محض عناد اور گستاخانہ رویہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان مغربی حضرات نے بعض بد بخت اور لعین مسلمانوں کی خدمات بھی بڑی بھاری قیمت ادا کر کے حاصل کی ہیں کہ جن کے قلم کی سیہ کاریوں سے ان معاند مغربی حضرات کے ذوق اہانت کی تسکین ہوتی ہے۔

مغرب کے ایسے حضرات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ سراسر دماغی مریض دکھائی دیں گے۔ افسوس تو یہ بھی ہے کہ جن کے ہاں کتوں اور بلیوں تک کے حقوق کا احترام پایا جائے، ان کے ہاں مذہبی اکابر کی اہانت کے ایسے حربے اختیار کیے جائیں، جن کی کوئی تہذیب اور نظام اخلاق اجازت نہیں دیتا۔ ماضی میں نصرانی مستشرقین بالعموم اور یہودی سکالرز بالخصوص علمی تحقیق کے نام پر پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن مجید کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں۔ مسلم دانشوروں نے ان سب کا بہت سنجیدگی سے جواب دیا، مگر اب آزادی صحافت اور آزادی اظہار رائے کے نام پر آپ ﷺ کے ایسے خاکے تیار کیے جا رہے ہیں کہ جن سے صریحاً آپ ﷺ کی اہانت مقصود ہے۔

امریکہ میں نائن الیون کا حادثہ جس کی اب تک کی تحقیقات میں مسلم عنصر کے

بارے میں کوئی واضح اور قطعی شہادتیں موجود نہیں ہیں، البتہ اس میں یہودی سازش کے ڈانڈے بدستور اور بتدریج ملتے چلے جا رہے ہیں۔ امریکہ اور امریکیوں کو یہودی اقلیت نے کس طرح یرغمال بنا رکھا ہے، یہ بھی ایک عبرتناک داستان ہے۔ یہ یہودی عنصر وقفے وقفے سے اپنی میڈیا کی قوت کے ذریعے سے ایسا ماحول پیدا کرتا رہتا ہے کہ جس سے مغربی طاقتوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جا سکے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ ڈینیل پائپس نامی امریکی یہودی نے کس طرح ستمبر 2005ء میں خاکوں کے ذریعے آپ ﷺ کی اہانت کی منصوبہ بندی کی۔

اپنے مذموم مقاصد کے لیے ان یہودیوں نے کارٹونوں کے مقابلے منعقد کروائے اور پھر ان کی اشاعت کے لیے ایک ایسے ملک کا انتخاب کیا جہاں انسانی حقوق کا احترام اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ ہم جنسی پرستی کو بھی جواز مل گیا ہے۔ ان کے ہاں یہ اباحیت اور فحش کی حد تک بڑھی ہوئی جنسیت کیا کیا گل کھلا رہی ہے، اہل نظر اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔

اپنے مذموم مقاصد کے لیے یہودی لابی نے ڈنمارک کے ایک انتہائی غیر معروف اخبار ''یولانڈز پوسٹن'' میں 30 ستمبر 2005ء کی اشاعت میں ان خاکوں کو شائع کرایا۔ پیش نظر رہے کہ اس اخبار کا مالک بھی ایک یہودی ہے۔ اس حرکت پر مسلمانوں نے اپنا تاریخ احتجاج ریکارڈ کرایا۔ مگر یہودی ذہنیت میں تہذیب اور شرافت کے اجزا سرے سے غائب ہیں۔ یہودیوں کی اس ہٹ دھرمی اور مخاصمت کے پیش نظر اُنیس اکتوبر کو ڈنمارک میں موجود گیارہ مسلمان سفیروں نے ملک کے وزیراعظم آندرس فوگ راسموسین سے ملاقات کی اور انہیں اخبارات کی اس گستاخانہ روش پر توجہ دلائی، جس کے باعث ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے دل زخمی ہوئے ہیں۔ وزیراعظم بھی تو ڈنمارک کے دودھ کا نکلا ہوا مکھن تھا، سو وہ بھی چکنا گھڑا ثابت ہوا۔ سفیروں کے احتجاج کو نظر انداز کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ دس جنوری 2006ء کو اسی اخبار نے ان خاکوں کو دوبارہ شائع کر کے اپنی بدنیتی اور شر انگیزی کا اعادہ کیا۔

یکم فروری 2006ء کو فرانس، جرمنی، اٹلی اور اسپین کے بعض اخبارات نے ان خاکوں کو شائع کر کے ڈنمارک کے اخبارات کے ساتھ اپنی ''یکجہتی'' کا اظہار کیا۔ خیال رہے کہ یہودی صرف عالمی اقتصادیات کو ہی یرغمال نہیں بنائے ہوئے ہیں، بلکہ عالمی میڈیا اور صحافت پر ان کا کنٹرول بھی لائق توجہ ہے۔ اُمت مسلمہ کے خلاف ان کے عناد اور دشمنی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ کئی محاذوں پر انہیں تنگ کرنے اور کمزور بنانے کی پلاننگ کر چکے ہیں۔ یہودی

مستشرقین اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ یہ اُمت اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر ﷺ سے کس درجہ عقیدت اور محبت رکھتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ہمیشہ انہی دونوں مراکز عقیدت و محبت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس ''کارخیر'' سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ نتیجتاً 13 فروری 2008ء کو ایک مرتبہ پھر سکنڈے نیوین ممالک کے سترہ اخبارات نے ان گستاخانہ خاکوں کو شائع کیا ہے۔ مغرب کا صحافتی گھوڑا یہودی کوچوان کی گرفت میں عدم رواداری کی شاہراہ پر سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ وہ اس حرکت کے نتائج سے بے خبر نہیں کہ اس نتیجے میں ایک ایسی عالمی جنگ کا آغاز ہو سکتا ہے جو پوری انسانیت کے خاتمے کا اعلان ہوگی۔ آگ لگانے والوں کو فی الحال اس کا اندازہ نہیں کہ اس جلائی ہوئی آگ میں وہ خود بھی بھسم ہو جائیں گے۔ مگر عصبیت اور عناد کی نفسیات ہی یہ ہوتی ہے کہ اس شر انگیزی میں مبتلا فرد یا گروہ عواقب سے بے پروا اور نتائج سے غافل اپنی حرکات میں مصروف رہتا ہے۔

ان مذموم خاکوں کے خلاف امت مسلمہ کے جاری احتجاج کو اب ایک نئے محاذ کا سامنا درپیش ہے۔ ہالینڈ کے ایک رکن پارلیمنٹ گیرٹ وائلڈر نے ''فتنہ'' کے عنوان سے ایک ایسی فلم تیار کی ہے جس میں قرآن مجید کے حوالے سے فتنہ انگیزی کی ہے۔ افسوس کہ جو کتاب دنیا میں ہر نوع کے فتنوں کا استیصال کرنے کے لیے نازل ہوئی، خود اسے فتنہ انگیزی کا موضوع بنا دیا گیا۔ اس موقع پر عالم اسلام کے دانشوروں اور ارباب اختیار کو بہت سنجیدگی سے سر جوڑ کر بیٹھنے، تجزیہ کرنے اور راہِ عمل تجویز کرنے کی ضرورت ہے کہ مغرب کے مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ کھیلنے کی اس مسلسل روش کا توڑ کیسے کیا جائے؟

مغرب میں گذشتہ ایک صدی سے انسانی حقوق کے حوالے سے بہت زور شور دکھائی دیتا ہے۔ انسانی حقوق کے احترام سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اسلام نے تو سب سے پہلے میثاق مدینہ اور خطبہ حجۃ الوداع کے ذریعے حقوق کا ایک ایسا آئینی اور دستوری پیکیج عطا کیا جو کسی مسلسل احتجاج اور قرار دادوں کے نتیجے میں نہیں بلکہ اسلام کی فطری تعلیمات کے حوالے سے نہ صرف پیش کیا گیا، بلکہ اس پر عمل درآمد کی روشن مثالیں اسلامی تاریخ کا مستقل طغرائے امتیاز ہیں۔ کیا کسی ایک فرد یا طبقے کا کسی دوسرے فرد یا طبقے کے حقوق کو سلب کرنا بھی انسانی حقوق کے احترام کا تقاضا ہے؟ کیا مغرب کے اس یہودی ذہن کا یہ ''کرشمہ'' کہ جس کے باعث ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ انسانی حقوق کا

احترام ہے یا ان کا انہدام ہے......؟ یہود کی فطرت ملاحظہ کیجیے کہ ایک طرف ہولوکاسٹ جیسے معروف واقعے کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ اس کے بارے میں تاریخی حقیقت کو معلوم کرنے کی بھی اجازت نہیں اور اگر کوئی ایسا کرے تو ان کے نزدیک یہ قانونا جرم ہے۔ دوسری طرف وہ مسلمانوں کے حقوق کو نگلنے اور نظر انداز کرنے کی مستقل پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ اس روش پر جن اداروں کو انہیں لگام دینا چاہیے تھی، وہی اس کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ فلسطین میں گزشتہ چھ عشروں میں مسلمانوں کے حقوق کا جو تلاف اسرائیلیوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے، اس سے عالمی امن، بھائی چارے اور انصاف کے اداروں کی بے بسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یورپ میں آزادی اظہار رائے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو اس حق سے اختلاف نہیں ہے، مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس حق کے استعمال کی بھی کچھ حدود و قیود ہیں یا نہیں۔ کوئی تہذیب و ثقافت شاید اس حرکت کی تو اجازت دے دے کہ آپ ہاتھ میں چھڑی لے کر بے تکلفی سے اسے گھماتے ہوئے چلتے جایئے مگر یہ آزادی اس مقام پر آ کر ختم ہو جاتی ہے کہ جہاں یہ کسی دوسرے کے ناک کو چھونے کی کوشش کرے۔ اہل مغرب تو اس چھڑی سے مسلمانوں کے جسم کے ہر حصے کو کچوکے لگا رہے ہیں۔ مادیت اور ٹیکنالوجی کے پندار میں مبتلا مغرب کے دانشوروں کو سوچنا ہوگا کہ کیا دوسرے مذاہب کے اکابر اور ان کے شعائر پر اس نوع کے نازیبا حملے آزادی رائے کے زمرے میں آتے ہیں۔ اگر آپ نے اس نوع کی منفی اور مذموم سرگرمیوں اور حرکات کو آزادی رائے تصور کر رکھا ہے تو آپ انسانیت کے مستقبل ہی نہیں، حال کو بھی ایک جہنم زار بنا دیں گے۔ ایک طرف آپ بین المذہبی اور بین التہذیبی مکالمے کی بات کرتے ہیں، لیکن اسی سانس میں آپ ان تہذیبوں اور مذاہب کے اکابر اور شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں، کیا یہ آپ کی اس مکالمے کے اجرا اور فروغ سے دلچسپی اور سنجیدگی کی علامت ہے......؟

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

دنیا کے تمام سنجیدہ سکالرز اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اسلام نہ صرف یہ کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، بلکہ ان کی عزت و تکریم کی بھی تلقین کرتا ہے۔ قرآن مجید نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ "لانفرق بین احد من رسلہ" اور اسی

تعلیم نے ہمیں تمام رسولوں کے احترام کا پابند بنایا ہے۔ ہمارے عیسائی بھائیوں نے بھی مسیح علیہ السلام کی اہانت کے سلسلے میں (Blasphemy) کے حوالے سے ایسے قوانین کا ذکر کیا ہے جس کی بنا پر مقدس شخصیات اور ناموں کی بے حرمتی نہیں کی جا سکتی۔ مغربی ممالک میں جو ضوابط تعزیرات پائے جاتے ہیں، ان میں اس جرم اہانت کی سزا موت درج تھی، مگر اٹھارھویں صدی میں مادی اور ثقافتی تبدیلیوں نے اس موت کی سزا کو Civil Death کی اصطلاح کا نام دیا ہے۔ مغرب کی عدالتوں کے فیصلے اور نظائر ہمارے مطالعے میں ہیں کہ جن میں مذہبی پیشواؤں اور شعائر کی بے حرمتی پر سزائیں دی گئی ہیں۔ صد حیف کہ مغرب ایک دوہرے معیار کا خوگر ہو چکا ہے۔ مغربی ممالک کے دساتیر اور تعزیرات میں مذہبی شعائر کا مذاق اڑانے والوں اور مذہبی سطح پر دوسروں کی دلآ زاری کرنے والوں کے لیے مختلف سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔

مگر جب معاملہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی دلآ زاری کا آتا ہے تو ان کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ خود ڈنمارک کے دستور کے آرٹیکل 77 کے تحت کسی بھی شخص کو غلط اور نامناسب چیزیں شائع کرنے پر عدالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی ملک کے پینل کوڈ (تعزیرات) کے سیکشن 140 میں توہین آمیز مواد کی اشاعت پر پابندی موجود ہے۔ نیز تعزیرات کے سیکشن 266 اے میں رنگ ونسل یا مذہبی جذبات کے خلاف اقدامات سے باز رہنے کی ہدایت بھی موجود ہے۔ یورپین یونین آف ہیومن رائٹس کے تحت ڈنمارک بین الاقوامی ضوابط اور قوانین پر عمل درآمد کا پابند ہے۔ یہ ملک ایک مدت سے ایک لبرل سوسائٹی کے قیام کا مدعی ہے۔ جس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ یہاں ہم جنس پرست جوڑوں کی شادیوں کے حقوق کو فخریہ پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا سیکولرازم اور جمہوری کلچر کا یہی تقاضا ہے کہ آپ دوسرے مذاہب بالخصوص ان کے پیشواؤں کی کردار کشی کے لیے اہانت اور تضحیک کا رویہ اپنائیں۔ ہالینڈ کے پینل کوڈ (تعزیرات) کے آرٹیکل 137 کے تحت بھی توہین آمیز تحریروں کے ذریعے نفرت و تعصب پھیلانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ہالینڈ کے وزیر اعظم نے فلم ''فتنہ'' کے فتنہ گر گیرٹ وائلڈر کی اس کوشش کو طبقات میں نفرت پھیلانے کا موجب بتایا ہے۔ اگر وہ یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں تو پھر حکومت کو ایسے فتنہ گر کے خلاف خود بھی مقدمہ چلانا چاہیے۔ اس فلم کا پلاٹ اس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اسلام کو ایک پرتشدد مذہب ثابت کیا جائے۔ اس

کے پلاٹ میں مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے ایسا الم غلم مواد مہیا کیا گیا ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو تشدد پر ابھارنے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازی می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

دنیا کے تمام سنجیدہ دانشوروں کو اس نکتے پر مسلسل سوچنا چاہیے کہ اہانت انبیا اور مذہبی صحائف کی اس تضحیک سے عالمی ثقافت اور جہانی سیاست میں کیا خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں؟ غیر مسلم دانشوروں اور میڈیا سے متعلق ذمہ داران کو سوچنا چاہیے کہ اظہار رائے کی آزادی کی حدود و قیود کیا ہونا چاہئیں؟ ایسی مذموم حرکات کے مقاصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں سے عناد رکھنے والے حضرات ایسی تحریروں، خاکوں اور فلموں کے ذریعے مسلمانوں کو اشتعال دلا کر انہیں دہشت گرد ثابت کریں۔ ان کی یہ حماقت اور سادہ لوحی پوری انسانیت کو ایک عالمگیر جنگ کی طرف دھکیل رہی ہے۔ پہلے سے صلیبی جذبات میں سلگتی فضا، ایسی شرمناک حرکات سے انسانیت کو جہنم زار بنا سکتی ہے۔ آزادی اظہار رائے کے نام پر دریدہ دہنی، افترا پردازی اور تخلیقی ہذیان کا مظاہرہ سراسر بدنیتی، عناد اور مخاصمت ہے جس سے انسانی اقدار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ مغرب اور بالخصوص عالم یہود کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی یہ مذموم حرکات فساد فی الارض کا باعث ہے۔ دنیا کی تمام امن پسند اقوام، صلح جو معاشروں، اخلاقی اقدار کے فروغ میں یقین رکھنے والے مذہب اور عالمی احترام و اخوت کی جویا قوتیں اور تنظیمیں عالم یہود کی اس سازش کی مذمت کریں۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ اور عالمی عدالت انصاف کو ایسی قانون سازی کرنا چاہیے جس میں کسی قوم یا مذہب کو ایسی غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہ ہو۔ بین المذاہبی اور بین التہذیبی مکالمے کے اداروں اور تنظیموں کو اپنا کردار انجام دینا چاہیے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور انسانی حقوق کے اداروں کو بھی ایسی حرکات کا نوٹس لینا چاہیے۔ پُرامن بقائے باہمی کے لیے مسلسل ایسے اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے کہ جس میں برابری اور مساوات کی بنیادوں پر حقوق اور اقدار وروایات کو تحفظ دیا جائے۔

عالم اسلام کے فرزندانِ توحید کو بھی اس سلسلے میں اپنی صفوں میں اتحاد اور وحدت پیدا کرنا چاہیے۔ یہود و ہنود کی ہرزہ سرائیوں کے مقابلے میں ہمارا احتجاج ہماری تہذیبی اور

اخلاقی روایات میں ڈھلا ہونا چاہیے۔ او آئی سی، رابطہ عالم اسلامی، مؤتمر عالم اسلامی اور دوسری مسلم تنظیمات اور تحریکات کو ان موضوعات پر ایک مشترکہ موقف اپنانا چاہیے۔ عالم اسلام کے سیاسی قائدین کو ایسے ممالک کے خلاف اقتصادی بائیکاٹ کا حربہ استعمال کرنا چاہیے جو ایسی ناپسندیدہ حرکات کی سرپرستی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے نبی مکرم ﷺ کی عزت و حرمت کے حوالے سے ایک جرأت مندانہ اور اسلامی حمیت سے لبریز رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ عالم اسلام کے علمی، تحقیقی اور تدریسی اداروں کو منصبِ نبوت، مقام نبوت اور عظمت نبوت کے حوالے سے دقیع کام انجام دینا چاہیے۔ دنیا شاید معیشت کے سازو سامان سے محرومی کی صورت میں ختم نہ ہو، مگر اخلاقی زوال اور روحانی افلاس کے باعث ختم ہو جائے گی اور یہ اخلاقی ورثہ اور روحانی ترکہ نبوت کے مقام و منصب کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ انسانیت کے مستقبل کی درخشندگی اور تازگی کارِ نبوت کے ساتھ وابستہ ہے اور انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں میں صرف ایک سیرت ہی اپنے کارنامہ سیرت کے ساتھ زندہ موجود ہے۔ اس مصطفوی تہذیب و ثقافت کی حفاظت ملت اسلامیہ کی بالعموم اور اس کے دانشوروں کی بالخصوص ذمہ داری ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ سعودی عرب یا پاکستان کے اکابر تمام مذاہب کے صف اول کے دینی رہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائیں جس میں مذاہب کے اکابر اور شعائر کی عزت و حرمت پر کوئی متفقہ لائحہ عمل اپنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے **ورفعنا لک ذکرک** کی جو نوید قرآن بیان کی ہے، دنیا میں مصطفوی تہذیب و ثقافت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد کیتھولک عیسائیوں کی تعداد سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اب اسلام کے فروغ میں خود مسلمان ممالک کے سربراہ رکاوٹ ہیں۔ اگر ہم میں مطلوبہ تبدیلی آ جائے تو چار سو ان شاء اللہ تبدیل ہو جائے گا۔

مرزا محمد الیاس

آزادیٔ اظہار سے اظہارِ منافرت تک

توہین رسالت ﷺ کے واقعات کے تناظر میں لبرل حلقوں کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ آزادیٔ اظہار پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی کیونکہ یہ ایک آزاد جمہوری معاشرے کی بنیادی اقدار میں سے ہے۔ ان لبرل حلقوں میں مغرب کا پورا نظامِ تمدن بھی شامل ہے اور وہ لبرل بھی اس کے حامی ہیں جو دو طرح کے مغربی اثرات رکھتے ہیں۔ ان میں پہلے وہ ہیں جو لبرل ازم سے سیکولرازم تک عقیدے اور ایمان کی حد تک یقین رکھتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو اپنے رویوں، اقدار اور شناخت میں لبرل کہلاتے ہیں، لیکن بعض واقعات اور تناظر ان کو بھی لبرل تشریح کے ساتھ قبول نہیں ہیں۔ ان حلقوں میں بھی یہ سوال زیرِ بحث آتا رہتا ہے کہ آیا آزادیٔ اظہار لامحدود ہے؟ کیا یہ قدر سب سے مقدم ہے اور اس سے باقی اقدار کا یقینی اظہار ممکن ہے؟ کیا دیگر بنیادی اور ناگزیر اقدار کو آزادیٔ اظہار متاثر کر رہی ہو، تب کیا رویہ ہونا چاہیے؟ کیا اس قدر کو بھی نظامِ اقدار کے پورے دائرے میں متعین کرنا ممکن ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ جب نفرت کسی اظہار کا حصہ بن جائے، جسے معروف معنوں میں نفرت پر مبنی تقریر یا منافرانہ تقریر یا اظہارِ منافرت (Hate Speech) کہا جاتا ہے، تب بھی اسے آزادی ہی کہا جائے گا۔ ان سوالات پر بحث جاری ہے اور ان کے جوابات کے معاشروں پر مرتب ہونے والے اثرات پر بھی تحقیق و جائزہ ہو رہا ہے۔ ہم یہاں کوشش کریں گے کہ کچھ ایسے جوابات حاصل کرسکیں جن سے آزادیٔ اظہار کے مغربی دعوے کی حقیقت بھی سامنے آئے اور آزادیٔ اظہار سے اظہارِ منافرت تک کا فاصلہ کس طرح اچانک سکڑ جاتا ہے، اسے بھی سمجھا جاسکے۔ اس طرح ہم محض ردِعمل کے گرداب سے نکل کر عمل کے قابل ہوسکیں گے۔

انسان کی امتیازی خوبی اس کا بولنا ہے، بات کرنا ہے اور اپنے ذہن و عمل میں اپنے قول و فکر سے تبدیلی لاتا ہے۔ اگر وہ بولنا بند کردے تو گونگا کہلاتا ہے۔ وہ بے تکان بولنے

لگے تو لوگ اسے خبطی قرار دے کر اس سے نظریں بچانے لگتے ہیں۔ بعض لوگ بہت خاموشی سے سب کچھ دیکھتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو بسا اوقات کہا جاتا ہے کہ مردہ جب بھی بولتا ہے، کفن پھاڑ کے بولتا ہے۔

انسان نے ہی خود کو مختلف شناختیں دے رکھی ہیں۔ اس کے مختلف حوالے ہیں۔ ذات، رنگ، نسل، علاقہ، عقیدہ، قوم اور ملک بھی اس کی شناخت کے حوالے ہیں۔ ان حوالوں سے ماورا بھی کچھ حوالے ہیں۔ یہ حوالے اسے زمان و مکان کی قید سے آزاد کرا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مذہبی یا غیر مذہبی کی شناخت اختیار کرتا ہے۔ وہ لبرل یا نظریاتی اعتبار سے سخت گیر، اعتدال پرست یا انتہا پسند بھی کہلاتا ہے یا ایسا اسے اس کے افکار اور اعمال کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

جن معاشروں نے لبرل ہونے کی شناخت اختیار کی ہے، انہوں نے آزادیوں پر ایسے تصرف کا تصور دیا ہے جو ناقابل تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ آزادی کے اسی مفہوم کو عالمگیر سمجھتے اور بنانا چاہتے ہیں جو ان کے لیے یا ان کے نزدیک آزادی کی مکمل تشریح کرتا ہے۔ جمہوریت کے نظام کو لیجیے۔ آج کی دنیا میں اس کے سوا کسی اور تصور حکومت کو بیک جنبش قلم مسترد کر دیا جاتا ہے خواہ وہ جمہوریت سے زیادہ جمہوری ہو۔ یہ تصرف اقدار پر بھی ہے اور اقدار سے مرتب ہونے والے نظام پر بھی ہے۔ حقیقت میں یہ اجارہ داری ہے جس میں ان گروہوں، اداروں اور اقوام کو مجبور کیا جاتا ہے۔ جو مغلوب یا کسی وجہ سے محکومی کے تجربات سے گزر رہی ہیں۔ یہی معاملہ آزادی اظہار کا ہے۔ ایک لبرل فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہے، جیسے چاہے کرے۔ تاہم وسیع تناظر میں وہ اس وقت پابند بھی ہوتا ہے جب وہ لبرل نظام کا حصہ ہو۔ پھر اس کے چاہنے اور کرنے سے زیادہ بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کی پامالی اسے جیل لے جاتی ہے۔

کسی مذہب نے اپنے پیروکار کو بات کرنے سے کبھی نہیں روکا۔ اسے سوال کرنے کی آزادی دی ہے۔ اس آزادی کا استعمال اس نظام اقدار و اخلاق کا پابند ہے جس مذہب سے اس کا تعلق ہے۔ لبرل رویوں میں بھی یہی کیفیت ہے، اگرچہ اس کا اطلاق مختلف ہوسکتا ہے۔ یہاں بھی یہ سوال بہت اہم ہے کہ دوسری اقدار بچانے کے لیے آزادی اظہار کی قدر کو محدود کیا جاتا ہے، کیا جاسکتا ہے یا یہ بالکل آزاد ہے؟ اس پر پابندیاں قبول نہیں کی جاتیں،

لیکن زمانہ امن و جنگ میں ذرائع ابلاغ ایک ایسے ضابطے کے پابند ضرور رہتے ہیں جو بظاہر لکھا ہوا نہیں، لیکن قومی ترجیحات، توقعات اور ضروریات پابندی کراتے ہیں۔ عراق میں امریکی جنگ پر کوئی اس پالیسی کے خلاف نہیں بولتا جو سرکاری طور پر طے ہوتی ہے۔ جب کوئی بولتا ہے تو بہت نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔ عراقی شہریوں کی ہلاکت کی تصاویر دنیا نے نہیں دیکھیں، لیکن ہزاروں کے مارے جانے کی خبریں غیر امریکی میڈیا دیتا رہتا ہے۔ گویا آزادیِ اظہار بھی کچھ تقاضوں اور ضرورتوں سے آزاد ہرگز نہیں ہے۔ اہل مغرب خود کہتے اور جانتے ہیں کہ مادر پدر آزادیِ اظہار کوئی شے نہیں ہے۔ ہر معاشرہ اس پر اپنے نظامِ اقدار کے حوالے سے پابندیاں عائد کرتا ہے۔ کوئی ریاست کسی کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ وہاں کے دستور یا بنیادی نظریے کے خلاف بات کرے خواہ وہ لبرل نظریہ ہی کیوں نہ ہو۔ آزادیِ اظہار کا آسان سا مفہوم یہی لیا جاسکتا ہے کہ مجھے ہر وہ بات کہنے کی آزادی ہے جو کسی کے لیے آزار کا سبب نہ بنے۔ وہ بات سچی ہو، مصدقہ ہو، مسلمہ ہو یا کوئی دوسری کیفیت ظاہر کرتی ہو، یہ سب بعد میں آئے گا۔ جب وہ بات میرے اپنے نظامِ اقدار یا کسی [illegible] نظام [illegible] کو [illegible] پہنچا[illegible] نے والی ہو تو اس کے کہنے کا دائرہ، ذریعۂ اسلوب اور عمل سب مشروط ہو جائیں گے۔ آزادیِ رائے اس طرح سے وجود پائے گی کہ یہ ایک سیاسی حق ہے، زبان کو بے لگام کرنا ہرگز نہیں۔ آزادی کی بات کرنے والوں کو بھی علم ہے کہ آزادی تب ہی اپنا وجود منوا سکتی ہے جب اس کو یہ علم ہو کہ کسی اتھارٹی سے اسے آزادی درکار ہے۔ گویا اتھارٹی تو موجود ہے، اس کا عمل کیا ہوگا، یہ مختلف معاشروں میں مختلف ہوگی۔

اس بات کو دیکھنا ضروری ہے کہ اصل قدر محض اظہار نہیں ہے، غیر محدود تو بالکل ہی نہیں۔ غیر محدود یا لامحدود اظہار تو یورپ کے معاشروں میں بھی ممکن نہیں۔ ان معاشروں میں بھی یہ ضرورت رہتی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس پر کیا حدود لاگو ہوں گی اور کن حدود سے یہ پامال ہوگی۔ سٹینڈرڈ انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی میں آزادیِ اظہار کے حوالے سے توجہ دلائی گئی ہے کہ مادر پدر آزاد اظہار خطرناک ہوتا ہے:

> ”جو لوگ مادر پدر آزاد بات کرنے کے لیے وکالت کرتے ہیں، وہ بھی خبردار کرتے ہیں کہ اظہار پر کسی بھی نوعیت کی پابندی لگانے سے سنسر شپ اور آمریت کو قوت ملتی ہے۔ ان دلائل میں یہ موقف اختیار کیا

جاتا ہے کہ ہم بات کرتے ہوئے بالکل آزاد ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کوئی راستہ ممکن نہیں ہے۔ ہم واقعی زبان کی پھسلن کا شکار ہو جاتے ہیں، ہم ایسا چاہیں یا نہ چاہیں۔ ہمارے سامنے آپشن بھی رہ جاتا ہے کہ ہم کس حد تک اوپر جا سکتے ہیں اور کس حد تک نیچے آ سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اس پھسلن سے بالکل ہی لڑکھڑا جائیں۔"

اس وضاحت کے بعد یہ بھی بتا دیا گیا ہے:

"ہمیں یہ آزادی ہے کہ ہم آزادی سے بات کر سکیں۔ چنانچہ بولنے کی آزادی دراصل آزادیِ عمل کے دوسرے طریقوں سے مختلف ہے۔ اگر حکومت اپنے شہریوں کو کسی کام میں ملوث ہونے سے روکنا چاہتی ہے، مثال کے طور پر موٹر بائیک کی سواری سے، وہ ایسی آزادی کو روک سکتی ہے۔ وہ صرف یہ کرے گی کہ موٹر سائیکل ہی دستیاب نہ ہونے دے۔ مثال کے طور پر موجود موٹر سائیکلیں تباہ کر سکتی ہے اور نئی پر پابندی لگا دے گی کہ اب یہ درآمد ہی نہیں کی جا سکتیں۔ آزادیِ اظہار کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کوئی حکومت کسی کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ کوئی خاص بات نہ کہے۔ وہ صرف یہ کر سکتی ہے کہ جب وہ فرد ویسا کرے اور کہے تو اس کو سزا دے سکتی ہے۔"

اسی انسائیکلوپیڈیا میں آزادیِ رائے پر بحث میں آزاد گفتگو پر کچھ لبرل اصولوں کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس بحث میں جان سٹوارٹ مل کے ایک اصول (Harm Principle) پر بات میں کہا گیا ہے کہ آزادیِ اظہار کی آزادی کی مکمل اجازت اس لیے لازمی ہے تاکہ ہم اپنا استدلال پوری طرح سے اور منطقی طور پر بیان کر سکیں۔ مل یہ بھی تجویز کرتا ہے کہ ہمیں سیاسی وحدت کے ارکان کے اعمال کو کسی ضابطے میں لانے کے لیے بہرحال یہ ضرورت رہے گی کہ کچھ اصول وضع کریں۔ اس اصول کو وہ (Harm Principle) کا نام دیتا ہے۔ اصول یہ ہے:

"کسی بھی مہذب معاشرے کے کسی بھی فرد کے خلاف قوت کا استعمال

صحیح طور پر، اور اس کی مرضی کے خلاف، تب ہی ہو سکے گا جب اسے ایسے اقدام سے روکنا ضروری ہو جائے جس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔"

یہاں فاضل مصنف نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ہمیں یہ ضرورت ہوگی کہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ کس نوعیت کی تقریر یا گفتگو نقصان دہ قرار دی جائے گی۔ اس سوال کا جواب پانے کے لیے آزادیٔ اظہار کی حدود کا ہمیں پہلے سے تعین کرنا ہوگا۔ مل نے یہاں جو مثال دی ہے وہ غلے کے تاجروں کے حوالے سے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ دعویٰ تو درست ہے کہ یہ تاجر غریبوں کو بھوکے مارنا چاہتے ہیں، لیکن یہ بات کسی شائع شدہ ذریعہ سے ہی کہی جا سکتی ہے۔ یہ بات کسی غم و غصے سے بھرے مجمعے میں نہیں کہی جا سکتی جو کسی بھی وقت پھٹ پڑے اور وہ تاجر کے سٹور کے باہر جمع ہو چکا ہو۔ اس نکتے کی وضاحت ڈینیل جیکب سن کے حوالے سے یوں کی گئی ہے کہ مل آزادیٔ اظہار پر پابندی کے حق میں نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بیان سے دوسرے کو نقصان پہنچے گا۔ غلے کے تاجروں کے بارے میں یہ بات کہی جائے گی تو وہ معاشی پریشانی سے دوچار ہو جائیں گے۔ مل جو فرق بیان کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ کون سا نقصان صحیح کہا جا سکتا ہے اور کون سا غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ دونوں ہی آزادیٔ اظہار ہیں۔ ایسا تب ہی ہوگا جب یہ علم ہو کہ ایسی گفتگو سے کسی کے حقوق پامال ہوں گے اور اس صورت میں اسے محدود کیا جائے گا۔ اس اصول سے ہتک عزت کا دعویٰ درست قرار پاتا ہے، بلیک میلنگ سے نجات مل سکتی ہے، اشتہار بازی میں صریح غلط بیانی کو روکا جا سکتا ہے، بچوں کے لیے خطرناک اشتہار بازی سے منع کیا جا سکتا ہے۔ ان صورتوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نقصان پہنچایا گیا ہے اور حقوق پامال کیے گئے ہیں۔

منافرانہ تقاریر پر مشکل صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ صورتِ معاملہ یہ ہے کہ یورپ کے مختلف ممالک میں منافرانہ تقاریر (Hate Speech) پر پابندی ہے۔ اگر کینیڈا کی مثال لی جائے تو اس کے ضابطہ فوجداری اور انسانی حقوق کے قانون میں بھی ایسی دفعات موجود ہیں جن سے ایسی تقاریر پر پابندی لگائی گئی ہے۔ کینیڈا کے دس صوبوں اور تین علاقوں میں ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ ضابطہ فوجداری میں نفرت پر مبنی پروپیگنڈہ کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایسا کرنے والے پر دفعہ 318، 319 اور 320 کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس پروپیگنڈہ سے مراد

ہر ایسی تحریر، علامت یا تصور ہے جس سے قتل عام کا خدشہ ہو یا اس کی وجہ سے کوئی فرد ان دفعات میں بتائے گئے جرم کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ دفعہ 318 کے تحت ایسے جرم کی سزا پانچ سال قید ہو سکتی ہے۔ قتل عام کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ یہ وہ اقدام ہے کہ کسی ایسے گروہ کے خلاف یا اس کے افراد کے خلاف ہو جن کی واضح شناخت ہو۔ اس گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جن کا تعلق کسی رنگ، نسل، مذہب، علاقے یا لسانی گروہ سے ہو۔ حتیٰ کہ مخصوص جنسی شناخت والوں کو بھی نشانہ نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ سیکشن 319 میں کہا گیا ہے کہ پروپیگنڈہ صحیح ہو تو اس پر سزا نہیں دی جائے گی۔ 2003ء میں ڈیوڈ اھانیکے کے خلاف الزام لگایا گیا کہ اس نے یہودیوں کے خلاف ایک رپورٹر کے سامنے چند جملے کہے تھے۔ 2005ء میں اسے مجرم قرار دے کر ایک ہزار ڈالر جرمانہ کر دیا گیا۔ 2009ء میں ایک مقدمہ (Warman v. Northern Alliance) درج کیا گیا جس میں کہا گیا تھا:

ایک ویب سائٹ بند کی جائے جس پر ایسا مواد رکھا گیا ہے جس سے رومیوں، یہودیوں، مسلمانوں، ہم جنس پرستوں، سیاہ فاموں اور عربوں کی دل آزاری ہو رہی ہے۔ اس پر دفعہ (a)(1)54 کے تحت حکم جاری کیا گیا اور ویب سائٹ بند کر دی گئی۔

مل کے اصول کے مطابق کسی گفتگو، رائے یا بات کو اس کے اثر کے حوالے سے دیکھا جائے گا۔ اگر اس کے اثرات سے کسی کو نقصان پہنچتا ہے یا کسی دوسری انسانی قدر کی نفی ہوتی ہے تو اسے روک دیا جائے گا اور سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ منافرانہ تقریر بھی روکی جا سکتی ہے اور جھوٹ پر مبنی پروپیگنڈہ بھی خلاف قانون قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سے جوئیل فائن برگ نے جارحیت کا اصول (Offense Principle) پیش کیا اور یہ کہا کہ مل کے اصول سے سارے امور طے نہیں ہو پاتے۔ جوئیل کا کہنا تھا کہ کسی بھی اظہار کو اس کے جارحانہ ہونے کی بنیاد پر روکا جا سکتا ہے۔ کسی کو نقصان پہنچانا زیادہ سنجیدہ اور سنگین معاملہ ہے جبکہ کسی کو اس نقصان میں مبتلا کرنا اس سے کم سنگین ہے تاہم سزا دونوں صورتوں میں دی جائے گی۔

سٹینلے فش کا کہنا ہے کہ آزادی اظہار کے حوالے سے ہمیں دو اور دو چار کی طرح کی قانون سازی یا اصول بنانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے ایک ایسے سمجھوتے کی ضرورت ہے جو ہمیں متنوع اقدار کے تحفظ کے قابل بنا سکے۔ انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی میں آزادی

اظہار کا مصنف لکھتا ہے:

> ''دوسرے الفاظ میں، ایسے اسباب کا ہونا ضروری ہے جو کسی استدلال کو اظہار کے مراحل میں بیان کرنے میں مددگار ہوں۔ ہم محض اس لیے یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ فرسٹ ترمیم میں یوں کہا گیا ہے، اس لیے ہمیشہ ایسا ہی کرنا ہوگا۔ کام یہ نہیں ہے کہ ہم کوئی اصول وضع کر لیں جس سے ہمیشہ اظہار رائے کی حمایت ہو رہی ہو، بلکہ یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کون سا اظہار اچھا ہے اور کون سا برا ہے۔''

(www.plato.standard.edu)

• ان مثالوں سے بھی واضح ہوتا ہے کہ خود لبرل ازم کے بڑے بڑے مفکرین کے مطابق بھی آزادیٔ اظہار پابندی سے یکسر آزاد نہیں ہے۔ توہین رسالت ﷺ کا ارتکاب کرنے والوں کا آزادیٔ اظہار کے پردے میں پناہ لینا یکطرفہ عمل ہے اور خود لبرل معاشروں کے قوانین اور نظام اقدار کے مطابق ایک قابل سزا جرم ہے۔ آزادی کو کسی بھی پابندی سے آزاد کر دیا جائے تو یورپ کے ان تمام قوانین کا جواز باقی نہیں رہے گا جو منافرانہ تقاریر کے بارے میں بنائے گئے ہیں۔

صحیح بات تو یہ ہے کہ توہین رسالت ﷺ کا ارتکاب کرنے والے ایسا اس لیے نہیں کرتے کہ وہ اظہار اور رائے کی آزادی کا حق استعمال کر رہے ہیں۔ بلکہ ایسی حرکتوں کا ارتکاب مخصوص ایجنڈے کے تحت کیا جاتا ہے۔ ڈنمارک میں کارٹون بنانے والا راس فلیمنگ صیہونیت کے بہت قریب ہے اور اس بارے میں خود یورپی میڈیا کی رپورٹیں موجود ہیں۔

طارق جان

آزادی رائے قتل کا اجازت نامہ نہیں!

کیا بے قید آزادروی سے قومی آزادی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے؟

آئی اے رحمٰن کا مضمون Not a Matter of Concessions (یہ رعایتوں کا سوال نہیں) پڑھیے، شاید آپ کو جواب مل جائے۔

اُن کی تحریر میں سب کچھ ہے جو نراجی ذہن کا خاصہ ہے، یعنی تصادم اور ہر ایک کے لیے پنجہ آزمائی کی دعوت بھی۔ اگر نہیں تو وہ ہے امن اور سلامتی کی خواہش۔ وہ بے قید آزادئ اظہار چاہتے ہیں۔ میں اسے زیادہ سے زیادہ نراجی اظہار کا کیس سمجھتا ہوں، کیونکہ نراجی ذہن صرف اسی چیز کو آزادی تصور کرتا ہے، جو اسے نراجیت پھیلانے میں مدد دے۔ جب یہ اپیل کی جاتی ہے کہ شوق سے ہر چیز پر تنقید کرلو، لیکن پاکستان کو معاف رکھو، تو اسے یوں لیا جاتا ہے جیسے آزادی رائے پر قدغن لگ رہی ہو کہ وہ ''فتنے نہ اٹھا سکے''۔ ان کے خیال میں بدعنوانی سے پردے اٹھانا تو لڑکوں بالوں کا کام ہے۔ وہ خود چونکہ ماشاء اللہ بالغ ہیں، اس لیے وہ یہ نہیں کریں گے۔ انہیں تو اپنی من پسند راگنی الاپنی ہے کہ پاکستان کو کیسے تاراج کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پھر ان کے ہاں حقیقی آزادی کا تصور کیا ہے؟ مضمون نگار موصوف کے الفاظ میں ''ان روایتی تصورات کو چیلنج کرنے کی اہلیت جن کا اطلاق عوامی معاملات پر ہوتا ہے۔ یعنی دین کا سیاست میں کردار، ملکی سلامتی کی حکمت عملی اور تخفیف اسلحہ اور فوجی قوت ختم کرنے کے امور۔'' ظاہر ہے وہ آزادئ اظہار کو اپنے گروہی موقف کے پھیلاؤ اور وسعت کے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہیں، تا کہ ایک مسلمان معاشرے کے ''روایتی تصورات'' کو ہدف بنایا جاسکے۔ ان روایتی تصورات میں موصوف اسلام کو ''روایتی'' کہتے ہوئے کوئی ذہنی الجھن محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح انہیں آزادی رائے کے لیے کسی عوامی طلب اور افادیت کی بھی ضرورت نہیں۔ یوں اہم بنیادی مسائل جیسے:

- ❑ ہمیں یہ طاقت واستحکام کیسے حاصل ہو کہ ہم قوموں کی برادری میں سربلند رہیں، یہ ان کا مسئلہ نہیں۔
- ❑ انہیں کوئی تشویش نہیں کہ ہماری سماجی، معاشی اور سلامتی کے معیارات میں مثبت تبدیلی کیسے آئے۔
- ❑ ان کی قلم کاری کو اس سے بھی کوئی واسطہ نہیں کہ ہمارا دستور کیسے قابل عمل بن سکتا ہے؟ (جبکہ ہمارے پاس یہی ایک متفق علیہ چیز ہے)۔
- ❑ مرکز اور صوبائی اکائیوں کے دستور کے انحراف پر ہم کیسے روک لگا سکتے ہیں؟
- ❑ وہ اس بات پر بھی سوچنا گوارا نہیں کرتے کہ ہم اپنے لوگوں کو کیسے متحد رکھیں اور انہیں بیرونی آدم خوروں سے کیسے بچائیں؟

جب صورت معاملہ یہ ہے تو پوچھیے کہ یہ صاحب چاہتے کیا ہیں؟ ان کے مضمون کا مرکزی خیال یہ ہے کہ وہ اظہار کی آزادی مانگتے ہیں تاکہ اسلام کو "روایتی" قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف مورچہ زن ہوسکیں۔ پہلے قدم کے طور پر وہ اسے ریاستی امور سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی شدید خواہش ہے کہ وہ دین اور سیاست میں تفریق پیدا کریں، باوجود اس امر کے کہ ریاست پاکستان اس دستوری عہد و میثاق کی پابند ہے کہ وہ اسلامی تصورات کے مطابق عادلانہ نظام قائم کرے، اور معاشرے اور افراد کی کردار سازی اسلامی قدروں کے مطابق کرے، تاکہ ایک مسلمان معاشرے کی اخلاقی جہت دنیا کے سامنے لائی جاسکے۔

اسی طرح جناب آئی اے رحمٰن اس بات کے بھی طالب ہیں کہ انہیں کھلا چھوڑ دیا جائے کہ وہ غیروں کی رضا جوئی کے لیے اپنی قوم کو اپنے دفاع سے فارغ کردیں، اور یہ سب کچھ وہ ایک ایسی بے رحم اور سنگ دل دنیا میں رہتے ہوئے کرنا چاہتے ہیں، جس پر ہوس اور طاقت حکمران ہیں۔ اس پہلو سے "آزادیٔ اظہار" کا مخصوص تصور ہمارے دشمنوں کے لیے خوشی کی نوید ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ وطن کے امن وسکون کی بربادی ہے۔ ظاہر ہے دین و سیاست کی تفریق کا مطلب اس قومی اتفاق رائے کی دھجیاں اُڑانا ہے، جو ایک مسلمان ملت کے طور پر اس کے وجود کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں کہ اس کا مطلب روایت کو تبدیل کرنا ہے۔ لیکن موصوف اپنے قاری کو یہ نہیں بتاتے کہ روایت سے ان کا مفہوم کیا ہے؟ اس طرح وہ اپنے قاری کو ابہام کے حوالے کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آزادی کا یہ تصور انہوں نے کہاں سے اخذ کیا؟ غالباً یہ مغرب کی خوشہ چینی ہے، جس کے ساتھ ہمارے یہ سیکولر یا تاریخ کے مسترد شدہ کمیونسٹ حضرات رومان میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن باوجود اس امر کے وہ مغربی فکر کے خوشہ چین ہیں، خود وہاں بھی بددیانتی کرتے ہوئے صرف اپنے مطلب کی چیز اخذ کرتے ہیں اور جہاں کسی ایسی اجازت پر قدغن لگتی ہو اس سے نظر چُرا کر نکل جاتے ہیں۔ مغربی لبرل فلسفہ کی رُو سے آزادی ہر شخص کے لیے ہونی چاہیے، تاکہ متصادم نظریات کے بیچ سے سچائی اُبھر کر سامنے آئے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ بالآخر طاقتور اور جان دار نظریہ حاوی ہوگا۔ اس پس منظر میں صداقت کا مطلب لازماً بین الموضوعی (Intersubjectivity) نہیں ہے جو عدم سے وجود میں آئے۔ بلکہ اس سے کسی پیش آمدہ مسئلے کے ضمن میں ایک روشن خیال اور سچا سمجھا نقطہ نظر سامنے آنا چاہیے، جس سے معاشرے کو تقویت ملے، نہ کہ اس کی کمزوری کا باعث بنے۔

یہ دیکھ کر ہرگز حیرت نہیں ہوتی کہ مغرب میں بہترین قانونی آرا آزادیٔ اظہار کے حق میں ہیں، لیکن چند تحفظات کے ساتھ۔ یعنی کوئی چاہے تو بے مہار آزادی کے تصورات کے ساتھ بطور تفریح کھیلتا رہے، لیکن عملی زندگی میں قانونی حدود پار نہیں کی جاسکتیں، نہ سماجی رویوں سے بے نیازی برتی جاسکتی ہے۔ یہ بات قریب قریب سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ امریکی جج برینر (Brenner) اور ریورز (Rivers) کہتے ہیں:

"کسی قوم کا دستور، آزادی کے عقیدے میں کتنا بھی بلند بانگ ہو، مگر عملاً ہر معاشرہ کھلے اظہار کو محدود کرتا ہے"۔

قانونی زبان اور مباحث میں مفاد عامہ بہ مقابل حق آزادی اظہار پرسش و تحقیق کا ایک درست اور باضابطہ گوشہ تسلیم کیا گیا ہے، اور اس حوالے سے باقاعدہ قانون سازی ہوئی ہے۔ ان میں اوّلیں اصول اور ضابطہ یہ پیش نظر ہوتا ہے کہ بے قیود اظہار رائے سے عوامی مفاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہو۔ برینر کہتا ہے:

> "کچھ کوائف کی اشاعت روکنے کے لیے حکومت کو دی جانے والی اجازت سے اگر کوئی مقصد حاصل ہوتا ہے تو اس کی بنیاد یہ دلیل ہوگی کہ باہمی موازنہ میں مفاد عامہ کو پہنچنے والا نقصان زیادہ بھاری اور قابل لحاظ ہے، بہ نسبت (امریکی دستور کی) "ترمیم اوّل" کی خلاف

ورزی کے، جو تقسیم واشاعت سے پہلے تحریر وتقریر پر پابندی کے خلاف
ضمانت مہیا کرتی ہے۔ (بالخصوص) جنگ کے دوران جب حساس
معلومات عام کرنے کا نتیجہ امریکی فوجیوں کی ہلاکت یا ہماری فوج کی
شکست کی صورت میں سامنے آنے کا خدشہ ہو تو احتیاطی قدغنوں کا
نظریہ (Doctrine) زیادہ معقول ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں یہ
نظریہ معاشرے کے خود حفاظتی نظام کا حصہ بن جاتا ہے، جو اس نے اپنی
ہی آزادروی کے آزار اور تباہی سے بچنے کے لیے وضع کیا ہوتا ہے۔"

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں آزادی اظہار کا سیاق وسباق آرٹیکل 2۔
اے اور پاکستان کے ضابطہ قانون فوجداری (PPC) کی دفعہ 123۔اے کے دائرے میں
واضح طور پر ثبت ہے، جس میں من جملہ یہ کہا گیا ہے:

"ہر گاہ کہ بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی، بہ شمول...... فکر،
اظہار، عقیدہ، ایمان، عبادت اور تلازم ورفاقت (Association)
کی آزادی، لیکن قانون اور اخلاق عامہ کا پورا لحاظ کرتے ہوئے۔
اس میں وفاق کی علاقائی سلامتی، اس کا استقلال اور اس کے حقوق بہ شمول
زمین، سمندر اور فضا پر اس کے اقتدار اعلیٰ محفوظ و مامون ہوں گے۔"

دستور کی مذکورہ آرٹیکل میں دو طرح کے تناؤ (Tensions) موجود ہیں۔ ایک
قسم کا تناؤ اظہار کی آزادی اور مملکت کی سلامتی کے درمیان ہے۔ دوسری قسم کا تناؤ اگر ایک
طرف آزادی اظہار رائے اور ملکی قانون کے درمیان ہے تو دوسری طرف عوام الناس کے
اخلاق وکردار سے ہے۔ اس کا کیا مطلب ثابت ہوا؟ یہی کہ جب دونوں میں تصادم ہو تو
مملکت، قانون اور عوام الناس کے اخلاقیات کا تحفظ پہلی ترجیح ہوگی۔

اس طرح پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 123۔اے پوری باریک بینی سے یہ طے کرتی ہے:

"کوئی بھی فرد، خواہ ملک کے اندر ہو یا باہر، کسی کو متاثر کرنے کے
ارادے سے، یا یہ جانتے ہوئے کہ وہ کسی شخص، ساری قوم یا عامۃ
الناس کے ایک حصے، ممکنہ طور پر متاثر کرلے گا۔ ایک ایسے انداز میں
جو پاکستان کی سلامتی کے خلاف تعصب یا پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کو

خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہو...... وہ بول چال یا تحریری الفاظ یا اشارے کنایے، یا کسی واضح نمائندگی سے پاکستان کی تخلیق کو جو ہندوستان کی تقسیم کا نتیجہ ہے، بُرا بھلا کہے گا، یا پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کی تخفیف یا تنسیخ کی وکالت کرے گا...... خواہ یہ ہمسایہ ریاستوں کے علاقوں میں ادغام کی بات ہو...... ایسے شخص کو دس برس قید با مشقت دی جائے گی، جرمانہ اس کے علاوہ ہوگا۔"

واضح ہو کہ اظہار کی آزادی کسی ایسے شخص کو نہیں دی جا سکتی جو دستوری پابندیوں سے پہلو تہی کرے۔ یہ ہر معاشرے کا مشترکہ خاصہ ہے۔ پاکستان مین میڈیا کو اس عمومی ضابطے سے مستثنا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے برعکس صاحب مضمون، آزادی اظہار کا نقشہ ایک ایسے خیالی معاشرہ میں کھینچتے ہیں، جس کے گرد کوئی حفاظتی باڑ نہ ہو۔ جو نہ تاریخ کا شعور رکھتا ہو، نہ اس کی اٹھان اقدار و روایات پر ہو۔ یہ ایک ایسی قوم ہو جس کے سامنے زندگی کا کوئی مطمع نظر نہ ہو اور جو بھٹکی ہوئی سرگرداں اور خود اعتمادی سے عاری قوم کی طرح اپنے وجود اور سلامتی سے بے پروا ہر زخم کھانے کے لیے تیار بیٹھی ہو۔ بالیقین موصوف کچھ ضرورت سے زیادہ تصور کیے بیٹھے ہیں۔

آزادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ کسی کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ جسے چاہے چیلنج کرتا پھرے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کوئی شخص از خود افلاطون بن کر مقام دانش و آگہی پر براجمان ہو جائے کہ اس سے کسی غلطی کا صدور ممکن نہیں اور وہ یہ فرض کر لے کہ اس کی پوری سوسائٹی جاہل اور کودن ہے۔ وہ اس قومی اتفاق (اجماع) کی بھی پروا نہ کرے کہ مملکت اپنے معاملات کس ڈھنگ سے چلائے۔

موصوف کے نزدیک اظہار کی مادر پدر آزاد روش کو اختیار کرنا لازم ہے، جو اپنے مزاج میں نراجی کیفیت ہے اور کسی ایسے معاشرے میں ہی ممکن ہو سکتی ہے جس کے منہ میں نہ دانت ہوں اور نہ اُسے اپنی سلامتی کے ماحول کی کوئی فکر ہو۔ تکلف برطرف، اس رنگ کے جاہلانہ کھوکھلا پن کا حصول اس کرہ ارض پر تو ممکن نہیں۔ وجہ اس کی بہت سادہ سی ہے کہ معاشرے کھلا کھیل کا میدان نہیں ہوتے اور نہ شخصی آزادیاں محض برائے مادر پدر آزادی کے مصداق ہوتی ہیں۔ ہر معاشرہ اس کی اجازت اس پابندی کے ساتھ دیتا ہے کہ اس کا اظہار

مخصوص سماجی رویوں اور حدود کے اندر ہوگا۔ یہ معاشرہ اپنے اخلاقیات کے بے حد محتاط اور بندھے اتباع کا مطالبہ کرتا ہے، تا کہ یہ خود تشکیک اور قنوطیت کا شکار ہو کر کمزور نہ پڑے۔ اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ معاشرہ انفرادی آزادیوں پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ یہ شوق اظہار نہ ہو تو سوسائٹی کے اہم حیاتی اعضا نگلے گا اور نہ اسے ان بنیادی اصولوں کی پٹڑی سے اتارنے کی کوشش کرے گا، جن کے صدقے میں انفرادی آزادیوں کو جواز اور وزن ملتا ہے۔

اس کے برعکس موصوف سماجی قدروں اور سلامتی کے ماحول کو ہلڑ بازی کر کے تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ اُن کو اصل دلچسپی صرف ایک بات سے ہے، اور وہ یہ کہ اپنے لیے اور اپنے ہم مشربوں کے لیے دستور سے بالاتر آزادیوں سے کھتے بھر لے، تا کہ پاکستانی قوم کا یکجا رکھنے والی بنیادوں کو تہہ و بالا کر سکیں۔ کچھ لوگ پہلے ہی سے اسلامی قوانین کو داغدار بنا کر دکھانے کے لیے میڈیا کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ آنحضور ﷺ کی ذات پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ رب العزت کو بھی نہیں بخشتے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک اسلامی قوانین ''پرانے زمانے سے متعلق''، ''سفاکانہ'' اور ''رواجوں کا مجموعہ'' تھے، اسلامی مملکت ایک ''عذاب'' تھی اور رسول خدا ﷺ محض ایک مصلح تھے۔ اسی طرح ان کے بقول قرآن کا پیش کردہ خدا معاذ اللہ ''پدرانہ'' (Patriachal) تھا۔ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف لادینوں (زنادقہ) کی یہ طیش اور ہفوات قابل فہم ہیں کہ وہ مذہب بےزار اور اباحیت پسند ہیں، لیکن جس پاکستان نے انہیں سایہ مہیا کر رکھا ہے، اس کے وجود سے کیا بغض ہے؟ پوری ڈھٹائی اور بے شرمی سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ ایک ''نمائشی مملکت'' ہے۔ انہیں پاکستان کا تشخص مصنوعی لگتا ہے اور مکرر اعلان کرتے ہیں کہ ''ہندوستان کے ساتھ کنفیڈریشن'' ان کا مطمح نظر اور ہدف ہے۔

جان ایڈمز (John Adams) جب میساچوسٹس کے دستور کے لیے ''آزاد پریس کی شق'' تیار کر رہا تھا، تو اس نے لکھا: ''پریس کی آزادی مملکت کی سلامتی کے لیے لازمی ہے''۔

اس حساس توقع کے برعکس ہمارے ہاں کے ''آزادی کے جنگ باز طلب گار'' اظہار کی کھلی آزادی چاہتے ہیں، تا کہ نہ صرف مملکت پاکستان کو ہتھیاروں سے محروم کر دیں، بلکہ اس ''روایت کو بھی بدل کر رکھ دیں'' جو پاکستان کے لیے تخلیق کا سبب تھی اور جس کے طفیل ہم آج اس مقام پر ہیں۔

یہ امر بے حد افسوسناک ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں اس سے پہلے اظہار آزادی کا

اتنا خطرناک اور بے دریغ غلط استعمال نہیں ہوا۔ مملکت کے اساسی کردار کو بدل کر رکھ دینے کی مجنونانہ کوشش میں سیکولر حلقہ آزادی اور انتشار کے باریک فرق کو بھی بُری طرح بھلا بیٹھا ہے۔

بے مہار آزادیاں چاہنے والوں کو، مَیں ایڈورڈ ڈی بون (Edward de Bone) کا قول یاد دلاتا ہوں: ''تہذیب محض آزادی سے متعین نہیں ہوتی، بلکہ کس طرح آزادی کو ذمہ داریوں، فرائض اور دردمندی سے محدود کیا جائے اور اگر یہ کافی نہ ہوں تو پھر قانون کا سہارا لیا جائے۔ جنگل آزاد ہوتا ہے، تہذیب نہیں۔''

ہمارے زمانے کے زندقہ (سیکولر) توہین رسالت قوانین سے بڑے دل برداشتہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ رسالت مآب ﷺ کی توہین نعوذ باللہ بنیادی حقوق کے زمرے میں لائی جائے اور اس طرح وہ باز پرس سے آزاد ہوں۔ لیکن برا ہو وطنِ عزیز کے ''دقیانوسی عوام'' کا کہ وہ اس ضمن میں کسی ایسے حق سے محروم رہنے کو ترجیح دیتے ہیں جس سے توہین رسالت کا پہلو نکلتا ہو۔ سیکولر حضرات کی اب تک کی کوششوں کے تین پہلو نمایاں ہیں:

اوّل: یہ کہ ایسا کوئی قانون بننے نہ دیا جائے۔

دوم: کسی نہ کسی طرح اسے کالعدم قرار دیا جائے۔

سوم: اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ایسی ترامیم قانون میں لائی جائیں جس سے اس کا اطلاق سرے سے غیر موثر ہو جائے۔

سیکولر لابی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود مندرجہ بالا اول الذکر دونوں صورتوں میں ناکام ہوگئی تو پھر وہ قانون توہین رسالت کو غیر موثر کرنے کے لیے کمربستہ ہوگئی۔ لیکن بُرا ہو ان ''جذباتی'' مسلمانوں کا کہ انہوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ انتظامیہ نے باوجود اپنی آزادروی کے اچھا کیا کہ توہین رسالت آرڈیننس میں مجوزہ ترمیم واپس لے لی۔ بظاہر تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن اپنی علامتی قدر و قیمت میں کافی وزنی ہے۔ اس نے پاکستان کے اٹھارہ کروڑ عوام کو یہ تسلی آمیز پیغام دیا کہ اسلام اس مملکت کی نفسیات میں دُور تک پیوست ہے، اور اسے ترک کرنا ملت اسلامیہ پاکستان کو ختم کرنے کے مترادف ہوگا، جس کی اجازت کبھی نہیں دی جانی چاہیے۔

ترمیم کی واپسی سے ہمارے اُن ''دانشوروں'' کو مایوسی ہوئی، جو ایک مورچہ بند انتظامیہ کی آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ان ''تاریک قوتوں'' کے منہ پر ''ناں'' کہے گی، جو وطن

عزیز میں اسلامی تصورات اور روایات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ کچھ اور حضرات جنہوں نے اپنے ذہن میں موجودہ حکمرانوں کو سخت گیر آزاد خیال سمجھا ہوا تھا اور جو ان کے خیال میں سماوی قدروں کے مخالف تھے اور واقعتاً ہیں، ان کے منہ لٹک گئے، کیونکہ جو وہ چاہتے تھے، وہ نہ ہوا۔ اُن کے سوچے سمجھے خاکے بے رنگ رہے۔

فلسفیانہ سطح پر بھی سیکولر نظریے کو دو حوالوں سے جھٹکا لگا:

اوّل، سیکولروں کی اولین خواہش یہ ہے کہ ریاست کا دین سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ سوسائٹی اپنا استناد دینی جوہر سے نہ پائے، نہ اس کی تعریف دینی نظریے کے تحت متعین ہو۔ اس لحاظ سے کوئی بھی اسلامی حوالہ ان کے نزدیک خطرناک ہے، کیونکہ اس کا مطلب قومی تشکیل میں دین کا کردار تسلیم کرنا ہے۔ اس انداز سے دیکھیں تو مملکت اور دین کی جدائی آزاد خیالوں کے لیے بنیادی تزویراتی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ ایک دفعہ یہ تفریق بروئے کار آجائے تو پھر مسلم عوام اس سیکولر اقلیت کے سامنے بے بس کھڑے ہوں گے، جو انہیں اپنی دشنام طرازی کا نشانہ بنائے گی، اور اس طرح ان کی اخلاقی اور روحانی قدروں کی پامالی کا سلسلہ تیز تر ہو جائے گا۔ توہین رسالت کے سابقہ قانون کا باقی رکھنا لادینوں کے لیے تشویشناک یاد دہانی ہے کہ جب سیکولر خواص سب حوالوں سے برتر حوالے محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات کے ساتھ الجھنے کی کوشش کریں گے تو سوسائٹی کی طرف سے جوابی اقدام بھی ہوگا۔

انتظامیہ کے توہین رسالت قانون میں مجوزہ قواعد وضوابط کی ترمیم واپس لینے کے فیصلہ نے اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ اسلام ایک اجتماعی ضرورت ہے جو ریاست اور نظریے کی مصنوعی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ نیز یہ کہ جب معاملہ پیغمبرؐ خدا کے مقامِ احترام کا ہو تو طاقتور اور کمزور، امیر اور غریب غرض ملک کی اکثریت کے جذبات ایک سے ہوتے ہیں۔ اس صورتحال نے بے چارے لادینوں کو وہیں واپس دھکیل دیا جہاں سے وہ چلے تھے۔

دوم، لادینوں کا تکیہ بدلتے موسموں پر تھا، جو سیکولر تعلیم اور الیکٹرانک میڈیا کا ثمر ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان اور اسلام کے متعلق غیر دوستانہ بین الاقوامی ماحول، توہین رسالت کے قانون کی تنفیذ کو معرض التوا میں ڈالنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ان کے ایکشن پلان کی کامیابی کے لیے اس امر کی بے حد اہمیت تھی، کیونکہ ایک بار وہ توہین رسالت کے

قانون کو شکار کر لیں تو ان کے لیے آسانی پیدا ہو جاتی کہ وہ آزادی اظہار کی دہائی دیں اور ہر اس سماجی اور اخلاقی قدر کی بیخ کنی کر دیں، جس نے ہماری قوم کو جوڑ رکھا ہے۔ کچھ لوگ اس بدقسمت مہم میں پہلے سے جُتے ہوئے ہیں کہ اسلامی قوانین، نبی اکرم ﷺ، یہاں تک کہ ذات باری تعالیٰ کو بھی بدنام اور رُسوا کیا جائے۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلامی قوانین ''ازمنۂ وسطیٰ سے متعلق''، ''وحشیانہ'' اور ''رواجی'' ہیں۔ اسلامی مملکت کو یہ لوگ ''پھٹکار'' سمجھتے ہیں، حضور نبی کریم ﷺ کو محض ''مصلح'' قرار دیتے ہیں اور قرآن کے پیش کردہ خدا کو ''پدرانہ'' سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں اس سے پہلے آزادی اظہار کا اتنا بے قید اور بے دریغ استعمال نہیں ہوا تھا۔ ہماری قومی خصوصیت کو کچھ اور شکل دینے کی مجنونانہ کوشش میں لادین حضرات آزادی اور انارکی کے نزدیک فرق کو بالکل بھول جاتے ہیں۔

بہر کیف، آرا و نظریات کی اس کشمکش میں رسول اللہ ﷺ کی ذات اور مرتبے کی حفاظت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اسلامی نظریے کے علمبردار کہتے ہیں کہ اسلام جو کچھ بھی کہتا یا چاہتا ہے، اس میں حضرت محمد ﷺ کا مقام مرکزی ہے۔ تحقیر اور طنز کے ذریعہ حضور نبی کریم ﷺ کی گرفت مسلمانوں پر سے کمزور پڑ جائے تو خود اسلام کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں لبرل روایت کا خیال ہے کہ افراد اور سوسائٹیوں کو مذہبی قیود اور اثرات سے آزاد کر دیا جائے کہ انسانی تاریخی فکر، اداروں اور افراد پر کسی طرح کی پابندی خواہ کتنی ہی ضروری ہو، رجعت پسندی ہے۔ اسی طرح ان کے نزدیک اسلام کے اجتماعی اظہار میں، انہیں ایک مذہبی ریاست کی بو آنے لگتی ہے۔ پس جب سیکولر کسی قانون کو رجعت پسندانہ کہتے ہیں یا اسے غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف قرار دیتے ہیں، تو یہ دراصل ان کی سیکولر روایت کا اظہار ہوتا ہے۔

چنانچہ ظاہر بات ہے کہ اس مناظرے میں لبرل آواز اگرچہ کافی کرخت اور بلند آہنگ ہے، لیکن ایک آوارہ للکار سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتی۔ پاکستان کا سوادِ اعظم یہ پختہ عقیدہ رکھتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے لیے ان کی محبت اور عقیدت ان کی زندگی میں ایسی بنیادی حیثیت رکھتی ہے، جیسی محبت آپ ﷺ اپنی حیات مبارکہ میں اس امت کے لیے رکھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اس امت کی سلامتی، ان کے عزت، وقار اور ان کی ترقی اور سرفرازی کے لیے دعا کی کہ یہ امت عالم انسانیت کے لیے عدل و انصاف کی علمبردار ہو۔ چنانچہ منطق بڑی سادہ اور قابل فہم ہے۔ ہمیں جو کچھ بھی ملا، خواہ یہ بحیثیت مسلمان اور انسان

اپنے شرف کا احساس ہو یا اللہ کی ذاتِ بابرکات کا ادراک، یہ سب کچھ انہی کی عطا ہے۔ ہم جب زمین کے بے مایہ خس و خاشاک سے زیادہ کچھ نہ تھے تو انہوں نے 1400 برس پہلے ہمیں دنیا کی سب سے بڑی مہذب طاقت بنا دیا تھا۔ نوع انسانی کی تاریخ میں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ آنحضور ﷺ نے تو اپنے پر بھیجے جانے والے درود و سلام میں بھی ہمیں یاد رکھا اور اسے سب مومنین تک وسعت دے دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کروڑوں مسلمان روزانہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ یہ اجتماعیت اور ایک ملت ہونے کا احساس مسلمانوں کا امتیازی وصف ہے۔ چنانچہ جو رسول اللہ ﷺ کی توہین کا ارتکاب کرتا ہے، وہ دراصل پوری امت کی توہین کرتا ہے۔

لیکن سیکولر حضرات کو حضور نبی کریم ﷺ اور ان کی امت کا ان سے گہرا قلبی تعلق محسوس ہی نہیں ہوتا، حالانکہ یہ رشتہ بہت مقدس، گہرا اور بے حد جذباتی نوعیت کا ہے۔

اسلامی نکتۂ نظر کے حاملین بجا طور پر یہ کہتے ہیں کہ اقلیتوں کا معاملہ ضرورت سے زیادہ اُچھالا جا رہا ہے، اور اسے سیکولر حلقہ اغیار کے روبرو بڑی چالاکی اور چابک دستی سے استعمال کر رہا ہے۔ عیسائی اقلیت کے دوست خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہ السلام سے کتنی محبت ہے۔ بلکہ کوئی شخص مسلمان رہ ہی نہیں سکتا اگر وہ انبیائے بنی اسرائیل میں سے کسی کا بھی انکار کر دے۔ اندریں حالات مسلمان بھی دوسروں سے جوابی احترام کی توقع کرتے ہیں۔ توہین رسالت کے بدقسمت معاملے میں بھی ان کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ شکایت کا فیصلہ قانون کی عدالت کرے۔ اگر معاملہ ضلعی سطح کے کسی افسر کے سپرد ہوگا تو یہ عدلیہ کی توہین بھی ہوگی اور اس کی دیانت پر شبہ کا اظہار بھی۔

ایسے معاشرے میں کیا تہذیب اور انسانیت نوازی ہوگی کہ جس میں دوسروں کی توہین برداشت کی جاتی رہے، خواہ وہ کسی عام شہری ہی کی توہین کیوں نہ ہو؟ آخر مملکت اور معاشرے کو یکجا رکھنے کی صورت کیا ہوگی؟ کیا عدم اطمینان پھیلا کر، لوگوں کے جذبات و احساسات مجروح کر کے اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر کے یکجہتی کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ توہین رسالت کے معنی و مفہوم دینی قدروں سے ہی ماخوذ ہیں، لیکن سماجی حوالے سے یہ ایک دنیاوی مسئلہ بھی ہے، کیونکہ اس کے قانونی اور امن و امان سے متعلق مضمرات ہیں۔

یہاں توہین رسالت کے حوالے سے مغرب کے طرز عمل پر نگاہ ڈالنا ہمارے موضوع سے متجاوز نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں اینگلوسیکسن روایت کو دیکھنا بھی اہم ہے، کیونکہ پاکستانی لادینیوں کی مہربانی سے مغرب کو بھی اس معاملے میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔

میں اس سلسلے میں برطانیہ کے "میری وہائٹ ہاؤس بنام گے نیوز" کیس پیش نظر رکھوں گا۔ 1977ء میں "گے نیوز" (Gay News) نے ایک مصور تشریحی نظم شائع کی، جس میں (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہم جنس زدہ دکھایا گیا تھا۔ مقدمے میں پبلشر کو دو کے مقابلے میں دس ججوں نے مجرم قرار دیا۔ اپیل میں بھی تین اور دو کی اکثریتی رائے نے فیصلہ برقرار رکھا۔

اس کیس میں ارادے اور جذبات کو مجروح کرنے کے دونوں پہلو زیر بحث رہے کہ یہی دو سوال ہمارے ہاں کے لادین بھی اٹھاتے رہے ہیں۔ قانونی کیس کا حوالہ دے کر کوئین یونیورسٹی بلفاسٹ کے شعبہ فقہی امور کے پروفیسر سائمن لی (Simon Lee) کا کہنا تھا:

> "جج صاحبان کے سامنے سوال یہ تھا کہ آیا ہتک و توہین کا جرم اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کی پشت پر ایک ارادہ ہو جو صدمے کی کیفیت کو جنم دے اور عیسائی عوام میں غصے اور آزردگی کا باعث بنے۔ یا جرم یہ بھی ہوگا کہ محض ایک نظم کی اشاعت کا ارادہ تھا جس کے مذکورہ اثرات تو ہوئے جبکہ پبلشر کا مقصد دوسروں کو مشتعل کرنا نہ تھا"۔

فیصلے میں کہا گیا کہ اگر کسی کے جذبات مجروح کرنے کا ارادہ نہ بھی ہو، لیکن اس کی اشاعت سے لوگ مشتعل ہو گئے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

سائمن لی کے بقول لارڈ سکارمین (Lord Scarman) کا اس قانونی نکتہ پر اظہار رائے "منصفانہ حد تک کافی مشہور و معلوم" ہے، کیونکہ موصوف برطانوی ججوں کے حلقے میں بہت زیادہ آزاد خیال مانے جاتے ہیں اور بائیں بازو کے بہت پسندیدہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "مائی لارڈز! میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ توہین و ہتک کے عام قانون کا جرم قانونی نظام میں کوئی مفید خدمت انجام نہیں دیتا۔ اس کے برعکس میں سمجھتا ہوں کہ یہ قانون سازی کا ایک کیس بنتا ہے، جس کا دائرہ غیر عیسائی آبادی کے مذہبی عقائد اور جذبات کے تحفظ تک

وسیع کیا جائے۔ اس جرم کا تعلق ان فوجداری جرائم کے گروپ سے ہے، جن کی تشکیل و تسوید برطانوی مملکت کے امن وسکون کے تحفظ کے لیے کی گئی ہے۔ ایک روز افزوں ہم رنگ عقائد ونظریات کے حامل معاشرے میں، جیسا کہ جدید برطانوی معاشرہ ہے، یہ لازم ہے کہ نہ صرف سبھی اختلافی مذہبی عقائد، محسوسات اور طور طریقوں کو احترام دیا جائے بلکہ انہیں فحش گوئی و بدکلامی، تذلیل ورسوائی اور تحقیر و توہین سے بھی بچایا جائے۔"

اس مذکورہ متن میں ایک بہت ہی آزاد خیال جج توہین رسالت کے قوانین کی پاسداری پر زور دے رہا ہے، کیونکہ بقول اس کے: اس سے اس کی قوم کے امن وسکون کی حفاظت ہوگی۔ کیا مسلم ملت کے لیے اس سے بڑھ کر بھی عدم استحکام کا باعث کوئی عامل ہوسکتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کی عزت واحترام کی حفاظت کا انتظام نہ ہو؟

محمد عطا اللہ صدیقی

آزادیٔ رائے، مسلم دنیا کے خلاف نیا استعماری ہتھیار

جس طرح حضور اکرم ﷺ کی تکریم بنی نوع انسانی کی تکریم ہے۔ اسی طرح ان کی توہین (معاذ اللہ) انسانیت کی توہین ہے۔ انسانیت کے عظیم ترین محسن کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت کے بغیر انسانی حقوق کا کوئی بھی چارٹر ایک مہمل دستاویز سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

انسانی حقوق کے حوالے سے ''آزادیٔ ضمیر''، ''آزادیٔ عقیدہ'' اور ''آزادیٔ رائے'' جیسی اصطلاحات کا بہت کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان خوش کن تراکیب کی من مانی تعبیرات کے ذریعے اسلام اور شارع اسلام ﷺ پر ناروا تنقید کے جواز مہیا کیے جاتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی دفعہ 18 اور 19 میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''ہر شخص کو آزادی خیال، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ مذہب کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں اپنا مذہب اور عقیدہ تبدیل کرنے اور انفرادی و اجتماعی طور پر علیحدگی میں یا سب کے سامنے، اپنا مذہب یا عقیدے کی تعلیم، اس پر عمل کرنے، اس کے مطابق عبادت کرنے اور اس کی پابندی کرنے کی آزادی کا حق شامل ہے۔'' (شق نمبر 18)

''ہر شخص کو آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں بلا مداخلت رائے رکھنے کی آزادی اور بلا لحاظ علاقائی حدود کسی بھی ذریعے سے اطلاعات اور نظریات تلاش کرنے، حاصل کرنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کی آزادی شامل ہے۔'' (شق نمبر 19)

مندرجہ بالا شقیں بہت واضح ہیں، ان کا کوئی بھی جملہ قانون توہین رسالت سے متصادم یا متعارض نہیں ہے۔ پاکستان میں مسیحی برادری کو اپنے ضمیر اور مذہب کے اظہار کی مکمل آزادی ہے۔ ''آزادیٔ رائے'' میں جہاں معقول اور صائب طریقے سے اپنا مافی الضمیر بیان

کرنے کی مکمل آزادی ہے وہاں اس اصطلاح کے دائرہ کار میں کسی دوسرے انسان کی کردار کشی، گالی گلوچ، توہین، دل آزاری یا سب وشتم ہرگز شامل نہیں ہے۔ جب ''آزادی رائے'' کے حق کو کسی دوسرے انسان کی تذلیل تک توسیع نہیں دی جا سکتی تو پھر اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ''توہین رسالت ﷺ'' کے استحقاق کا دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ انسانی حقوق کے انتھک منادوں کے لیے یہ ایک کھلا چیلنج ہے کہ وہ ثابت کریں کہ قانون توہین رسالت انسانی حقوق کے منافی آخر کس طرح ہے؟

انسانی حقوق کا چارٹر 1948ء میں پیش کیا گیا۔ بعد میں جنیوا کنونشن وغیرہ بھی سامنے آئے۔ کسی بھی دستاویز میں توہین رسالت کے خلاف سزا کو انسانی حقوق کے منافی قرار نہیں دیا گیا۔ درحقیقت Blasphemy (توہین رسالت) اور انسانی حقوق کا ربط اس وقت جوڑا گیا جب شاتم رسولؐ سلمان رشدی ملعون کی ''شیطانی آیات'' پر مسلمانوں نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا۔ سلمان رشدی نے اس سے پہلے بھی دو ناول تحریر کیے تھے لیکن اس کو وہ پذیرائی نہ ملی تھی۔ لیکن اس کے شیطانی ناول کے حقوق پلک جھپکتے ہی کروڑوں میں بک گئے۔ اس ناول میں ملعون رشدی کی ناپاک تھوتھنی سے خیر البشر ﷺ کے منزہ و پاکیزہ گھرانے پر زہر افشانی کرائی گئی تھی۔ مغرب کی ایک مخصوص صہیونی و عیسائی لابی آج بھی پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے مقدس گھرانے کے خلاف گستاخانہ جسارتوں پر مریضانہ حظ اٹھاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مغرب اپنی تمام تر روشن خیالی اور سیکولرازم سے وابستگی کے باوجود مسلمانوں کے خلاف صلیبی دور کا بغض اور کینہ اب تک پال رہا ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف توہین آمیز سازشوں کی نئی تحریک ننگ اسلام بے دین ''مسلمانوں'' کے ذریعے سے برپا کی جا رہی ہے جس کے مہرے سلمان رشدی، بنگلہ دیشی تسلیمہ نسرین جیسے لوگ ہیں۔ ان کی تمام تر شیطانی ہرزہ سرائیوں کو ''انسانی حقوق'' کا نام دے کر تحفظ دیا جا رہا ہے۔ ''انسانی حقوق'' کے لبادے میں مسلمانوں سے ''شیطانی حقوق'' کو تسلیم کرانے کی مہم زوروں پر ہے۔ ''انسانی حقوق کے چارٹر'' کو انسانیت کا ''متفق علیہ مذہب'' بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مسلم دنیا کے خلاف نیا استعماری ہتھیار ہے جسے بے حد مکاری اور منافقت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

محمد متین خالد

آزادیٔ اظہار، اسلام کے خلاف مغرب کا فکری حربہ

افغانستان میں روس کی عبرتناک شکست کے بعد امریکہ ایک سپر پاور کے طور پر دنیا کے نقشہ پر ابھرا۔ اس کے مدمقابل بظاہر کوئی ایسی قوت نہیں جو اس کی طاقت کے نشے میں بے لگام سرگرمیوں کے سامنے مزاحمت کر سکے۔ اس لیے اس کی طرف سے پوری دنیا میں اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے "نیو ورلڈ آرڈر" (New World Order) کا اعلان کیا گیا۔ اس نئے حکم کے بین السطور امریکہ نے پوری دنیا کو بالعموم اور عالم اسلام کو بالخصوص دھمکی دی کہ وہ اس کے ہر حکم کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر لے، ورنہ وہ مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب آج بھی اسلام ہی کو اپنا حریف اور دشمن سمجھتا ہے۔ سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر (Henry Kissinger) نے کہا تھا کہ اگلی صدی عیسائیت اور اسلام کی باہمی چپقلش کی صدی ہے۔ 1987ء میں سابق امریکی صدر مسٹر رچرڈ نکسن (Richard Nixon) نے اس وقت کے امریکی صدر رونالڈ ریگن (Ronald Reagan) اور روسی قیادت کو ایک مشترکہ کھلا خط لکھا تھا کہ امریکہ اور روس آپس میں لڑنا چھوڑ دیں۔ ان کا اصل دشمن اسلام ہے۔ ان کی لڑائی سے فائدہ اسلام کو پہنچے گا۔ معروف امریکی مفکر سیموئل پی ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington) نے بھی اپنے مشہور مقالے "تہذیبوں کا تصادم" (The Clash of Civilizations) میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ مستقبل میں مغربی تہذیب کا تصادم اسلام سے ہوگا کیونکہ یہ امریکہ کے لیے خطرناک اور ناقابل برداشت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سپین میں مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہاں پے در پے توہین رسالت ﷺ کے واقعات پر مسلمانوں نے اپنا ردعمل ظاہر کرنا چھوڑ دیا تھا جن کی سزا انہیں یہ ملی کہ وہ اس خطہ سرزمین پر حکمرانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ 1933ء میں کانگریس کے ایک لیڈر پانیکر (Panikkar) نے ایک کمیشن قائم کر کے سپین

بھیجا تھا کہ وہ ان حالات اور واقعات کا مطالعہ کر سکے جن کی وجہ سے سات سو سال تک اندلس پر شان وشوکت سے حکومت کرنے کے باوجود سپین سے مسلمانوں کا بیج تک ختم ہو گیا۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں توہین رسالت ﷺ کے واقعات پر ماضی کے برعکس مسلمانوں کی بے حسی، بے حمیتی اور غیرت وحمیت کے فقدان کو ان کے زوال کا خصوصی سبب قرار دیا تھا۔ اس رپورٹ کی روشنی میں اب مغرب پوری دنیا میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت توہین رسالت ﷺ کے واقعات دہرا رہا ہے۔

علامہ محمد اسدؒ "اسلام دوراہے پر" میں لکھتے ہیں:

"یورپ کا رویہ اسلام کے بارے میں اور صرف اسلام ہی کے بارے میں، دوسرے غیر مذاہب اور تمدنوں سے بے تعلقی کی ناپسندیدگی ہی نہیں بلکہ گہری اور تقریباً مجنونانہ نفرت پر مبنی ہے، یہ محض ذہنی نہیں ہے بلکہ اس پر شدید جذباتی رنگ بھی ہے۔ یورپ بدھشت اور ہندو فلسفوں کی تعلیمات کو قبول کر سکتا ہے اور ان مذہبوں کے متعلق ہمیشہ متوازن اور مفکرانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے، مگر جیسے ہی وہ اسلام کے سامنے آتا ہے، اس کے توازن میں خلل پڑ جاتا ہے اور جذباتی تعصب آ جاتا ہے۔ بڑے سے بڑے یورپی مستشرقین بھی اسلام کے متعلق لکھتے ہوئے غیر معقول جانبداری کے مرتکب ہوئے ہیں اور وہاں ہمیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کی بالکل مسخ شدہ تصویر ملتی ہے۔"

صاحبان علم ودانش کا کہنا ہے کہ مغرب، دین اسلام کے حوالے سے احساسِ کمتری اور خوف کا شکار ہے۔ اپنی عالمگیر سچائیوں کی بدولت دین اسلام مغرب کے ہر گھر پر ہی نہیں، ہر دردل پر بھی دستک دے رہا ہے اور خوشبو کی طرح پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ نومبر 2012ء میں ویٹی کن میں عالمی مجلس کلیسا کے ایک اہم اجلاس میں مصدقہ اعداد وشمار کے مطابق اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ نے دنیا بھر کے پادریوں کے ہوش اڑا دیے ہیں۔ تصدیق شدہ تجزیوں کی روشنی میں آئندہ چار دہائیوں کے بعد مغرب کے کئی ممالک میں دین اسلام اکثریت والا دین بن جائے گا۔ اپنے عقائد ونظریات کے دفاع کے لیے پڑھے لکھے مغرب کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ظاہر ہے جب آدمی دلیل وبرہان کے میدان میں شکست کھا جاتا ہے تو ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے، پھر "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مصداق جھوٹ اور سب وشتم پر اتر آتا ہے۔ یہ علمی اور نفسیاتی شکست خوردگی کی واضح علامت ہے۔ یاد رہے موجودہ عیسائیت کے بانی پولوس

ساؤل نے اپنے مذہب کی اشاعت کی خاطر جھوٹ کو جائز قرار دیا ہے۔اس نے رومیوں کے نام ایک خط میں لکھا: ''اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی، اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر میں گنہگار کیسے ہوں؟ ہم برائی سے بھلائی پیدا کرتے ہیں''۔ (7:3) بقول نطشے: ''یہودیوں اور عیسائیوں نے جھوٹ بولنا صحیح سمجھ لیا تو اس جھوٹ کو آزادی رائے بتلایا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ شر سے کبھی بھی خیر حاصل نہیں ہوتا''۔ لہٰذا اب امریکی ومغربی حکام، دانشوروں، میڈیا اوران کے تھنک ٹینکس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ آزادیٔ اظہار کے نام پر مسلمانوں کی محبوب ترین شخصیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی توہین کریں گے، اسلامی شعائر اور تعلیمات کا تمسخر اُڑائیں گے، مقدس اسلامی مقامات کی تضحیک کریں گے، الہامی کتاب قرآن مجید کی بے حرمتی کریں گے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بے ہودہ ولغو کتابیں منظر عام پر لائیں گے، نازیبا خاکے شائع کریں گے، شرمناک فلمیں بنائیں گے اور دنیا بھر میں مسلمانوں کو تیسرے درجے کا شہری قرار دلائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ان بزرجمہروں کو معلوم نہیں کہ ان گھٹیا حرکات سے دین اسلام کی جولانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس ان کا اپنا ہی خبث باطن دوسروں کے سامنے آشکار ہو جاتا ہے۔ ایسی گھٹیا اور مذموم حرکتیں دین اسلام کا راستہ نہیں روک سکتیں بلکہ یہ دین اپنی آفاقی سچائیوں کے سبب تیزی سے بلندی کی منازل طے کر رہا ہے۔

اسلام رواداری، برداشت، امن اور محبت کا درس دیتا ہے۔ وہ ہر قسم کی دہشت گردی کی سختی سے مذمت اور مخالفت کرتا ہے۔ مغرب اسلام کی آفاقی تعلیمات کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔ اب اس کی تمام تر توانائیاں محض اس بات پر صرف ہو رہی ہیں کہ مسلمانوں کو پوری دنیا میں دہشت گرد قرار دے دیا جائے۔ حالانکہ ان سے پوچھنا چاہیے! پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی؟ دوسری جنگ عظیم کس نے شروع کی؟ آسٹریلیا میں 2 کروڑ سے زائد قدیم قبائلی باشندوں (Aborigines) کا قتل کس نے کیا؟ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کس نے گرائے؟ 18 کروڑ سے زائد افریقیوں کو کس نے سالہا سال تک غلام بنائے رکھا، جس میں سے 88 فیصد کو مر جانے کے بعد بحر اوقیانوس میں پھینک دیا گیا؟ کس نے شمالی امریکہ میں 10 کروڑ سے زائد انڈینز قتل کیے؟ کس نے جنوبی امریکہ میں 5 کروڑ انڈینز کو ہلاک کیا؟ کس نے ویت نام، عراق اور افغانستان پر بلاوجہ جنگ مسلط کی؟ مغرب کبھی ان

سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔

بقول حافظ شفیق الرحمٰن: ''امریکہ اور یورپ کو آخر کس چیز پر ناز ہے؟'' بیس لاکھ سالانہ حرامی بچوں پر، پچیس لاکھ سالانہ بن بیاہی ماؤں پر، پندرہ لاکھ سالانہ مطلقہ عورتوں پر، ہیروشیما کے ویرانوں پر، ناگاساکی کے کھنڈرات پر، فلوجہ کے ویران گلی کوچوں پر، قندھار کے اجڑے درو بام پر، ویٹو کے امتیازی حق پر، ہائی سکولوں کی 86% ٹین ایجز حاملہ طالبات پر، عراق میں سویلین آبادی کو بطور جنگ فاقوں میں مبتلا کرنے پر، ویتنامیوں کے اجتماعی قتل پر، کمزور ملکوں کی بحری اور معاشی ناکہ بندی کرنے پر، لاکھوں شیر خوار بچوں کے منہ سے فیڈر چھین لینے پر، ماؤں کے پیٹوں میں پلنے والے معصوم بے گناہ بچوں کے خلاف بیالوجیکل وار شروع کرنے پر، چلی میں رات کے سناٹے میں بندوقوں کی چھاؤں تلے جمہوریت کی دیوی کی پرورش پر، کوریا اور ویتنام کی جنگوں میں اپنے چھ لاکھ فوجیوں کو ہلاک کروانے اور دو لاکھ کو لولا لنگڑا بنانے پر، لاس اینجلس میں پچھتر ہزار اور کیلی فورنیا میں پانچ لاکھ شہریوں کی اجتماعی خود کشی پر، کیا یہی تمدن ہے۔ یہی تہذیب ہے، یہی روشن خیالی ہے یہی ثقافتی عروج ہے۔ یہی مکینکی مہارت ہے، یہی جمہوریت ہے؟ یہی آزادی اظہار ہے؟''

انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے مغرب کے اپنے پیمانے اور دوہرے معیارات ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے نہایت متعصبانہ رویہ رکھتا ہے مثلاً اگر کوئی غیر مسلم غلط کام کرے تو اسے جرم (Crime) کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور اگر وہی کام کسی مسلمان سے سرزد ہو جائے تو اسے دہشت گردی (Terrorism) سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ جب ایک یہودی لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ اس کے مذہب کا حصہ ہے، لیکن ایک باریش مسلمان کو انتہا پسند اور دہشت گرد گردانا جاتا ہے۔ کوئی سکھ پگڑی پہنے تو اسے تہذیب کی علامت کہا جاتا ہے اور اگر کوئی مسلمان عمامہ پہنے تو اسے شدت پسندی کی علامت گردانا جاتا ہے۔ ایک عیسائی راہبہ (Nun) جب اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خداوند کے لیے وقف کر دیا ہے۔ لیکن جب ایک مسلمان خاتون سکارف لیتی ہے تو مغرب اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عیسائی مرد و عورت اگر صلیب (✞) کا نشان گلے میں ڈال کر سرعام پھریں یا سینے پر کراس بنانے کے لیے انگلیاں گھمائیں تو اسے ہرگز ناروا نہیں سمجھا جاتا لیکن ایک مسلمان کو دینی وشرعی صورت اور اعمال پر معترضہ قرار دیا جاتا

ہے۔ چرچ کی عمارت پر گھنٹیاں بجیں تو درست ہیں، مگر مسجد سے اذانوں کی آوازیں بلند کی جائیں تو اسے سماعت پر بوجھ اور نیند کش کہا جاتا ہے۔ جب ایک مغربی عورت ملازمت کرنے کے بجائے اپنے خاوند اور بچوں کی خاطر ایک گھریلو عورت کا کردار ادا کرتی ہے تو پورا معاشرہ اس کی تحسین کرتا ہے کہ اس نے اپنے گھر کے لیے خارجی زندگی کی قربانی دی ہے مگر جب ایک مسلمان عورت ایسا کرتی ہے تو اس پر زبردست تنقید ہوتی ہے کہ اسے گھٹن کے ماحول سے باہر نکلنا چاہیے کیونکہ اسے آزادی کی ضرورت ہے۔ مغرب میں نوجوان لڑکی کو مکمل آزادی اور حقوق حاصل ہیں کہ وہ یونیورسٹی یا کالج میں اپنی مرضی کا لباس پہنے، چہرے اور بازوؤں پر نقش و نگار (Tattoo) بنوائے حتیٰ کہ وہ سمندر کے کنارے گھنٹوں برہنہ دھوپ سینکے، لیکن جب ایک مسلمان لڑکی حجاب پہن کر کالج جاتی ہے تو اس کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔ "Free to bare but not to cover" یعنی وہاں ننگا ہونے کی تو آزادی ہے لیکن پردے پر پابندی ہے۔ اسرائیل کا طالب علم اگر فوجی ٹریننگ لے تو یہ اُس کے ذاتی دفاع کی تیاری کہلواتا ہے، اس کے برعکس اگر کوئی مسلم طالب علم اپنی حفاظت کے لیے پتھر اٹھاتا ہے تو اُسے انتہا پسند کہا جاتا ہے۔ امریکہ، اسرائیل، نیٹو، بھارت اور برما کی ظالم حکومتیں روزانہ مسلمانوں کو موت کی نیند سُلا دیں تو یہ "امن کی جنگ" کہلواتی ہے، اس کے برعکس اگر کوئی مسلمان اپنے جائز حق کی خاطر کفر کے سامنے ڈٹ جائے تو اُسے باغی قرار دے دیا جاتا ہے۔ مغرب میں جب ایک بچہ کسی خاص موضوع کے لیے خود کو مخصوص کر دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ اس کی ذہانت اور Potential کا بین ثبوت ہے لیکن جب ایک مسلمان بچہ خود کو اسلام کے لیے وقف کر دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا مستقبل اور کیریر تباہ کر لیا ہے۔ عقل سے عاری کوئی ناکارہ پادری اسلام کے خلاف زہر آلود بیانات، تشدد آمیز رویوں اور اہانت آمیز گستاخانہ نظریات کا پرچار کرے تو اس کو آزادیٔ اظہار کے نام پر آئینی تحفظ کی دیوار کے پیچھے چھپا کر بچا لیا جاتا ہے لیکن جب ایک مسلمان امریکہ کی اسلام دشمن پالیسیوں پر محض زبانی تنقید کرتا ہے تو اسے نفرت پھیلانے کے جرم (Hate Crime) میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ امریکہ یا مغربی ممالک میں پادریوں کی طرف سے قرآن مجید نذرِ آتش کیا جائے تو یہ فردِ واحد کا فعل گردانا جاتا ہے اور اگر کوئی مسلمان پاکستان میں امریکی جھنڈا جلا دے تو امریکی میڈیا پورے پاکستان کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے، جب ایک یہودی کسی کو قتل کرتا ہے تو

یہ اس کا ذاتی فعل قرار دیا جاتا ہے، اس کے برعکس جب ایک مسلمان اپنے بچاؤ میں کسی کو مار ڈالتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایسا کیا ہے۔ جب کوئی یہودی کسی کی خاطر خود کو تیاگ دیتا ہے تو ہر شخص اس کے کردار کی تعریف کرتا ہے لیکن جب کوئی فلسطینی مسلمان اسرائیلی فوج سے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے ایسا کرتا ہے تو اس کے بھائیوں کے بازو توڑ دیے جاتے ہیں، اس کی والدہ کی عزت لوٹ لی جاتی ہے، اس کے گھر کو تباہ کر دیا جاتا ہے اور اسے دہشت گرد قرار دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹارچر سیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مغرب کو یہ زعم ہے کہ وہ انتہائی تہذیب یافتہ اور رواداری کا عالمی چیمپئن ہے۔ ان دو غلے اور دوہرے معیار اور سلوک کی نہ جانے کتنی مثالیں ہیں جو ان ملکوں میں نمایاں نظر آتی ہیں جو انسانی آزادی، انسانی حقوق اور آزادی اظہار کے علمبردار کہلاتے ہی نہیں، دعویدار بھی بنتے ہیں۔

بقول شخصے: ''آزادی کے حوالے سے یہ بنیادی بات کبھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ جب تک حاصل نہ ہو انسان کا حق رہتی ہے، حاصل ہو جائے تو یہ آزادی سب سے بڑی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ آزادی انسان کی امتیازی صفت بھی ہے اور اس کی سب سے بڑی آزمائش بھی۔ آزادی محض ایک لفظ نہیں ہے، زندگی کا ایک رجحان ہے۔ غلامی میں طاقتور انسان کمزور پر پابندیاں لگاتا ہے، آزادی میں انسان خود اپنے اوپر پابندیاں لگاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انسان کی آزادی، اس کے شعور کی بیداری سے وابستہ ہے اور اس حقیقت کے پیش نظر ختم نبوت کا اعلان اجتماعی طور پر پوری نسل انسانی کے باشعور ہونے کا اعلان بھی ہے۔ اسلام نے انسانی شعور کو اعلیٰ انسانی اقدار سے مربوط کر دیا ہے اور انہی اقدار کی روشنی میں انسانی معاشرے میں فکر وعمل کی حدود کا تعین بھی ہوتا ہے۔ اسلام آزادی کا دین ہے، اس لیے آزاد انسانوں کا دین ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ''بے شک ہم نے بنی آدم کو درجۂ تکریم عطا کیا ہے۔ انہیں خشکی اور سمندر میں سواریاں عطا کی ہیں۔ ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر ان کو نمایاں فوقیت بخشی'' (بنی اسرائیل:70) اسلام نے انسان کو تکریم کا رتبہ دیا ہے اور تکریم میں آزادی بہر حال شامل ہوتی ہے۔ آزادی سے نسل انسانی کی وحدت کا شعور بھی وابستہ ہے۔ خطبۂ حجۃ الوداع خود اپنی جگہ حقوق انسانی کا عالمگیر منشور ہونے کی وجہ سے اسلام اور آزادی کے باہمی ربط کی بھرپور

وضاحت کرتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں آزادی کی حفاظت کے لیے اسلام میں حقوق سے زیادہ فرائض پر زور دیا گیا ہے، فرائض ادا ہوتے رہیں تو حق تلفیوں کے امکانات اسی نسبت سے کم ہو جاتے ہیں۔ قانون کی بالادستی، آزادی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اسلامی نظام میں قانون کی مکمل بالادستی کا ثبوت اس آیہ مبارک میں موجود ہے جس میں رسول کریم ﷺ کی سیرتِ پاک کو بہترین نمونہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ حیات مقدس میں اللہ کے ہر قانون کی عملی تفسیر موجود ہے۔ قانون کی بالادستی کی اس سے بڑی مثال ممکن نہیں۔ وہ اصول جنہیں ہم آزادی کے حوالے سے انسانی حقوق میں شامل کرتے ہیں، قرآن میں ان کو فرائض کی صورت میں احکامات بنایا گیا ہے۔ جان کا تحفظ، انصاف کا حصول، مساوات، معاشرتی نظام شرکت۔ نیکی میں باہمی تعاون، بدی کے کاموں میں عدم تعاون، جبر سے حفاظت، آزادی ضمیر اور آزادیٔ اظہار، عقیدے کی آزادی، عزت نفس اور نیک نامی کا تحفظ، تخلیے کا حق، محنت کے مطابق ملکیت اور محنت کا معاوضہ، اسلام میں معاشرتی آزادی کو ان فرائض کی ادائیگی سے مربوط کیا گیا ہے۔"

مغرب کی اسلام دشمنی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں اگر کسی کالے شخص پر حملہ ہو تو اس کو نسل پرستی کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کسی یہودی کے خلاف سخت الفاظ کہے جائیں تو اسے یہود دشمنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی عورت پر حملہ ہو تو اسے جنسی امتیاز کہا جاتا ہے۔ اگر کہیں ہم جنس پرستوں پر کوئی حملہ ہو تو اِسے عدمِ برداشت کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مذہب کے ماننے والوں کو نشانہ بنایا جائے تو اِسے نفرت کی آگ سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی عزت و ناموس یا مسلمانوں کی مقدس الہامی کتاب قرآن مجید پر حملہ کیا جائے تو اِسے آزادیٔ رائے کا نام دے کر غیر اہم قرار دے دیا جاتا ہے۔ پوچھنا چاہیے یہ آزادی اظہار ہے یا آزادی آزار؟

چند ماہ بیشتر امریکی ریاست فلوریڈا (Florida) کے ایک چرچ میں ملعون امریکی پادری ٹیری جونز (Terry Jones) اور اس کے ساتھی پادری وائن ساپ نے 30 آدمیوں کی موجودگی میں قرآن کریم کی بے حرمتی کی اور اسے نذر آتش کر دیا۔ اس خبیث، بدفطرت اور مخبوط الحواس پادری نے گیارہ ستمبر 2010ء کو بھی قرآن کریم جلانے کا اعلان کیا تھا، اس وقت دنیا بھر میں مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا، جس کے بعد اس پادری نے مجرمانہ چپ

سادھ لی تھی۔ لیکن 21 مارچ 2011ء کو اس نے اپنے ناپاک منصوبے پر عمل کرتے ہوئے (نعوذ باللہ) قرآن کریم کو شعلوں کے حوالے کردیا۔ قرآن پاک کی شہادت کا انکشاف فرانسیسی خبررساں ادارے نے اپنی رپورٹ میں کیا جس کے بعد یہ خبر درجنوں آئن لائن اخبارات اور بالخصوص عرب ویب سائٹس پر شائع ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق فلوریڈا کے قصبے گینس ویل میں اتوار کو ملعون پادری ٹیری جونز نے قرآن پاک کی شان میں گستاخی کے لیے ایک نام نہاد عدالت لگائی، جس کے بعد اس کے ساتھی ملعون پادری وائن ساپ نے قرآن پاک کے ایک نسخے کو آگ لگا دی۔ خبررساں ادارے کے مطابق چرچ میں قرآن پاک کے خلاف ''مقدمہ'' چلایا گیا۔ ملعون ٹیری جونز نے اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب کو (نعوذ باللہ)! دہشت گردی اور دیگر جرائم کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس کے بعد ''جیوری'' نے آٹھ منٹ تک غور و خوض کیا اور پھر ''سزا'' سنائی۔ اس دوران قرآن پاک کو ایک گھنٹے تک مٹی کے تیل میں ڈبوئے رکھا گیا۔ ملعون پادریوں نے شیطانی عدالتی کارروائی کے بعد قرآن کو نکال کر پیتل کی ایک ٹرے میں چرچ کے عین درمیان رکھا۔ معلون ٹیری جونز کی نگرانی میں ذہنی دیوالیہ پن کے شکار دوسرے پادری وائن ساپ نے قرآن پاک کے نسخے کو آگ لگادی، اس موقع پر چند لوگوں نے جلتے قرآن مجید کے نسخے کے ہمراہ فوٹو بھی بنوائے۔ اطلاعات کے مطابق چرچ میں 30 کے قریب لوگ موجود تھے جن میں ایک خاتون سمیت اسلام سے مرتد ہونے والے 3 بدبخت بھی شامل تھے۔ ملعون ٹیری جونز کا کہنا تھا کہ میں نے ستمبر میں مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ اپنی کتاب کی حفاظت کرلیں اور اس کا دفاع کریں لیکن مجھے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو میں نے سوچا کہ حقیقی سزا دیئے بغیر منصفانہ ٹرائل نہیں ہوسکتا، اس لیے میں نے قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) سزا دے دی۔ مبصرین کے مطابق اس واقعہ کے بعد امریکہ میں اسلام مخالف انتہا پسندوں کی حوصلہ افزائی ہوئی، کیونکہ پاکستان میں تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کی دفعات کو اقلیت کے خلاف قرار دینے والے امریکہ نے اپنے ملک کی مسلم اقلیت کے خلاف امتیازی سلوک کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔

ملعون پادری ٹیری جونز سے جب پوچھا گیا کہ کیا اس کا یہ اقدام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے؟ تو ملعون نے جواب دیا کہ اگر آج یسوع مسیح زندہ ہوتے تو میرے اس اقدام کی تعریف کرتے اور خود بھی قرآن مجید کو جلانے کا فتویٰ جاری کرتے۔ اس

نے مزید کہا کہ امریکہ کا آئین اور قانون اسے اس اقدام کی اجازت دیتا ہے۔ یاد رہے ملعون ٹیری جونز پر ہم جنس پرستی کے الزامات بھی ہیں۔ اگست 2009ء میں اسے بچوں سے جنسی زیادتی کرنے کے الزام میں گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے اسلام دشمن جذبات کا اظہار ایک کتاب "Islam is of the Devil"، ''اسلام ایک شیطانی مذہب ہے!'' لکھ کر کیا (نعوذ باللہ)! یہ کتاب انٹرنیٹ پر آج بھی موجود ہے۔ یاد رہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں برطانیہ کے وزیراعظم گلیڈسٹون (Gladstone) نے برطانوی پارلیمنٹ میں قرآن مجید کا نسخہ فضا میں لہراتے ہوئے کہا تھا: جب تک یہ کتاب موجود ہے، دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔ (نعوذ باللہ) اسی طرح متحدہ ہندوستان میں یوپی کے گورنر سر ولیم میور (Sir William Muir) نے ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا تھا: دنیا میں انسانیت کی دشمن دو چیزیں ہیں ایک محمد (ﷺ) کی تلوار اور دوسرا اس کا قرآن۔ (معاذ اللہ)

ملعون و مبغوض امریکی عیسائی پادری اسلام، قرآن، نبی آخر الزمان ﷺ اور مسلمانوں کی دشمنی میں ایسے اندھے اور پاگل ہو چکے ہیں کہ ان کے دل و دماغ اور فکر و نظر سے صحیح اور غلط، حق اور باطل میں امتیاز مفقود اور رخصت ہو چکا ہے، اس لیے کہ جس کلام مقدس و مطہر نے حضرت بی بی مریم علیہا السلام کی پاکدامنی کی گواہی دی، جس عظیم کتاب نے یہودیت کی طرف سے بی بی مریم علیہا السلام پر لگائے جانے والے الزامات اور بہتانوں کا دفاع کیا، جس کلام الٰہی نے ان کو صدیقہ کے لقب سے نوازا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی مکمل تفصیلات کو بیان کیا، اور گہوارے میں ہوتے ہوئے ان کا اقرار (کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، مجھے اللہ نے کتاب دی، اللہ تعالیٰ نے مجھے منصب نبوت عطا کیا، اللہ تعالیٰ نے مجھے بابرکت بنایا، اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی۔ (مریم:30، 31)) تفصیل سے ذکر کر کے دنیائے عیسائیت پر عظیم احسان کیا ہے، حیرت ہے عیسائی پادری اسی سچی کتاب پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن کریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ کی عفت، پاکدامنی اور پاکیزگی کی صفائی اور شہادت نہ دیتا تو عیسائی دنیا قیامت تک یہودیوں کے پروپیگنڈوں کے سامنے شرمندگی سے سر نہ اٹھا سکتی تھی اور نہ ان کے اتہامات اور الزامات کا دفاع کرسکتی تھی لیکن قرآن کریم نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اولی العزم اور

برگزیدہ نبی ہونے کی تصدیق کی، بلکہ یہودیوں کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام پر لگائے جانے والے تمام اتہامات اور الزامات کا منہ توڑ جواب بھی دیا، لیکن یہ ملعون اور غلیظ و پلید پادری پھر بھی اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

ملعون پادری ٹیری جونز کا لوگوں کو اس شرمناک فعل اور مذموم حرکت میں شرکت کے لیے دعوت نامے تقسیم کرنا، امریکی مقامی انتظامیہ کا مجرمانہ خاموشی اختیار کرنا اور ان ناپاک پادریوں کو اس گھناؤنی حرکت سے باز رکھنے کے لیے موثر اقدامات نہ کرنا، مسلمانوں کے بھرپور احتجاج پر یہ کہنا کہ یہاں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہے اور اس کے بعد امریکی کانگریس کی کمیٹی کا مسلمانوں میں دہشت گردی کے رجحانات کے جائزے کے نام پر متعصبانہ سماعت کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی تنگ نظری اور عدم برداشت کا طعنہ دینے والے خود تشدد پسند، برداشت سے عاری اور متعصب ہیں۔ ورنہ بتلایا جائے کہ جو امریکہ اور اس کے حواری پاکستان میں کسی خود ساختہ واقعے پر مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کی مذمت کرتے دیر نہیں لگاتے، انھوں نے ان پلید پادریوں کی اس ناپاک جسارت کو ابھی تک مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کیوں قرار نہیں دیا؟

بقول جمال عبداللہ عثمان: آج ایک بار پھر بدی کی قوتوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ مسلمانوں کے دل چھلنی ہیں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اس توہین کے پیچھے مذہب کا لبادہ اوڑھنے والا عیسائی مذہبی رہنما ہے۔ یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کی توہین وہ شخص کر رہا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ آسمانی مذہب کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے روحانی پیشوا ''پوپ بینی ڈکٹ'' خاموش ہیں۔ اس بنیاد پر مسلمانوں کا شکوہ بجا ہے کہ بدترین فعل کرنے والوں کو روحانی پیشوا کی پس پشت حمایت حاصل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، یقیناً روحانی پیشوا ویٹی کن سٹی کی بالکونی سے نمودار ہوتے۔ وہ دنیا کے کروڑوں عیسائیوں کو مخاطب کرتے اور کہتے: ''ہم تمام آسمانی مذاہب کا احترام کرتے ہیں۔ اسلام ایک آفاقی دین ہے۔ اس کا احترام ہم سب پر واجب ہے۔ جو عیسائی پیغمبر اسلام کے خاکے بناتا ہے، جو ان کے توہین آمیز کارٹون بناتا ہے، چھاپتا ہے، اس کا عیسائی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے عیسائیت میں کوئی پناہ نہیں۔ اگر عیسائیوں کے روحانی پیشوا واقعی مخلص ہوتے، وہ ایسا عمل کرتے، کسی میں ہمت نہ ہوتی کہ وہ عیسائیت کا لبادہ اوڑھ

کر نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرتا۔ کون نہیں جانتا کہ عیسائیوں کے روحانی پیشوا کو ایک بے عمل عیسائی بھی ''باپ'' کا درجہ دیتا ہے۔ امریکی صدر تک ان کے فرمان پر جان نچھاور کرتا ہے۔ ملعون پادری ٹیری جونز بھی اپنے روحانی پیشوا کے فرمان پر جان قربان کرتا ہے، مگر افسوس! پوپ نے اس حوالے سے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔ ویٹی کن سٹی سے ایک بے ضرر سی پریس ریلیز جاری ہوئی ہے، جسے مضحکہ خیزی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جس طرح بچہ پڑوس کے کسی بچے کی پٹائی کرے۔ پڑوس کا شخص گلہ کرے اور محض لوگوں کو دکھانے کے لیے بچے کا سرپرست ہلکی سی چپت رسید کرے اور بعد میں اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ ویٹی کن سٹی اور عیسائیوں کے روحانی پیشوا کا کردار اس وقت بالکل ایسا ہی ہے۔ انہوں نے چپ سادھ رکھی ہے۔ حالانکہ کئی ایسے مواقع آئے ہیں جب سیاسی معاملات میں بھی عیسائیوں کے روحانی پیشوا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مشرقی تیمور کے مسئلے میں سابق پوپ کا کردار کس سے ڈھکا چھپا ہے؟ افغانستان میں مرتد ہونے والے ''عبدالرحمن'' کو ویٹی کن سٹی میں پناہ کی پیشکش کس نے دی تھی اور سابق امریکی صدر کو فون کر کے مرتد کو صحیح سلامت پہنچانے کا حکم کس نے جاری کیا تھا؟ اسی طرح چند سال قبل ایران میں کچھ برطانوی سیلرز داخل ہوئے۔ ایران نے انہیں گرفتار کیا۔ جب عیسائیت کے روحانی پیشوا کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ایرانی صدر کے نام خط لکھا۔ اس خط میں درخواست کی کہ ہمارا مقدس تہوار ''ایسٹر'' قریب ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے ان برطانوی سیلرز کو رہا کر دیا جائے۔ یہ خط عیسائیوں کے روحانی پیشوا نے خود لکھا۔ اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے لیے کس قدر پریشان ہیں۔ جب چند سیلرز کی گرفتاری پر عیسائی دنیا کے روحانی پیشوا ایکشن لے سکتے ہیں، پھر سوا ارب سے زائد مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے چند جملے کیوں نہیں ادا کر سکتے؟ (روزنامہ ''امت'' کراچی، 21 ستمبر 2012ء)

الحمد للہ! مسلمان جس طرح تمام انبیا کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں، اس طرح تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی تعظیم و تکریم اور عزت و حرمت کو بھی فرض گردانتے ہیں۔ مسلمان جس طرح قرآن کریم کا ادب و احترام کرتے ہیں، اسی طرح تمام آسمانی کتب کا ادب کرنا بھی اپنے اوپر لازم، فرض اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک جس طرح حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ادنیٰ توہین یا تنقیص سے کفر لازم آتا ہے، اسی

طرح کسی سچے نبی کے انکار، توہین یا تنقیص سے بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متعصب، متشدد اور مذہبی تنگ نظر مسلمان ہیں یا یہ یہود ونصاریٰ؟

ہالینڈ کے ممبر پارلیمنٹ اور انتہائی متعصب جنونی عیسائی گیرٹ وائلڈرز (Geert Wilders) نے 20 اپریل 2008ء کو ملعون پادریوں کے ایک گروہ کے تعاون سے قرآن مجید کے خلاف بنائی جانے والی دل آزار فلم ''فتنہ'' انٹرنیٹ پر ریلیز کی جس میں مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن مجید کی تضحیک اور اس کی پاک تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے دہشت گردی کا منبع قرار دیا۔ پادریوں کی اس ناپاک جسارت سے ہر مسلمان خون کے آنسو روتا رہا۔ گیرٹ کی اس ناپاک جسارت کو تمام مغربی ممالک نے نہ صرف سراہا بلکہ اسے مکمل تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی۔ مسلمانوں کے احتجاج پر گیرٹ وائلڈرز نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ (نعوذ باللہ) قرآن مجید ایک دہشت گرد کتاب ہے جس کی تعلیمات تشدد پر اکساتی ہیں، اس لیے اس نے یہ فلم بنائی۔ فارسی کی ایک مشہور مثل ہے: تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ (یعنی انسان تدبیر کرتا ہے مگر تقدیر اس پر ہنس رہی ہوتی ہے)۔ قدرت کا کمال دیکھیے کہ اس فلم کے ریلیز ہونے سے اب تک 1200 کے قریب عیسائیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ جن کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس فلم کو دیکھنے کے بعد قرآن مجید کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فلم ''فتنہ'' میں پیش کی جانے والی تمام باتیں نہ صرف غلط بلکہ اسلام کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہیں۔

حقیقی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف انتہا پسندی کا شور مچانے اور نعرے لگانے والے عیسائی رہنما خود سب سے بڑے انتہا پسند ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں سے جو امتیازی سلوک ہو رہا ہے وہ کسی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں۔ محمد اور احمد ناموں کے حامل مسلمانوں پر ویزہ اور ملازمت کی پابندی لگانا، نئے نئے سخت امیگریشن قوانین بنانا، سکیننگ کے ذریعے مسلمان خواتین و مردوں کی تلاشی لینا۔ انٹرنیٹ پر ''الفرقان'' کے نام سے جعلی قرآن مجید پیش کرنا کس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے؟ کیا یہ سب انتہا پسندی اور دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتا؟ کیا یہ سب اسلام فوبیا میں مبتلا ہونے کی علامات نہیں؟

امریکہ کی اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی اور خبث باطن کا اندازہ اس ویڈیو سے لگایا جا سکتا ہے جو آج بھی انٹرنیٹ یوٹیوب پر موجود ہے۔ اس میں امریکی اور برطانوی فوجیوں کو

طالبان کی لاشوں پر پیشاب کرتے دکھایا گیا ہے۔ امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ (The Washington Post) نے اپنی اشاعت 4 جون 2005ء میں انکشاف کیا کہ گوانتانا موبے جیل (Gawantana Mobay Jail) میں مسلمان قیدیوں سے تفتیش کے دوران انہیں ذہنی اذیت دیتے ہوئے ان کے سامنے قرآن مجید کے نسخوں پر نہ صرف پیشاب کیا گیا بلکہ ان نسخوں کو پھاڑ کر ٹائلٹ میں بھی بہایا۔ اسی طرح بگرام افغانستان کے ٹارچر سیل سے بھی مصدقہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ یہاں قرآن مجید کے اوراق کو ٹائلٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا اور پھر اسے فلش میں بہا دیا جاتا ہے۔ بغداد کے نواحی قصبے رضوانیہ (Ridhvania) میں ایک ملعون فوجی آفیسر جس کا تعلق امریکہ کی 64ویں آرمڈ رجمنٹ سے تھا، اپنی نشانہ بازی کی مشق کے دوران اپنی رائفل کی گولیوں سے (نعوذ باللہ) قرآن مجید کے نسخے کو ہدف بناتا۔ مسلمان قیدیوں سے تفتیش کے دوران تفتیشی آفیسر جوتوں سمیت قرآن مجید پر کھڑے رہتے، اسے اپنے بوٹوں سے ٹھوکریں مارتے رہتے۔ یاد رہے کہ یہ سب کچھ امریکی جنرل جے ہڈ کی ہدایت پر ہوتا رہا جو وہاں کا انچارج تھا۔

ستمبر 2005ء میں ڈنمارک کے اخبار "جے لینڈز پوسٹن" "Jyllands Posten" نے (نعوذ باللہ) حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے توہین آمیز خاکے شائع کیے تو پورے عالم اسلام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی جس نے جلد ہی آتش فشاں کا روپ دھار لیا۔ اس نام نہاد مہذب ملک کی حکومت سے امید تھی کہ وہ اپنے ملک کے اخبار کی شرانگیزی پر عالم اسلام سے غیر مشروط معافی مانگ کر مجرموں کو سزا دے گی۔ لیکن خلاف توقع ڈنمارک کی حکومت کا کہنا تھا کہ ان کے ملک میں آزادی اظہار رائے "Freedom of Expression" کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اخبار چاہے جو لکھیں، جو شائع کریں، حکومت اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتی۔ اس کے برعکس اس اخبار کا دوہرا اور دوغلا معیار ملاحظہ کیجیے کہ جب اس اخبار میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین پر مبنی کارٹون اشاعت کے لیے آئے تو انتظامیہ نے یہ کہہ کر اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ اس سے عیسائیوں میں اشتعال پھیل سکتا ہے۔ گویا یورپ کو آزادئ اظہار رائے اور آزادئ صحافت کے نام سے اسلام کو تختہ مشق بنانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ 2008ء میں امریکی خاتون کارٹونسٹ مولی نورس (Molly Norris) نے ایک تنظیم

Citizens Against Humor قائم کی جس نے مطالبہ کیا کہ آزادی اظہار کے سلسلہ میں ہر شخص کو مسلمانوں کے رسول (حضرت محمد ﷺ) کا گستاخانہ کارٹون بنانے کی مکمل اجازت اور آزادی ہونی چاہیے۔ آپ مغرب کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ جب اخبار Jyllands-Posten کے ایڈیٹر سے گستاخانہ خاکے شائع کرنے پر احتجاج کیا گیا تو اس نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا "ہمیں خدا کا کارٹون بنانے اور مذاق اڑانے کا بھی حق حاصل ہے۔" (نعوذ باللہ)

آزادی اظہار رائے کی آڑ میں عیسائی مذہب کے ماننے والوں نے دین اسلام سے جس قسم کی نفرت کا کھلم کھلا اظہار کیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عیسائی دنیا میں ان خاکوں کو کم از کم 175 اخباروں میں شائع اور 200 ٹی وی اسٹیشنوں سے نشر کر کے اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی توہین کی مذموم کوشش کی گئی۔ اس قسم کی کھلی دشمنی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ کوئی اتفاقیہ حادثہ یا کسی کا انفرادی فعل نہیں ہے بلکہ اس کی کڑیاں قدیم صلیبی جنگوں سے ملائی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ڈنمارک کے پینل کوڈ سیکشن 266-B کے مطابق کوئی شخص اگر کھلے عام یا اس نیت سے ایسے مواد کی تشہیر کرتا ہے یا ایسے بیانات دیتا ہے یا ایسی اطلاع فراہم کرتا ہے جس سے کسی دوسرے شخص یا گروہ کو اس کے رنگ ونسل، مذہب، عقیدے اور فرقے کی بنیاد پر دھمکی دینا یا توہین کرنا مقصود ہو تو ایسے شخص پر جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے، عارضی طور پر حوالات میں بھیجا جا سکتا ہے یا اسے جیل میں قید کیا جا سکتا ہے جس کی مدت 2 سال ہے۔ اگر ڈنمارک کا پینل کوڈ ایسے جرم کے مرتکب لوگوں کو جیل بھیجنے کی اجازت دیتا ہے تو ابھی تک جائی لینڈ پوسٹن کے کلچر ایڈیٹر فلیمنگ روز (Flemming Rose) جو اس سازش کا مرکزی کردار ہے اور ایڈیٹر انچیف کارسٹن جوستے (Carsten Juste) کو جیل کیوں نہیں بھیجا گیا؟ انہیں حکومت نے تحفظ کیوں فراہم کیا؟ اس گھناؤنی حرکت کو اظہار رائے کی آزادی کا نام دے کر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ حالانکہ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس ناپاک سازش کے پیچھے وہ عناصر کام کر رہے ہیں جو دنیا کے امن کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ وہی سازشی لابی ہے جو عمداً چھ ماہ بعد یا ہر سال مسلمانوں کی دل آزاری پر مبنی واقعات دہراتی رہتی ہے تاکہ انہیں اشتعال دلا کر دنیا کا امن تباہ کیا جا سکے۔

آزادیٔ اظہار رائے، آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ فکر کی آڑ میں مغرب اور امریکہ کی

دوغلی پالیسیاں اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہیں۔ آزادی کا مطلب مادر پدر آزادی نہیں، آزادی تو صرف اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب اس کی حدود کا واضح تعین ہو اور ایک کی آزادی دوسروں کے لیے دست درازی اور غلامی کا طوق نہ بن جائے۔ جرمن مفکر ایمانویل کانٹ (Immanuel Kant) نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ جواب زبان زد خاص و عام ہو چکی ہے۔ آزادی کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

"I am freee to move my hand but the freedom of my hand ends where your nose begins"

"میں اپنے ہاتھ کو حرکت دینے میں آزاد ہوں لیکن جہاں سے تمہاری ناک شروع ہوتی ہے وہاں پر میرے ہاتھ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آزادی اور انارکی کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔ آزادی اگر حدود سے آزاد ہو جائے تو پھر وہ انارکی بن جاتی ہے اور دوسروں کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔ غرض آزادی اور ذمہ داری یا آزادی اور حدود کی پاسداری لازم وملزوم ہیں۔ آزادئ اظہار کے نام پر نہ تو دوسروں کی آزادی اور حقوق کو پامال کیا جاسکتا ہے اور نہ آزادئ اظہار کو دوسروں کی عزت سے کھیلنے اور ان کے کردار کو مجروح کرنے کا ذریعہ بننے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظام میں آزادی کو قانونی، اخلاقی اور ملکی سلامتی کی حدود میں پابند کیا جاتا ہے۔ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے فریم ورک ہی میں آزادی کارفرما ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی سلامتی، معاشرے کی بنیادی اقدار کا تحفظ اور شخصی عزت وعفت کا احترام ہر نظام کا حصہ ہے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے آرٹیکل 29 کے پیراگراف 2 میں واضح درج ہے کہ آزادی اظہار کے حق کا اطلاق، دوسروں کے حقوق آزادی اور اخلاقی اقدار کے تحفظ کے ساتھ مشروط ہے۔

"In the exercise of his rights and freedoms, everyone shall be subject only to such limitations as are determined by law solely for the purpose of securing due recognition and respect for the rights and freedoms of others and of meeting the just requirements of morality, public order and the general welfare in a democratic society."

اسی طرح دنیا کے تمام ممالک کے منشور یا آئین میں یہ بات متفقہ طور پر درج ہے کہ ہر شخص کو اس وقت تک اپنے خیالات اور عقائد کے اظہار کا حق حاصل ہے جب تک وہ قانون میں بیان کردہ حدود میں رہے۔ تاہم کوئی بھی شخص اس بات کا مجاز نہیں کہ وہ جھوٹ کی اشاعت کرے یا ایسی اطلاعات پھیلائے جو عوامی مزاج کو مشتعل کریں یا تہمت تراشی کرے یا دوسرے لوگوں پر طعن وتشنیع کرے یا ان پر ہتک آمیز الزامات لگائے۔ کوئی شخص دوسروں کے مذہبی عقائد کی توہین یا تضحیک نہیں کرے گا یا ان کے خلاف عوام میں عداوت یا نفرت نہیں پھیلائے گا۔ دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام ہر شخص کا فرض ہے۔ ہر شخص کو اپنے خیالات، آرا اور عقائد کا حق حاصل ہے اور اسے ان کے اظہار کا حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک وہ قانون کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے آئین کی دفعہ 20 پاکستان کے تمام شہریوں کو اپنے مذہب کو ماننے، عمل کرنے اور اشاعت کرنے کا حق دیتی ہے لیکن یہ حق قانون، امن عامہ اور اخلاق کے تابع ہے۔ اس کا بیان یوں ہوا ہے: ''قانون، امن عامہ اور اخلاق کے مطابق ہر شہری کو اپنا مذہب ماننے، اس پر عمل کرنے اور اس کی اشاعت کا حق حاصل ہوگا۔''

جہاں تک آزادی یا آزادیٔ اظہار رائے کا تعلق ہے تو دنیا کے کسی بھی دستور میں ''آزادی مطلق'' کا حق نہیں دیا گیا۔ مثلاً سب سے پہلے فرانس کو لے لیں جہاں کے اخبارات نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں اہانت آمیز خاکے شائع کیے اور اس کی آڑ میں ''آزادیٔ اظہار رائے'' کو اپنا حق قرار دیا، اس کے آرٹیکل نمبر 1 میں کہا گیا ہے۔ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزاد رہے گا اور سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے لیکن سماجی حیثیت کا تعلق مفاد عامہ کے پیش نظر کیا جائے گا۔'' آرٹیکل نمبر 4 میں کہا گیا ہے: ''آزادی کا حق اس حد تک تسلیم کیا جائے گا جب تک کہ اس سے کسی دوسرے شخص کا حق متاثر یا مجروح نہ ہو اور ان حقوق کا تعین بھی قانون کے ذریعہ کیا جائے گا۔'' جرمنی کے آئین کے آرٹیکل نمبر 5 میں کہا گیا ہے: ''ہر شخص کو تحریر، تقریر اور اظہار خیال کی آزادی کا حق حاصل ہے۔'' مگر اس کے ذیلی آرٹیکل نمبر 3 میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ حقوق شخصی عزت وتکریم کے دائروں میں رہتے ہوئے استعمال کیے جاسکیں گے۔ امریکی دستور میں بھی مطلق آزادی کا کوئی تصور نہیں، امریکن سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق دستور میں ایسی تحریر اور تقریر کی اجازت نہیں جو عوام میں اشتعال

انگیزی یا امن عامہ میں خلل اندازی کا سبب بنے یا اس سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہو، ریاست کو ایسی آزادی سلب کرنے کا اختیار ہے۔ اسی طرح آزادی مذہب کے نام پر توہین مسیح کے ارتکاب کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہی حال برطانیہ کا ہے، وہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا برطانوی ملکہ کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کی اجازت نہیں۔ وہاں ہائیڈ پارک میں ''اسپیکر کارنر'' کے نام سے ایک گوشہ مختص ہے جہاں مخصوص اوقات میں ہر شخص کو جو جی میں آئے، کہنے اور یاوہ گوئی کی چھوٹ دی گئی ہے حتیٰ کہ خدا اور اس کے رسولوں کے بارے میں بھی ہرزہ سرائی کی کوئی ممانعت نہیں۔ لیکن یاد رہے یہاں کسی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کرے یا ملکہ کی شان میں گستاخی کرے۔ خلاف ورزی کی صورت میں برطانیہ کا قانون حرکت میں آجائے گا اور آزادیٔ رائے ختم ہو جائے گی۔ جب خود ان قوموں کے دساتیر میں ''آزادیٔ اظہار رائے'' کو مشروط کیا گیا کہ اس کی اسی وقت اجازت ہے جب وہ کسی کے حق اور جذبات مجروح کرنے کا ذریعہ نہ بنے، ایسے میں اس عمل کا جواز کیونکر ہو سکتا ہے کہ کائنات کی سب سے محترم اور مقدس ہستی کی توہین کی جائے، جو دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے اربوں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن ہے!! کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مغرب اسلام سے مذہبی تعصب میں اندھا ہو چکا ہے۔

دریں اثنا قانونی حلقوں نے اس بات کو بھی محل نظر قرار دیا ہے کہ امریکہ خود کو آزاد اور مکمل طور پر سیکولر ملک قرار دیتا ہے مگر اس کے ہاں صرف مسیحی افراد کو اپنے دین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے، جبکہ مسلمانوں کو ایسی آزادی حاصل نہیں۔ اسلامی شعائر کے تحت وہاں زندگی نہیں گزاری جا سکتی جبکہ وہاں پر مذہب کو مکمل آزادی دینے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی انہی اسلام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے مسلمان اس سے نفرت بجا طور پر کرتے ہیں۔ امریکہ اظہار آزادی کے نام پر اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والوں کو قانون کی چھتری فراہم کرتا ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کے ردعمل سے اس کے مفادات پر زد پڑتی ہے تو اسے قابل گردن زنی سمجھا جاتا ہے۔

اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ کی کوڑھ زدہ ذہنی پسماندگی، جنون اور پاگل پن کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ 11 ستمبر 2012ء کو ایک اسرائیلی یہودی سام باسل Sam Bacile اور مصری عیسائی Morris Sadek نے مل کر توہین رسالت ﷺ پر مبنی

نہایت دل آزار فلم "Innocence of Muslims"، "مسلمانوں کی معصومیت" کے عنوان سے ایک فلم تیار کی۔ بعدازاں تحقیقات کے نتیجہ میں پتہ چلا کہ سام باسل تو ایک فرضی کردار ہے جبکہ یہ حرکت ایک عیسائی پادری نکولا باسلے نکولا Nakoula Basseley Nakoula کی ہے جو امریکی ریاست کیلیفورنیا میں ایک بینک میں گرفتار ہو کر سزا پا چکا ہے۔ اسے 21 ماہ کی قید اور تقریباً 7 لاکھ ڈالر جرمانہ ہوا۔ اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی ہے کہ ملعون پادری ٹیری جونز نے اس فلم کی تشہیر کے لیے تمام وسائل مہیا کیے۔ اس متنازعہ اور گستاخانہ فلم کی نمائش کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر انہیں تشدد، توڑ پھوڑ اور قتل و غارت پر اکسایا جائے تاکہ بعدازاں دنیا کو باور کرایا جائے کہ مسلمان انتہا پسند ہیں اور اسلام تشدد، انتہا پسندی اور عدم برداشت کو فروغ دینے والا مذہب ہے۔

دنیا بھر کے ایک ارب 50 کروڑ مسلمانوں کی دل آزاری آخر کہاں کی آزادی رائے ہے؟ کیا اظہار کی آزادی اور دشنام طرازی میں کوئی فرق نہیں؟ افسوس! مسلمانوں کے احتجاج کو ناقابل برداشت اور "مہذب" دنیا کے اصولوں کے خلاف گردانا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اس شیطانی اقدام اور فتنہ انگیز شرارت کو محض غلطی اور ایک فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیا جا رہا ہے۔ 30 لاکھ ڈالر سے تیار ہونے والی گستاخانہ فلم کے ڈانڈے یہود و نصاریٰ سے جا ملتے ہیں جنہوں نے مہینوں کی منصوبہ بندی اور مال کی فراہمی کر کے اسے ممکن بنایا۔ یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اسلام کے خلاف یہ شرانگیز فلم بنانے والے فلمساز بل ماہر (Bill Maher) نے صدر اوباما کی انتخابی مہم کے لیے دس لاکھ ڈالر کا عطیہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی صدر بارک اوبامہ نے تمام اسلامی ممالک کے گستاخانہ فلم پر پابندی کے متفقہ مطالبے کو مسترد کر دیا اور کہا کہ گستاخانہ فلم پر پابندی اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے کیونکہ امریکی آئین اس کی اجازت نہیں دیتا۔ امریکی صدر اوباما نے مزید کہا کہ مذہبی آزادی ہر ملک کا حق ہے، ہم مذہبی آزادی اور مذہبی تحفظ پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم تحمل، برداشت اور مفاہمت کے رویوں کے حامی ہیں۔ چونکہ امریکی آئین آزادی اظہار کا تحفظ کرتا ہے، اس لیے ہم اس ویڈیو کو انٹرنیٹ سے نہیں ہٹا سکتے۔ پوچھنا چاہیے کہ کیا حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ، قرآن مجید اور اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی آزادی اظہار رائے ہے؟ صدر اوباما کا یہ بیان اس بات کی بین دلیل ہے کہ امریکی حکومت بھی اس انتہائی قبیح حرکت میں برابر کی شریک ہے جو

چاہتی ہے کہ دنیا میں تہذیبوں کے تصادم سے عالمی جنگ کا آغاز ہو۔ یاد رہے امریکی صدر اوباما کو اس سال امن کا نوبل پرائز دیا جا رہا ہے جس پر خود صدر اوباما حیران ہیں۔

گستاخانِ رسول کے متعلق یہ کہنا کہ وہ نفسیاتی مریض ہیں یا یہ ان کا انفرادی عمل ہے، حقائق سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نائن الیون کے واقعہ کے بعد صدر بش اپنے خطاب میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کو کروسیڈ کا نام نہ دیتا۔ امریکی صدر بارک اوباما، جس کو ابراہ ثانی بھی کہا جاتا ہے، اپنی انتخابی مہم میں مکہ اور مدینہ پر ایٹم بم برسانے کی ناپاک خواہش کا اظہار نہ کرتا جس کی بنیاد پر اسے امریکی عوام کی اکثریت نے ووٹ دیے۔ گستاخانہ فلم کے خلاف پرتشدد احتجاج کے دوران لیبیا میں امریکی سفیر کے مارے جانے پر بارک اوباما نے مسلم ممالک کو دھمکی دی کہ اب اگر کہیں امریکی مفادات کو نقصان پہنچا تو امریکہ اس ملک میں اپنی فوج بھیج دے گا۔ کیا یہ دھمکی ملعون ٹیری جونز اور ملعون نکولا کی پشت پناہی نہیں جس میں امریکی صدر براہ راست کردار ادا کر رہا ہے۔ ستمبر 2012ء کو پاکستان اور افغانستان کے لیے امریکہ کے خصوصی ایلچی مارک گراسمین (Marc Grassman) نے ایک پریس کانفرنس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''گستاخانہ فلم فرد واحد کا فعل ہے، امریکی حکومت یا امریکی عوام کا اس سے کوئی تعلق نہیں''۔ لیکن مجال ہے کہ انہوں نے اس سانحہ پر کوئی اظہار افسوس کیا ہو۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ فرد واحد کے جرم کی پاداش میں امریکی سفارت خانوں پر حملے نہیں ہونے چاہئیں۔ ہمارے خیال میں مارک گراسمین اور دیگر اعلیٰ امریکی حکام کا یہ موقف بالکل درست ہے۔ لیکن پوچھنا چاہیے! کیا کسی فرد واحد کو ''آزادی اظہار'' کے نام پر یہ اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ دنیا کی مقدس ترین ہستی کی توہین وتذلیل کرتا پھرے اور امریکیوں کی جان خطرے میں ڈال دے۔ ان تھنک ٹینکس کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسامہ بن لادن بھی ایک ''فرد واحد'' تھا جس کے کیے کی سزا امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک پوری دنیا کے مسلمانوں کو مسلسل دے رہے ہیں۔ صدام حسین بھی ''فرد واحد'' تھا جس کے فعل کی سزا عراقیوں کو دی گئی۔ صدر قذافی بھی ''فرد واحد'' تھا جس کے کسی عمل کی سزا پورے لیبیا کی عوام کو دی گئی اور اب کسی امریکی فرد واحد کی ناپاک حرکت پر مسلمان امریکہ کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں تو یہ ''امریکی روایات'' اور ''مغربی تہذیب'' کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ اس پر اعتراض کیسا؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ قرآن سوزی اور گستاخانہ فلم بنانے کا معاملہ

فردِ واحد کا ہے اور اس کا حکومت یا عوام سے کوئی تعلق نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکی فوج جو حکومت اور عوام کی نمائندہ ہوتی ہے، اس سے مسلمانوں کی دل آزاری کی مذموم حرکتیں کیوں سرزد ہوتی ہیں۔ گوانتانا موبے اور بگرام کے عقوبت خانوں میں جس طرح قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی، طالبان کی لاشوں پر پیشاب کیا گیا، ان کی ڈاڑھیوں پر غلاظت ملی گئی.......... کیا یہ فردِ واحد کے کارنامے ہیں۔ کیا یہ انصاف کا پیمانہ اور مذہب کا احترام ہے، کیا یہ اظہار رائے کی آزادی کے نمونے ہیں؟

سلطان عبدالحمید نے اپنی حکومت کے آخری ایام میں بھی اسلام کے دفاع سے نہ ہٹنے کا فیصلہ برقرار رکھا تھا۔ فرانسیسی مصنف والٹئیر کی تصنیفات کی بنیاد پر فرانس اور برطانیہ میں ایک سٹیج ڈرامہ کھیل کے لیے پیش ہوا جس کا عنوان تھا ''محمد یا جنونی؟'' جس میں نبی اکرم ﷺ کے کردار پر حضرت زینبؓ و زیدؓ کے نکاح کے ذریعے گرد اڑائی گئی۔ جب خلیفہ کو اس ''سٹیج ڈرامہ'' کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرانس میں اپنے سفیر کے ذریعے فرانسیسی حکومت کو کھیل جاری رکھنے کی صورت میں سنگین ردعمل کی تنبیہ کی۔ فرانس نے فوراً ''سٹیج ڈرامہ'' روک دیا اور یہ گروہ انگلینڈ چلا گیا۔ جب یہی وارننگ انگلینڈ پہنچی تو جواز تراشا گیا کہ ٹکٹیں فروخت کر دی گئی ہیں اور اب ''سٹیج شو'' پر پابندی شہریوں کی آزادی پر قدغن لگانے کے مترادف ہے۔ اس پر سلطان عبدالحمید نے دوٹوک الفاظ میں یہ فرمان جاری کر دیا: ''میں اسلامی امہ کے نام ایک فرمان جاری کردوں گا کہ برطانیہ ہمارے پیارے رسول کریم ﷺ کی توہین کر رہا ہے، لہٰذا میں برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کرتا ہوں۔'' اس الٹی میٹم پر ''اظہار رائے کی آزادی'' کے سب دعوے بھلا دیے گئے اور فی الفور ''سٹیج ڈرامہ'' روک دیا گیا۔ شاید مسلمانوں کے پاس اس طرح کی آزمائش میں سرخرو ہونے کا یہ واحد حل ہے!!

دکھ اور افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ فرانس، جہاں یورپ کے حوالے سے سب سے زیادہ مسلمان بستے ہیں، میں بھی بعض شیطان صفت صحافی اور جرائد نبی کریم ﷺ کے بارے میں توہین آمیز خاکے شائع کرنے سے باز نہیں آرہے۔ اُن کی ناپاک جسارت دیکھیے کہ امریکی شہری نکولا بیسلے کی بنائی گئی گستاخانہ فلم کے خلاف جب یورپ سمیت ساری دنیا میں مظاہرے ہو رہے تھے، اُسی ہفتے فرانس کے ایک جریدے ''چارلی ہیبڈو'' (Charlie Hebdo) نے نہایت دل آزار اور گستاخانہ خاکے شائع کیے۔ یہ غلیظ حرکت دانستہ کی گئی لیکن

افسوس! فرانسیسی حکومت نے اس میگزین کو مارکیٹ میں فروخت کرنے سے منع نہ کیا حالانکہ اِن خاکوں کے بارے میں حکومتِ فرانس کو پہلے ہی سے معلوم ہو چکا تھا لیکن آزادیٔ صحافت کے نام نہاد قانون کا سہارا لے کر حکومت نے اس پر کوئی پابندی نہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ ہم اِسے فرانسیسی حکومت کا منافقانہ اور دوغلا پن کہیں گے۔ یاد رہے کہ ''چارلی ہیبڈو'' گزشتہ 52 برسوں سے شائع ہو رہا ہے لیکن درمیان میں تقریباً دس سال کے لیے یہ شائع نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے فرانسیسی صدر کے خلاف نہایت غیر اخلاقی اور واہیات قسم کے خاکے شائع کر دیے تھے۔ اُس پر حکومتِ فرانس حرکت میں آئی اور ''چارلی ہیبڈو'' کو دس سال کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس پس منظر میں عالم اسلام خصوصاً فرانسیسی مسلمانوں نے بجا طور پر فرانسیسی صدر سے احتجاج کیا کہ اگر ماضی قریب میں فرانسیسی صدر کی بے حرمتی کرنے کی پاداش میں جریدہ مذکور پر پابندیاں عائد ہو سکتی تھیں تو مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کرنے پر اس جریدے پر پابندی کیوں نہیں لگائی جا سکتی؟ لیکن فرانسیسی حکومت نے اِس مطالبے پر کان دھرنے سے انکار کر دیا بلکہ فرانس کے صدر نے اعلان کیا: ''اوّل: ہم آزادیٔ اظہار کے قوانین کی موجودگی میں مذکورہ جریدے پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ دوم، پورے فرانس میں مسلمانوں کو توہین آمیز خاکوں کے خلاف جلسے جلوس نکالنے اور احتجاج کرنے کی قطعی اجازت نہیں ہوگی۔ سوم، جریدے کے ایڈیٹر کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ چہارم، جس کسی مسلمان کو اِن خاکوں کی اشاعت پر تکلیف ہے، وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ حکومتِ فرانس نے اِسی پر بس نہیں کی بلکہ چند روز بعد، 27 ستمبر 2012ء کو فرانسیسی وزیرِ داخلہ مینوئل والز (Manual Valls) نے فرانسیسی مسلمانوں کو دھمکی دیتے ہوئے کہا: ''ہم ایسے لوگوں کو ملک بدر کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائیں گے جو اسلام پر چلنے کا دعویٰ کریں اور ہمارے امن عامہ کے لیے خطرہ بن جائیں۔ جو مسلمان ہمارے قوانین اور اقدار کا احترام نہیں کرے گا، وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ فرانس میں نفرت کے پرستاروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔'' یہ ہے مغرب کا منافقانہ اور انسانیت دشمن چہرہ! پوچھنا چاہیے کہ کیا کسی عظیم ہستی کو گالی دینا آزادی اظہار ہے یا بدتہذیبی؟ یہ آزادی رائے کی معراج ہے یا تذلیل؟ احتجاج کرنا جرم ہے تو ایک ارب 30 کروڑ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا کیسے جائز ہو گیا؟ واہ رے مغرب تیری کونسی کل سیدھی!

بعد ازاں ان گستاخانہ خاکوں کے خلاف فرانسیسی مسلمانوں کی تنظیم یونین آف فرنچ

اسلامک آرگنائزیشن نے عدالت کو درخواست دی۔ مسلمانوں کا موقف تھا کہ توہین آمیز کارٹونوں سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوئی ہے جبکہ تمام مذاہب کا یکساں احترام فرانسیسی دستور کا حصہ ہے۔ عدالت کے روبرو اپنے ایک تحریری بیان میں فرانسیسی صدر نے خاکوں کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا کہ طنز ومزاح فرانسیسی ثقافت کا حصہ ہے اور مذہبی جذبات کے نام پر اظہار رائے کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت نے مسلمانوں کی درخواست مسترد کردی اور فیصلہ سنایا کہ یہ کارٹون محض طنز ومزاح ہیں اور اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے پہلے جب ڈنمارک کے رسالے جے لینڈ پوسٹن نے 2005ء اور 2006ء میں توہین آمیز خاکے شائع کیے تھے، اس وقت بھی ڈینش مسلمانوں نے عدالت سے رجوع کیا لیکن ڈنمارک کی عدالت نے اظہار رائے کی آزادی کے نام پر اس درخواست کو مسترد کردیا۔ دوسری طرف احتجاجی یادداشت لے کر اخبار کے دفتر جانے والے چار مسلمانوں کو اسلامی دہشت گرد قرار دے کر قید وجرمانے کی سزا سنادی گئی، یعنی مسلمانوں کو احتجاج اور ناراضی کے اظہار کی آزادی بھی حاصل نہیں۔

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ 1991ء میں نیویارک کے معروف چوک میں جب ایک شخص نے صدر بش ہونے کا دعویٰ کیا تو پولیس نے اسے گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا تھا۔ اسے آزادی اظہار رائے کی کوئی رعایت نہ دی گئی۔ یہ ہے وہ تضاد جو امریکی معاشرے کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔ انہیں تو اپنے لیے اتنا بھی گوارا نہیں کہ کوئی مسخرہ جعلی طور پر ان کے صدر کا نام استعمال کرے، اس کا روپ دھارے یا خود کو صدر کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لے لیکن ہمارے ہاں جب کوئی بدبخت جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرے، مسیح موعود ہونے کا اعلان کرے یا مہدی ہونے کا پرچار کرے تو امریکہ بہادر اس کی سرپرستی کرنے فوراً میدان میں آجاتا ہے اور ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس بہروپیے کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی کرنے سے روک دیتا ہے۔ اگر بادل نخواستہ حکومت عوام کے احتجاج پر اسے گرفتار کرلیتی ہے تو مغربی میڈیا پاکستان کے خلاف شور مچانا شروع کردیتا ہے کہ پاکستان میں آزادی اظہار رائے پر قدغن ہے۔ چنانچہ اس کی آڑ میں پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد بند کردینے کی دھمکیاں شروع ہوجاتی ہیں۔

امریکہ اور مغربی ممالک میں فرد کی آزادیٔ اظہار محض ڈھونگ اور منافقانہ عمل ہے۔

اگر فرانس میں فرد کو ہر قسم کی بات کہنے کی آزادی ہے تو اسی آزادی کے نام پر جب فرانس میں بسنے والی مسلمان خواتین اجتماعی طور پر یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم حجاب بھی کریں گی اور برقع بھی پہنیں گی تو فرانسیسی حکومت انہیں یہ آزادی دینے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ برقع اور حجاب استعمال کرنے والی مسلمان مستورات کو ریاستی پولیس تنگ کیوں کرتی ہے؟ اُن کے خلاف مقدمے کیوں بنائے جاتے ہیں؟

مغرب کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کی ایمانی حرارت جانچنے کے لیے ان کے جذبات پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ یہ بات بہرحال ثابت شدہ ہے کہ آزادئ اظہار یا آزادئ رائے کی اس سے بھونڈی شکل اور کوئی نہیں کہ آپ کسی انفرادی شخص کے یا کسی اجتماعی گروہ کے مذہبی جذبات مجروح کریں۔ اخلاقی گراوٹ کی یہ شاید سب سے بڑی انتہا ہے۔ اس کی تازہ مثال ملاحظہ کیجیے کہ فرانس میں مساجد کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا حکومت نے چرچ سے مل کر ایک سازش تیار کرتے ہوئے ہم جنس پرستوں کے لیے الگ مسجد کے قیام کا اعلان کیا۔ اس ''مسجد'' پر اٹھنے والے تمام اخراجات حکومت فرانس برداشت کرے گی۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہم جنس پرست اپنی عبادت کے ساتھ ساتھ اپنی جنسی خواہشات بھی یہیں پوری کریں گے۔ اس قبیح حرکت کا مقصد صرف اور صرف اسلام کو بدنام کرنا ہے۔

اسلام کے خلاف مغرب کے شیطانی اقدام سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں خواہ کتنا ہی اشتعال کیوں نہ پھیلے، مغرب میں کوئی بھی مادر پدر آزاد ''آزادئ اظہار'' پر پابندی لگانے کے لیے تیار نہیں۔ آزادئ اظہار کے نام پر شعائر اسلامی کی توہین کی اجازت اور اس کے مرتکبین کو ''قانون'' کی چھتری فراہم کرنا بھی امت مسلمہ کے زخموں پر نمک پاشی کی ایک شرمناک اور قبیح حرکت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی ذرائع ابلاغ دنیا کے کسی دوسرے مذہب کے خلاف ایسا کیوں نہیں کرتے حالانکہ دنیا میں غیر آسمانی مذاہب اور اس کے ماننے والوں کی کمی نہیں؟ صبر، رواداری اور برداشت کا درس دینے والے عالمی چیمپئن امریکہ اور اس کے مغربی حواریوں کا خود یہ دوہرا معیار ہے کہ 26 ستمبر 2012ء کو جب ایرانی صدر نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب شروع کیا تو ان تمام ممالک نے اس خطاب کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ دسمبر 2008ء کو ایک پریس کانفرنس میں صدر جارج بش جب صحافیوں سے خطاب کر رہے تھے تو ایک عراقی صحافی منتظر الزیدی نے صدر بش پر اپنا جوتا اچھال دیا تھا جسے کیمرے کی

آنکھ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا۔ دنیا بھر کے لوگوں نے دیکھا کہ اسی وقت امریکی ایجنسیوں کے اہلکاروں نے اس صحافی پر گھونسوں اور مکوں کی بارش کردی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں صبر اور برداشت کہاں چلا جاتا ہے؟ ایک اور اہم بات جس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ستمبر 2001ء میں جب امریکہ میں نائن الیون کا واقعہ ہوا تو امریکی خفیہ ایجنسی FBI نے پورے امریکہ سے ٹیلی فون کا ڈیٹا اکٹھا کیا اور جس مسلمان نے بھی اس واقعہ کی کسی دوسرے کو اطلاع دیتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا، اسے گرفتار کرکے مختلف عقوبت خانوں میں تفتیش کے جانکسل مراحل سے گزار کر جیل بھیج دیا گیا۔

مغرب مسلمانوں کو کرب میں مبتلا رکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اس کی مثال 1988ء میں بدنام زمانہ گستاخ رسول ملعون سلمان رشدی کے ناول Stanic Verses (شیطانی آیات) سے ملتی ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ کی بدترین توہین کی گئی۔ اس نہایت غلیظ ناول کی اشاعت سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہر ملک اور ہر شہر میں اس کتاب کے مندرجات اور ملعون سلمان رشدی کے خلاف احتجاج ہونے لگا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مغرب نے بجائے اس کتاب کی مذمت کرنے کے محض اسلام دشمنی میں ملعون سلمان رشدی کی سرپرستی شروع کردی۔ برطانوی وزیر اعظم نے سلمان رشدی کو سخت سیکیورٹی مہیا کی۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور برطانوی وزیر خارجہ نے مسلمانوں کے احتجاج کے جواب میں کہا کہ آزادی اظہار پر کسی کو دھمکی دینا بین الاقوامی رویے کے خلاف ہے۔ آزادی اظہار ہماری بنیادی قدر ہے، ہم اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتے۔ کئی امریکی یونیورسٹیوں نے اس ''کارنامے'' پر رشدی کو اعزازی ڈگریاں دیں، امریکی صدر بل کلنٹن نے اسے خصوصی طور پر واشنگٹن وائٹ ہاؤس میں دعوت دی۔ نائٹ ہڈ کے خطاب سے نوازتے ہوئے برطانوی ملکہ الزبتھ نے 18 جون 2007ء کو اپنی سالگرہ کے موقع پر بکنگھم پیلس میں منعقدہ ایک تقریب میں سلمان رشدی کو شاہی مہمان کے طور پر مدعو کیا اور اسے ''سر'' کا خطاب دیا۔ پوچھنا چاہیے کہ یہ سارے اعزازت واکرامات کس ''خدمت عالیہ'' کا معاوضہ ہے؟ ظاہر ہے، توہین رسالت ﷺ، شعائر اسلام کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی دل آزاری مغرب کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور ایسا کرنے والا مغرب کا ''محبوب'' قرار پاتا ہے۔

اسلام کے ساتھ مغرب کے تعصب اور دشمنی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے

کہ دنیا بھر میں انسانی حقوق، انسانیت پر ہونے والی زیادتیوں اور حق تلفیوں کے تدارک کی کوشش کرنے والی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے 1994ء میں ملعون سلمان رشدی کی کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ کرنے والے ملحد عزیز نشین کو اپنی تنظیم کی جانب سے امن وسلامتی کا ایوارڈ دیا۔ حالانکہ اس ترجمہ کی اشاعت کے بعد ترکی میں زبردست احتجاج ہوا جس میں 27 سے زائد افراد جاں بحق ہو گئے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا ملعون عزیز نشین کو امن وسلامتی کا ایوارڈ دینا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ توہین رسالت ﷺ پر مبنی کتاب سلمان رشدی کا ذاتی فعل نہیں تھا، بلکہ یہ اقوام مغرب کی اسلام کے خلاف بھیانک سازش اور سوچی سمجھی پالیسی ہے جس کا مقصد اسلامی شعائر واقدار کی توہین وتضحیک اور مسلمانوں کے جذبات کو پامال کرنا ہے۔

یاد رہے مغرب نے یہی پذیرائی بنگلہ دیش کی ملعونہ تسلیمہ نسرین کو دی جس نے اپنی کتاب ''لجا'' (شرم)، انٹرویوز اور کالموں میں دین اسلام کی تعلیمات اور حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کی۔ یورپی پارلیمنٹ نے اس ملعونہ کے حق میں ایک قرارداد منظور کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مغرب ہر اس شخص کو اپنی آنکھوں پر بٹھاتا ہے جو اسلام کی تنقیص اور مسلمانوں کی دل آزاری کرتا ہے۔ حال ہی میں کینیڈا کی گستاخ عورت ارشاد مانجی (Irshad Manji)، جو دراصل سوڈانی النسل ہے، نے اسلام کے خلاف کتاب ''The Trouble With Islam Today'' لکھ کر نہ صرف اسلامی قوانین کا مذاق اڑایا بلکہ شریعت اسلامیہ کی بے حرمتی بھی کی۔ مسلمانوں کے احتجاج پر کینیڈین میڈیا نے مسلمانوں کو برداشت اور رواداری کی تلقین کرتے ہوئے انہیں اپنا رویہ تبدیل کرنے کو کہا۔ جبکہ ان کے ہاں بیروزگاری، کساد بازاری اور حکومتی پالیسیوں کے خلاف آئے روز احتجاج ہوتے رہتے ہیں جو بعض اوقات تشدد کا روپ دھار لیتے ہیں۔ حیرانی ہے کہ ان مظاہروں اور احتجاجی جلوسوں کو وہ آزادی اظہار کا نام دیتے ہیں۔ یہ ہے مغرب کا دوہرا معیار۔ مغرب خود معیار طے کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

بقول حافظ شفیق الرحمٰن: ''کہتے ہیں کہ یورپ کا مذہب ''آزادی'' ہے۔ ہوس کی آزادی، دشنام طرازی کی آزادی، الزام تراشی کی آزادی، غلام سازی کی آزادی، چھوٹے

ملکوں میں جارحیت اور دہشت گردی کی آزادی، مشرقی اقدار کو پامال کرنے کی آزادی، اسلام کی انسانیت ساز تعلیمات کا مذاق اڑانے کی آزادی...... مغرب جب چاہے، جیسے چاہے، جب تک چاہے، کھل کھیلے...... کوئی صدائے احتجاج نہ بلند کرے...... صیاد کو آزادی ہے کہ وہ آزاد پرندوں کو زیر دام لا کر ان کی آزادی سلب کرے اور ان کی شہ رگ، لبرل ازم کی چھری سے کاٹ کر رکھ دے، لیکن زخمی اور نیم بسمل پرندوں کو تڑپنے، پھڑکنے اور پھڑ پھڑانے کی بھی آزادی نہیں...... باؤلے کتوں کو شریف شہریوں پر بھونکنے اور معصوم راہگیروں کو کاٹ کھانے کی آزادی ہے لیکن باؤلے کتوں کو کچلہ دینے اور انہیں نمدا باندھنے کی آزادی نہیں۔ کیونکہ اس سے مذکورہ معزز کتوں کے کاٹ کھانے اور بھونکنے کے بنیادی اور پیدائشی ''حقوق'' پر زد پڑتی ہے۔

امریکہ اور مغربی حلقے توہین رسالتؐ کے جس قانون کی آڑ لے کر اتنا شور شرابہ پیدا کر رہے ہیں اور ہلا گلا مچا رہے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ اس قانون کے نفاذ سے تمہیں کیا تکلیف ہے؟ اس قانون کا نفاذ ایک ایسے ملک میں ہو رہا ہے جہاں 97 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ یہ ملک اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ یہ معاشی، سماجی اور جدلیاتی مسائل کا ناٹک تو 1970ء کے بعد رچایا گیا۔ روٹی تو ہندوستان کے مسلمان کو یوپی، سی پی، بہار، دکن، مشرقی پنجاب اور بنگال میں بھی مل رہی تھی...... پاکستان امریکہ کی طرح مہم جوؤں اور طالع آزماؤں کی حادثاتی دریافت نہیں۔ یہ تو بقول قائد اعظم یہاں کے مسلمانوں کا فطری مطالبہ تھا اور ہے۔ اس پر ''احتجاج'' اگر ملک کے اندر موجود چند جنونی مغرب پرست کر رہے ہیں تو ان کی تعداد انگلیوں کی پوروں سے بھی کم ہے۔

یہ تو بتایئے کہ جب سے یہ قانون منظر عام پر آیا ہے، سلمان رشدی اور راجپال کے کتنے پیروکاروں کی دریچوں پر صلیبیں آویزاں کی گئی ہیں؟ کتنے سلامت مسیحوں کو تختہ دار پر لٹکایا گیا ہے؟ کتنے رشدی، نسرینیں اور ر. پال آج جیلوں کی کال کوٹھڑیوں اور پھانسی گھاٹ کے ڈیتھ سیلوں میں روسو کے ''اعترافات'' لکھنے میں معروف ہیں؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مٹھی بھر مغرب پرستوں اور امریکی چنڈو خانے کے ان طاغوتی چوہوں کے نزدیک کسی بھی ''انسان کا سب سے بڑا بنیادی حق'' توہین رسالت کرنا ہے۔ توہین رسالتؐ ایکٹ کے وجہ سے ذہنی اور فکری عدم توازن کے شکار یہ دانشور اپنے اس بنیادی حقوق سے محروم ہو رہے ہیں، اس لیے وائٹ ہاؤس کے مندر میں براجمان آزادی کے مندر کے ''چیف پروہت'' کو مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔''

نہایت افسوس کی بات ہے کہ مغرب گستاخیِ رسول کو آزادیٔ اظہار سے تعبیر کرتا ہے لیکن اس کے ہاں کسی شخص کو یہ جرأت نہیں کہ وہ ہولوکاسٹ (Holo Caust) پر ایک لفظ بھی ادا کر سکے۔ ہولوکاسٹ کا مفہوم یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ پروپیگنڈہ کیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کے دورِ اقتدار میں پولینڈ کے شہر شوتز میں بنائے گئے گیس چیمبرز میں تقریباً 60 لاکھ یہودیوں کو قتل کیا گیا۔ اس بنیاد پر یہودیوں نے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں ایک الگ ملک دیا جائے۔ اس پروپیگنڈہ کے نتیجہ میں اُن کو اسرائیلی ریاست الاٹ کر دی گئی۔ بعد میں تحقیق ہوئی تو یہودیوں کا دعویٰ سراسر جھوٹا اور من گھڑت نکلا۔ تب یہودیوں نے ایک قانون بنوا دیا کہ ہولوکاسٹ کی مبینہ صداقت کو کہیں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص ہولوکوسٹ کے جھوٹ پر تحقیق کرے گا، وہ قابل گردن زدنی ہوگا۔ 19 جون 2004ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ نے حکومت کو یہ اختیار دیا کہ دنیا میں کبھی بھی، کسی جگہ بھی اگر کوئی شخص 60 لاکھ کی تعداد کو کم بتانے کی کوشش کرے تو وہ اس پر مقدمہ چلا سکتی ہے اور اس ملک سے اسے نفرت پھیلانے کے جرم "Hate Criminal" کے طور پر مانگ سکتی ہے، گرفتار کر سکتی ہے اور سزا دے سکتی ہے۔ جرمنی جیسا ملک سالانہ 50 ملین مارک آج تک اسرائیل کو ادا کر رہا ہے اور یہ جرمانہ 2030ء تک ادا کیا جائے گا۔ اب وہاں یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ کیا واقعی اُس وقت جرمنی میں 60 لاکھ کے قریب یہودی موجود تھے؟ چند سال پیشتر معروف تاریخ دان ڈیوڈ اروِنگ (David John Cawdell Irving) کو آسٹریلیا کی عدالت نے محض اس لیے تین سال کی سزا سنا ڈالی کہ اُس نے صرف اتنا کہا تھا کہ ہولوکاسٹ میں یہودیوں کے قتل کی تعداد اتنی نہیں جتنی مبالغہ آرائی کی جاتی ہے۔ حالانکہ اُس نے عدالت میں بیان دیا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی اور میں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ وہ آسٹریلیا کا شہری نہیں مگر اُسے آسٹریلیا میں سزا دی گئی کیونکہ یورپ میں باقاعدہ یہ قانون ہے کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی شخص ہولوکاسٹ کو چیلنج نہیں کر سکتا، خلاف ورزی کی صورت میں اسرائیل کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے گرفتار یا اغوا کر کے لے آئے اور اُسے سزا دے۔ اس وقت 104 ممالک میں یہودیوں کی تعداد ایک کروڑ 47 لاکھ کے لگ بھگ ہے جن میں سے 55 لاکھ اسرائیل میں رہتے ہیں۔ وہ چاہے دنیا کے کسی بھی ملک میں رہتے ہوں، اپنے ملک سے مخلص اور متحد ہیں، ان کا ایک ہی مقصد ہے: اسرائیل کا تحفظ۔ دنیا بھر کے یہودی اپنی آمدن میں سے سالانہ 7

ارب ڈالر اسرائیل کو عطیہ کرتے ہیں۔ حیرانی ہے کہ اس پدی برابر ملک نے امریکی اور مغربی ممالک کی عدالتوں بلکہ بین الاقوامی عدالت انصاف میں ایسا قانون بنوا دیا ہے کہ ''ہولوکاسٹ'' کے خلاف کوئی بولے یا نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کے کوائف اور اعداد و شمار کو چیلنج کرے یا اختلاف کرے تو وہ قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ اسرائیل کے اس مطالبہ اور مغرب کی ہولوکاسٹ کے خلاف قانون سازی کو اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف عیسائیت کے بعد دنیا کے سب سے پہلے اور بڑے دین اسلام کے مقتدا و پیشوا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خلاف جو بھی بدزبانی اور سوقیانہ پن اختیار کیا جائے، اسے آزادئ صحافت، آزادئ رائے اور آزادئ اظہار کی آڑ میں جائز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہے مغربی تہذیب جس کا چہرہ بظاہر روشن لیکن اندروں چنگیز سے بھی تاریک تر ہے۔ اس کے مقابلہ میں 56 اسلامی ممالک میں ایک ارب 50 کروڑ سے زائد مسلمان رہتے ہیں۔ ان ممالک کی اپنی تنظیم OIC او آئی سی ہے۔ کیا یہ سب ممالک سفارتی سطح پر اقوام متحدہ پر زور نہیں دے سکتے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی عزت و ناموس پر ایک عالمی قانون بنایا جائے کہ کوئی شخص خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتا ہو، اگر مسلمانوں کے رسول اعظم حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کرے تو وہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہودیوں کی دل جوئی کے لیے اقوام متحدہ کی سطح پر قانون سازی کی جا سکتی ہے تو عصمت انبیا بالخصوص حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزت و ناموس کے لیے قانون سازی کیوں نہیں ہو سکتی؟ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے اسلامی حکمران دینی غیرت و حمیت سے سرشار ہوں ورنہ مغرب کے در پر سجدہ ریز ہونے سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔

یاد رہے مغرب خصوصاً امریکا میں ہٹلر کا نشان سواسٹیکا Swastika بنانے، لہرانے، شائع کرنے، پینٹ کرنے یا کسی بھی طرح استعمال کرنے پر سخت پابندی اور قابل جرم ہے۔ خلاف ورزی پر قانون حرکت میں آ جاتا ہے۔ امریکہ میں کوئی شخص اس نشان کی شرٹ پہن کر آزادانہ گھوم پھر نہیں سکتا بلکہ ایسی شرٹس کی خرید و فروخت بھی جرم ہے۔ ہٹلر کے اس امن نازی نشان سے یہودی چڑتے ہیں۔ انہیں اس نشان میں اپنی اصلیت نظر آنے لگتی ہے۔ امریکی حکومت ایسے معاملات کو نظرانداز نہیں کرتی بلکہ اس کا قانون آنکھیں بدل لیتا ہے۔ آزادی اظہار کے علمبردار امریکہ سمیت تمام یورپ میں کسی صحافی کی جرأت نہیں کہ وہ کسی

اخبار، رسالے، کتاب یا اپنی تقریر میں ہٹلر کا یہ تاریخی قول دہرا دے۔ "میں چاہتا تو دنیا کے تمام یہودیوں کو ختم کرسکتا تھا مگر کچھ یہودی میں نے اس لیے چھوڑ دیئے تاکہ دنیا کو پتا چل سکے کہ میں نے یہودیوں کو کیوں قتل کیا؟" کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے ان پر اذیتوں کے پہاڑ ٹوٹ سکتے ہیں۔ مغرب میں یہودی مخالف ہونا جرم ہے، اس پر سزا اور جرمانہ ہے۔ جبکہ وہاں اسلام دشمن ہونا ہر آزاد شہری کا حق ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت، آئین اور قانون اسے مکمل تحفظ اور سرپرستی فراہم کرتے ہیں۔ 2006ء میں ایک معروف بھارتی سرمایہ کار ستیش سبھلوک نے ممبئی بھارت میں ایک جدید ترین ریسٹورنٹ بنایا جسے ہٹلر کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس پر دنیا بھر کے یہودیوں نے بھرپور احتجاج کیا جس پر ریسٹورنٹ کے مالک نے یہودیوں سے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ریسٹورنٹ کا نام تبدیل کر دے گا۔ ریسٹورنٹ کے مالک نے کہا کہ ہماری طرف سے اپنایا گیا نام غیر مناسب تھا اور اس کا مقصد کسی طور پر ہٹلر کے نظریات اور عزائم کو پیش کرنا نہیں تھا اور اس نام کے استعمال سے جو اشتعال پھیلا، اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مغرب کی آزادئ اظہار کہاں چلی جاتی ہے؟ کچھ عرصہ پہلے پیرس، فرانس میں دنیا کے سب سے بڑے فیشن ڈیزائنر جان گیلیانو (John Galliano) نے ایک تقریب میں صرف اتنا کہا تھا "میں ہٹلر کو پسند کرتا ہوں!" اس پر پولیس نے فوراً ڈیزائنر کو گرفتار کرلیا، فرنچ کمپنی نے اسے ملازمت سے فارغ کردیا اور حکومت نے اس سے فرانس کا سب سے بڑا سول ایوارڈ بھی واپس لے لیا۔ یہ بات بھی قارئین کی دلچسپی کا باعث بنے گی کہ انٹرنیٹ پر ہر شخص کو بولنے اور لکھنے کی مکمل آزادی ہے۔ مگر یہاں آپ ہولوکاسٹ کے خلاف کوئی لفظ نہیں بول سکتے۔ گویا یہ یہودیوں کی دم پر پاؤں رکھنے والی بات ہے۔ کوئی فلم اپ لوڈ نہیں کرسکتے، فیس بک اور ٹویٹر وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرسکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ کی گفتگو یا تحریر فوری ختم کردی جائے گی اور آپ کا انٹرنیٹ پر داخلہ ممنوع ہوجائے گا۔ لیکن یہاں اسلام کے خلاف سب کہنے اور بولنے کی پوری آزادی ہے۔

"آزادی اظہار اور "آئی سی سی" کی حیثیت" کے عنوان سے جناب سید راشد احد لکھتے ہیں:

"حال ہی میں ایک حیرت انگیز انکشاف سامنے آیا ہے کہ نیویارک کے قریب واقع گرین وچ ویلیج میں موساد نے اپنا ایک محفوظ ٹھکانہ بنایا ہوا ہے اور یہیں سے وہ سینڈی

ہک جیسے دہشت گردانہ واقعہ میں ملوث ہونے کے الزام کی نفی کی کوشش میں معروف ہے جو کہ اسرائیل کے لیے ہلاکت خیز بدنامی کا سبب ہوا ہے۔اب جب کہ فلسطین اس پوزیشن میں ہے کہ وہ ہیگ کی انٹرنیشنل کریمنل کورٹ میں اسرائیلی جرائم سے پہنچنے والے نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کرے، تو اسرائیل بھی اس فکر میں ہے کہ کسی طرح اس کے خلاف بلند ہونے والی ہر صدائے احتجاج کو خاموش کردے خواہ وہ فلسطینیوں کی جانب سے ہو یا کسی اور کی جانب سے۔اسرائیل نے پہلے ہی یورپ اور دوسرے علاقوں میں پریس ٹی وی کو بند کرانے کی کوشش کی ہے تاکہ اس طرح غزہ میں ہونے والی شکست کے نقصانات اور سینڈی ہک میں ملوث ہونے کی بدنامی کا سدباب کیا جاسکے۔ یورپی ممالک بالخصوص جرمنی، آسٹریا، فرانس، نیدر لینڈ، سوئٹزرلینڈ اور کینیڈا حتیٰ کہ امریکہ میں اسرائیل نے پریس سے متعلق نئے قوانین پاس کرانے کی کوششوں میں مدددی ہے تاکہ مستقبل میں اسرائیل کے خلاف اٹھائے جانے والے اقدامات کو ناکام بنایا جاسکے۔ مثلاً جرمنی اس بات کے لیے آمادہ ہے کہ وہ ہرایک کے خلاف خواہ وہ قانون دان ہو، سفارت کار ہو، صحافی ہو یا پروفیسر ہو، قانونی کارروائی کرے گا، اگر اس نے ایسا کوئی بیان دیا ہو یا ایسی کسی معلومات کی اشاعت کی ہو جو اسرائیل کے مفاد اور اس کی سلامتی کے خلاف ہو۔

جرمنی میں اب یہ جرم ہے کہ کوئی ایسی دستاویز تیار کی جائے، خواہ اقوام متحدہ یا انٹرنیشنل کریمنل کورٹ میں پیش کرنے کی غرض سے ہی سہی، جس میں اسرائیل جرائم کے خلاف ثبوت وشواہد موجود ہوں۔ وہ قانونی ماہرین جو فلسطینی اتھارٹی کی نمائندگی کرتے ہیں اور جنھیں فلسطینی ریاست کی خودمختاری اور بالخصوص بین الاقوامی طور سے اب تسلیم شدہ فلسطین میں ''نیتن یاہو کی یہودی آبادکاری کی نئی منصوبہ بندی'' کے حوالے سے اسرائیل کی حالیہ خلاف ورزیوں کے خلاف مقدمہ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس وقت اسرائیل کی جانب سے انھیں قید و بند کا سامنا ہے۔ایسی رپورٹیں سامنے آئیں ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اخبار کے مدیران، مترجمین اور مصنفین حتیٰ کہ کمپیوٹر ماہرین کے خلاف بھی مقدمات دائر کیے گئے ہیں۔اس معاملے میں عدالت چارہ جوئی سے اقوام متحدہ اور انٹرنیشل کریمنل کورٹ کے ملازمین بھی مستثنٰی نہیں ہیں۔ان لوگوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی ایک طویل تاریخ ہے جنھوں نے ہولوکاسٹ کی تاریخی روداد کو چیلنج کیا ہے۔

سیکڑوں دانشوروں اور ان کے مقدمے کی وکالت کرنے والے قانونی ماہرین حتیٰ کہ صحافی حضرات کو بھی محض اس بنا پر کہ انہوں نے یہودیوں سے متعلق مسائل میں قربانی کا بکرا بننے کے فلسفے (Victimization Dogma) کی پیروی نہیں کی۔ 15 سالوں پر محیط طویل قید و بند کی سزا کاٹی ہے۔ مزید برآں ہزاروں اساتذہ کو اس جرم میں معلمی کے فرائض سے سبکدوش کیا جاچکا ہے اور بہتیرے صحافیوں کو اخبارات اور میڈیا چینلو سے برطرف کیا گیا ہے۔ اسی طرح بہتوں پر سفر کی پابندی عائد کی گئی ہے اور مذکوہ بالا ممالک ان حضرات کے لیے پولیس اسٹیٹ ثابت ہوئے ہیں جہاں ان کی سرگرمیوں کی کڑی نگہداشت کی جاتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ تاریخی روداد پر کسی نظر ثانی کی بات کرنے والوں کو ہراساں کیا جاتا ہے، قید و بند کی سزائیں دی جاتی ہیں حتیٰ کہ انہیں شکنجے بھی دیے جاتے ہیں۔ یہ خیال بعید از امکان نہیں ہے کہ اسرائیلی پالیسیوں کے بہت سارے ناقدین کی غیر متوقع اور مشکوک اموات آزادیٔ اظہار رائے کا گلا گھونٹ دینے کی مہم کا حصہ ہوں۔" (پندرہ روزہ "معارف فیچر" کراچی، یکم فروری 2012ء)

ٹوئٹر (Twitter) دنیا کے مقبول ترین سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس میں ایک ہے۔ اس سائٹ نے جرمن حکومت کی سفارش پر نازی نظریے کے حامی جرمن صارفین کے اکاؤنٹس بلاک کر دیے ہیں۔ ٹوئٹر کے اس فیصلہ کے بعد صرف جرمنی میں اس سائٹ کے صارفین، نازی نظریہ کے حامیوں کے ٹوئٹس تک رسائی حاصل نہیں کر پائیں گے لیکن باقی پوری دنیا کے صارفین ان ٹوئٹس کو دیکھ سکیں گے۔ واضح رہے کہ یہ پہلی بار ہے جب ٹوئٹر نے اپنی مقامی سنسر شپ سے متعلق پالیسی کا نفاذ کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس کی پالیسی پار سال جنوری 2012ء میں وجود میں آئی تھی۔ اس پالیسی کے تحت اگر ٹوئٹر پر شائع ہوئے پیغام یا ٹوئیٹس کسی ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو انہیں مقامی طور پر بلاک کر دیا جاتا ہے اور اسی پالیسی کے تحت جرمنی میں نازی نظریہ رکھنے والے صارفین کے ٹوئٹس بلاک کر دیے گئے ہیں۔ کمپنی کے جنرل کاؤنسل الیکس میگریولی نے سائٹ پر وہ خط بھی شائع کیا ہے جو جرمنی کی پولیس نے انہیں بھیجا تھا۔ جرمن پولیس نے اس خط کے ذریعے ٹوئٹر سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کے ملک میں ان لوگوں کے ٹوئٹس بلاک کر دے جو نازی نظریہ رکھتے ہیں۔

17 ستمبر 2012ء کے گلف نیوز میں معروف خاتون تجزیہ کار لینڈا ایس ہیرڈے نے "آزادیٔ رائے کا نامعقول اظہار" کے عنوان سے لکھا:

''آزادیٔ رائے اور اپنی آواز بلند کرنے کی آزادی دونوں جمہوریت کے ستون ہیں جن کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اسلام کے متعلق یہ شرمناک اور اشتعال انگیز اقدام اسلام سے نفرت کرنے والے اس دھوکہ باز شخص نے کیا جو 21 ماہ جیل میں رہ چکا ہے۔ اگر حکومت اس مواد کو قانون شکن آزادی کے اصولوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کنٹرول نہیں کر سکتی تھی تب بھی غلط زبان کو روکا جا سکتا تھا۔ یقیناً قانونی نظام میں کہیں خرابی ضرور ہے جو بار بار زہر افشانی کرنے والے لوگوں سے معاشرے کو محفوظ رکھنے میں ناکام ہے۔ 65 سالہ فلم ساز نکولا بیسیلے سے پولیس نے تفتیش کی لیکن اسے گرفتاری کا کوئی خوف نہیں کیونکہ بقول اس کے اس نے قانون کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ کیا اس امریکا کو مہذب و متمدن ملک سمجھا جائے گا جہاں انتہائی بنیادی ضرورت کا قانون نہیں۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہوں گے کہ امریکی کانگرس نے 2004ء میں عالمی سامی مخالف ریویو ایکٹ منظور کیا تھا جس میں سامی مخالف کی تعریف یوں کی گئی کہ اس سے مراد اسرائیلی مخالف تند جذبات، سابقہ اور موجودہ اسرائیلی رہنماؤں پر مخاصمانہ تنقید ہے۔ اس میں بعض حقائق کا حوالہ دیا گیا تھا کہ یہ رویہ کسی نہ کسی طرح 60 لاکھ یہودیوں کے ہندسے کو آہستہ آہستہ ختم کر دے گا جو ہولوکاسٹ کا نشانہ بنے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہودی مذہب یا اس کے مذہبی رہنماؤں پر تنقید بھی اسی ایکٹ کی زد میں آئے گی۔ یہ خلاف آئین تھا یا نہیں، اس ایکٹ کی منظوری پر زیادہ ردِعمل نہیں ہوا تھا۔ اس صورت حال میں کیوں نہ اس قانون کو توسیع دی جائے تاکہ مسلمانوں سمیت دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے احساسات و جذبات کا احترام کیا جا سکے''۔

2004ء میں ہالینڈ کے قومی ٹیلی ویژن نے چند خبیثوں کے تعاون سے اسلام کے خلاف نہایت بے ہودہ فلم Submission بنائی جس سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ان تمام واقعات کا مقصد صرف اور صرف مسلمانوں کی دل آزاری کرنا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی ناپاک حرکات ایسے ممالک کے آفیسر کر رہے ہیں جنہیں زعم ہے کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے مہذب، دانشور، حقوق انسانی کے علمبردار اور آزادی اظہار کے رکھوالے ہیں۔

6 اکتوبر 2002ء کو معروف امریکی پادری جیری فال ویل نے امریکی ٹیلی ویژن سی بی ایس (CBS) کے ایک پروگرام سکسٹی منٹس (Sixty Minutes) کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے حضور شفیع المرسلین حضرت محمد ﷺ کی شان میں بدترین گستاخی کا ارتکاب کیا۔ مغرب

پوری دنیا میں آزادی افکار، آزادیٔ ضمیر اور آزادی اظہار کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ پوچھنا چاہیے کہ کیا دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو ذہنی اذیت اور روحانی کرب میں مبتلا کرنا آزادی اظہار ہے؟ کیا مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دینا آزادی ضمیر ہے؟ دنیا کا کوئی قانون یا آئین اس کی اجازت دیتا ہے؟ کیا یہی اخلاقیات ہیں جن پر مغرب کو فخر ہے؟

مغرب جو آزادی اظہار، آزادی رائے، آزادی تقریر و تحریر، حقوق انسانی، امن و آشتی، روشن خیالی، علم و شعور، وسعت نظر، تحمل، برداشت، عدم تشدد، مذہبی رواداری، شہری آزادی، فہم و تدبر، جمہوریت، حقوق نسواں اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ مہذب ہونے کا پرچارک اور بلاشرکت غیرے چیمپین بننے کا دعویدار ہے۔ یہاں ہر رنگ، ہر نسل، ہر قوم اور ہر مذہب کے افراد رہتے ہیں جنہیں یکساں حقوق حاصل ہیں مگر مسلمانوں کے ساتھ اسلام دشمنی کی آڑ میں نفرت انگیز اور متعصبانہ رویہ رکھا جاتا ہے۔ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ، مغرب میں شراب خانوں کو مدینہ اور نائٹ کلبوں کو مکہ کا نام دیا جاتا ہے، کبھی جوتیوں پر قرآنی آیات منقش کر دی جاتی ہیں، کبھی زیر جامہ اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والی تحریریں لکھ دی جاتی ہیں، مسلمانوں کی مسجدوں پر حملے اور ان کی بے حرمتی معمول کی بات ہے، گنبد اور مینار بنانے پر پابندی ہے۔ برقع اور سکارف کو اپنی تہذیب کے خلاف قرار دے کر پابندی لگا دیتے ہیں۔ راہ چلتی برقع پہنے خواتین پر تھوکا جاتا ہے۔ حالانکہ وہاں مردوں اور عورتوں کے سرعام ننگے ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ ڈاڑھی اور پگڑی کو نفرت کی علامت بنا دیا گیا ہے، ایسے مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند ہیں۔ اسامہ بن لادن کی ڈاڑھی اور پگڑی والی تصویریں جوتوں اور انڈر ویئر پر شائع کر کے فروخت کی جاتی ہیں۔ خواتین کے ملبوسات پر مقدس قرآنی آیات چھاپنا، پھر ان ملبوسات کی نمائش کے لیے خواتین کی کیٹ واک کرنا، شراب کی بوتلوں کے ڈھکنوں، کوکا کولا کے کین، فٹ بال اور جوتوں پر کلمہ طیبہ، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لکھنا، اسلام کی مقدس شخصیات کے کرداروں پر فلمیں بنانا، مسجد اقصیٰ میں سور کا سر رکھنے کے شرانگیز واقعات، پرنٹ میڈیا میں اسلامی مقدس شخصیات کی خیالی تصاویر شائع کرنا اور ان کے خیالی مجسمے بنانا، اسم محمد کو انگریزی میں بگاڑ کر لکھنا، رسائل و جرائد اور کتابوں میں توہین کرنا، انٹرنیٹ پر قرآنی

آیات میں تحریف کرنا، فرشتوں، پیغمبروں، رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی فرضی تصاویر اور غلط فرضی معلومات فراہم کرنا تو مغرب کا روزہ مرہ کا معمول ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سب کچھ آزادی مذہب اور آزادئ اظہار کے نام پر کیا جاتا ہے۔

اس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

آج یورپی ممالک میں بلند آواز سے میوزک سننا منع ہے کہ اس سے پڑوسیوں کی سمع خراشی ہوتی ہے، سڑک پر ہارن بجانا خلاف قانون ہے اور گاڑی میں زور سے گانا نہیں سنا جا سکتا، سگریٹ پینے کو اس وجہ سے ممنوع قرار دیا جاتا ہے کہ اس عمل سے دوسروں کے حقوق مجروح ہوتے ہیں۔ مگر دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کے جذبات پر نشتر چلانے کی آزادی ہے۔ بغض ونفرت کی انتہا دیکھیے کہ مسلمانوں کو حلال گوشت کے استعمال سے روکا جا رہا ہے۔ دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اسلامی طریقے سے ذبح کیے گئے جانور کا گوشت بہت سے غیر مسلموں کے نزدیک حرام ہے۔ علاوہ ازیں اس سے اسلامی شرعی قوانین کو فروغ مل رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں برطانیہ میں ویسٹ منسٹر پیلس نے اپنے ریستورانوں میں حلال گوشت فراہم کیے جانے کے مطالبے کو مسترد کر دیا ہے۔ چرچ آف انگلینڈ نے اس فیصلے کی مکمل حمایت اور تائید کرتے ہوئے مزید مطالبہ کیا کہ تمام ہوٹلوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ اپنے ہاں حلال گوشت سے بنی کوئی چیز فروخت نہ کریں۔ باخبر ذرائع کے مطابق یورپی یونین بھی اس اقدام کو قانونی حیثیت دینے والی ہے۔ نومبر 2012ء میں یہ بھی انکشاف ہوا کہ حکومت نے کئی سکولوں میں بچوں کو جو کھانا دیا، وہ غیر حلال یعنی حرام تھا۔ یاد رہے ان سکولوں میں مسلمان طلبا بھی کثیر تعداد میں پڑھتے ہیں جن کے والدین نے اس واقعہ پر شدید احتجاج کیا۔ یہ ہے وہ گھناؤنی تصویر جس نے آزادئ اظہار، آزادئ مذہب اور حقوق انسانی کے مغربی فلسفے اور نعرے کی حقیقت کا پول کھول دیا ہے۔

مغرب مسلمانوں کی دل آزاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اسلام کے بارے میں اس کی سوچ نہایت گھٹیا اور بغض وعناد سے بھری ہوئی ہے۔ 2008ء میں ایک

امریکی کمپنی نے اسامہ بن لادن کی تصویر والا ٹائلٹ ٹشو بنانے کا اعلان کیا تو اسے اتنے آرڈر ملے کہ دن رات فیکٹری چلا کر بھی اس آرڈر کی تکمیل مشکل ہو گئی تھی۔ یہ اس ملک کا حال ہے جو آزادی اظہار کا علمبردار ہے اور پوری دنیا کو اخلاقیات کا درس دیتا نہیں تھکتا۔ 2008ء میں ہی امریکی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے ''ساؤتھ پارک'' نامی مزاحیہ کامیڈی پروگرام شروع کیا جس میں حضور نبی رحمت حضرت محمد ﷺ سمیت تمام انبیائے کرام کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔

اپریل 1990ء میں ہالینڈ کی ایک عالمی شہرت یافتہ شراب فروخت کرنے والی کمپنی نے اپنی تیار کردہ شراب کی بوتلوں کے ڈھکنوں پر کلمہ طیبہ پرنٹ کرنے کی ناپاک جسارت کی۔

1998ء میں کورین کمپنی ''سویز پوسٹ'' نے اپنے تیار کردہ جوتوں کے نیچے لفظ ''اللہ اور محمد'' لکھا۔ اسی سال معروف امریکی کمپنی NIKE نے خواتین کے ملبوسات پر قرآنی آیات پرنٹ کروا کر اس کی فروخت کے لیے نمائش کروائی اور اپنے تیارہ کردہ جوتوں پر لفظ ''اللہ'' لکھا۔ اس سے مسلمانوں میں بے حد اشتعال پیدا ہوا۔ دوسری طرف کمپنی مالکان کی طرف سے کہا گیا کہ جو مسلمان یہ مصنوعات نہیں خریدنا چاہتے، نہ خریدیں لیکن اِس پر احتجاج نہ کریں کیونکہ اِس سے ہمارے حقوق آزادی مجروح ہوتے ہیں۔ اِسے کہتے ''اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''۔

چند سال پیشتر امریکی یہودیوں نے ایک فلم بنائی جس کا نام ''محمد پیغمبر خدا'' تھا۔ مسلمانوں نے اس پر شدید احتجاج کیا، لیکن پابندی نہ لگائی گئی۔ اس پر ایک غیور مسلمان خلیفہ حماس عبدالخالص نے واشنگٹن میں چند یہودی افسروں کو یرغمال بنا کر مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کروایا، مگر بعد میں خلیفہ حماس ہی نہیں، بلکہ اس کی بیوی اور تین معصوم بچوں کو بھی شہید کر دیا گیا۔ اسرائیل کے شہر ''اشدود'' میں قائم یہودی ڈسکو ڈانس کلب کا نام ''مکہ'' رکھا گیا۔ مسلمانوں کے احتجاج پر فوج نے 3 فلسطینیوں کو شہید اور 11 کو شدید زخمی کر دیا۔ خود کو مہذب اور انسانی حقوق کے علمبردار کہلوانے والوں کو یہ بھی نظر نہ آیا کہ مئی 2010ء میں غزہ میں مجبور و مقہور اور محصور و بے کس پر امن فلسطینی مسلمانوں کی امداد کے لیے جانے والے سامان کو نہ صرف اسرائیلی حکومت نے روک لیا بلکہ ان تمام افراد کو گرفتار بھی کر لیا جو سامان لے کر جا رہے تھے۔ کتوں اور بلیوں کے حقوق پر قانون سازی کرنے والوں نے چپ سادھ لی تھی۔ کسی کو احتجاج بلند کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اگست 2012ء میں امریکہ کے شہر ٹیکساس کی ایک فوجی عدالت نے دہشت گردی

کے الزام میں گرفتار امریکی فوج کے ماہر نفسیات میجر ندال حسن (Major Nidal Hasan) کو ڈاڑھی رکھنے پر ایک ہزار ڈالر جرمانہ کرتے ہوئے آئندہ پیشی سے قبل زبردستی اس کی ڈاڑھی منڈوانے کا حکم دیا اور کہا کہ اگر وہ آئندہ پیشی پر ایسی حالت میں عدالت آئے تو وہ توہین عدالت کے بھی مرتکب ہوں گے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ اسلام دشمنی میں کس حد تک چلا گیا ہے۔ حالانکہ یہ وہ ملک ہے جو دنیا بھر کے ممالک کو اپنے ہاں مغربی آزادیوں کے سلسلہ میں مزید مراعات دینے اور رکاوٹوں کو ختم کرنے کا حکم جاری کرتا رہتا ہے۔

دنیا بھر کو مذہبی رواداری اور برداشت کا درس دینے والے امریکہ کا اصل چہرہ دیکھیے کہ وہاں آج بھی مختلف امریکی فوجی کالجز میں اسلام دشمنی پر مبنی نصاب پڑھایا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسلام ایک وحشیانہ مذہب ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جائے گا۔ فوجیوں کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ خود کو اسلام کے خلاف مزاحمتی تحریک کا ایک حصہ سمجھیں۔ نصاب میں یہ بھی درج ہے کہ وقت آنے پر مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات مکہ اور مدینہ پر بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے اس کورس کے انسٹرکٹر لیفٹیننٹ کرنل متھیو ڈولی ہیں جو اپنی اسلام دشمنی میں فوج میں خاصے مشہور ہیں۔

15 مئی 2008ء کو عیسائی انتہا پسندوں نے "دی ریڈیکل آف اسلام" کے نام سے فلم ریلیز کی جس میں حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کی گئی۔ 12 دسمبر 2008ء کو احسان جامی (مرتد) جو کہ ہالینڈ کا رہائشی اور سیاستدان ہے، نے ایک ویڈیو فلم بنائی جس کا نام "محمد سے انٹرویو" رکھا۔ اس ویڈیو فلم کا دورانیہ 15 منٹ ہے، جس میں خواتین کے حقوق، غیر مسلموں سے نفرت کے متعلق خود ساختہ سوالات بنائے گئے۔ جب ہالینڈ کے وزیر اعظم جان پیٹر بالکنندے سے اس پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر مطالبہ رد کر دیا کہ یہاں مذہبی آزادی ہے۔

اسپین کے ایک علاقے گیلاس میں ایک ایسی عمارت تعمیر کی گئی جس پر 20 لاکھ 70 ہزار ڈالر لاگت آئی ہے۔ اسے ایک جامع مسجد کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ دیکھنے والے اسے ایک مسجد ہی سمجھتے ہیں۔ اس عمارت کا نام "مکہ" رکھا گیا ہے۔ مگر جب کوئی شخص وہاں پہنچتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد نہیں بلکہ ایک "نائٹ کلب" ہے جہاں دن رات شراب و

شباب کی محفلیں سجتی ہیں۔ مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا مگر میڈیا نے اسے قطعاً کوئی اہمیت نہ دی اور کہا گیا کہ یہاں ہر چیز کی آزادی ہے۔

آزادی اظہار مغرب کے پاس ایک ایسا ہتھیار ہے جسے وہ جب چاہے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرے اور جب چاہے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرے۔ امریکہ میں شائع ہونے والے ناول "The Last Temptation of Christ" پر 1988ء میں اس نام سے بننے والی فلم ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک عورت سے بوس و کنار کرتے ہوئے دکھایا گیا جس پر عیسائیوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بعد ازاں عیسائیوں نے بعض سینما گھروں پر پتھراؤ کیا اور ان کو نقصان پہنچایا۔ چنانچہ 2010ء میں کئی ملکوں میں اس کی نمائش پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بائبل کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور واقعات پر بنائی جانے والی مشہور فلم "The Ten Commandments" پر ڈنمارک میں پابندی عائد کی گئی۔ یہ پابندی ایک معمولی یہودی کی درخواست پر عائد کی گئی۔ کہا گیا کہ اس میں یہودیوں کی دل آزاری پر مشتمل کئی مناظر ہیں جس سے معاشرے میں نفرت پھیلنے کا خدشہ ہے۔ لہٰذا اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ حالانکہ اس فلم نے 2010ء تک 977 ملین ڈالر کا بزنس کیا تھا۔ اس کے علاوہ معروف ویب سائٹ www.wikipedia.com پر یہود و نصاریٰ کے مفادات پر زد پڑنے والی بے شمار کتابوں اور فلموں پر پابندی کی مکمل تفصیلات موجود ہیں۔

جناب محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ”برطانیہ میں ایک فلم ڈائریکٹر مسٹر ونگرو نے ایک ویڈیو فلم تیار کی جس میں سولہویں صدی کی عیسائی راہبہ ٹریسا جو حضرت یسوع مسیح کی بڑی عقیدت مند تھی، حالت وجد میں صلیب کے گرد رقص کرتے ہوئے اپنا گریبان چاک کر کے اپنے عریاں سینہ کو لہو رنگ کر لیتی ہے اور اسی حالت میں تصوراتی مسیح کا بوسہ لیتی ہے جس پر جناب مسیح کے لبوں کو بھی ہلکی سی جنبش ہوتی ہے۔ اس فلم کو برطانیہ کے سنسر بورڈ نے نمائش کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جس پر یہ معاملہ عدالتوں تک پہنچا۔ جہاں یہ قرار دیا گیا کہ یہ مقدس سینٹ ٹریسا کے کردار کی توہین ہے جس سے برطانیہ کے عیسائی شہریوں کے جذبات مشتعل ہونے کا اندیشہ ہے۔ ان فیصلوں کے خلاف جوڈیشل ریویو کے برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت ہاؤس آف لارڈز میں سماعت کے لیے آیا۔

وہاں کے تمام جج حضرات نے ماتحت عدالتوں کے فیصلہ کو بحال رکھا۔ عدالت عظمیٰ کے ایک معروف لبرل جج اسکارمین نے یہ بھی قرار دیا کہ بلاس فیمی لا (Blaspheme Law) برطانیہ کی سالمیت کے لیے ناگریز ہے۔ اس فیصلہ کو مملکت برطانیہ کے خلاف مسٹرونگرو نے یوروپی یونین کے حقوق انسانی کی اعلیٰ ترین عدالت میں چیلنج کر دیا کہ اس فیصلہ سے ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کے آزادیٔ اظہار کے حقوق ختم ہوئے ہیں جو یوروپی یونین کے کنونشن (آئین) کے آرٹیکل 10 کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یورپ کے ہیومن رائٹس کی اس عدالت عالیہ نے اپنے آئین کے آرٹیکل 10 کی تشریح کرتے ہوئے ہاؤس آف لارڈز کے فیصلہ کی توثیق کر دی اور ونگرو کی اپیل کو مسترد کر دیا۔ مملکت برطانیہ کے حق میں فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا کہ توہین مسیح کے قانون کی بدولت حقوق انسانی کا تحفظ برقرار رہتا ہے۔"

(ناموس رسولؐ اور قانون توہین رسالت ﷺ از محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ)

اکتوبر 2012ء میں پیرس فرانس کے معروف میگزین کلوزر Closer نے برطانوی شہزادہ ولیم (Prince William) کی بیوی کیٹ مڈلٹن (Kate Middleton) کی نیم برہنہ تصاویر شائع کیں تو برطانوی شاہی خاندان نے عدالت کا رُخ کیا۔ عدالتی کارروائی کے دوران رسالے کی انتظامیہ نے موقف اختیار کیا کہ کیمرے سے کھینچی گئی تصاویر حقیقی ہیں۔ شہزادی کھلے عام بےلباسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ قارئین کو بھی یہ منظر دیکھنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ تصاویر پر پابندی لگانا آزادیٔ اظہار کے خلاف ہے، اس سے ہمارا حق آزادی مجروح ہو گا۔ عدالت، رسالے کی انتظامیہ کے موقف سے متفق نہ ہوئی اور دو دن کی سرسری سماعت کے بعد اپنا فیصلہ سناتے ہوئے اس جریدہ کو فوری طور پر مزید تصاویر شائع کرنے سے روک دیا جبکہ برطانوی ملکہ الزبتھ کو خوش کرنے کے لیے اس اخبار پر نہ صرف ایک لاکھ یورو کا جرمانہ عائد کیا گیا بلکہ انتظامیہ کو حکم دیا کہ شہزادی کی تمام اصل مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصاویر فوری طور پر شاہی خاندان کو واپس کر دی جائیں اور کسی شکل میں بھی انہیں دوبارہ شائع نہ کیا جائے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ اگر کسی دوسرے میگزین نے ان تصاویر کو شائع کیا تو میگزین کلوزر کو 10 ہزار یورو جرمانہ ادا کرنا ہوگا کیونکہ پہل اس میگزین نے کی ہے۔ یہ تصاویر آئرلینڈ کے ایک اخبار "آئرش اسٹار" نے بھی شائع کیں جس کی پاداش میں اخبار کے ایڈیٹر کو فوری طور پر برطرف کر دیا گیا۔ انٹرنیٹ پر خرید و فروخت کے سب سے بڑے ادارے "eBay" نے بھی اپنے

کسی بھی لنک پر تینوں جریدوں کلوزر، شائی اور آئرش اسٹار کو اپ لوڈ کرنے پر تا حکم ثانی پابندی لگا دی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تصاویر نہ تو من گھڑت خاکے تھے اور نہ کوئی تصوراتی فلم۔ یہ تو ایک حقیقت تھی جو کیمرے کی آنکھ نے دیکھی اور محفوظ کر لی۔ آزادیٔ اظہار کے علمبرداروں سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور اس جریدے پر پابندی لگا دی۔ پورے یورپ سے اس میگزین کی تمام کاپیاں اٹھا لی گئیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ پبلشرز نے عدالت اور شاہی خاندان سے غیر مشروط معافی بھی مانگی مگر عدالت نے اپنا حکم سنا دیا۔ اس کے برعکس جب دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خاکے مغربی اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں تو یہ عدالتیں منافقت اور دوغلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہم اظہار آزادی پر پابندی نہیں لگا سکتے۔

عیسائیوں کی طرف سے اسلام کے خلاف توہین آمیز واقعات پر احتجاج کرنے والے مسلمانوں کو برداشت کا سبق دینے والے پوپ بینی ڈکٹ خود عدم برداشت کے کتنے اونچے درجے پر فائز ہیں، اس کا اندازہ روزنامہ گارجین لندن کا 15 ستمبر 2010ء کا اخبار پڑھ کر کیا جا سکتا ہے جس میں پوپ بینی ڈکٹ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے یورپ اور برطانیہ میں لانچ کی جانے والی آئس کریم کمپنی انتونیو فریڈریکی (Antonio Federici) کی اشتہاری مہم پر غیظ وغضب کا مظاہرہ کیا اور اس اشتہاری مہم کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے اعلیٰ برطانوی حکام کو اس اشتہاری مہم کو روک دینے کا حکم دیا جس کے چند گھنٹے بعد لندن کے حکام نے اپنا فرض عین سمجھتے ہوئے اس اشتہاری مہم کو روک کر اس پر ہمیشہ کے لیے پابندی عائد کر دی۔ اطالوی آئس کریم کمپنی کے اشتہار کے حوالے سے ایڈورٹائزمنٹ واچ ڈاگ کا کہنا تھا کہ وہ اشتہار عیسائیوں کے لیے ناقابل برداشت تھا، اس لیے اس کو ہٹا دیا گیا۔ آئس کریم کمپنی انتونیو فریڈریکی کے اشتہار میں ایک عیسائی راہبہ کو حاملہ دکھایا گیا ہے جس پر پوپ بینی ڈکٹ نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ واضح رہے کہ آئس کریم کمپنی کے لیے اشتہار تیار کرنے والی اشتہاری کمپنی کا کہنا تھا کہ اس نے اشتہار میں وہی معاملات دکھائے جو اس وقت بھی یورپ اور کلیسا میں ایک کڑوی حقیقت کے طور پر موجود ہیں۔ یورپ سے لے کر امریکہ اور آسٹریلیا سے لے کر افریقہ تک پھیلے کلیساؤں میں بدکردار پادریوں کے کارنامے خود یورپی اور امریکی میڈیا منظر عام پر لا چکا ہے۔ حال ہی میں برطانیہ میں ایک

پادری نے برطانوی شہزادے کی منگنی ٹوٹنے کی پیش گوئی کی تو اس پادری کو چرچ سے فارغ کر دیا گیا۔ پوپ بینی ڈکٹ نے اس بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی حالانکہ اسے اس معاملہ میں زیادہ بڑھ چڑھ کر بولنا چاہیے تھا۔

شراب نوشی دین اسلام اور عیسائی مذہب دونوں میں سختی سے حرام ہے۔ ہمارے علما کرام مسلمانوں کو شراب نوشی سے روکتے اور اس کی خرید و فروخت کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عیسائی ''پوپ'' سمیت تمام پادریوں کا یہ حال ہے کہ قانونِ آزادیٔ اظہار ہونے کے باوجود اُن کی جرأت نہیں کہ وہ شراب کی خرید و فروخت کے خلاف کوئی بات کر سکیں۔ کیونکہ اِس صنعت سے کروڑوں لوگ وابستہ ہیں اور روزانہ لاکھوں ڈالر کا بزنس ہوتا ہے۔ مختلف شراب کمپنیوں کے مالکان چرچ کو وسیع چندہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے پادری حضرات شراب کی مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتے، بلکہ حد یہ ہے کہ امریکہ میں مشہور شراب کا نام "Bloody Merry" حضرت مریم علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں کنٹربری میں برطانیہ کا قدیم ترین گرجا گھر فروخت کیا گیا۔ سب سے زیادہ بولی شراب کے تاجر نے دی۔ آج یہ چرچ شراب خانے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایسے معاشرے سے مقدس ترین ہستیوں کی عزت و توقیر کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ جس روز پوپ نے بائبل کی روشنی میں شراب نوشی اور اس کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا، اُسی روز اُس کی اِس پرکشش عہدہ سے چھٹی ہو جائے گی۔ اِسلام دشمن مستشرق سر ولیم میور اعتراف کرتا ہے: ''اسلام فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ترکِ میکشی کرانے میں جیسا وہ کامیاب ہوا ہے، کوئی اور مذہب نہیں ہوا ہے۔'' (لائف آف محمد: 521) انیسویں صدی کے ربع آخر میں لندن میں چرچ کانگرس کے ایک اجلاس کے موقع پر ایک ممتاز پادری اسحاق ٹیلر نے کہا تھا: ''دنیا میں انسدادِ میکشی کی سب سے بڑی انجمن خود اسلام ہے، برخلاف اس کے ہماری یورپین تجارت کے قدم جہاں جہاں پہنچتے جاتے ہیں، مے نوشی و بدکاری اور لوگوں کی اخلاقی پستی بڑھتی ہی جاتی ہے۔''

دسمبر 2010ء میں معروف ویب سائٹ وکی لیکس کے بانی اور آسٹریلوی صحافی جولین اسانج Julian Assange کی گرفتاری نے مغرب کے دعویٔ آزادیٔ صحافت کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ ان کی ویب سائٹ نے امریکہ کی خفیہ دستاویزات کے اجرا کے ذریعے عالمی شہرت حاصل کی اور دنیا بھر کے سفارتی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ اسانج کے

انکشافات دنیا بھر میں متعین امریکی سفیروں کے مراسلات، خفیہ بات چیت اور سرگرمیوں کی رپورٹوں پر مشتمل تھے۔ ان انکشافات سے امریکہ کی سفارتی منافقت، مختلف ملکوں کے خلاف سازشوں، اندرونی معاملات میں مداخلت اور انہیں اپنے زیر اثر لانے کے غیر قانونی ہتھکنڈوں کا راز فاش ہوگیا۔ اس پر امریکی حکومت آپے سے باہر ہوگئی۔ اس نے سویڈن اور برطانوی حکومت پر زور دیا کہ اس پر مقدمات قائم کر کے اسے گرفتار کیا جائے۔ چنانچہ سویڈن حکومت نے امریکی دباؤ کے تحت جنسی جرائم کے الزام میں ایک پرانے مقدمہ میں جولین اسانج کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے۔ اسانج کی سرگرمیاں چونکہ برطانیہ میں جاری تھیں، اس لیے اس کی گرفتاری برطانوی پولیس کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ یہ ہے امریکہ اور یورپ کے ممالک کی آزادی اظہار کی اصل حقیقت! جب اظہار رائے کے ذریعے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے تو آزادی کے بارے میں ان کے قوانین تبدیل ہو جاتے ہیں اور جب مسلمانوں کی دل آزاری مقصود ہو تو کہہ دیتے ہیں کہ آزادی رائے پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔

یہاں بطور خاص یاد رہے وکی لیکس نے یہ بھی خوفناک انکشاف کیا تھا کہ امریکی سفارت کار، انٹیلی جنس معلومات کے لیے عیسائی چرچوں کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے وسیع نیٹ ورک سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی پادریوں کو پوری دنیا میں تبلیغ کی آڑ میں جاسوسی کرنے، ارتداد پھیلانے کی مکمل آزادی اور امریکی سرپرستی حاصل ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اگر عیسائی مشنریز کو ان کی خلاف قانون سرگرمیوں سے روکا جائے تو وہ پوری دنیا میں چیخ چیخ کر پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ان کی آزادی مذہب پر پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ چنانچہ پورا مغربی میڈیا ان کی حمایت میں نکل آتا ہے۔

سی آئی اے کے سابق اہلکار جان کیرایکو (John Kiriakau) جس نے 1990ء سے 2004ء تک سی آئی اے کے لیے کام کیا، نے 2007ء میں ایک ٹی وی انٹرویو میں صحافی کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اسے امریکی انڈر کور ایجنٹ کا نام بتایا اور یہ بھی سچ اگلا کہ گوانتاناموبے جیل میں مسلمان راہنما ابوزبیدہ سے تفتیش کے دوران تشدد و بربریت کے کون کون سے ہولناک طریقے استعمال کیے گئے تھے۔ جان کیراٹیکو کے اس سچ بولنے پر اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آزادی کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں جنہیں عبور کرنا قانونی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مغرب میں اسلام کے خلاف

ہرزہ سرائی "ایسی آزادی" کہلاتی ہے جس کی کوئی حدود نہیں، خواہ اس سے کتنا ہی فساد فی الارض کیوں نہ پھیلے کیونکہ مغرب سمجھتا ہے کہ اسلامی روایات کی پامالی اس کا حق ہے۔

اسرائیل کا معروف صحافی یوری ایونری (Uri Avnery) یہودی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور آج کل تل ابیب میں رہتا ہے۔ وہ اسرائیل کے فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم پر اکثر احتجاج کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنا ایک رسالہ HaOlam HaZeh بھی نکالتا ہے۔ اس پر کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ بعد ازاں اس کے دفتر کو نامعلوم افراد نے نذر آتش کر دیا جس سے اس کا تمام قیمتی ریکارڈ جل کر راکھ ہو گیا۔ پولیس نے حملہ آوروں کو گرفتار کیا لیکن بعد ازاں انہیں "پاگل" قرار دے کر چھوڑ دیا گیا ..... تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر یہی صحافی اسلامی تعلیمات پر حملہ کرتا، مسلمانوں کے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی تنقیص کرتا، قرآن مجید کے بارے ہرزہ سرائی کرتا یا مسلمانوں کے مقدس مقامات پر نعوذ باللہ حملہ کرنے کی بات کرتا تو وہ آج اسرائیل کا ہیرو قرار پاتا۔ امریکہ اسے نوبیل انعام کے لیے نامزد کرتا، برطانوی ملکہ اسے سر کے خطاب سے نوازتی۔ سویڈن اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری جاری کرتا۔ جرمنی اسے اپنے ملک کی شہریت دے دیتا، فرانس اسے کسی بھی شہر کا میئر بننے کی پیش کش کرتا۔ ڈنمارک اپنے ہاں کسی معروف سڑک کا نام اس سے منسوب کر دیتا، اقوام متحدہ پوری دنیا میں اسے اپنا خیر سگالی کا سفیر مقرر کرتا۔ ویٹی کن سٹی اس کے اعزاز میں عالمی عشائیے کا اہتمام کرتا، پوپ اسے اپنا نمائندہ قرار دیتا، عالمی کلیسا بائبل میں سے کوئی فقرہ نکال کر اس پر منطبق کرتے ہوئے اسے "مجاہد" قرار دیتا، سی این این، بی بی سی، اور سکائی نیوز کے نمائندے اس سے انٹرویو کے لیے بے چین ہوتے، اسے سخت سیکورٹی فراہم کی جاتی، ہر بڑی یونیورسٹی میں اس کے لیکچر ہوتے۔ اس کا شمار مغربی تھنک ٹینکس میں ہوتا، ہالی وڈ اس پر فلمیں بناتا............

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

آزادیٔ اظہار کے علمبرداروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود یورپ میں بھی آزادیٔ اظہار بے لگام نہیں ہے۔ 1985ء میں امریکہ کی ریاست ٹیکساس کے شہر واکو میں ایک شخص ڈیوڈ کوریش (David Koresh) نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ اپنے آپ کو "Yeh Weh" (پرانی کتابوں میں خدا کا نام) کہلواتا تھا۔ اس نے ٹیکساس میں دو ایکڑ اراضی پر اپنی

قلعہ نما رہائش تعمیر کروائی ہوئی تھی۔ وہ وہاں اپنی بے شمار نوجوان بیویوں، بچوں اور پیروکاروں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اس قلعے میں عیاشی کا مکمل سامان موجود تھا۔ اس کے پیروکار ہمہ وقت شراب وشباب میں ڈوبے رہتے۔ یہی ان کی عبادت تھی۔ اس کے پیروکاروں کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ آخر کار اپریل 1993ء میں امریکی صدر بل کلنٹن نے ایف بی آئی (FBI) کو اس کا قلعہ تباہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ فروری 93ء میں تربیت یافتہ کمانڈوز نے بکتر بند گاڑیوں کی مدد سے چھاپہ مارا تو دونوں اطراف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ جس کے نتیجہ میں 10 سے زائد افراد جاں بحق ہو گئے۔ پولیس نے 51 دن تک عمارت کا محاصرہ کیے رکھا۔ بالآخر عمارت کو آگ لگا دی گئی جس سے ڈیوڈ سمیت 100 سے زائد افراد ہلاک ہو گئے جن میں 21 چھوٹے بچے بھی شامل تھے۔

ہم اس اقدام کی تائید کرتے ہیں کہ جعلی عیسیٰ کے مدعی کو قتل ہونا چاہیے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دعویدار جھوٹا مسیح موعود امریکہ میں دعویٰ کرتا ہے تو وہاں کی حکومت اس فتنہ کا فوراً قلع قمع کر دیتی ہے لیکن جب کوئی جھوٹا مسیح موعود پاکستان یا ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے تو امریکی حکومت نہ صرف اس کی سرپرستی کرتی ہے بلکہ حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالتی ہے کہ ان کا ہر صورت میں خیال رکھا جائے۔ آخر یہ منافقت کیوں؟ جس طرح جعلی عیسیٰ بننے اور اس پر ایمان لانے والوں کو سزا دی گئی ہے، اس طرح جعلی محمد (ﷺ) بننے اور نبوت و رسالت کے لٹیروں پر بھی اس سزا کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اور اگر حکومت پاکستان اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھاتی ہے تو اس پر کسی کی ناک بھوں نہیں چڑھنی چاہیے۔ اگر حقوق انسانی کی تنظیموں کو 100 کے قریب انسانی جانوں کا زندہ جلا دینا انسانی حقوق کی خلاف ورزی نظر نہیں آیا (جیسا کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہوا) تو پھر کسی کا ایسے ہی کسی جرم میں پھانسی چڑھا دینا کیونکر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوسکتا ہے؟ اگر گستاخ رسول ﷺ کی سزا، سزائے موت انسانی حقوق کے منافی ہے تو سو انسانوں کو زندہ جلا دینا بدرجہا اولیٰ انسانیت کا قتل قرار پاتا ہے اور جب اپنے پرائے مذہب کے نام پر جعل سازی کرنے والوں کی سزا پر متفق ہیں تو گستاخ رسول ﷺ کی سزا پر بھی کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آتا ہے جبکہ اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی آتا ہے نظر
دیکھ اے غافل، اپنی آنکھ کا شہتیر بھی

2003ء میں معروف امریکی مصنف اور ناول نگار ڈان براؤن Dan Brown نے ایک ناول "دی ڈونچی کوڈ" The Da Vinci Code لکھا۔ عیسائی راہنماؤں کا کہنا تھا کہ اس ناول میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات پر رکیک حملے کیے گئے ہیں اور مصنف نے آپ کی شخصیت کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہوئے انتہائی دیدہ دہنی کا ثبوت دیا ہے۔ عیسائی راہنماؤں کا کہنا ہے کہ یہ ناول عیسائیت کے خلاف ایک گھناؤنی سازش کا ارتکاب ہے۔ بعد ازاں 2006ء میں ہالی وڈ نے اس ناول پر فلم بنائی جس پر عیسائی دنیا نے زبردست احتجاج کرتے ہوئے اس ناول اور فلم پر پابندی کا مطالبہ کیا۔ بعض ممالک میں اس متنازعہ ناول کی اشاعت، خرید و فروخت اور فلم کی نمائش وغیرہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس متنازعہ ناول کے خلاف معروف عیسائی مصنف ارون ڈبلیو لٹزر نے ایک کتاب شائع کی جس کا ترجمہ "ناول ڈونچی کوڈ کے پس پشت کیا ہے؟" کے نام سے معروف عیسائی ادیب ڈاکٹر کنول فیروز نے کیا جسے پاکستان بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور نے 2008ء میں شائع کیا۔ یاد رہے یہ وہی ڈاکٹر کنول فیروز ہیں جو پاکستان میں برداشت، رواداری اور آزادیٔ اظہار کے بڑے مبلغ تصور کیے جاتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جب یورپی اخبارات و رسائل نے حضور نبی کریم ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کیے تھے تو دنیا بھر کے مسلمانوں کے بھرپور احتجاج پر یورپی کمیشن کے صدر جوز مینوئل باروسوہ (Jose Manuel Barrose) نے اس ناپاک جسارت کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ آزادیٔ اظہار ہے اور آزادیٔ اظہار پر کوئی بات نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ہمارے آزاد اور جمہوری یورپی معاشرے کی ایک اہم اور ضروری قدر ہے۔ حالانکہ ایسا عمل آزادیٔ رائے کا مسئلہ نہیں بلکہ فساد فی الارض ہے۔

2004ء میں ہالی وڈ کے معروف ہدایت کار مل گبسن (Mel Gibson) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر ایک نئی فلم "دی پیشن آف دی کرائسٹ" The passion of the Christ ریلیز کی جس نے امریکی سینماؤں میں کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ اس فلم میں بائبل کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آخری 12 گھنٹوں میں یہودیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کیے جانے والے بہیمانہ ظلم و تشدد کو جس انداز میں دکھایا گیا، خدشہ تھا کہ امریکہ میں عیسائی یہودی فسادات شروع ہو جاتے۔ چنانچہ یہودیوں کے احتجاج پر امریکی حکومت نے اس فلم کی نمائش پر فوری پابندی لگا دی۔ حالانکہ اس فلم نے ابتدائی چند ہفتوں میں

600 ملین ڈالر کا بزنس کیا تھا۔

اگست 2012ء میں روس کی معروف گلوکارہ ماریا رائیو کینا کے خلاف ماسکو کے ایک چرچ میں حکومت کے خلاف گانا گانے پر مقدمہ درج کیا گیا۔ بعد ازاں عدالت نے گلوکارہ کو 2 سال کی قید سنا کر جیل بھیج دیا۔ کچھ عرصہ قبل افغان جنگ پر تنقید کرنے پر برطانوی رکن پارلیمان پائل فلائن کی رکنیت ختم کر دی گئی۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ خود مغرب میں آزادی اظہار بے لگام نہیں بلکہ اس کی کچھ حدود اور قیود ہیں۔ بے لگام آزادی اظہار کے علمبرداروں سے پوچھنا چاہیے کہ جب آپ روڈ پر گاڑی چلاتے ہیں تو چوراہوں پر سرخ لائٹ روشن ہونے پر کیوں گاڑی روک لیتے ہیں؟ حالانکہ سڑک بھی خالی ہوتی ہے اور وہاں کوئی سپاہی بھی نہیں ہوتا۔ محض چالان کا ڈر ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ اس کا مطلب ہے کہ مغرب میں ہر آزادی مادر پدر آزاد نہیں۔ اس کی چند قیود و حدود بھی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی تذلیل کے سلسلہ میں مغرب ہر قانون، آئین اور اخلاقیات سے عاری ہے۔ یہ رویہ مغرب کے کھلے تعصب اور تنگ نظری کا آئینہ دار ہے۔

آزادئ اظہار کے علمبرداروں کو بھارت کی بھی خبر لینی چاہیے جہاں آپ کشمیر کی آزادی کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتے جہاں آپ مہاتما گاندھی کا کوئی کارٹون شائع نہیں کر سکتے جہاں ہندوؤں کی فرسودہ رسوم و رواج پر بات نہیں سکتے جہاں پاکستان زندہ باد! کہنے پر غداری کا مقدمہ درج ہو جاتا ہے، جہاں مسلمان بچوں کو زبردستی بندے ماترم پڑھایا جاتا ہے جہاں گائے کی قربانی تو بڑی دور کی بات ہے، اس کے تذکرہ سے ہی پورے بھارت میں فسادات پھیل جاتے ہیں اور حکومتی سرپرستی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو جاتا ہے۔

آزادی اظہار کے علمبرداروں کی منافقت ملاحظہ کیجیے کہ 1931ء میں ایک ہندو پنڈت نے سوامی دیانند کے خلاف ''رنگیلا رشی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں سوامی دیانند کی شرمناک کرتوتیں بیان کی گئی تھیں۔ ہندو پریس نے اس کتاب کی مخالفت میں آسمان سر پر اٹھا لیا اور حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب پر فوری طور پر پابندی عائد کی جائے کیونکہ ایسی کتابیں ان کے لیے نہایت نقصان دہ ہیں۔ (ماہنامہ آریہ سماج جلد 2، شمارہ 10، مارچ 1931ء)۔ اس کے برعکس 1923ء میں جب ملعون راجپال نے دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کی محبوب ترین شخصیت حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان اقدس کے

خلاف نہایت دل آزار کتاب شائع کی تو مسلمانوں کے ہاں کہرام مچ گیا اور کتاب کے خلاف پورے ملک میں احتجاجی جلسے اور جلوس نکلنا شروع ہو گئے۔ اس پر تمام ہندوؤں اور ان کے پریس نے مکمل کر ملزم راجپال کے موقف کی حمایت کی اور اسے ہر ممکن اخلاقی، مالی اور جانی تعاون پیش کرنے کا اعلان کیا۔ پوچھنا چاہیے کہ مذہبی منافرت پھیلانے، نفرت انگیز مواد شائع کرنے اور مقدس ترین ہستیوں کی توہین کرنا کیا ہندو مذہب کا حصہ ہے؟ کیا ان میں اتنی بھی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ راجپال کی مذموم حرکت پر ملامت کرتے؟ عجیب ہے جب ان کے اپنے مذہبی راہنما پر تنقید ہوئی تو سب کو ''احترام'' یاد آ گیا۔

جولائی 1997ء کے پہلے ہفتے فلسطین میں غزہ کی پٹی کے نزدیک، جہاں مقام الخلیل پر یہودیوں نے مسلمانوں کے شدید احتجاج کے باوجود نئی بستیاں بسانی شروع کر دی تھیں، ایک یہودی عورت نے دانستہ دیواروں پر ایسے پوسٹر چسپاں کیے جس میں نبی کریم ﷺ اور قرآن حکیم کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ یہ پوسٹر انتہائی دل آزار تھا، جس کے چسپاں ہوتے ہی فلسطینی مسلمانوں میں شدید اضطراب پھیل گیا۔ چنانچہ انہوں نے ہر جگہ مظاہرے کیے اور اسرائیلی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس عورت کے پیچھے اس گروہ کو سخت سزا دے جس نے دراصل یہ کام کروایا ہے۔ اس پوسٹر کی وجہ سے پیدا ہونے والے ہنگاموں میں اسرائیلی فوجیوں نے پانچ فلسطینی شہید کر دیے۔ امریکہ میں مقیم یہودیوں نے یک آواز اعلان کیا کہ الخلیل میں جس یہودی عورت نے حضور نبی پاک ﷺ کے بارے میں دل آزار پوسٹر چسپاں کیے، وہ درست اور حقیقت پر مبنی تھے۔ نیو یارک سے شائع ہونے والے معروف یہودی ہفت روزہ ''دی جیوش ویک'' (The Jewish Week) نے 11 جولائی 1997ء کے شمارے میں اس ملعون عورت کے حق میں ایک طویل اداریہ تحریر کرتے ہوئے اسے اسرائیل اور عالمی یہودیوں کی ''مجاہدہ'' کے لقب سے یاد کیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔

جرمنی کے علاقے ڈریسڈن میں مصری خاندان سکونت پذیر تھا۔ یہ مختصر سی فیملی تین افراد پر مشتمل تھی۔ علوی عکاظ شوہر، مروۃ الشربینی بیوی اور ان کا ڈھائی سالہ پیارا معصوم سا بچہ مصطفیٰ۔ اسکندریہ (مصر) سے یہ فیملی مشرقی جرمنی شفٹ ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ مروۃ الشربینی کے شوہر علوی عکاظ کو ڈریسڈن میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی تھی اور وہیں ان کی جاب تھی۔ مروۃ الشربینی ایک دین دار خاتون تھیں، وہ شام کے وقت مقامی پارک میں چہل

قدمی کے لیے گئیں۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا مصطفیٰ بھی تھا۔ حسب معمول مروۃ الشربینی نے حجاب زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان کے پاس ایک شخص ایلیکس وینز (Alex Wiens) آیا، اس نے نہ صرف حجاب کی مذمت کی، برا بھلا کہا بلکہ اس نے مروۃ الشربینی کو نازیبا کلمات کہے۔ مروۃ الشربینی ایک غیرت مند خاتون تھیں۔ انہوں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ یکم جولائی 2009ء کو مقدمے کی کارروائی کے دوران ایلیکس نے بھری عدالت کے اندر مروۃ الشربینی پر خنجر کے پے در پے وار کر کے انہیں شہید کر دیا اور جب ان کے شوہر انہیں بچانے کے لیے آئے تو سیکورٹی اہلکاروں نے ان پر فائرنگ کر دی جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے۔ اس الم ناک اور دلسوز سانحہ پر پورا مغرب خاموش ہے۔ ہیومن رائٹس کی ساری تنظیموں کی زبانیں گنگ ہیں، آزادی اظہار اور جمہوریت کی دعویدار ریاستوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستین
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

آزادی اظہار، آزادی اظہار کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے امریکہ اور مغربی ممالک کو کیا معلوم ہے کہ برما میں کوئی مسلمان اظہار رائے کی آزادی تو بڑی دور کی بات ہے، اس پر ایک لفظ تک ادا نہیں کر سکتا۔ آج کل برما کے مسلمانوں پر کس قدر ظلم و تشدد ہو رہا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برمی مسلمان جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، انہیں معزول کر دیا گیا اور ان کی جگہ بدھسٹوں کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے مال و جائیداد سرکاری تحویل میں لے لیے گئے ہیں۔ 300 سے زائد مدارس و مکاتب بند کر دیے گئے ہیں، ان کی کتابوں، اخبارات اور جرائد پر پابندی عائد کر دی گئی، بچوں سے زبردستی بیگار لی جا رہی ہے، نوجوانوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا ہے، اب تک 35 ہزار کے قریب برمی مسلمانوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔ مسلم راہنماؤں کو جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔ سرکاری فوج مسلمان خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ انہیں مسلم نام رکھنے، قرآن مجید پڑھنے، مسجد میں جانے، روزہ رکھنے، اذان دینے پر سختی سے ممانعت ہے، یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے ملک ہجرت بھی نہیں کر سکتے۔ چھپ چھپا کر بے پناہ اذیتوں اور صعوبتوں کے بعد ہجرت کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے۔ ان کے سارے بنیادی انسانی حقوق سلب کر لیے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کی اس حالت زار پر اقوام متحدہ بھی خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہا ہے۔ یہی

حالات عیسائیوں کے ہوتے تو اقوام متحدہ اس ملک پر حملہ کرنے کی منظوری دے دیتا۔

سینیٹر بلیک اسٹون Black Stone کی وہ تقریر جو امریکا میں آزادی اظہار خیال کے قانون کی بنیاد تصور کی جاتی ہے، اس میں اس نے اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہر آزاد شخص کو بلاشبہ یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ عوام کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کر سکے، اس پر پابندی لگانا پریس کی آزادی کو ختم کرنا ہے، لیکن اگر وہ ایسی بات چھاپتا ہے جو نامناسب، شر انگیز یا غیر قانونی ہو تو اسے اپنی جسارت کی ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔ پریس کو محتسب کی قدغن کے ماتحت کرنا آزادی ضمیر کو ایک ایسے شخص کے ذاتی رجحان پر چھوڑنا ہوگا جسے علم، مذہب اور حکومت کے اختلافی مسائل میں فیصلہ کن اور غلطی سے مبرا مان لیا گیا ہو، لیکن خطرناک اور مجرمانہ تحریریں جنھیں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ مقدمہ کے بعد نقصان دہ سمجھا جائے۔ اس پر سزا دینا امن وامان، حکومت اور مذہب کی بقا کے لیے ضروری ہے کیونکہ انہی پر شہری آزادی کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس طرح افراد کا ضمیر تو آزاد ہے لیکن اس کے غلط استعمال پر سزا دینا تعزیراتی قانون کا مقصد ہے۔''

بقول شخصے: ''آزادیٔ اظہار بڑی پرفریب اصطلاح ہے۔ اس کی آڑ میں جو منہ میں آئے، بولنا اور لکھنا جائز سمجھ لیا گیا ہے۔ ایک اصطلاح آزادیٔ عمل کی بھی ہے، اس کا اطلاق پہلے مقصد کے حصول کے بعد کیا جاتا ہے یعنی جب کسی قوم کو آزادی اظہار کے ذریعے بے حس بنا دیا جائے تو پھر اسے آزادی عمل کا چکمہ دیا جاتا ہے کہ اب جو کرنا ہے، کر گزرو۔ کوئی پوچھ کچھ نہیں ہوگی، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا۔ امریکی اور مغربی تہذیب دونوں حدیں پار کر چکی اور اب وہ باقی دنیا کو بھی اپنے سانچے میں ڈھالنے پر تلی ہوئی ہے۔ مادر پدر آزادی کا نظریہ مسلم ممالک پر زبردستی ٹھونسا جا رہا ہے۔''

امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس اولیور ہومز (Oliver Wendell Holmes) نے 1919ء میں اپنے ایک فیصلہ میں کہا تھا کہ ''فری سپیچ'' کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی آدمی ایک بھرے ہوئے تھیٹر میں اٹھ کر آگ، آگ، آگ کا شور مچا دے کیونکہ اس آزادی اظہار کے نتیجہ میں جو بھگدڑ مچے گی، وہ جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے اور یوں یہ آزادی اظہار ایک مجرمانہ فعل بن جائے گا جس کی قانون میں کوئی گنجائش نہیں۔

کیا امریکہ اور مغربی ممالک کی جمہوری حکومتوں کے اندر کسی شخص کو آزادی اظہار

کے نام پر یہ کہنے اور لکھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ جمہوریت کے برعکس فاشزم اور آمریت کا پرچار کرے؟ کیا ان ممالک میں کوئی شخص ہولوکاسٹ کے خلاف فلم بنا سکتا ہے؟ کیا وہاں کسی پب کے دروازے پر لکھا جاسکتا ہے کہ یہاں آئرش، سیاہ فام نگر (Nigger) اور کتوں کا داخلہ بند ہے؟ کیا وہاں جہاد کے بارے میں کوئی تقریر، تحریر، سٹکر یا وال چاکنگ ہوسکتی ہے؟ کیا وہاں ماں اور بیٹی جو ایک ہی بوائے فرینڈ پر گزارا کرتی نظر آتی ہیں، کوئی شخص ان کے خلاف ایک جملہ بھی ادا کرسکتا ہے؟

''آزادی اظہار کے مغربی نعرے کی اصل حقیقت'' کے عنوان سے روزنامہ ''اسلام'' کراچی اپنے اداریہ میں لکھتا ہے:

''ہمارے نمائندے کی رپورٹ کے مطابق عافیہ موومنٹ کی سب سے پہلے بنائی جانے والی فیملی ویب سائٹ www.freeaafia.org کو بلاک کر دیا گیا جبکہ 3 ماہ قبل ایک ای میل اکاؤنٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے حوالے سے بنائی گئی ان کی فیملی ویب سائٹ جو 8 سال پہلے بنائی گئی تھی، اس ویب سائٹ پر ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے تمام حالات زندگی اور عافیہ کیس کے حوالے سے دستاویزات موجود تھیں۔ عافیہ موومنٹ کے ترجمان کے مطابق جب ویب سائٹ سے متعلق انٹرنیٹ سرچ انجن گوگل سے رابطہ کیا گیا تو اس کا کہنا تھا ''ویب سائٹ قوانین کی خلاف ورزی'' کرنے کی وجہ سے بند کر دی گئی ہے۔ تاہم اس کی کوئی ٹھوس توجیہ نہیں کی گئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغرب اور اس کی سرپرستی میں چلنے والے بین الاقوامی ابلاغی اداروں کی جانب سے ''آزادیٔ اظہار'' کے نعروں کی اصل حقیقت کیا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے بغض وعناد کی سطح کس حد تک پہنچ چکی ہے۔ حالیہ دنوں اسی گوگل کمپنی کے ذیلی ادارے یوٹیوب پر توہین رسالتؐ پر مبنی نہایت دل آزار فلم چلائی گئی تو پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا اور گوگل سے اپیل کی گئی کہ دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو ذہنی اذیت پہنچانے والی اس ویڈیو کو یوٹیوب سے ہٹایا جائے لیکن گوگل نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے انکار کر دیا۔ اب اس کی جانب سے ڈاکٹر عافیہ کی مظلومیت دنیا پر واضح کرنے کے لیے بنائی گئی ایک ویب سائٹ کو سراسر ناجائز طریقے سے بند کیا گیا ہے۔ اب دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس کمپنی کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔'' (روزنامہ اسلام کراچی 24 اکتوبر 2012ء)

المیہ یہ ہے کہ پاکستان ایسی اسلامی نظریاتی مملکت میں بیشتر انگریزی اخبارات و رسائل اسلام اور نظریۂ پاکستان کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ آج تک ان کے خلاف حکومت یا کسی ادارہ نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ یہ لوگ مغرب میں سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کی غیر معمولی پذیرائی دیکھ کر ایسے مضامین لکھتے ہیں اور اس کی آڑ میں بے پناہ مراعات حاصل کرتے ہیں۔ صد حیف کہ ایسے لوگ صحافت کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا محمود نے 1952ء میں اپنی جماعت کو ہدایت کی تھی کہ ہمارا تناسب فوج میں دوسرے محکمہ جات سے بہت زیادہ ہے، لیکن پھر بھی ہمارے حقوق کی حفاظت پوری طرح سے نہیں ہو سکتی۔ اس لیے باقی محکمہ جات پولیس، ریلوے، فنانس، اکاؤنٹس، کسٹمز، انجینئرنگ وغیرہ تمام محکموں میں ہمارے آدمیوں کو جانا چاہیے۔ اس تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے 10 فروری 2006ء کو لندن کی قادیانی عبادت گاہ میں قادیانی جماعت کے پانچویں خلیفہ مرزا مسرور نے دنیا بھر کے قادیانیوں کو ہدایت کی کہ وہ صحافت کا شعبہ اپنائیں۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ہاں انگریزی صحافت میں زیادہ تر قادیانیوں کا غلبہ ہے جو اسلام اور پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو منہدم کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا جب کسی نہ کسی انگریزی اخبار میں قادیانیوں کو تمام سیاسی جماعتوں کی طرف سے متفقہ طور پر پارلیمنٹ سے غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے والی منظور شدہ آئینی ترمیم واپس لینے، قانون ناموس رسالت ﷺ اور حدود قوانین ختم کرنے، آئین سے قراردادِ مقاصد کو کالعدم قرار دینے، پاکستان کو ایک سیکولر مملکت بنانے، اس کے نام سے اسلامی جمہوریہ کے الفاظ حذف کرنے، ناچ گانے کو سرکاری سرپرستی دینے، دینی مدارس پر پابندی لگانے، اسرائیل کو تسلیم کرنے، ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو بدنام کرنے، غدار پاکستان ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی کو قومی ہیرو قرار دینے، تعلیمی نصاب سے اسلامیات کا مضمون ختم کرنے، بسنت اور ویلنٹائن ڈے قومی سطح پر منانے، میراتھن ریس کو قومی کھیل قرار دینے، نیو ائیر نائٹ کو ثقافت قرار دینے، اپریل فول کو تفریح قرار دینے، سکولوں میں فیشن شو کرنے، گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والے لڑکے لڑکی کو قانونی تحفظ دینے، اسقاط حمل کی اجازت دینے، کنڈوم کلچر کو فروغ دینے، ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کو "Love Child" کہنے، شریعت اسلامیہ کو ناقابل عمل قرار دلوانے، جہاد کو دہشت گردی قرار دینے، ہم جنس پرستی کو انسانی حق

قرار دینے، طوائفوں کو جنسی ورکر قرار دینے، مشترکہ خاندانی نظام کو سبوتاژ کرنے، شراب اور جوئے سے پابندی ہٹانے، عارضی شادی کی اجازت دینے، بھارتی فلموں کی نمائش پر پابندی ہٹانے، آئین پاکستان سے اسلامی دفعات ختم کرنے، صدر اور وزیراعظم کے لیے مسلمان ہونے کی شرط ختم کرنے، مردوں کی دوسری شادی پر پابندی لگانے، پاک بھارت کرنسی ایک کرنے، ایٹمی پروگرام ختم کرنے، پاک فوج کے موٹو جہاد، تنظیم، اتحاد کو تبدیل کرنے یا ڈرون حملوں کے خلاف احتجاج کو ممنوع قرار دینے کے بارے میں کوئی نہ کوئی سٹوری یا مضمون شائع نہ ہوا ہو۔

ہمارے ہاں بعض سیکولر سیاسی راہنما، ٹی وی اینکر اور کالم نگار بھی گاہے بگاہے نہ صرف خود شعائر اسلامی کا مذاق اڑاتے بلکہ کھلم کھلا گستاخانِ رسول کی حمایت اور تائید بھی کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں کہیں بھی توہین رسالت کا کوئی واقعہ ہو، یہ سیکولر فاشسٹ فوراً امریکہ کے اشارے پر مسلمانوں پر سیاسی اور نفسیاتی دباؤ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں برداشت اور رواداری کا درس دیتے ہیں۔ انہیں آزادئ اظہار کے نئے معنی ومفہوم سمجھاتے ہیں۔ احتجاج اور مظاہروں کو تشدد پسندی کا نام دیتے ہیں۔ ان کی جسارت دیکھیے کہ یہ بدذات لوگ توہین رسالتؐ کے لیے Trivia کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس کا معنی ہے معمولی معاملات، ادنیٰ چیز، غیر اہم، ہیچ، پوچ، یعنی ان سیکولر حضرات کے نزدیک ناموس رسالت ﷺ ایک غیر اہم اور ادنیٰ چیز ہے جسے مسلمانوں کو اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ ان ملعونوں نے میڈیا پر اب اسلامی اقدار، تہذیبی روایات اور دینی تعلیمات کے خلاف باقاعدہ جارحانہ یلغار کا آغاز کر دیا ہے۔ اسلام کے خلاف ان کے ذہنوں میں کدورت، تعصب، بغض وعناد اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ دلیل و برہان سے بات کرنے کے بجائے ریٹنگ کے چکر میں وہ اسلام کے خلاف ہمیشہ اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ یورپی معاشرے کی تعریف وتحسین میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ ان کی رواداری، آزادئ اظہار، احترام انسانیت اور ترقی یافتہ مہذب ہونے کے گیت گاتے رہتے ہیں۔ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا آزادئ اظہار، احترام انسانیت اور ترقی یافتہ مہذب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی حضرت محمد ﷺ کی شان میں توہین کر کے زمین پر فساد پھیلایا جائے؟

امریکی ڈالروں اور ویزوں سے ''فیض یاب'' ہونے والے یہ سیکولر، دہریے، بے دین اور مذہب بیزار آئے روز اپنے کالموں اور پروگراموں کے ذریعے معاشرے میں فکری انتشار، علمی کثافت اور ذہنی ژولیدگی پھیلاتے رہتے ہیں۔ اسلام اور پاکستان کی نظریاتی

سرحدوں کے خلاف ان کے زہریلے تجزیے ان کے باؤلے پن اور گندی ذہنیت کا بین ثبوت ہیں۔ وہ پاکستان کے ساتھ لفظ ''اسلامی جمہوریہ'' سے شدید چڑ کھاتے ہیں۔ بے غیرت بریگیڈ کا یہ ہراول دستہ ہر متفقہ اور اجماعی مسئلہ میں شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے۔ انجمن غلامانِ امریکہ کے ان عہدیداروں کا کہنا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اللہ اکبر کا نعرہ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ (نعوذ باللہ)! ان ضمیر فروشوں کی اکثریت ''فتنہ غامدیت'' کی پیروکار ہے جس کے بانی نے متنازع فلم ''بول'' کے مکالمے لکھ کر اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دیا۔ جاوید غامدی کے متعلق اب یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ وہ یہودی تنظیم فری میسن کا اہم ممبر ہے جس کے ذمہ اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنا ہے۔ غامدی اور اسکے چیلے چانٹے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اپنے فرائض خبیثہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کررہے ہیں۔ انہیں زعم ہے کہ وہ کسی افلاطون یا ارسطو سے کم نہیں۔ ان کا یہی احساس برتری ان کے بھیانک انجام کی خبر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری سول سوسائٹی، این جی اوز اور دیگر فارن ایڈ فنڈڈ ادارے جو حقوق انسانی، آزادی اظہار اور رواداری کے فروغ کے لیے جلسے اور جلوس نکالتی ہیں۔ کسی غیر مسلم کی نکسیر بھی پھوٹ جائے تو یہ تنظیمیں ہاہاکار مچا دیتی ہیں۔ لیکن ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی دل آزاری اور توہین رسالت کے واقعات پر انہیں سانپ کیوں سونگھ جاتا ہے؟ ان واقعات سے مکمل چشم پوشی اور سکوت کس ایجنڈے کی نشاندہی کرتا ہے؟ سیکولر میڈیا کی خاموشی کس سازش کی چغلی کھا رہی ہے؟ ظاہر ہے، یہودیوں، عیسائیوں اور قادیانیوں سے مال بٹورنے والے اپنے سرپرستوں اور آقاؤں کے خلاف یہ کیسے بول سکتے ہیں؟ مغرب کے ان پرستاروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''سورج'' ہمیشہ مغرب میں غروب ہوتا ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو مسلمانوں کی صفوں میں ہوتے ہوئے ان کے خلاف اپنی توانائیاں صرف کرنے کو سرمایہ افتخار سمجھے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کو صبر، تحمل، رواداری اور برداشت کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ لیکن مجال ہے کہ انہوں نے کبھی گستاخانِ رسولؐ یا ان کے سرپرستوں کے خلاف کبھی کوئی جملہ کہا ہو۔ ہمارے ہاں گستاخ رسول کے سر کی جب قیمت لگائی جاتی ہے تو اس پر وہ ناک بھوں چڑھا لیتے ہیں۔ اسے عدم برداشت کا نام دیتے رہتے ہیں۔ لیکن جب امریکہ ہمارے ہاں مذہبی راہنماؤں کے سر کی قیمت مقرر کرتا ہے تو سب کے لبوں پر مہر سکوت ثبت ہو جاتی ہے۔ (کاش! انہیں تب کوئی کہے: ''بول'' کہ لب آزاد ہیں تیرے)!

ہمارے ہاں جو سیکولر دانشور، ٹی وی اینکر اور کالم نگار آزادیٔ اظہار کی آڑ میں توہین رسالت ؐ کا ارتکاب کرنے والوں کے ردِعمل میں مسلمانوں کو برداشت، تحمل، وسعت نظری، آزادی اظہار اور رواداری کا درس دیتے ہیں، ان سے پوچھنا چاہیے کہ روزمرہ زندگی میں خود ان کا اپنا طرز عمل کیا ہے؟ وہ اکثر اوقات اپنے نقطہ نظر سے اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں پر اس قدر برہم ہو جاتے ہیں کہ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہے۔ پوچھنا چاہیے کہ اگر ان کے نزدیک آزادی اظہار کی اتنی اہمیت ہے تو وہ مسلمانوں کو اپنے موقف کے اظہار کی آزادی دینے کے لیے کیوں تیار نہیں؟

یہ امریکی گماشتے اور سامراج کے زلہ ربا مسلمانوں کو یہ درس دیتے نہیں تھکتے کہ ہمیں یورپ کے "مذہب" آزادی اظہار کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ پاکستان میں آزادی اظہار پر پابندی ہے، اس لیے یہ ترقی نہیں کر سکا۔ آزادی اظہار کے ان نام نہاد علمبرداروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود یورپ میں بھی آزادی اظہار بے لگام اور مادر پدر آزاد نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب ان کے اپنے مفادات پر زد پڑتی ہے تو قانون حرکت میں آ جاتا ہے اور جب اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل مقصود ہو تو قانون پھر خواب خرگوش کی نیند سو جاتا ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں سیکولر انتہا پسندوں کے قلم اسلامی تعلیمات کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں اور ٹیلی ویژن کے ٹاک شوز میں بیٹھ کر خاک اڑاتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ اعتدال پسند کہلواتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی اسلام پسند دلیل اور منطق کی بنیاد پر ان کی کسی رائے سے اختلاف کر دے تو فوراً اس پر انتہا پسندی کا الزام لگا کر اسے قابل گردن زنی قرار دے دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین کو سائنس اور جدید ٹیکنالوجی سے نا آشنا قرار دے کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن حیف! خود انہیں آداب طہارت تک معلوم نہیں۔ وہ اس پر بھی شرمندہ رہتے ہیں کہ ان کے ماں باپ نے ان کی مرضی کے بغیر ان کے "ختنے" کیوں کروائے؟

ان سیکولر فاشسٹوں کا کہنا ہے کہ ہمیں قائد اعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کا پاکستان چاہیے۔ ان سے پوچھنا چاہیے کہ اگر قائد اعظم محمد علی جناحؒ اور حضرت علامہ اقبالؒ آج ہمارے درمیان موجود ہوتے تو کیا وہ توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے؟ حضرت قائد اعظمؒ نے تو خود غازی علم الدین شہیدؒ کا مقدمہ لڑا اور علامہ اقبالؒ نے غازیؒ کے جنازہ پر ایک تاریخی جملہ کہا تھا "اسیں گلاں کر دے رہ گئے، تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا!!!" ایک گستاخ رسول کو واصل جہنم کرنے والے غازی عبدالرشیدؒ کی

شہادت پر حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ اے مرد مسلماں! تجھے کیا یاد نہیں؟
حرف لا تدع مع اللّٰہ الٰھاً آخر

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے فروری 1948ء میں کہا تھا: "پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے اور یہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بنائے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس دستور کی شکل و ہیت کیا ہوگی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوگا۔" 21 نومبر 1945ء کو سرحد مسلم لیگ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ وہ مسلمان ایسے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطہ حیات، اپنے تہذیبی ارتقاء، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کرسکیں۔" 24 نومبر 1945ء کو قائداعظم نے سرحد مسلم لیگ کانفرنس سے دوبارہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا "ہمارا دین، ہماری تہذیب اور ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں۔"

یاد رہے کہ قیام پاکستان سے قبل حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ نے 101 مرتبہ اور قیام پاکستان کے بعد 14 مرتبہ ایسے ہی خیالات کا برملا اعلان کیا۔ پوچھنا چاہیے کہ کیا ان نظریات کا حامل کوئی سیکولر ہوسکتا ہے؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ آزادئ اظہار کی آڑ میں توہین رسالت کے مرتکبین، ان کے ہمنواؤں اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کے ہوش ٹھکانے لگانے کے لیے غازی علم الدین شہیدؒ اور غازی ملک ممتاز حسین قادری کے مقدس مشن کو آگے بڑھایا جائے۔ یہی ان کا اصل علاج ہے۔ چھوٹی موٹی دوا دینے سے یہ "راجپال کے جانشین" ٹھیک نہیں ہوں گے۔

آخر میں ایک ضروری بات کہ امریکہ بلکہ پوری دنیا کی معیشت کا انحصار مسلم ممالک پر ہے۔ اگر آج مسلم ممالک امریکہ کی تیل پر سے اجارہ داری ختم کردیں اور اس کی تمام مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کردیں تو "آزادی اظہار" کے علمبردار امریکہ کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ مغرب نے تو اپنے خبث باطن کا ثبوت دے دیا ہے، اب مسلمان ملکوں کے جذبہ

ایمانی کی آزمائش کا وقت ہے۔

اس سلسلے میں ممتاز سیاسی تجزیہ نگار جناب آصف جیلانی کہتے ہیں:

"اسلام کے دشمن امریکیوں اوران کے اتحادیوں کی مصنوعات کے بائیکاٹ کا راز، یہ راز کوئی نیا نہیں اور نا آزمودہ نہیں بلکہ برصغیر کی جدوجہد آزادی کے دوران یہ ہتھیار آزمایا ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ کے نسل پرست نظام کے خاتمہ میں بھی یہ ہتھیار کارگر ثابت ہوا تھا۔ آج کل امریکہ اور مغربی ممالک اپنے فیصلے دوسرے ملکوں پر مسلط کرنے کے لیے تادیبی اقتصادی پابندیوں کے نام سے بائیکاٹ کا یہی ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ آج اگر پاکستان کے مسلمان اپنے دین کی عزت اور اپنے رسول ﷺ کے ناموس کے تحفظ کی خاطر یہ ہتھیار اٹھالیں اور امریکی مصنوعات کے بائیکاٹ کا اعلان کردیں تو تجارت وسرمایہ کو اپنا ایمان سمجھنے والے اور اس کی خاطر جان دینے والے امریکی سرمایہ داروں کے ایوان لرز اٹھیں گے۔ اس ہتھیار میں پاکستان کے عوام کو ایسی زبردست قوت حاصل ہوگی کہ امریکہ کو زیر نہیں تو کم از کم جھکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے عوام کے سامنے یہ فیصلہ کا وقت ہے جو قوموں کی زندگی میں بہت کم آتا ہے۔ ایک طرف اپنے دین اور اپنے نبی پاک ﷺ کے ناموس کی حفاظت کا معاملہ ہے جس کے لیے امت مسلمہ کا بچہ بچہ اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے ہرلحہ تیار رہتا ہے، دوسری طرف اسلام اور رسول ﷺ کے دشمنوں کے ہاتھوں میں اپنی تقدیر اور اپنی اگلی نسلوں کا مستقبل سونپ دیتا ہے۔ امریکی اور اس کے اتحادیوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ پاکستان کے عوام اور ان کی معیشت کی آزادی کا نقیب ثابت ہوگا۔ شروع میں مشکلات تو پیش آئیں گی لیکن بہت جلد پاکستان ایک نئی آزادی سے روشناس ہوگا۔ پاکستان کے عوام کو فیصلہ کرنا ہے کہ کیا وہ ناموس رسول ﷺ کا تحفظ کریں گے یا اسلام کے دشمنوں کی معیشت کی آبیاری میں جتے رہیں گے۔ اگر پاکستان کے عوام بے بسی کا طوق اتار کر اور مغرب کی ذہنی غلامی کی بیڑیاں توڑ کر اس وقت اٹھ کھڑے نہیں ہوتے تو پھر مظاہروں، نعروں اور ناموس رسالت ﷺ کے لیے جان دینے کا دعویٰ نہ کریں۔"

اپنے مالک سے تعلق کی نئی راہیں بھی ڈھونڈ
صرف سجدوں ہی سے روشن اپنی پیشانی نہ کر

ورقہ بن نوفل، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچیرے بھائی تھے۔ وہ توریت اور انجیل کے زبردست ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے نامور عالم اور بزرگ تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا اور پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ

گھر تشریف لائے اور اپنی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سارا واقعہ بیان کیا۔ وہ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جنھوں نے یہ سارا ماجرا سن کر کہا تھا کہ آپ نبی آخر الزماں ہے جن کا انتظار کیا جارہا ہے۔ آپ کے پاس آنے والا فرشتہ وہی ہے جو دیگر انبیا پر خدا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کی شان میں کئی اشعار کہے، ان میں ایک بہت ہی فکر انگیز اور خوبصورت ہے

بان محمدا سیسود فینا

ویخصم من یکون له حجیجا

ترجمہ: "حضرت محمد ﷺ ہم میں عنقریب سردار ہو جائیں گے اور ان کی جانب سے جو شخص کسی سے بحث کرے گا، وہی غالب رہے گا"۔

یعنی جو مسلمان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے گستاخان رسول اور ان کے حامیوں سے بحث و مباحثہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ عزت اور طاقت عطا فرمائیں گے۔ ایک دفعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھری مجلس میں صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر اپنی خواہش کا اظہار فرمایا: "مخالف شعرا کی ہرزہ سرائیاں حد سے بڑھتی جارہی ہیں تم لوگوں نے تلوار سے تو میری مدد کی ہے، کیا کوئی ایسا بھی ہے جو زبان سے میری مدد کرے"۔ اس موقع پر حضرت حسان بن ثابتؓ اٹھے اور کہنے لگے، یا رسول اللہ ﷺ اس خدمت کے لیے یہ ناچیز حاضر ہے چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کی عزت و ناموس کا تحفظ اپنی زبان و قلم سے کیا۔ اس پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو بے شمار دعائیں دیں۔ یہ فیض آج بھی گنبد خضریٰ سے جاری و ساری ہے بشرطیکہ کوئی خود کو اس کا اہل ثابت کرے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اخلاص اور نیک نیتی سے حضور نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے میدان عمل میں آئے اور اپنے لیے روز محشر شفاعت محمدی ﷺ کا سامان پیدا کرے۔ ورنہ یاد رکھیے! جو مالک ارض وسما ابرہہ کی ناقابل تسخیر فوج سے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے ابابیلوں کا معمولی لشکر بھیج کر اُسے کھائے ہوئے بھوسے میں تبدیل کر سکتا ہے، وہ اپنے محبوب نبی ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔ اس نے تو خود اپنے محبوب سے فرمایا ہے: ترجمہ: "آپ کا استہزا کرنے والوں کے لیے ہم کافی ہیں"۔ (الحجر:95) اللھم صلی علیٰ محمد خاتم النبیین و خاتم المرسلین.

۞......۞......۞

پروفیسر خورشید احمد

اظہار رائے کی آزادی اور مغرب

آزادیِ اظہار رائے اور آزادیِ صحافت پر مغربی اقوام اپنی اجارہ داری کا کیسا ہی دعویٰ کریں، حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق ہمیشہ سے انسانی معاشرے اور تہذیب سے رہا ہے اور یہ ان کی ایجاد نہیں۔ آج بلاشبہ مغربی ممالک میں ان اقدار کا بالعموم اہتمام و احترام ہو رہا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ انہی ممالک میں ان آزادیوں کا خون نہ کیا جا رہا ہو۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں اپنے اپنے زمانے میں آزادی اظہار کا ایک مرکزی مقام رہا ہے۔ گو اس کے آداب اور اظہار کے طریقوں میں فرق رہا ہے۔ اسلام نے اوّل دن سے آزادی اظہار کو ایک بنیادی انسانی ضرورت اور قدر کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی دے کر پیدا کیا ہے اور وہ اس آزادی کو اس حد تک بھی لے جا سکتا ہے کہ خود اپنے خالق کا انکار کر دے۔ بلاشبہ اس انکار کے نتائج اس کو بھگتنے پڑیں گے مگر انکار کا حق اسے دیا گیا ہے۔ مغرب کو زعم ہے کہ روسو نے یہ کہا تھا کہ Man is born free, but is everywhere in chains. (انسان آزاد پیدا ہوا، لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے) لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادی کا تصور وحی الٰہی پر مبنی ہے اور قرآن اس کا جامع بیان ہے۔ نیز نبی اکرم ﷺ کا خطبہ حجۃ الوداع (9ہجری) تاریخ کا پہلا چارٹر ہے اور سیدنا حضرت عمرؓ نے روسو سے بارہ سو سال پہلے فرمایا تھا کہ تم نے انسانوں کو غلام کب سے بنا لیا؟ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

قولوا قولاً سدیدا کا حکم دے کر قرآن نے آزادی اظہار کا دستوری حق تمام انسانوں کو دیا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے اصول میں مذہبی رواداری اور حقیقی تکثیریت (Genuine Plurality) کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔ امرھم شوریٰ بینھم کے ذریعے پورے اجتماعی نظام کو آزادی، مشاورت اور حقیقی جمہوریت سے روشناس

کرایا گیا۔ حکمرانوں سے اختلاف کے حق کو فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ ورسولہ کے فرمان کے ذریعے قانون کا مقام دے دیا گیا۔ آزادئ اظہار پر مغرب کی اجارہ داری کا دعویٰ تاریخ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

لیکن آزادی کے معنی مادر پدر آزادی نہیں، آزادی تو صرف اس وقت ہی ممکن ہو سکتی ہے جب اس کی حدود کا واضح تعین ہو اور ایک کی آزادی دوسروں کے لیے دست درازی اور غلامی کا طوق نہ بن جائے۔ جرمن مفکر ایمانویل کانٹ (Immanul Kant) نے بڑی پتے کی بات کہی ہے جب اس نے کہا:

I am free to move my hand but the freedom of my hand ends where your nose begins.

میں اپنے ہاتھ کو حرکت دینے میں آزاد ہوں، لیکن جہاں سے تمہاری ناک شروع ہوتی ہے، میرے ہاتھ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آزادی اور انارکی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آزادی اگر حدود سے آزاد ہو جائے تو پھر انارکی بن جاتی ہے اور دوسروں کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔ آزادی اور ذمہ داری اور حدود کی پاسداری لازم وملزوم ہیں۔ آزادی اظہار کے نام پر نہ تو دوسروں کی آزادی اور حقوق کو پامال کیا جا سکتا ہے اور نہ آزادی اظہار کو دوسروں کی عزت سے کھیلنے اور ان کے کردار کو مجروح کرنے کا ذریعہ بننے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظام میں آزادی کو قانونی، اخلاقی اور ملکی سلامتی کی حدود میں پابند کیا جاتا ہے۔ جان، مال، عزت وآبرو کی حفاظت کے فریم ورک ہی میں آزادی کارفرما ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی سلامتی، معاشرے کی بنیادی اقدار کا تحفظ اور شخصی عزت وعفت کا احترام ہر نظام قانون کا حصہ ہے۔ اقوام متحدہ کا چارٹر آف ہیومن رائٹس بھی آزادی اور حقوق کو ملکی قانون اور معاشرے کی اقدار سے غیر منسلک (Delink) نہیں کرتا۔

آزادئ اظہار کا حق غیر محدود نہیں ہے۔ عالمی ضابطہ برائے شہری اور سیاسی حقوق **(International Convention on Civil and Political Right ICCPR)** اس آزادی کو صاف الفاظ میں تین چیزوں سے مشروط کرتا ہے، یعنی امن عامہ، صحت اور اخلاق کو قائم رکھنا **Maintenance of public order, health and**

morals اس کے نفاذ کے لیے ہر ملک اپنا قانون بناتا ہے لیکن عالمی سطح پر بھی کچھ اہم ضوابط (Conventions) ہیں اور دنیا کے بیش تر ممالک نے ان کی توثیق کی ہے اور وہ بین الاقوامی قانون کا حصہ ہیں۔ اس سلسلے میں ایک عالمی ضابطہ نسلی امتیاز کی تمام شکلوں کے خاتمے کے لیے (International Convention on Elimination of All Forms of Racial Discrimination - ICERD) ہے جس کے ذریعے نسلی تفاخر، نفرت اور نسلی تفریق کے فروغ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس قانون کے تحت لازم کیا گیا ہے کہ تمام ممالک ان لوگوں کو سزا دیں جو نسلی اور گروہی منافرت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں عالمی سطح پر نسلی امتیاز کے خاتمے کے لیے ایک کمیٹی (The Commitee on the Elimination of Racial Discrimination - CERD) ہے جو متذکرہ بالا قانون (ICERD) کے نفاذ کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کمیٹی کی عمومی ہدایات (xv of CERD) یہ ہیں:

> ''ملکی جماعتوں کے لیے لازمی ہے کہ نسلی تفاخر یا نسلی منافرت پر اُکسانے کو قابل تعزیر جرم قرار دیں۔ کسی بھی قسم کی قومی، نسلی یا مذہبی منافرت کی وکالت جسے نسلی امتیاز پر اُبھارنا قرار دیا جا سکے، قانوناً ممنوع ہوگی۔ اس طرح کی تعزیر اظہار رائے کی آزادی سے مطابقت رکھتی ہے۔ ان فرائض کو ادا کرنے کے لیے سرکاری پارٹیاں نہ صرف مناسب قانون سازی کریں گی بلکہ اس کے نفاذ کو یقینی بنائیں گی۔ کسی شہری کا آزادی اظہار رائے کا یہ حق خصوصی ذمہ داری اور فرائض رکھتا ہے''۔ (عمومی سفارش نمبر 15، سی ای آر ڈی)

اسی طرح انسانی حقوق کی کمیٹی (Human Rights Committee - HRC) ہے جس نے درجنوں رپورٹیں تیار کی ہیں اور ان میں وہ رپورٹ بھی موجود ہے جس میں آزادی کے اظہار کی حدود کا واضح تعین کر دیا گیا ہے، اس لیے کہ اوپر مذکورہ کنونشن کی دفعہ 20(2) میں مرقوم ہے کہ: ''آزادی اظہار رائے کے حق کا استعمال اپنے ساتھ خصوصی فرائض اور ذمہ داریاں رکھتا ہے''۔ (آرٹیکل 20[25])

ایک مشہور عدالتی فیصلے Faurisson vs France میں HRC کا فیصلہ ہے:

"ایسے بیانات پر، جو یہودیت دشمن جذبات کو ابھاریں یا انہیں تقویت دیں، پابندیوں کی اجازت ہوگی تاکہ یہودی آبادیوں کے مذہبی منافرت سے تحفظ کے حق کو بالا دست بنایا جا سکے"۔

اسی طرح انسانی حقوق کے یورپی کنونشن کا فیصلہ ہے:

"اظہار رائے کی آزادی کے اس حق کا اطلاق ان معلومات اور نظریات پر بھی ہوگا جو ریاست یا آبادی کے کسی حصے کو ناراض کریں، صدمہ پہنچائیں یا پریشان کریں۔ کثیر القومیتی معاشرت اور روا داری کے یہی تقاضے ہیں جن کو پورا کیے بغیر کوئی جمہوری معاشرہ قائم نہیں ہوتا"۔(Hyndyside) کیس)

اسی طرح ایک اور اہم فیصلے میں عدالت نے یہ اصول اس طرح بیان کیا ہے:

"دفعہ 9 میں کسی مذہب کے ماننے والوں کے مذہبی احساسات کے احترام کی جو ضمانت دی گئی ہے، بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی احترام کی علامات کو اشتعال انگیز انداز میں پیش کر کے اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ مذہبی احترام کی ان علامات کا اس طرح سے پیش کرنا اس رواداری کے جذبے کی بدنیتی سے خلاف ورزی قرار دی جا سکے جو ایک جمہوری معاشرے کی خصوصیت ہونا چاہیے۔

مذہبی عقائد کی جس انداز سے مخالفت کی جائے یا انکار کیا جائے، اس کا جائزہ ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے، یہ ذمہ داری کہ خاص طور پر دفعہ 9 کے تحت جس حق کی ضمات دی گئی ہے، اسے ان عقائد کے علم بردار پُر امن طور پر استعمال کر سکیں۔ عدالت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی ایسے فرد پر پابندی لگا دے جو کسی مذہب کی مخالفت یا انکار میں اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتا ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو، ان خیالات سے بچا جا سکے جو دوسروں کے لیے اشتعال انگیز ہوں"۔

(Otto Preminger Institut vs Austria)

اسی اصول کو اور بھی وضاحت کے ساتھ ایک دوسرے مقدمے کے فیصلے میں اسی عدالت نے یوں بیان کیا ہے کہ:

> "مذہبی تقدس کی حامل باتوں کا اشتعال انگیز اور پُر تشدد طور پر پیش کرنا دفعہ 9 کے تحت دیے گئے حقوق کی خلاف ورزی شمار ہو سکتا ہے۔ ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ عقائد کے بارے میں حساس اقلیتوں کو حملے سے تحفظ دے۔ ریاست کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی حق کے استعمال کو کسی قاعدے میں لانے کے لیے کسی فرد کی اظہار رائے آزادی میں مداخلت کرے۔ ریاست کا یہ فریضہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ افراد اور سرکاری اداروں کے درمیان تعلقات کے دائرے میں مذہبی احترام کو یقینی بنائے۔ اس فریضے کو مناسب ترقی دینے سے ہی یہ ممکن ہے کہ یورپی کنونشن برطانیہ میں اقلیتی مذاہب کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کر سکے"۔

بین الاقوامی قانونی اور عالمی عدالتوں کے فیصلے اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں اور کوئی جمہوری ملک محض جمہوریت اور آزادی اظہار وصحافت کے نام پر مذہبی منافرت، مذہبی شخصیات کی تذلیل وتضحیک اور کسی انسانی گروہ کے جذبات سے مذہبی، تہذیبی یا لسانی اہداف کو تحقیر اور تمسخر کا نشانہ بنا کر کھیلنے کا حق نہیں رکھتا اور اس سلسلے میں معاملہ صرف خود احتسابی کا نہیں، بلکہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ افراد، گروہوں اور برادریوں کے اس حق کا تحفظ کریں۔

خود ڈنمارک کا قانون اس باب میں خاموش نہیں ہے۔ اس ملک میں مذہبی عقائد، شعائر اور شخصیات کی عزت کے تحفظ کے لیے ناموسِ مذہب کا قانون Blasphemy law صدیوں سے موجود ہے۔ اس طرح ہر فرد کی عزت کے تحفظ کے لیے Law of Libel and Slander موجود ہے۔ پھر ملک کے قانون فوج داری میں صاف صاف ایسی تمام حرکتوں کو قابل دست اندازی جرم قرار دیا گیا ہے جو دوسرے کی تذلیل اور ان کے جذبات کو مجروح کرنے والے اور مختلف گروہوں اور برادریوں کے خلاف امتیازی سلوک کے مرتکب ہوں۔ ڈنمارک کے ضابطۂ فوج داری کی دفعہ 140 اس طرح ہے:

> "جو لوگ کسی مذہبی برادری کی عبادات اور مسلمہ عقائد کا کھلا مذاق اڑا

ئیں یا ان کی توہین کریں، ان کو جرمانے یا چار ماہ کی قید کی سزا دی جائے گی"۔

اسی طرح دفعہ بی 266 میں مرقوم ہے:

"کوئی بھی فرد جو کھلے عام یا وسیع تر حلقے میں پھیلانے کی نیت سے کوئی بیان دے یا کوئی اور معلومات پہنچائے جس کے ذریعے وہ لوگوں کے کسی گروہ کو ان کی نسل، رنگ یا قومی ونسلی عصبیت، عقیدے یا جنس کی بنیاد پر دھمکی دے، توہین کرے، یا تذلیل کرے، وہ جرمانے، سادہ حراست یا دو سال سے کم قید کی سزا کا مستحق ہوگا"۔

یہ خود اس ملک کا قانون ہے جس میں مسلمانوں کے ایمان کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور جس کا دفاع آزادیٔ اظہار کے نام پر کرنے کی جرأت مغربی اقوام کے دانش ور اور سیاسی قائد کر رہے ہیں۔

بات صرف قانون اور نظری حیثیت کی نہیں، اگر ان ممالک کے تعامل پر نگاہ ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ معاملہ مذہبی امتیاز Religious Discrimination کا ہے۔ اسی اخبار کے ایڈیٹر نے 2003ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہتک آمیز کارٹون چھاپنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ قارئین ان خاکوں کو اچھا سمجھیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا خیال ہے کہ اس سے ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ اس لیے میں انہیں استعمال نہیں کروں گا۔

نبی پاک ﷺ کے خلاف یہ شرمناک اور ہتک آمیز کارٹون شائع کرنے کے بعد جب احتجاج ہوا اور ایران نے جرمنی کے ہولوکاسٹ کے بارے میں کارٹون بنانے کی دعوت دی تو اس اخبار کے کلچرل ایڈیٹر فلیمنگ روز نے سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا عندیہ دیا کہ وہ ہولوکاسٹ پر بھی کارٹون شائع کرے گا۔ لیکن اس اعلان کے فوراً بعد اخبار کے ایڈیٹر نے اس کی تردید کی اور ساتھ ہی فلیمنگ روز کو طویل رخصت پر بھیج دیا۔ آج یورپ کے کم از کم سات ممالک میں قانونی طور پر ہولوکاسٹ کو چیلنج کرنا جرم ہے اور آسٹریا میں تاریخ کا ایک پروفیسر ڈیوڈ ارونگ (David Irving) جیل میں اس لیے بند ہے کہ اس نے برسوں پہلے ہولوکاسٹ کے بارے میں دیے جانے والے اعداد و شمار کو چیلنج کیا تھا اور اب اسے تین

سال کی سزا ہو گئی ہے حالاں کہ اس نے عدالت کے سامنے بیان دیا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی اور میں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا ہے۔ وہ آسٹریا کا باشندہ بھی نہیں مگر اس کو آسٹریا میں سزا دی گئی ہے۔ اسرائیل میں باقاعدہ قانون ہے کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی شخص ہولو کاسٹ کو چیلنج کرے تو اسرائیل کو حق ہے، اسے اغوا کر کے لے آئے اور اس کو سزا دے۔ انگلستان کے اخبار انڈی پنڈنٹ نے کسی نبی یا یہودی مذہبی لیڈر نہیں ایک دہشت گرد جرنیل ایریل شیرون کے بارے میں ایک کارٹون شائع کیا تھا جس میں اسے فلسطینی بچوں کا خون چوستے دکھایا گیا تھا جس پر ساری دنیا میں ہنگامہ ہو گیا تھا۔ برطانوی یہودیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا اور جرمنی کے اخبار نے اس کارٹون کو چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ فرانس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایک فلم میں رکیک جنسی حوالوں کی وجہ سے ہنگامے ہوئے، ایک سینما کو آگ لگا دی گئی اور ایک شخص جل کر مر گیا۔ آج یورپی ممالک میں گھر میں بلند آواز سے میوزک سننا منع ہے کہ اس سے پڑوسیوں کی سمع خراشی ہوتی ہے۔ سڑک پر ہارن بجانا خلاف قانون ہے اور گاڑی میں زور سے گانا نہیں سنا جا سکتا مگر دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات پر نشتر چلانے کی آزادی ہے اور اس کا دفاع بھی جمہوریت کے نام پر کیا جاتا ہے۔ کیا آزادی کے ایسے تباہ کن تصور کو، جو دراصل فسطائیت کی ایک "مہذب" (Sophisticated) شکل ہے، ٹھنڈے پیٹوں قبول کیا جا سکتا ہے؟

مسلمانوں کو تحمل اور برداشت کا درس دینے والوں کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ظلم کی سرپرستی اور ترویج کا اس سے بھی بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ ظلم کا استیصال تو اسے چیلنج کر کے اور مزاحمت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

سرور احمد ملک

آزادیٔ اظہار یا خیر و شر کا معیار؟

مغربی تہذیب، بت پرستی سے خود پرستی کا سفر ہے۔ درمیان میں عیسائیت کے نام سے خدا پرستی کا جو وقفہ آیا، اس کی بنیاد آسمانی صحیفوں کی بجائے سینٹ پال کا وہ فلسفہ ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مرکزِ تبلیغ یروشلم کی بجائے یونانی فلسفیوں کے مرکز ایتھنز میں جنم لیا۔ یونانی فلسفے اور بائبل و تورات کے امتزاج سے جنم لینے والی عیسائیت نے یورپ میں جس مذہبی تہذیب کو جنم دیا، اس کا بھی خاتمہ ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ کچھ باقی ہے تو وہ خود پرستی جو عیسائیت کے خدا سے بغاوت کے بعد خود خدا بن بیٹھی ہے۔ اس خود پرستی میں کائنات کا مرکز و محور انسان ہے۔ وہ انسان جو دیگر عناصر فطرت کی طرح فطرت کے ارتقائی سفر کا مظہر ہے۔ دیگر عناصرِ فطرت کی طرح انسان کی تخلیق بھی نہ کسی خالق کی محتاج ہے اور نہ کسی خالق کو جوابدہ۔ انسانی عقل کے حاصل فلسفہ کا ہزار ہا سالہ سفر رد و قبول اور قیاس در قیاس کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا چلا آ رہا ہے۔ ہر بدلتی آن فطرت کے اسرار کھولتی چلی آتی ہے۔ ہر نیا دن، نیا انکشاف اور تکنیکی ہنرمندی کی نئی معراج کا حامل ہوتا ہے۔ موجودہ دور کی ''حقیقت مطلق'' فشارِ عظیم (بگ بینگ) انہی قیاسات کا تسلسل اور عقلی سفر کا موجودہ پڑاؤ ہے جن کی بنیاد ایمان کی بجائے ذاتی دھیان ہے۔

لیکن انسان کی عقلی و فکری پرواز کی انتہا کوئی بھی ہو، اس پرواز کی ابتدا بھی قیاس ہے اور انتہا بھی قیاس۔ قیاس کی ان دو انتہاؤں کے درمیان ان کو اگر کوئی حقیقت نظر آتی ہے تو وہ انسان کا وجود ہے۔ فلسفے کی دنیا میں انسان ہی واحد زندہ حقیقت ہے۔ اس واحد حقیقت کے احترام نے انسان کو خود پرستی کی راہ پر چلاتے چلاتے خدائی کی منزل تک پہنچا دیا۔ اس خدائی کا اوّل و آخر مقصود انسان اور انسان کے نفسانی تقاضوں کا حصول ہے۔ ان تقاضوں کے حصول کے لیے عبدیت (خالق کی غلامی) سے نجات ضروری ہے۔ جب تک انسان آزاد و

خودمختار نہیں ہوگا تب تک نفسانی تقاضوں کے حصول میں کامیاب نہیں ہوگا۔ یہ آزادی، خودمختاری صرف مادی و جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی و فکری بھی ہونی چاہیے۔ ایسی ذہنی و فکری آزادی جو ہر انسان کو اچھائی و برائی اور نیکی و بدی کا معیار متعین کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ خالق حقیقی نے انسان کو خیر و شر کا معیار دے کر اسے ان دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا تھا۔ انسانی عقل و فکر کے حامل فلسفے نے آزادی و خودمختاری کو خیر و شر کے درمیان ''انتخاب کی آزادی'' کی بجائے اس آزادی و خودمختاری کو خود خیر اور شر کا ''معیار'' مقرر کرنے میں تبدیل کر دیا۔

موجودہ مغربی تہذیب نے خیر اور شر کا معیار متعین کرنے کی آزادی کے فلسفہ سے ہی جنم لیا ہے۔ اس تہذیب کی عمارت عبدیت کی بنیاد پر تعمیر ہی نہیں ہوئی۔ مغربی تہذیب کی بنیاد خالق سے انکار اور انسانی خدائی کی دعویدار ہے۔ اس خدائی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ذہن و فکر کا بھی ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہونا ضروری ہے اور اس آزاد ذہن و فکر کے حاصل خیالات و افکار کے پرچار کا بھی ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہونا ضروری ہے۔ انسانی ذہن و فکر کے حاصل افکار کے پرچار کو ہی مغربی تہذیب میں ''آزادیٔ اظہار'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس اظہارِ رائے کی آزادی کو یقینی بنانے کے لیے ہی مغربی ممالک میں ایسے قوانین و ضابطے تخلیق کیے گئے ہیں جن کے سائے میں خدا کے پیغمبر اور رسول تو کیا خود خدا کے وجود سے بھی انکار کی آزادی کو یقینی بنایا گیا ہے۔

یہی آزادی و خودمختاری ہے جس کی بنیاد پر مغربی تہذیب کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ مغربی دانشور اور سیاستدان اسی آزادی و خودمختاری کو تمغۂ امتیاز قرار دیتے ہوئے غیر مغربی اقوام کو شائستہ زبان میں غیر مہذب (جاہل) اور سفارتی زبان میں حاسد (دشمن) قرار دیتے ہیں۔ نائن الیون کے نام پر ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ کے دوران بش اور بلیئر نے عالم اسلام کے خلاف جو فکری دلائل دیئے تھے، ان کی بنیاد مغربی تہذیب سے حسد تھی۔ بش اور بلیئر کے نزدیک ''وہ (مسلمان) ہماری آزادی سے حسد کرتے ہیں''۔ کون سی آزادی؟ یہی ذہنی و فکری غلاظتوں کے پرچار کی آزادی۔ اس آزادی کے تحفظ کو ہی عالم اسلام کے خلاف جنگ کی فکری بنیاد بنایا گیا تھا۔ بش اور بلیئر جیسے سیاستدانوں کی فکری اٹھان کی یہی حد تھی۔ اس

لیے انہوں نے مغربی جرائم کے خلاف نفرت کو ذہنی وفکری طور پر ''آزاد'' مغربی معاشروں سے حسد قرار دیا تھا۔ لیکن ان عملی سیاستدانوں کی زبان کے پیچھے وہی مغربی فکر کارفرما ہے جس میں انسان کو ہی خیر وشر کا معیار مقرر کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے۔ اس فکر میں انسان کی پسند ہی خیر ہے اور انسان کی ناپسند ہی شر ہے۔ جو انسان جسے اپنے لیے بہتر سمجھے، اس کے لیے وہی بہتر ہے۔ دوسرے لفظوں میں مغربی معاشروں میں ''آزادی'' اور ''آزادیٔ اظہار'' کو جو تقدس حاصل ہے، وہ اپنی اصل میں رائے کے اظہار کی آزادی کی بجائے خیر وشر کا معیار متعین کرنے کی آزادی ہے۔ وہ خیر وشر جن کی بنیاد آسمانی ہدایت کی بجائے حیوانی و جسمانی خواہشات ہیں۔ وہ حیوانی و جسمانی خواہشات جو مسرت اور لذت کی خودساختہ حدود سے باہر دیکھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں۔ یہ انفرادی حق ہی جب اجتماعی حق کی صورت اختیار کرتا ہے تو خیر وشر کا معیار متعین کرنے کا یہی حق اپنی اجتماعی لذت ومسرت کے حصول کے لیے اس کرۂ ارض کے دوسرے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے پچھلے تین چار سو برس کی تاریخ اس حق کی ہی تعبیر ہے۔

اس لیے مغرب سے ''آزادی اظہار'' پر پابندیاں لگانے کا مطالبہ مغربی تہذیب کی اس بنیاد کو خود مغرب کے ہاتھوں سے گرانے کا مطالبہ ہے جس کی بنیاد پر مغربی تہذیب کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جانب امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن ''آزادیٔ اظہار'' کے حق کو استعمال کرتے ہوئے زبانی طور پر امریکی شہری کے گھناؤنے فعل کی ایسے لفظوں میں مذمت کرتی ہے جو کسی مسلمان وزیر خارجہ کو بھی نصیب نہ ہوں۔ لیکن جہاں تک اس گھٹیا فعل کو روکنے کا تعلق ہے، اس کا جو جواب امریکی صدر نے اقوام متحدہ جیسے عالمی فورم پر دیا ہے، وہ اس فکر کا بہترین عکاس ہے جس فکر کی بنیاد پر مغربی تہذیب کی بنیادیں اٹھی ہوئی ہیں۔ امریکی قومی سلامتی کے ڈپٹی ایڈوائزر نے اوباما کے اقوام متحدہ سے خطاب کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے اوباما کی تقریر کو ان لفظوں میں سمیٹے ہوئے واضح کیا کہ: ''توہین آمیز فلم جیسے اقدامات کو روکنا ممکن نہیں، اس لیے اس فلم کے خلاف احتجاج کے نام پر پُرتشدد مظاہروں کا کوئی جواز نہیں۔ وہ تمام ممالک جہاں مظاہرے ہو رہے ہیں وہاں سفارت خانوں کے مزید حفاظتی اقدامات کی بجائے احتجاج کا سلسلہ ختم کرنا ہوگا۔ آزادیٔ اظہار کے خلاف احتجاج کا

کوئی جواز نہیں بنتا۔"

کیا امریکی صدر کی جانب سے اس واضح پیغام کے بعد بھی مسلمانانِ عالم زبانی احتجاج کے عملی نتیجے کی توقع رکھ سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں! خالقِ کائنات کے بعد کائنات میں برتر و بالا ایسی ہستی جسے ربِ کائنات نے خود ورفعنا لک ذکرک کی نوید سنائی ہے، اگر اس ہستی کے ذکر کو بلند سے بلند تر کرنا ہی مسلمانوں کے اعمال وافکار کی کسوٹی ہے تو کیا اس ہستی کی حرمت کا تحفظ مسلمانوں اور ان کے نمائندہ حکمرانوں سے عملی اقدامات کا تقاضا نہیں کرتا؟

محسن فارانی

آزادیٔ اظہار اور ابلیسی ذہنیت

مغرب کے یہود و نصاریٰ جو صلیبی جنگوں اور ارضِ مقدس فلسطین پر غاصبانہ قبضے کی ترنگ میں ایک خاص ذہنیت میں ڈھل گئے ہیں، اسلام کے بارے میں ان کا خبث باطن ایک بار پھر اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ امریکی حکومت کی ناک تلے شیطان صفت نکولا بیسلے نکولا نے ایک مسلم آزار فلم بنائی۔ اس کی شوٹنگ لاس اینجلس کے قریب ایک گرجے میں 2011ء کی گرمیوں میں ہوتی رہی۔ اداکاروں کو ایک ''سبز سکرین'' کے آگے کھڑا کیا گیا جو بیک گراؤنڈ امیج نمایاں کرنے کے لیے استعمال کی گئی۔ اس میں تقریباً پچاس اداروں نے حصہ لیا۔ ان میں سے ایک بیکرز فیلڈ کیلیفورنیا کی سنڈی لی گارشیا ہے۔ چڑیل صفت سنڈی اب کہتی ہے کہ اسے فریب دیا گیا تھا اور اسے ہرگز علم نہیں تھا کہ فلم پیغمبر اسلام (ﷺ) کے بارے میں ہے۔ سنڈی فلم کے کلپس میں تھوڑے وقفے کے لیے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے: ''یہ فلم بہت غیر حقیقی ہے۔ اس میں وہ کچھ نہیں جس کی ہم نے فلمنگ کی تھی۔ وہ سب کچھ تو طلسماتی اور پراسرار تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ ''ڈیزرٹ واریئر'' نامی فلم ''تاریخی صحرائے عرب'' کی ایک مہماتی فلم ہے، نیز یہ کہا گیا تھا کہ فلم دو ہزار سال پہلے کے لگ بھگ Holy Prophet Jesus (رسول پاک یسوع) کے زمانے کی ہے''۔ یہودی سرمائے سے تین مختلف ناموں سے تیار کی جانے والی دل آزار فلم ''معصوم جنگجو'' یا بن لادن کی معصومیت'' یا پھر ''مسلمانوں کی معصومیت'' کی نمائش پہ ہونے والے ردِعمل میں بن غازی (لیبیا) میں امریکی سفارتخانے پر حملہ ہوا۔ راکٹ مار کر امریکی سفیر کرسٹوفر سٹیونز اور تین دیگر امریکی سفارتکاروں کو ہلاک کر دیا گیا۔ دو غلے امریکی صدر بارک اوباما نے توہین رسالت پر مبنی فلم بنانے والوں کی مذمت کرنے کے بجائے بس یہ کہا کہ ''سفارتکاروں کے قاتل سزا سے نہیں بچ سکیں گے''۔

ساتھ ہی اس نے دو جنگی بحری جہاز لیبیا کے سمندر میں بھیج دیے۔ ری پبلکن پارٹی کے بعض جنوبی ارکانِ کانگرس نے تو بن غازی پر ڈرون حملوں کا مطالبہ کر دیا۔ ادھر پورے عالم اسلام میں غم وغصہ میں جتلا مسلمان مظاہرے کر رہے ہیں۔ قاہرہ میں امریکی سفارت خانہ جلا دیا گیا اور فائرنگ میں چند مظاہرین ہلاک ہوئے۔ اگلے دن تیونس اور خرطوم میں امریکی و جرمن سفارتخانے نذر آتش ہوئے، نیز تیونس میں امریکی سکول اور لبنان میں ریستوران جلا دیا گیا۔ آسٹریلیا میں امریکی قونصل خانے کے باہر مظاہرہ ہوا۔ اسلام آباد میں امریکی سفارتخانہ چار روز کے لیے بند کر دیا گیا۔ 21 ستمبر کو کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پشاور میں خونریز مظاہرے ہوئے جن میں 29 افراد جاں بحق ہوئے۔ اوباما کہہ رہے تھے کہ ''امریکی شہریوں پر حملے ناقابل برداشت ہیں''۔ اور وزیر دفاع لیون پینٹا کہتا ہے کہ ''ہم مسلم ممالک میں فوجیوں کی تعیناتی پر غور کر رہے ہیں۔'' اگلے دن کہتا ہے کہ شرقِ اوسط میں مزید فوج نہیں بھیجیں گے۔

المیہ یہ ہے کہ امریکی اربابِ اختیار اور یورپ والوں کو احساس ہی نہیں کہ ایک ارب 60 کروڑ مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی کی توہین کتنا بڑا جرم ہے۔ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سمیت تمام انبیائے کرام کا یکساں احترام کرتے ہیں، مگر بعض بد باطن یہود و نصاریٰ نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے رسول کریم حضرت محمد ﷺ کی توہین کرنے سے باز نہیں آئیں گے اور مغرب کی صلیبی حکومتیں ایسے خبیث لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ گذشتہ سال ستمبر میں ملعون امریکی پادری ٹیری جونز قرآن مجید کو نذرِ آتش کرنے میں ناکام رہا، پھر اپریل میں قرآن پاک کو اعلانیہ جلانے کی ناپاک جسارت کی تھی اور اوباما حکومت نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اب وہی بدبخت ٹیری جونز مذکورہ دل آزار فلم کی عالمی تشہیر میں ملوث ہے۔ اس کے باوجود امریکی خصوصی نمائندہ برائے پاکستان و افغانستان مارک گراسمین کہتا ہے کہ ''گستاخانہ فلم فردِ واحد کا فعل ہے، امریکی حکومت ملوث نہیں''، جبکہ ایف بی آئی کے انسدادِ دہشت گردی کے عالمی شہرت یافتہ ماہر ڈیوڈ گومز کا کہنا ہے کہ ''جب تمہارے لفظوں کی وجہ سے معصوم لوگ مرنے لگیں تو خاموشی بہتر ہے۔ پاگل پادری ٹیری جونز کو فوراً بن غازی بھجوا دینا چاہیے تاکہ وہ لیبائی عوام کے سامنے اس فلم کے بارے میں اپنے موقف کا دفاع کر سکے۔'' لیکن انٹرنیٹ کمپنی گوگل نے وائٹ ہاؤس کی جانب سے متنازعہ فلم یو

ٹیوب سے ہٹانے کی درخواست مسترد کردی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی میڈیا اور حکومتوں نے اسلام دشمنی کے جرثومے کہاں کہاں پھیلا رکھے ہیں، گرا سمین گستاخانہ فلم کو فرد واحد کا فعل قرار دیتا ہے۔ یوں نائن الیون کا سانحہ بھی فرد واحد اسامہ کا فعل کہا جاسکتا ہے، پھر امریکہ نے فرد واحد کے فعل پر افغانستان پر حملہ کر کے تباہی کیوں مچائی؟

متنازعہ فلم کا ملعون پروڈیوسر پولیس ریکارڈ کے مطابق فراڈ کے کئی واقعات میں ملوث رہا ہے۔ وہ بینک فراڈ، منشیات اور علمی سرقے کے الزام میں 21 ماہ قید کی سزا کاٹ چکا ہے۔ اسے رہائی کے بعد بھی پانچ سال نگرانی میں رہنا تھا مگر مشروط معاہدے کے تحت رہائی پا کر اس ''لعنتی'' نے معطلی سزا کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رحمۃ اللعالمین نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات پر انتہائی دل آزار فلم بنا ڈالی جسے کوئی سچا مسلمان دیکھنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ ایک ماہ پہلے جرمنی میں توہین رسالت پر مبنی کارٹونوں کی نمائش کی گئی اور مقامی مسلمانوں کی طرف سے عدالتی چارہ جوئی پر اسلام دشمن جرمن جج نے اس نمائش کو آزادی اظہار قرار دے کر امتناعی درخواست مسترد کردی۔ یہود و نصاریٰ کی یہ آزادی اظہار ان کی ابلیسی ذہنیت کے سوا کچھ نہیں جبکہ اسی جرمنی، آسٹریا اور کئی دیگر یورپی ممالک میں ایک مضحکہ خیز قانون نافذ ہے۔ وہاں اگر کوئی شخص یہودیوں کے اس دعوے کو جھٹلائے کہ دوسری جنگ عظیم میں جرمن نازیوں کے ہاتھوں ہولوکاسٹ میں 60 لاکھ یہودی قیدی جلائے گئے تھے تو بس اتنی سی بات پر 3 تا 4 سال تک قید کی سزا سنا دی جاتی ہے۔ اگر آزادی اظہار اتنی ہی عزیز ہے تو اس کا اطلاق ہولوکاسٹ کو جھٹلانے پر کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا جواب کسی یہودی یا عیسائی کے پاس نہیں۔ ملعون نکولا بیسلے مصری قبطی عیسائی ہے جو برسوں سے امریکہ میں آباد ہے۔ اس کے بقول اس فلم پر 50 لاکھ ڈالر لاگت آئی جس میں تقریباً 100 یہودیوں اور مصری قبطیوں کے عطیات بھی شامل تھے۔ لعنتی بیسلے کو اپنے اس شیطانی فعل پر کوئی شرمندگی نہیں، البتہ وہ امریکی سفیر کی ہلاکت پر افسردہ ہے۔ امریکی عرب ریڈیو سے گفتگو کرتے ہوئے ملعون نے کہا کہ اس نے 14 منٹ کی گستاخانہ فلم انٹرنیٹ پر جاری کی ہے اور وہ پوری فلم جاری کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ دریں اثنا فلم میں کام کرنے والے ملعون اداروں نے کہا ہے کہ ان سے دھوکا کیا گیا، انہیں اندازہ نہیں تھا کہ گستاخانہ فلم کا پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات سے کوئی تعلق

ہے۔ گستاخانہ فلم کا ڈائریکٹر ایلن رابرٹس اس سے قبل عریاں اور فحش فلمیں بنانے کے کاروبار میں ملوث رہا ہے۔

امریکیوں کے غرور اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ قاہرہ میں امریکی سفارت خانے کے بیان میں توہین آمیز فلموں وغیرہ کی ہلکی سی مذمت کردی گئی۔ اس پر ری پبلکن صدارتی امیدوار مٹ رومنی بھنا اُٹھا۔ اس نے صدر اوباما کو ذمہ دار قرار دیا کہ "ان کا سفارتی عملہ ہماری اقدار کی حرمت کی پامالی کر رہا ہے۔" جواب میں صدر اوباما کی طرف سے معذرت کی گئی کہ "سفارتخانے کا بیان اُن کی پیشگی توثیق کے بغیر جاری کیا گیا ہے"۔ اور ان امریکیوں اور ان کے بھائی بندوں کی "اقدار" کیا ہیں؟ عریانی اور فحاشی پر مبنی حیوانی کلچر، شرفِ نسوانی کی توہین، قمار بازی، حرامی اولاد کی کثرت! غضب خدا کا انجلینا جولی نامی فاحشہ اداکارہ جو ایک اداکار بریڈ بٹ کے ساتھ برسوں سے بغیر نکاح کے رہ رہی ہے اور اس سے تین بچے بھی جن چکی ہے، اسے اقوام متحدہ نے اپنی سفیر برائے مہاجرین بنا رکھا ہے اور وہ کبھی افغانی خواتین اور کبھی شامی مہاجر خواتین اور کبھی عراقی لڑکیوں کو پُرسا دیتی نظر آتی ہے۔ اب ان کی "اقدار" میں پیغمبر اسلام ﷺ کی توہین بھی شامل ہوگئی ہے جسے مسلمان کسی طور برداشت نہیں کر سکتے۔ وہی اوباما جو 2009ء میں قاہرہ کانفرنس میں آکر مسلمانوں کو مفاہمت اور امن کا بھاشن دے رہا تھا، وہ اب ایک کٹر صلیبی کے روپ میں سامنے آیا ہے اور اس نے اب تک دل آزار فلم اور فلم بنانے والوں کی مذمت نہیں کی۔

مذکورہ دل آزار فلم کے ٹریلر نجی مصری ٹی وی "الناس" پر چلنے کے ساتھ ہی پروڈیوسر نکولا بیسلے نکولا زیرِ زمین چلا گیا۔ فلم عربی میں ڈب کی گئی ہے اور اس میں مصری قبطی مسیحیوں نے بھی کام کیا ہے۔ فلم کے اداکاروں نے "سی این این" پر یہ انکشاف کیا ہے کہ جس موضوع پر انہوں نے انگریزی میں مکالمے بولے تھے، جب فلم عربی میں ڈب کی گئی تو ان مکالموں میں محمد (ﷺ) کا نام شامل کر کے ان کو توہین آمیز بنا دیا گیا۔ اس سے پہلے گیرٹ ویلڈر نامی ڈچ نے "فتنہ" نامی فلم بنا کر اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایسی دل آزاد فلموں اور کارٹونوں کا سلسلہ روکنے کے لیے مسلم ممالک کو اقوام متحدہ کے آئندہ اجلاس میں موثر تحریک اٹھانی چاہیے اور عالمی کنونشن میں توہین انبیا کو فوجداری جرم قرار دلوانا چاہیے۔ ورنہ چھپن ستاون اسلامی

ممالک کا یوا ین او کا رکن رہنا بیکار ہے!

ابھی فلم کا معاملہ دل آزاری کا باعث بنا ہوا تھا کہ ایک فرانسیسی جریدے نے نبی رحمت ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کر دیے اور فرانسیسی وزیراعظم فرانسوا ہالینڈ نے انتہائی ڈھٹائی سے آزادی اظہار کے نام سے اس کی حمایت کی، حالانکہ اسی فرانس میں ایک رسالے نے برطانوی شہزادی ولیم کی اہلیہ شہزادی ڈلٹن کی چند عریاں تصویریں چھاپیں تو عدالت نے شاہی خاندان کی درخواست پر فوری حکم جاری کیا کہ بقایا تصاویر ہرگز نہ چھاپی جائیں اور تمام تصاویر شاہی جوڑے کے حوالے کر دی جائیں۔ اس سے اہل مغرب کا اسلام کے بارے میں شیطانی تعصب صاف عیاں ہے۔

۞......۞......۞
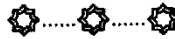
پروفیسر خورشید احمد

اسلام اور ناموسِ رسالت ﷺ پر کروسیڈی حملے......

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے جن قبطی، عیسائی شدت پسند اور اسرائیلی صہیونی شرپسندوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ایک نہایت گھٹیا، مکروہ اور غلیظ فلم کے ذریعے اسلام اور اس کے پاک نبی ﷺ کی ذاتِ اقدس کو نشانہ بنا کر پوری اُمت مسلمہ کے خلاف جس جارحیت کا ارتکاب کیا ہے، اس کے بنیادی حقائق ہر کس و ناکس کے سامنے آ گئے ہیں، اس لیے ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ نیز یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ اسلام اور حضور پاک ﷺ کی ذات بابرکات کو سب و شتم، جھوٹ اور افترا اور خبث باطن اور زہرناک دشمنی پر مبنی خیالی الزامات اور اتہامات کا نشانہ بنانا مغربی اہل قلم، مشنری اداروں اور میڈیا کا شیوہ رہا ہے، اور اس کا اعتراف مشہور عیسائی مؤرخ ڈبلیو منٹگمری واٹ نے ان الفاظ میں کیا ہے: ''دنیا کے تمام عظیم انسانوں میں سے کسی کو بھی محمد (ﷺ) سے زیادہ بدنام نہیں کیا گیا''۔

لیکن آج جس طرح، جس زبان میں اور جس تسلسل سے یہ جارحانہ کارروائیاں ہو رہی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ پھر اس پر مستزاد، میڈیا اور سوشل میڈیا کی نئی قوت کہ چشم زدن میں یہ آگ دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج مغربی میڈیا، دانشوروں کی اکثریت اور امریکا اور یورپی اقوام کی سیاسی قوت، سب اپنے اپنے انداز میں اس خطرناک کھیل میں شریک ہیں جس کی وجہ سے مسئلے کی جوہری نوعیت تبدیل ہوگئی ہے۔ آج امریکی دستور کی پہلی ترمیم جس کا تعلق مذہب اور ریاست کی علیحدگی اور آزادی رائے اور اظہار کی آزادی سے متعلق ہے، اور اقوامِ متحدہ اور یورپی یونین کے بنیادی حقوق کے اعلامیے کا سہارا لے کر اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور امت مسلمہ کو مطعون کرنے اور ان کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکانے اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے عزائم اور منصوبوں کا پرچار ہی نہیں، ان پر دعوتِ عمل دینے کا جو کام ہو رہا ہے، اس کا نوٹس نہ لینا اور

حالات کو بگڑنے سے بچانے کے لیے بروقت اقدام نہ کرنا، ایک مجرمانہ غفلت ہوگی۔

دلیل پر مبنی اختلاف رائے نہ کبھی محل نظر تھا اور نہ آج ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کا جو غلغلہ مغربی اہل قلم نے برپا کیا، وہ بھی کسی نہ کسی طرح برداشت کرلیا گیا۔ لیکن جس نظریاتی، تہذیبی اور سیاسی جنگ کو اب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلط کیا جارہا ہے، وہ ایک ایسا خطرہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ اور یورپی اقوام کی عسکری قوت اور سیاسی معرکے کا اصل ہدف مسلم دنیا بن گئی ہے، اور عالم اسلام کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی نقشے کو اپنے حسب خواہش تبدیل کرنے کا عمل بڑی چابک دستی سے کارفرما ہے۔ امریکی قیادت بڑی معصومیت سے کہہ رہی ہے کہ اس فلم سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، اور ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے افراد ایسی مذموم اور قبیح حرکتوں کو ناپسند بھی کرتے ہوں گے، لیکن یہ کہنا کہ امریکی اور یورپی قیادت کا دامن اس پورے کھیل سے پاک ہے جو تسلسل کے ساتھ کھیلا جارہا ہے، کسی طرح بھی قابل یقین نہیں۔ نائن الیون کے معاً بعد جس جنگ کا آغاز جارج بش نے Crusade کی تاریخی اصطلاح کو استعمال کرکے کیا تھا، وہ محض زبان کی لغزش (Slip of tongue) نہ تھی اور بعد کے واقعات نے ثابت کردیا ہے کہ ؏

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

گوانتاناموبے میں بار بار قرآنِ پاک کی بے حُرمتی کی گئی ہے، افغانستان کے بگرام کے عسکری اڈے پر 100 سے زیادہ قرآنِ پاک نذرِ آتش کیے گئے ہیں، امریکہ کے اعلیٰ فوجی ادارے جوائنٹ فورسز اسٹاف کالج میں اسلام کے خلاف لیکچرز نصاب میں شامل کیے گئے، جن میں اسلامی دنیا کو دشمن قرار دیتے ہوئے مکہ اور مدینہ کو ایٹم بم سے اُڑا دینے تک کا پیغام دیا گیا۔ اسی طرح ڈینش رسالے میں ہتک آمیز خاکے چھاپے گئے۔ امریکی پادری ٹیری جونز نے قرآنِ پاک جلانے کی ملک گیر مہم چلائی، فرانس کے رسالے چارلی ہیبڈو میں رسول پاک ﷺ کے تضحیک آمیز خاکے شائع ہوئے۔ ہالینڈ میں پارلیمنٹ کے رکن نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی، ناروے میں اسلام دشمنی کے نام پر خود اپنے 70 سے زیادہ نوجوانوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا...... یہ سب غیر مربوط واقعات نہیں، ایک پوری اسکیم کا حصہ نظر آتے ہیں اور امت مسلمہ کا ضمیر اس خطرے کو بھانپ رہا ہے، اور حکمرانوں کا رنگ ڈھنگ جو بھی ہو، عوام امریکہ اور مغربی اقوام پر بھروسہ نہیں کرتے اور اپنے دفاع کے لیے مضطرب

ہیں۔ اب یہ منظر نامہ اتنا واضح ہوتا جا رہا ہے کہ خود مغرب کے اہل نظر کا ایک طبقہ اس خطرناک کھیل پر اپنی پریشانی کا اظہار کر رہا ہے اور اسے خود مغربی اقوام اور خصوصیت سے عوام کے مفاد کے منافی محسوس کر رہا ہے۔

سام بیسائل کی 'مسلمانوں کی معصومیت' (Innocence of Muslims) کے نام پر امریکی اور یہودی سرمائے سے بنائی ہوئی یہ شیطانی فلم امریکی سفیر رچرڈ گلینڈ کے الفاظ میں: ''ایک شخص کا ذاتی فعل ہے، یہ سارے امریکہ کی رائے نہیں''۔ مگر یہ رائے تسلیم کرنا عقل اور تاریخ دونوں کے ساتھ مذاق ہوگا۔ فلم کتنی قبیح اور اشتعال انگیز ہے اس کے بارے میں صرف ایک پاکستانی صحافی جناب حامد میر کے یہ الفاظ پڑھ لینا کافی ہیں:

> ''11 ستمبر 2001ء کو نیویارک میں القاعدہ کے حملوں سے 3 ہزار امریکی مارے گئے تھے لیکن 11 ستمبر 2012ء کو یوٹیوب پر جاری کی جانے والی اس فلم نے کروڑوں مسلمانوں کی روح کو زخمی کیا۔ میں اس فلم کو چند منٹ سے زیادہ نہیں دیکھ سکا۔ اس خوفناک فلم کی تفصیل کو بیان کرنا بھی میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ بس یہ کہوں گا کہ اس فلم کے چند مناظر دیکھ کر سام بیسائل کے مقابلے پر اسامہ بن لادن بہت چھوٹا انتہا پسند محسوس ہوا۔ یہ اعزاز اب امریکہ کے پاس ہے کہ اس صدی کا سب سے بڑا دہشت گرد سام بیسائل اپنی انتہائی گندی اور بدبودار ذہنیت کے ساتھ صدر اوباما کی پناہ میں ہے''۔ (روزنامہ جنگ، 17 ستمبر 2012ء)

امریکہ، مغربی حکمران اور میڈیا، آزادیِ اظہار رائے، کے نام پر اس صہیونی اور صلیبی جنگ کے کمانڈروں کا پشتی بان ہے اور مسلمانوں کو درس دے رہا ہے کہ ''معاملہ آزادی کے بارے میں دو تصورات کا ہے'' (ملاحظہ ہو: Behind Clashes, Two Version of Freedom انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون، 18 ستمبر 2012ء)۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آزادی اور اس کے تصورات سے اس معاملے کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ بات تہذیبوں کے تصادم سے آگے بڑھ کر امریکہ اور یورپی اقوام کے اسلام اور اسلامی دنیا کے بارے میں عزائم کی ہے، اور جو کردار یہ فلم ساز، خاکہ نگار، صحافی، سیاسی اداکار انجام دے

رہے ہیں، وہ امریکہ اور یورپ کی سامراجی قوتوں کے نقشۂ جنگ میں اپنے مقام پر بالکل ٹھیک فِٹ ہوتا ہے اور اب اس کا اعتراف خود ان کے درمیان سے شاھد منھم سے بھی آنے لگا ہے۔

دی گارڈین کا کالم نگار سیماس ملن اپنے 18 ستمبر 2012ء کے مضمون میں (جس کا عنوان بھی چونکا دینے والا ہے، یعنی: ''تعجب کی بات صرف یہ ہے کہ شروق اوسط میں اور زیادہ پُرتشدد مظاہرے کیوں نہیں ہوئے'') لکھتا ہے:

''رُشدی کے معاملے اور ڈنمارک سے شائع ہونے والے متنازعہ خاکوں کے تناظر میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ محمد (ﷺ) کی توہین عام طور پر مسلمان اپنے اجتماعی تشخص پر حملہ سمجھتے ہیں جیسا کہ نعروں اور اہداف سے واضح ہے۔ جس چیز نے احتجاج کو بھڑکایا، وہ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو پہنچنے والا زخم گویا کہ ایک غرور سے بھری طاقت نے لگایا ہے جس نے کئی عشروں سے عرب اور مسلم دنیا پر حملہ کیا ہے، انہیں غلام بنایا ہے، اور ان کی تذلیل کی ہے۔''

ایک اور دانشور جمز رونگٹن جو کیمبرج یونیورسٹی میں تاریخ میں پی ایچ ڈی کا محقق ہے، الجزیرہ میں اپنے مضمون میں کہتا ہے:

''بیشتر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی مسلم دشمن ویڈیو امریکا کے لذت پرست کلچر اور اسرائیل کے لیے امریکی حمایت کا فطری نتیجہ ہے۔ مختصراً یہ کہ بہت سے مسلمانوں کے لیے یوٹیوب کی کلِپ ان کی زندگیوں اور کلچر پر امریکہ کے بگاڑ پیدا کرنے والے اثرات کی علامت ہے۔''

Counter Punch جو ایک مشہور آن لائن رسالہ ہے، اس کے 18 ستمبر 2012ء کے شمارے میں جیف سپیرو اپنے مضمون Islamophobia, Left and Right میں لکھتا ہے:

''لیکن خود فلم کے بارے میں کیا کہا جائے؟ غیر پیشہ ورانہ فلم کاری کا اتنا پھٹیچر نمونہ ایسا شعلۂ جوالہ (فلیش پوائنٹ) کیوں بن گیا؟ یہ فلم ایک ایسے وقت میں تیار کی گئی ہے، جب کہ یورپ اور امریکہ میں دائیں

بازو کے انتہا پسندوں نے ایک ایسا اسلام دشمن نظریہ اپنا لیا ہے جو تقریباً
بالکل ٹھیک روایتی یہود مخالف کلیدی طریقوں کو دُہراتا ہے۔"

بات صرف اس فضا کی نہیں، اس فضا کو بنانے، اسے تقویت دینے، اسے اپنے سیاسی اور عسکری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی ہے۔ ہدف اُمت مسلمہ کی شناخت اور اس کا سیاسی اور تہذیبی کردار ہے۔ مسئلہ دینی، اخلاقی اور تہذیبی ہے اور بلاشبہ ایک خاص سیاسی اور geo-strategic تناظر نے اسے اور بھی گمبھیر کر دیا ہے۔ بات اب صرف ان افراد تک محدود نہیں جو اس میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں، اصل مسئلہ ان قوتوں کا ہے جو ان کو پناہ دیے ہوئے ہیں اور جن کی پالیسیاں، جن کے تضادات اور دوعملیاں اور جن کے سیاسی اور عسکری مفادات ہی نے ان کو یہ کھیل کھیلنے کا موقع دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اظہار رائے کی آزادی اور امریکہ اور یورپی ممالک کے جن دستوری حقوق کے نام پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلم اُمہ پر جو وار کیے جا رہے ہیں ان کی حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

امریکی صدر، وزیر خارجہ، سفرا، دانشور اور صحافی ایک ہی راگ الاپ رہے ہیں، وہ ہے امریکی دستور کی پہلی ترمیم۔ نیز اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر اور انسانی حقوق کا یورپی کنونشن (European Convention on Human Rights) ہیں۔ دعویٰ ہے کہ ان دستاویزات کی روشنی میں مغربی تہذیب اور امریکہ اور یورپ کے سیاسی اور قانونی نظام کی بنیاد فرد کی آزادی ہے اور یہ وہ بنیادی قدر ہے جس پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا جا سکتا، خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں اور خواہ اس کی زد دنیا کے دوسرے مذاہب، اقوام اور انسانوں کے ایمان، عزت، تہذیب، اقدار اور ثقافتی اور دینی وجود اور شناخت پر کچھ بھی پڑے اور کتنے ہی انسانوں کی دل آزاری اور ان کی مقتدر شخصیات کی بے حُرمتی اور تضحیک ہو۔

ہم بڑے ادب سے عرض کریں گے کہ آزادی بلاشبہ ایک بنیادی انسانی قدر ہے اور ہم اس کی اہمیت اور قدر دانی میں کسی سے پیچھے نہیں، لیکن آزادی تو ممکن ہی کسی ضابطۂ کار کے اندر ہوتی ہے ورنہ مادر پدر آزادی جلد انارکی بن جاتی ہے۔

جرمن مفکر ایمانویل کانٹ نے بڑے دل نشیں انداز میں اس عقدہ کو یہ کہہ کر حل کر دیا تھا کہ، "مجھے ہاتھ ہلانے کی آزادی ہے لیکن میرے ہاتھ کی جولانیاں وہاں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے کسی دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے"۔ آزادی اسی وقت خیر کا ذریعہ ہو گی

جب وہ دوسروں کی آزادی اور حقوق پر دست اندازی کا ذریعہ نہ بنے۔ اظہار رائے کی آزادی کے معنی نفرت، تضحیک اور تصادم کے پرچار کی آزادی نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کو باقی تمام اقدار سے الگ کر کے نہیں لیا جا سکتا۔ اس کا واضح ترین ثبوت یہ ہے کہ ہر شخص آزاد ہے لیکن اسے یہ آزادی حاصل نہیں کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے کسی دوسرے شخص کا غلام بن جائے۔ حتیٰ کہ دنیا کے بیشتر قوانین میں آج بھی خودکشی ایک جرم ہے، اس لیے کہ آپ خود اپنی جان لینے کے لیے آزاد نہیں ہیں۔ نہ کوئی دوسرا بلاحق کے آپ کی جان لے سکتا ہے اور نہ آپ خود اپنی جان کو تلف کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

مغرب کے ارباب اقتدار اور اہل دانش اور خود ہمارے ممالک میں ان کے نام نہاد لبرل پیروکار امریکی دستور کی پہلی ترمیم کا راگ الاپ رہے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ امریکی دستور کی بنیاد جیفرسن کا یہ مقولہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور قانون اور دستور کے تحت سب کا مساوی مقام ہے۔ امریکی دستور کی پہلی ترمیم اپنی جگہ اہم ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

> ''کانگرس کوئی ایسا قانون نہیں بنائے گی جو کسی مخصوص مذہب کا احترام کرتا ہو، یا ان کے آزادانہ استعمال کو منع کرتا ہو، یا آزادی اظہار میں کمی کرتا ہو، یا رائے کی آزادی، پریس کی آزادی، عوام کے جمع ہونے کا حق اور شکایت پیدا ہونے پر حکومت کے پاس درخواست دینے کے حق سے روکتا ہے۔''

اس میں ترمیم نمبر 4 بھی ہے، جو کہتی ہے:

> ''عوام کا اپنی ذات کی حد تک تحفظ کا حق، مکانات، کاغذات اور سامان کے تحفظ کے حق، اور غیر معقول تلاشیوں اور ضبطیوں کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ کوئی وارنٹ جاری نہیں کیا جائے گا جسے کسی ممکنہ جواز کی تائید حاصل نہ ہو، اور جس جگہ کی تلاشی مقصود ہو اور چیزیں قبضے میں لینا ہوں، ان کو وضاحت سے بیان نہ کیا گیا ہو۔''

اسی طرح ترمیم 5 ہے جس کے ذریعے جان، مال اور آزادی کے لیے Due process of law کے بغیر محرومی کو ممنوع کیا گیا ہے۔ ترمیم نمبر 8 ہے جس میں excessive (بہت زیادہ، ظالمانہ) زرضمانت، جرمانہ اور سزا کو منع کیا گیا ہے اور یہ

اصول ترمیم نمبر 9 میں تسلیم کرلیا گیا ہے کہ:۔

"دستور میں کسی خاص حق کے اندراج کے یہ معنی نہیں لیے جانے چاہئیں کہ عوام کو حاصل دوسرے حقوق سے انہیں محروم کیا جائے یا ان کی تحقیر کی جائے۔"

سوال یہ ہے کہ پہلی ترمیم جہاں اظہار رائے کی آزادی دیتی ہے یا ریاست کی طرف سے مذہب کو مسلط کرنے کا دروازہ بند کرتی ہے، وہیں مذہب کی آزادی بھی دیتی ہے۔ نیز اگر دستور میں دیے ہوئے باقی تمام حقوق کو قانون اور اخلاق کا پابند کیا گیا ہے تو اظہار رائے کی آزادی کو اس سے آزاد اور مبرا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کی سپریم کورٹ نے 1942ء کے اپنے ایک اہم فیصلے میں اس امر کو واضح کر دیا ہے مگر امریکی حکمران اور دانشور اس کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے:

"تقریر کی کچھ ایسی متعین اور محدود قسمیں ہیں جن کو روکنے یا سزا دینے پر کوئی دستوری مسئلہ کبھی نہیں اُٹھایا گیا۔ اس میں فحش اور ناشائستہ، ملحدانہ، جھوٹے الزام لگانے والے یا ایسے توہین آمیز اور اشتعال انگیز الفاظ جو اپنی ادائیگی سے ہی امن کا فوری بگاڑ پیدا کریں شامل ہیں۔ اس بات کا بخوبی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس طرح کے الفاظ کسی بھی نکتۂ نظر کی وضاحت کا لازمی حصہ نہیں ہوتے اور سچائی تک پہنچنے کے لیے اتنی کم سماجی قدر و قیمت رکھتے ہیں کہ نظم اور اخلاقیات میں کوئی بھی سماجی مفاد جو ان سے پہنچ سکتا ہو، واضح طور پر بے وزن ہو جاتا ہے۔"

الجزیرہ میں 18 ستمبر 2012ء کو ایرک بلیچ کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی عوام اور اہم ادارے ایسی قانون سازی کے حق میں ہیں جس کے نتیجے کے طور پر نفرت پھیلانے والے خیالات کے اظہار کا دروازہ بند کیا جا سکے، جیسا کہ کتاب قانون کی حد تک یورپ کے کئی ممالک بشمول ڈنمارک میں ایسے قوانین موجود ہیں۔ گو وہ بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے طوفان کو نہیں روک سکے۔

پروفیسر ایرک بلیچ جو مڈل برے کالج میں علم سیاسیات کا پروفیسر ہے، کہتا ہے کہ امریکی رائے عامہ کے تمام سروے جو 1997ء سے 2008ء تک ہوئے ہیں، ظاہر کرتے

ہیں کہ امریکی عوام کی اکثریت اس کے حق میں ہے کہ ایسی آرا کے پبلک اظہار پر پابندی ہونی چاہیے جو نفرت پھیلانے اور خصوصیت سے دوسری نسل کے لوگوں کے خلاف زہر اُگلنے والے ہوں۔

امریکہ اور یورپی اقوام کے دوغلے پن کا سب سے بڑا ثبوت صہیونیت، اسرائیل اور خصوصیت سے جرمنی میں ہٹلر کے دور میں یہودیوں پر توڑے جانے والے مظالم جن کو ہولوکاسٹ کہا جاتا ہے، کے بارے میں قانون سازی اور عملاً anti-Semitism (یہود مخالف) کے نام پر اسرائیل، یہودیت، صہیونیت کے بارے میں کسی بھی مخالف رائے کا اظہار یا ہولوکاسٹ کے انکار، حتیٰ کہ ان کے بارے میں صہیونیوں کے پروپیگنڈے کے بارے میں کسی بھی شک وشبہے تک کا اظہار قانوناً جرم بنا دیا گیا ہے۔ دسیوں افراد کو ان قوانین کے تحت سزائیں دی گئی ہیں، اس سے اظہار رائے کی آزادی کے مقدس اصول پر کوئی حرف نہیں آیا۔

رابرٹ فسک نے لندن کے اخبار انڈی پنڈنٹ کے 13 ستمبر 2012ء کے شمارے میں نیوزی لینڈ کے ایک ایڈیٹر سے اپنی گفتگو نقل کی ہے، جس نے بڑے فخر سے دعویٰ کیا کہ اس نے نبی پاک ﷺ کو نشانہ بنانے والے ڈینش کارٹون اپنے اخبار میں شائع کیے:

> "جب میں نے اس سے یہ پوچھا کہ جب اسرائیل لبنان پر دوبارہ حملہ کرے گا تو کیا تم ایک اور کارٹون شائع کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہو جس میں ایک ربی (rabbi) کے سر میں بم لگا ہو، تو اس نے مجھ سے فوراً اتفاق کیا کہ یہ یہود مخالف ہوگا۔"

امریکی دستور کی پہلی ترمیم کی دہائی دینے والوں اور آزادیِ اظہار رائے کا دعویٰ کرنے والوں کا یہی تضاد ہے جس نے ان کی اصول پرستی، آزادی نوازی اور جمہوریت پسندی کا پول کھول دیا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے خبث باطن کو واشگاف کر دیا ہے۔

یورپ کے 34 ممالک میں anti-Semitism اور ہولوکاسٹ کے خلاف قوانین موجود ہیں جن کے تحت اس بارے میں ہر نوعیت کا منفی اظہار رائے جرم ہے جس پر قید اور جرمانے کی سزا دی جاسکتی ہے۔ امریکہ میں بھی ایک دوسرے انداز میں قانون جنگ موجود ہے جسے Global Anti-Semitism Review Act of 2004: کہا جاتا

ہے اور عملاً جس کے نتیجے میں یہودی مذہب تک کو تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ اگر صہیونی لابی کے زیر اثر یہ قانون سازی ہو سکتی ہے تو 1.6 ارب مسلمانوں اور ان کی 57 آزاد مملکتوں کے جائز دینی اور تہذیبی حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی قانون سازی کیوں نہیں کی جا سکتی؟

واضح رہے کہ اقوام متحدہ کے The Universal Declaration of Human Rights کی دفعہ 29 میں قانون کے تحت معقول پابندیوں کا ان الفاظ میں واضح ذکر موجود ہے:

> "اپنے حقوق اور آزادیوں کے استعمال میں ہر شخص ایسی حدود کا پابند ہوگا جن کا تعین قانون محض اس مقصد سے کرے گا کہ دوسروں کے حقوق اور آزادی کا تحفظ اور احترام ہو، اور اخلاقیات اور امن و امان اور جمہوری معاشرے میں عوامی بہبود کے منصفانہ تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔"

اسی طرح European Convention on Human Rights کی دفعہ 10 میں اظہار رائے کی آزادی اور اس کی حدود دونوں کا واضح الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے:

1- ہر شخص کو آزادیِ اظہار کا حق حاصل ہے۔ اس میں رائے قائم کرنے کی آزادی، سرکاری مقتدرہ کی مداخلت یا سرحدات سے بے نیاز ہو کر معلومات اور خیالات کو وصول کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی آزادی شامل ہے۔ یہ دفعہ حکومت کو اس بات سے نہیں روکے گی کہ براڈ کاسٹنگ، نشر و اشاعت، ٹیلی ویژن اور سینما کے لیے لائسنس جاری کرے۔

2- ان آزادیوں کے استعمال میں، چونکہ ان کے ساتھ فرائض اور ذمہ داریاں ہیں، ایسی شرائط، پابندیوں یا جرمانوں کی پابندی ہوگی جو قانون نے طے کیے ہوں اور کسی جمہوری معاشرے میں ضروری ہوں۔ ملک کی سلامتی، علاقائی یک جہتی، عوامی تحفظ، امن و امان کے تحفظ، جرائم کی روک تھام اور صحت عامہ اور اخلاق کے تحفظ، دوسروں کی شہرت اور حقوق کا تحفظ، اور ایسی معلومات کے پھیلاؤ کو روکا جا سکے جو اعتماد اور نیک نیتی سے دی گئی ہوں، اور عدلیہ کی بالادستی اور عدالت کی غیر جانبداری کو برقرار رکھ سکیں۔ (آرٹیکل 10)

امریکہ سے آنے والی فلم اور اس پر عالم اسلام کے ردعمل کی روشنی میں اس وقت پوری مغربی دنیا کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی ایک تعداد میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ آزادئ اظہار رائے کی حدود کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ آزادی اور اس کا ذمہ دارانہ استعمال ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں، جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان ملکوں کی قیادت ان حالات میں کیا کردار ادا کرتی ہے اور جو قربانیاں مسلمان عوام دے رہے ہیں، کیا ان کو کسی مثبت پیشرفت کا ذریعہ بنانے میں کامیاب ہوسکتی ہے؟

انڈی پنڈنٹ اخبار نے اپنے حالیہ ادارتی کالم میں اس ضرورت کا اعتراف کیا ہے۔ فرانسیسی اخبار Charlie Hebdo میں نبی پاک ﷺ کی توہین آمیز خاکے شائع کرنے کے بارے میں انڈی پنڈنٹ کہتا ہے:

> ''ایک آزاد پریس کا دفاع کرنے کی اس کی خواہش قابل تعریف ہوسکتی ہے لیکن اس نتیجے میں بچنا ناممکن ہے کہ اس کا رویہ (یعنی ایسے خاکوں کی اشاعت) غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اس اقدام سے لازماً دوسرے مشتعل ہوں گے۔ اس سے بھی زیادہ قابل تشویش بات یہ ہے کہ یہ لازماً تشدد کو اُبھارے گا اور اموات واقع ہوں گی۔ سنسرشپ کی مذمت کی جانی چاہیے لیکن دوسروں کے گہرے عقائد کا لحاظ نہ کرنا بھی قابل مذمت ہے۔ اخبار کے ایڈیٹر کو اپنا رسالہ فروخت کرنے سے پہلے ان خاکوں کو ہٹا لینا چاہیے اس سے قبل کہ دیر ہو جائے۔''

لندن کے اخبار دی آبزوَر 23 ستمبر 2012ء کے شمارے میں Henry Porter اپنے مضمون میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ: ''ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم آزادی رائے کو ذمہ داری سے استعمال کریں۔ یورپ اور امریکہ میں مذہبی اور نسلی جذبات اُبھارنے کے خلاف قوانین موجود ہیں جن کو فلم اور کارٹونوں نے توڑا ہوگا۔''

نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والا مضمون Free Speech Issue Bedevils Web Giants (آزادی رائے کے مسئلے نے ویب کے بڑوں کو چکرا دیا ہے) میں یہ چبھتے ہوئے سوالات اُٹھائے گئے ہیں کہ اگر گوگل کے خیالات میں اس بے ہودہ

فلم کو یوٹیوب پر ڈالنا اظہار رائے کی آزادی کا حصہ ہے تو پھر اسی گوگل نے لیبیا اور مصر کے لیے اس کی اشاعت کیوں روک دی ہے۔ اسی طرح انڈیا اور انڈونیشیا کے لیے بھی اسے روکا گیا ہے۔ اگر ان ممالک کے لیے روکا جاسکتا ہے تو باقی دنیا کے لیے کیا چیز مانع ہے؟ کیا اسی کا نام اصول پرستی ہے؟

بات صرف اس حد تک دوغلے پن اور دھاندلی کی نہیں۔ Counter PUnch کے ایک مضمون نگار نے 14 ستمبر 2012ء کی اشاعت میں گوگل کے بارے میں ناقابل انکار شواہد کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ Jewish Press کی یکم اگست 2012ء کی اشاعت کے مطابق گوگل نے ایک نہیں، 1710 ویڈیوز جن میں خاصی بڑی تعداد کا تعلق ہولوکاسٹ سے تھا، 24 گھنٹے کے اندر اپنی ویب سائٹ سے ہٹا دیے۔ اسی طرح جولائی 2011ء میں فیس بک نے اسرائیل کے کہنے پر فلسطینی اداروں کے درجنوں اکاؤنٹ بند کردیے حالانکہ ان کے مندرجات کسی قانون سے متصادم نہ تھے۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ فرانس کی حکومت نے مشہور مصنف اور نامور فلسفی روجر گارودی کو اسرائیل کے بارے میں ایک کتاب لکھنے پر قید کی سزا دی تھی اور آسٹریا میں 1989ء میں انگریز مؤرخ ڈیوڈ ارونگ کو ہولوکاسٹ کے بارے میں اپنی تحقیق شائع کرنے پر تین سال جیل کی سزا بھگتنا پڑی تھی۔

اس وقت جو احتجاج پوری دنیا میں ہوا ہے، اس سے مغربی اخبارات میں پہلی بار یہ آواز اُٹھنا شروع ہوئی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جارہا ہے، اور آزادیِ اظہار رائے کے نام پر کیا جارہا ہے، اس پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ یہ ہے وہ وقت کہ جب مسلم اُمہ کی سیاسی قیادت اپنی ذہنی غلامی اور سیاسی محکومی کے شکنجے سے نکلے اور اُمت کے اور اپنے دین کے حقوق کی پاسداری کے لیے مؤثر اور متحدہ اقدام کرے۔

عطاء الرحمٰن

آزادی اظہار...... مغرب کی عجیب منطق

حیرت ہے اگر امریکہ میں سرعام قرآن مجید کے نسخوں کو آگ لگا دی جائے، نفرت اور حقارت کے جذبات سے مغلوب ہو کر ڈاڑھیوں اور پگڑیوں کی وجہ سے مسلمان ہونے کے شبہ میں نو کے قریب سکھوں کو تہ تیغ کر کے رکھ دیا جائے، حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں برملا گستاخانہ فقرے کسے جائیں، توہین آمیز مواد پر مبنی ایسے مضامین اور کتابیں شائع کی جائیں جن کی کوئی علمی بنیاد ہو، نہ تاریخی ثبوت، اخبارات میں کارٹون چھاپے جائیں، مکہ اور مدینہ کے مقدس ترین مقامات کو بموں سے اُڑا دینے کے ناپاک عزائم کا اظہار کیا جائے، بار بار ایسی فلمیں تیار کی جائیں جن میں اسلام کے عظیم مشاہیر پر ایسے غیر اخلاقی الزامات عائد کیے جائیں جن سے دیکھنے اور سننے والوں کے سر شرم سے جھک جائیں، تو آج کے مہذب ترین مغرب کے نزدیک یہ سب کچھ اس لیے جائز ہے کہ اظہار رائے کا ہر کسی کو حق حاصل ہے۔ اس پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی، لیکن جواب میں اگر کوئی مسلمان غیرت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تشدد پر اُتر آئے اور کسی کی جان لے لے تو اس کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو قابل مذمت اور گردن زدنی ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ ان کے دین و مذہب اور معاشرتی اقدار ہر چیز کو سب و شتم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پہل ہمیشہ امریکہ اور یورپ کے اسلام مخالف عناصر کی جانب سے ہوئی ہے، مسلمانوں کا قصور صرف اتنا ہے کہ فوراً احتجاج کرتے ہیں اور جہاں تہاں شدید ردعمل کا مظاہرہ بھی کر دیتے ہیں۔ اگر آزادئ اظہار کی قدر اتنی ہی عزیز ہے تو اس کا اطلاق ہٹلر پر لگائے جانے والے یہودیوں کے قتل عام کے الزامات و واقعات پر کیوں نہیں ہوتا؟ جرمنی اور آسٹریا وغیرہ میں کوئی ہٹلر کے حق میں ایک لفظ کہہ دے یا قتل عام کی تفصیلات کو مبالغے سے تعبیر کر دے تو گردن زدنی قرار دے دیا جاتا ہے، قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

لیبیا میں امریکی سفیر کو قتل کر دیا گیا۔ مصر میں امریکی سفارت خانے پر حملہ ہوا......

لیکن کیا امریکہ میں بیٹھ کر خود کو اسرائیلی یہودی کہنے والے سام بیسائل نامی شخص کو جو ریاست کیلی فورنیا میں پراپرٹی ڈیلر ہے، یہ حق حاصل ہے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ خلاف پرلے درجے کی اہانت آمیز فلم بنائے۔ نعوذ باللہ! ایسے اخلاقی الزامات عائد کرے جو کبھی حضور اکرم ﷺ کی جان کے دشمن کفار مکہ، جن کے سامنے آپ کے دن رات کی زندگی بسر ہوئی تھی، کے وہم وخیال میں بھی نہ آئے تھے۔ سوا ارب آبادی کی حامل انسانیت کے مذہب کو کینسر سے تعبیر کرے۔ اس کام کی خاطر امریکہ کے یہودیوں اور ہم خیال عیسائیوں سے پچاس لاکھ ڈالر کا چندہ اکٹھا کرنے میں بھی دیر نہ لگے۔ پھر وہ فلم کے مسودے کی نوک پلک درست کرانے کے لیے ٹیری جونز جیسے اس پادری کی ہدایات پر عمل کرے جس نے سال گزشتہ میں ایک چرچ کے اندر کھڑے ہو کر قرآن مجید کو نذر آتش کیا تھا۔ اس کے بعد دھڑلے کے ساتھ فلم کی یوٹیوب کے ذریعے عالمی سطح پر گھر گھر میں نمائش کی جائے...... مسلمانوں کے جذبات کو اس حد تک برانگیختہ کر دینے کے بعد کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر کوئی اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلے گا۔ اس یہودی کی بزدلی کا یہ عالم ہے کہ خود تو فلم بنانے کے ساتھ جان بچانے کی خاطر کسی نامعلوم مقام پر چھپ کر بیٹھ گیا اور مسلمان ممالک میں متعین امریکیوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

امریکہ اور یورپی حکومتوں سمیت وہاں کے بڑے بڑے دانشور، لکھاری اور مقرر مسلمانوں کو برداشت کا بہت درس دیتے ہیں۔ خود ان کے اپنے اندر پائی جانے والی برداشت کا یہ عالم ہے کہ لیبیا اور مصر میں ہونے والے واقعات کے بعد قاہرہ میں امریکی سفارت خانے کی جانب سے جاری کردہ بیان میں ہلکے انداز سے توہین آمیز فلموں اور اس طرح کے دوسرے مواد کی مذمت کی گئی۔ اس پر صدارتی امیدوار مٹ رومنی بوکھلا اٹھے۔ انہوں نے صدر اوباما کو ذمہ دار قرار دیا کہ ان کا عملہ ہماری اقدار کی حرمت کی پامالی کر رہا ہے۔ جواب میں صدر اوباما کی جانب سے معذرت کی گئی کہ سفارت خانے کا بیان ان کی پیشگی توثیق کے بغیر جاری کیا گیا ہے۔ لاحول ولاقوۃ...... آپ اسلام دشمنی پر اس حد تک اُتر آئے ہیں کہ اس پر اپنے اندر کا تمام کوڑا کرکٹ ڈال دینا جائز اور برحق سمجھتے ہیں۔ آپ کا کوئی اہلکار اسے غلط قرار دے تو اس کی پوچھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ صدر اوباما نے نائن الیون کی گیارھویں برسی پر

بیان دیا: ''ہماری جنگ اسلام نہیں، القاعدہ کے خلاف ہے''۔ استغفراللہ......

القاعدہ کے بیج تو آپ نے افغانستان میں اس وقت بوئے تھے جب قابض سوویت فوجوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑنے کے لیے آئے ہوئے عرب مجاہد آپ کی آنکھ کا تارا تھے۔ اسامہ بن لادن حب آزادی کی جنگ لڑنے والا ہیرو تھا۔ بعد میں انہی اصولی بنیادوں پر آپ کے خلاف نبرد آزما ہوا تو دہشت گرد کہلایا۔ پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ جس لیبیا میں آپ کا سفیر قتل ہوا ہے وہاں، ابھی کل کی بات ہے، کرنل قذافی کی حکومت کا تختہ الٹنے کی خاطر امریکہ اور القاعدہ ایک دوسرے کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ اور کیا اس بات سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ آج کے شام میں بشار الاسد کا اقتدار ختم کرنے کی خاطر امریکہ اور القاعدہ شیر و شکر ہیں۔ اسلام کے خلاف آپ کے بغض کا یہ عالم ہے کہ نائن الیون کے واقعہ کے معا بعد صدر بش کی زبان سے جو فوری الفاظ نکلے، وہ صلیبی جنگ کے تھے، بعد میں واپس بھی لے لیے گئے، لیکن جس جذبے اور خیال کے تحت ادا کیے گئے، وہ آپ کے سینوں میں موجزن ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خلاف فلم پہلی بار تو نہیں بنی، اس سے پہلے ہالینڈ کا وین گاگ (Van Gogh) نامی ایک اسلام دشمن ایسی حرکت کر کے کیفر کردار کو پہنچ چکا ہے۔ تازہ فلم اعلانیہ طور پر جس یہودی نے بنائی ہے، اس کی وفاداری اسرائیل کے ساتھ ہے، جبکہ زمینوں کے لین دین کا کاروبار امریکہ میں کرتا ہے۔ سزا آپ کے سفیر کو بھگتنا پڑی ہے۔ یوں یہودی اپنے مذموم مقاصد کے لیے آپ کو نچا رہے ہیں جبکہ آپ کی تمام تر عالمی فوجی طاقت، بے پناہ دولت اور غیر معمولی اثر و رسوخ یہودیوں کے ہاتھوں آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اقبالؒ نے بلاوجہ نہیں کہا تھا کہ مغرب (فرنگ) کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے۔

مسلمانوں نے بائبل کی توہین کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں، ان کے اندر اہل کتاب کے جلیل القدر پیغمبروں کے بارے میں اہانت آمیز تو کیا، کسی قسم کا منفی خیال بھی نہیں آتا۔ خیر یہ تو ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ہم یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتاب اور دینی شخصیات کا احترام کر کے کسی پر احسان نہیں کرتے۔ لیکن مہاتما بدھ تو ہمارے نزدیک خدا کے پیغمبر نہیں تھے، ایک بہت بڑے مصلح تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک انسانی تاریخ کی قابل قدر شخصیات میں سے ہیں، ان کی بات بھی چھوڑیے، ہندوؤں کے ساتھ ہم مسلمانانِ پاکستان کی پرانی بلکہ ہزار سالہ لڑائی ہے۔ کرشن جی اور رام چندر جی ان کے دیوتا ہیں۔ کیا کبھی کسی

پاکستانی مسلمان نے، مذہبی یا غیر مذہبی بنیاد پر، ان کے بارے میں ایک ناگوار لفظ بھی اپنی زبان سے نکالا ہے۔ 1947ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پنجاب کے شہروں میں وہ سکھ مسلمان فسادات ہوئے کہ اب تک ان کی تلخ یادیں باقی ہیں لیکن کبھی ایک پاکستانی مسلمان نے سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کی تضحیک میں ایک لفظ کہا ہو تو بتا دیجیے۔ سکھ گوروؤں کا نام پورے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تقسیم کے موقع پر سکھوں کے Fire Brand لیڈر ماسٹر تارا سنگھ جنہوں نے لاہور میں پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کرپان لہرائی اور چیلنج دیا کہ راج کرے گا خالصہ باقی رہے نہ کو...... 66 سال گزر گئے ہیں ماسٹر تارا سنگھ کے بارے میں شاید ہی کبھی کسی نے اہانت آمیز بات کہی ہو۔ اس حد تک برداشت کا عملی مظاہرہ کرنے والے مسلمانوں کو وہ لوگ اس کی تلقین کر رہے ہیں جن کے پاس ہماری عظیم المرتبت ہستیوں کو گالی دینے کے سوا کچھ نہیں بچا۔

مولانا محمد شفیع چترالی

کیا انسانیت کے محسن کا کوئی حق نہیں؟

وکی لیکس کے بانی جولین اسانج کی گرفتاری نے آزادیٔ اظہار کے مغربی تصور اور فلسفے کے تاروپود بکھیر کر رکھ دیے ہیں اور مغربی قوتیں اپنے ہی بنائے گئے قوانین اور ضابطوں کے آئینے میں ایک بار پھر دنیا کے سامنے بے نقاب ہو گئی ہیں۔ وکی لیکس کے انکشافات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ کہیں یہ خود امریکا کی سازش تو نہیں؟ ان انکشافات کا ہدف کیا ہے؟ ان تمام سوالات پر میڈیا میں بحث ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی لیکن یہاں سب سے دلچسپ امر یہ ہے کہ وکی لیکس کے بانی کو امریکا و دیگر عالمی قوتوں کے راز افشا کرنے پر گرفتار کیا گیا ہے اور اس گرفتاری کے لیے ہمارے یعنی پاکستانی حکمرانوں کا ایجاد کردہ ''دیسی طریقہ'' اختیار کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں سیاسی مخالفت کی بنیاد پر بڑے بڑے رہنماؤں کو ''بھینس چوری'' کے مقدمے میں پکڑ کر اندر کرنے کی روایت موجود ہے، شکر ہے کہ اب ہمارے عالمی آقاؤں نے بھی ہماری ''عاجزانہ روایت'' پر عمل کر کے ہمیں شرف بخشا ہے۔ جولین اسانج پر سویڈن میں دو خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کا مقدمہ ''ڈال دیا گیا'' ہے کیونکہ اگر انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا تو وہ عالمی قوتوں کے سینے پر اسی طرح مونگ دلتے رہتے اور اگر انہیں رازوں کے افشا کے جرم میں پکڑا جاتا تو ''آزادیٔ اظہار'' پر حرف آتا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی فہمیدہ شخص عالمی قوتوں کے اس جواز کو قبول کرنے کو تیار نہیں اور جولین اسانج آزادیٔ اظہار کے عالمی علمبرداروں کا ہیرو بن گیا ہے۔

وکی لیکس نے سفارت کاری کے نام پر مغربی قوتوں کی دسیسہ کاریوں اور تیسری دنیا بالخصوص عالم اسلام کے ممالک میں کھلی مداخلت کو جس طرح بے نقاب کیا ہے، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ بالخصوص امریکا تو غریب اور ترقی پذیر ممالک کو اپنی نو آبادیات سمجھتا ہے اور ان ممالک کے حکمرانوں اور سیاست دانوں کے ساتھ ان کا رویہ آمرانہ اور متکبرانہ ہوتا ہے، اس پر سفارت کاری کا

محض لیبل لگایا جاتا ہے، عملی صورت حال فارسی شاعر کے اس بے مثال شعر کا مصداق ہوتی ہے کہ

گلبرگ راز سنبل مشکیں نقاب کن
یعنی کہ رخ بپوش و جہانے خراب کن

(شعر کا مطلب سمجھ نہ آئے تو آیئے مل کر فارسی کا نوحہ پڑھیں کہ اس پیاری اور شیریں زبان کو نکال کر ہم نے اپنا کتنا بڑا علمی و ادبی ورثہ کھو دیا ہے)

لیکن جولین اسانج کی گرفتاری کا سب سے اہم اور بڑا پہلو وہی ہے جس کو چھپانے کے لیے مغربی ممالک نے جولین پر "جینس چوری" کا مقدمہ کر دیا ہے۔ یہ مغرب کی جانب سے آزادیٔ اظہار کے اپنے ہی بنائے ہوئے اس اصول کی کھلی خلاف ورزی اور بے حرمتی ہے جس کے تحفظ کی خاطر دو تین سال قبل مغربی ممالک نے ڈنمارک اور ناروے کے گندے پلید اخبارات کی جانب سے توہین رسالت کے بدترین جرم پر دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی ناراضی کی پروا نہیں کی تھی اور کہا تھا کہ کچھ بھی ہو، مغرب آزادیٔ اظہار کے اپنے نظریے اور اصول سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ آج وہی مغربی ممالک جولین اسانج کو "سانچ کو آنچ نہیں" کہنے کی سزا دینے پر متفق ہیں۔

ویسے مغرب کے قوانین اور نظریے بڑے نرالے ہیں، مغرب میں ہر چیز کے حقوق متعین ہیں۔ وہاں جانوروں کے حقوق کی بات ہوتی ہے، بے جان چیزوں جیسے زمین، سمندر، فضاء اور خلا تک کے حقوق کی آواز بلند ہوتی ہے، مغرب میں تاریخی ورثے کی حفاظت اور احترام کو فرض کا درجہ حاصل ہے، زمین کے اوپر کہیں اگر کوئی سینکڑوں ہزاروں سال پرانا بت، مجسمہ یا حیوانی ڈھانچہ مل جاتا ہے تو مغربی ممالک اس کی حفاظت اور احترام کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، طالبان نے جب بامیان میں بدھ کے مجسمے گرائے تھے تو مغربی حکومتیں ہل کر رہ گئی تھیں اور ان کے مجسموں کی "بے حرمتی" پر پوری دنیا چیخ اٹھی تھی لیکن دوسری جانب وہ عظیم ہستیاں جنھوں نے اس روئے زمین کو اپنی روشن وارفع تعلیمات سے منور کیا، جن کے زندہ و جاوید کارنامے آج بھی انسانیت کے ماتھے کا جھومر ہیں، جن کے ناموں کے ساتھ آج بھی دنیا کے کروڑوں انسانوں کی سانسیں بندھی ہوئی ہیں اور دل دھڑکتے ہیں، کیا ان کا انسانیت پر کوئی حق نہیں؟ کیا ان کی ناموس و حرمت کا تحفظ کسی پر لازم نہیں؟ کیا کسی بھی یاوہ گو، دریدہ دہن، خبطی شخص کو ان کی ذات عالی پر کیچڑ اچھالنے کا "حق" حاصل ہونا چاہیے؟ اور کیا آزادیٔ

اظہار اسی کا نام ہے کہ جس کے منہ میں جو آئے کہتا رہے اور اس کو کوئی پوچھنے والا نہ ہو؟

کوئی اگر حضور سرور کونین ﷺ کو نبی اور رسول نہیں مانتا تو یہ الگ بات ہے۔ بے شک ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے ہدایت دے لیکن کیا حضور نبی کریم ﷺ کا پوری انسانیت پر کوئی بھی احسان نہیں ہے؟ یہ ہم نہیں کہتے۔ یہ بات آج سے کئی عشرے قبل معروف مغربی محقق اور مصنف مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب The Hundred میں لکھی اور دلائل کے ساتھ ثابت کی ہے کہ انسانی تاریخ کا دھارا بدلنے اور انسانیت پر سب سے زیادہ اثرات مرتب کرنے والی ہستی اگر تلاش کی جائے تو وہ آپ ﷺ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے مائیکل ہارٹ نے انسانی تاریخ کی سو عظیم شخصیات کی فہرست میں نبی کریم ﷺ کو سب سے پہلے رکھا۔ مائیکل ہارٹ نے عیسائی ہونے کے باوجود حضرت محمد ﷺ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مقدم رکھنے کی وجہ لکھی ہے کہ ”حضرت محمد ﷺ کا اثر دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے برتر ہے۔“ آپ ﷺ نے دنیا کو جہالت، اوہام پرستی، قبائلی تعصبات اور قتل وخونریزی سے نکال کر، علم، حکمت، دلیل، دانائی، تدبر، بصیرت اور مکالمے ومباحثے کے ماحول سے آشنا کر دیا، آپ کی فکر اور تربیت سے مستفید ہونے والوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں ایک تعلیمی وتہذیبی انقلاب برپا کر دیا، آج دنیا نے سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں جتنی ترقی کی ہے، یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور بہت سے مغربی مفکرین بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ اگر چھٹی صدی عیسوی میں جزیرہ عرب میں اسلام کا طلوع نہ ہوتا تو آج دنیا نے اتنی ترقی ہرگز نہ کی ہوتی۔ تو کیا جس ہستی نے خود مغربی محققین کے نزدیک انسانی تاریخ کے پورے دھارے کو تبدیل کیا، اس کا اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ اس کی حرمت وناموس کے تحفظ کو بین الاقوامی قانون کا درجہ دیا جائے؟ مغرب اگر ایسا نہیں کرتا تو یہ اس کا سراسر عناد اور بغض ہے اور وہ لاکھ چھپائے، اپنے اس بغض کو چھپا نہیں سکتا۔

ویسے بھی جمہوریت کے مغربی نظریے کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر محیط باشندوں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے۔ ہم مغرب سے ہر موضوع، ہر فورم اور ہر سطح پر بحث، مکالمے، مفاہمت اور سمجھوتے کے لیے تیار ہیں اور ہم نے ہر دور میں ان تمام چیلنجوں پر مغرب کا سامنا کیا ہے لیکن اگر مغرب ہماری عقیدتوں اور محبتوں کے مرکز پر حملہ کرے گا، ہمارے احساس وخیال کی اساس پر ضرب لگائے گا اور ہمارے دل ودماغ کی روشنی چھیننے کی کوشش کرے گا تو ہم اس سے الجھیں گے، اس کا گریبان پکڑیں گے۔ ہم دلیل و

منطق، مکالمے، مباحثے کے قائل ہیں لیکن ہماری زندگی میں بعض مراحل ایسے بھی آتے ہیں جن میں ہمارے شاعر نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے کہ:

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اس لیے کہ ہماری پوری جمع پونجی، ٹوٹل اثاثہ اور کل کائنات وہی ذات ستودہ صفات ہے جس کا نام نامی لیتے ہوئے ہم زندگی کا خوشگوار ترین احساس پاتے ہیں۔ بقول منیر نیازی مرحوم:

میں کہ ناآباد ہوں، آباد رکھتا ہے مجھے
دیر تک اسم محمدؐ شاد رکھتا ہے

گو کہ ہم اس آقا ﷺ کی تعلیمات، سیرت اور مشن سے بہت دور نکل چکے ہیں لیکن ہم دنیا کی خوش قسمت ترین قوم ہیں جنہیں کائنات کی اس مقدس ترین ہستی سے عقیدت ومحبت کی والہانہ وابستگی کا شرف حاصل ہے۔ ہم کتنے بھی گئے گزرے کیوں نہ ہوں، اپنی اس وابستگی پر کمپرومائز نہیں کر سکتے۔ اختر شیرانی کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک دفعہ ناؤ ونوش کی محفل چل رہی تھی، اختر اس میں موجود تھے، موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کمیونسٹ نے ان کے سامنے نبی کریم ﷺ کی گستاخی کی، اختر نے شراب کی بوتل اٹھا کر اس دہریے کے منہ پر دے ماری اور کہا کہ "کم بخت تم مجھ سے مغفرت اور بخشش کا یہ آخری سہارا بھی چھیننا چاہتے ہو"

علامہ محمد بن سعید البوصیری کا شہرۂ آفاق قصیدہ بردہ ویسے تو پورا کا پورا حب رسول ﷺ کا حسین مرقع ہے جس کا ایک ایک باب عشق ومحبت کے خمیر میں گندھا ہوا اور ایک ایک شعر کوثر وتسنیم میں دھلا ہوا ہے لیکن راقم کو ان کا یہ شعر خاص طور پر بہت اچھا لگتا ہے:

بشری لنا معشر الاسلام ان لنا
من العناية ركنا غير منهدم

ہم مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر خوشخبری اور نیک بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے پاس آقائے نامدار ﷺ کی ذات والا صفات کی صورت میں ایک ایسا ستون اور سہارا موجود ہے جس کو کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ وہ لوگ بھی کیا لوگ ہوں گے جن کی دنیائے خیال میں کوئی محمد (ﷺ) نہیں اور وہ انسان بھی کیا انسان ہوں گے جن کے آقائے نامدار ﷺ کی ذات سے محبت کا شرف حاصل نہیں۔

محمد سلیم قریشی

آزادی رائے اور توہین اسلام

یہ رائے کی آزادی نہیں، مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی وجود اور زندگی کی پوری معنویت کی توہین ہے۔ ہیلری کلنٹن نے کہا کہ "امریکہ کے خلاف مظاہرے بے معنی اور ناقابل قبول ہیں۔ توہین آمیز انٹرنیٹ ویڈیو کے ساتھ امریکی حکومت کا کوئی تعلق نہیں۔" امریکی وزیر خارجہ کی اس بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ توہین آمیز فلم کی تیاری اور اس کے مقاصد سے امریکی حکومت آگاہ نہیں تھی، یہ ایک ناقابل قبول خیال ہے۔ توہین آمیز فلم اس ذہنیت کا اظہار ہے جو اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے بارے میں صدیوں سے مغرب کے دل و دماغ میں اس طرح موجود ہے جس طرح بچپن کی یادیں، تعصبات، ہمدردیاں، محبتیں اور مخالفتیں ساری زندگی انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔ مغرب اکیسویں صدی میں بھی ذہنی طور پر گیارہویں صدی کی صلیبی جنگوں کی گرفت میں ہے۔ مسلمانوں کے خلاف بے پناہ ظلم اور درندگی جس کا فکری اور عملی محور ہے۔ امریکہ کے سابق وزیر خارجہ میڈیلین البرائٹ سے بی بی سی ورلڈ کے صحافی نے پوچھا، "عراق کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی پابندیوں سے 10 لاکھ افراد ہلاک ہوئے، ہلاک ہونے والوں میں 5 لاکھ بچے شامل ہیں، آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟" میڈیلین البرائٹ نے جواب دیا "It is acceptable and worth it" یعنی غذا اور دواؤں کی قلت سے ہلاک ہونے والے 10 لاکھ لوگوں کی ہلاکت ہمارے لیے قابل قبول اور معنی خیز ہے۔ بعد میں عراق پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے حملے سے چھ لاکھ مسلمان مزید ہلاک ہوئے۔ امریکہ نے مسلمانوں کے خلاف اس انسانیت سوزی کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی دینی جڑوں پر حملے کو بھی مسلسل وتیرہ بنا لیا۔

دنیا جانتی ہے قبائلی علاقے مکمل طور پر کسی بھی حکومت کے کنٹرول میں نہیں رہتے۔ اس کے باوجود وہاں کسی فرد یا گروہ کے امریکہ مخالف سرگرمی میں شامل ہونے کا شک بھی ہو تو

پاکستان کو ملوث کرتے ہوئے ایک طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے، حکومت پاکستان سے فوری کارروائی کا مطالبہ کیا جاتا ہے لیکن فساد پھیلانے والے ایک امریکی گروہ کا ایسا عمل جس نے دنیا بھر کے مسلمانوں میں احتجاج اور تشدد کے واقعات کو جنم دیا، امریکی حکومت سادگی سے اور سرسری انداز میں اسے اظہار رائے کی آزادی قرار دیتے ہوئے بری الذمہ ہونا چاہتی ہے۔ امریکی سپریم کورٹ کے ایک مشہور مقدمے میں جج نے فیصلہ دیا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی تھیٹر میں کھڑا ہو کر جھوٹ بولتے ہوئے آگ آگ پکارنا شروع کر دے تو کیا اسے ایسا کرنے کی اجازت اس بنا پر دی جاسکتی ہے کہ یہ اس کی آزادی اظہار کا معاملہ ہے۔ عدالت نے فیصلہ دیا جو آزادی اظہار تشدد پر ابھارے یا جس کا نتیجہ تشدد نکلے یا جس کا مقصد تشدد کے لیے مشتعل کرنا ہو، اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ آخر توہین آمیز آزادی رائے کا طوفان محض اسلام کے لیے کیوں وقف کر دیا گیا؟ فرانس کے ایک جریدے نے شہزادہ ولیم اور ان کی اہلیہ کی کچھ تصاویر شائع کیں تو اس پر برطانوی حکومت مذکورہ جریدے کے خلاف شاہی خاندان کے تخلیے میں مخل ہونے کے جرم میں مقدمہ کرنے والی ہے لیکن رسول اکرم ﷺ جن کی ذات گرامی مسلمانوں کے لیے صرف ایک شخصیت نہیں، ایک ادارہ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تہذیب ہے، تاریخ ہے، عمرانیات ہے، نفسیات ہے، سیاست ہے، معیشت ہے، نظام عدل ہے، امن اور جنگ ہر حالت میں سرچشمہ ہدایت ہے۔ ان کے باب میں مغرب چاہتا ہے کہ آزادی رائے کے نام پر اسے توہین کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ یہ تہذیبوں کے تصادم کی جانب پیش رفت ہے۔

اوریا مقبول جان

دیوانے اور فرزانے

میں ہرگز حسین حقانی کے مضمون کا جواب نہ دیتا کہ بحث میں اُلجھنا میری عادت نہیں، لیکن کیا کروں سید الانبیا ﷺ کا وہ دُکھ، اذیت اور کرب میں رچا ہوا فقرہ میرے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح لگتا رہا۔ عرب کے ایک سردار نے رسول اللہ ﷺ کی ہجو لکھی جس کے الفاظ اور شعر ایسے تھے کہ آپ ﷺ کو شدید رنج ہوا۔ آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے صحابہ سے فرمایا: ''ہے کوئی جو اس ہجو گو کا جواب اس سے بڑھ کر دے؟'' یوں حضرت حسان بن ثابتؓ نے ایک ایسی ہجو لکھی جو عربی ادب کا شاہکار ہے۔ میرے آقا ﷺ نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا: ''اے اللہ! جبریل امین کے ذریعے حسان کی مدد اور نصرت فرما۔''

حسین حقانی صاحب کا مضمون مجھے چند دن پہلے موصول ہو گیا تھا جس کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کیا گیا تھا کہ پاکستان میں کوئی اخبار بھی ان کا موقف چھاپنے کو تیار نہیں۔ جھوٹ اور سچ اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن ایک اخبار کو انہوں نے یہ مضمون ارسال ہی نہیں کیا۔ میں نے خود درخواست کر کے ان کا موقف چھاپنے کو کہا کہ قرآن کے مطابق جس نے فلاح پائی، اس نے دلیل سے فلاح پائی اور جو ہلاک ہوا وہ دلیل سے ہلاک ہوا۔

اس پورے مضمون میں حقانی صاحب کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے گمنام لوگ ہوتے ہیں جنہیں میرے جیسے جاہل، فرسودہ اسلام پسند، مقبول بنا دیتے ہیں اور اس سے سیاسی مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو بھی ایسی حرکت کرے، اس سے منہ پھیر لینا چاہیے۔ وہ خود ہی مقبولیت حاصل نہیں کر پائے گا۔ حسین حقانی صاحب کی اس ''خوبصورت'' دلیل پر اس دنیا میں ایک مذہب یعنی عیسائیت کے پیروکاروں نے ایک سو سال عمل کیا اور آج بھی عمل پیرا ہیں۔ جس زمانے میں عیسائیت کا پورے یورپ پر غلبہ تھا، عیسائی مذہب کی معمولی سی توہین کرنے والے کو جلتی

ہوئی آگ کے الاؤ میں پھینک دیا جاتا اور ہجوم یہ تماشا دیکھتا۔ آخری آدمی جسے عیسائیت کا تمسخر اُڑانے پر زندہ جلایا گیا، وہ ''ایڈورڈ وائٹ مین'' تھا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے سے انکار کرتا ہے۔ مقدمہ سننے کے لیے ایک ہجوم اکٹھا ہوا۔ اسے زندہ جلانے کی سزا سنائی گئی اور 11 اپریل 1612ء کو اسے آگ کے سپرد کر دیا گیا۔

اس کے بعد توہین مذہب کی سزا میں کسی کو زندہ نہیں جلایا گیا، لیکن پھانسی کی سزا عام طور پر نافذ العمل رہی۔ توہین عیسائیت کے حوالے سے آخری شخص جسے پھانسی پر لٹکایا گیا، وہ ''ٹامس ریکن ہیڈ'' تھا۔ یہ ایڈنبرا کا ایک طالب علم تھا جسے 8 جنوری 1697ء کو ایک ہجوم کے سامنے پھانسی دے دی گئی۔ اس نے آسمانی کتابوں کو پاگل پن کہا تھا اور کہتا پھرتا تھا کہ وہ اسلام کو عیسائیت سے بہتر مذہب تصور کرتا ہے۔ اس آخری پھانسی کے بعد مقدمات تو چلتے رہے، مگر توہین عیسائیت کی سزا کم ہوتی گئی۔ جان ولیم گوٹ آخری آدمی تھا جسے توہین عیسائیت کے جرم میں 1911ء میں جیل بھیجا گیا۔ اسے چار ماہ قید کی سزا ہوئی۔ اس کی قید کے ساتھ ہی توہین مذہب کے قانون کے خلاف لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور پارلیمنٹ میں بحثیں شروع ہو گئیں۔ اس زمانے میں ''ہربرٹ السیکوتھ'' وزیر اعظم تھا۔ اس نے توہین عیسائیت کا قانون بدلنے نہ دیا اور ''جان ولیم گوٹ'' کو 1921ء میں دوبارہ 9 ماہ کی سزا ہو گئی۔ یہ یورپ میں توہین رسالت پر آخری سزا تھی۔ پھر اس کے بعد انہوں نے وہی رویہ اختیار کر لیا جس کی حسین حقانی صاحب مسلمانوں سے توقع رکھتے ہیں۔ یورپ کے حسین حقانیوں نے بھی لوگوں اور حکومت کو یہی کہا کہ اس طرح یہ چھوٹے چھوٹے توہین کرنے والے لوگ مقبول ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ بھی کوئی کہے، بولے، کسی کو پروا نہیں کرنی چاہیے۔

اس کے بعد کے 90 سال عیسائیت کی مقدس ترین ہستیوں حضرت مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت جبریلؑ اور سینٹ پیٹر کی توہین اور تمسخر کے سال ہیں۔ اس وقت دنیا میں ہزاروں ایسی ویب سائٹس ہیں جن پر حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں غلیظ ترین لطیفے ملتے ہیں۔ ان لطیفوں کی کتابوں کی سیل لاکھوں میں ہے۔ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں گندے سے گندا کارٹون آپ کو رسالوں میں مل جائے گا۔ مزاحیہ فلمیں ہوں یا تھیٹر...... سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کردار کشی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ ہے اس خاموشی کا نتیجہ، جسے اختیار کرنے کا درس حسین حقانی مسلمانوں کو دے رہے ہیں اور قرآن کی

آیات کی غلط تفسیر بیان کر رہے ہیں۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ایک پڑھے لکھے باپ اور دین پر کاربند، رہنے والی ماں کے بیٹے ہیں۔ انہیں معلوم ہے اس معاملے میں اللہ کیا کہتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا عمل کیا ہے؟ قرآن کی تعبیر بھی رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ہوگی۔ اس لیے کہ قرآن رسول اللہ ﷺ پر اُترا ہے۔

توہین رسالت وہ فعل ہے جس پر اللہ خود انتقام پر اُتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں۔ "انا کفینک المستھزئین" (اے محمد (ﷺ)! تمہارا مذاق اُڑانے والوں کے لیے ہم کافی ہیں) اور پھر اللہ نے مکے کے کسمپرسی کے دور میں اس کا ثبوت دیا۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ولید بن مغیرہ، اسود بن عبدیغوث، اسود بن مطلب، حارث بن غیطل اور عاص بن وائل آپ ﷺ کا مذاق اُڑایا کرتے تھے اور آپ ﷺ خاصے رنجیدہ خاطر تھے۔ آپ ﷺ کی رنجیدگی پر فوراً حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ ولید بن مغیرہ کی آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔ آنکھ نکل کر ہاتھ میں آ گئی۔ حارث کی طرف جبریل متوجہ ہوئے۔ وہ پیٹ پکڑ کر کراہنے لگا۔ پھر اسی درد کی حالت میں مر گیا۔ اسود بن مطلب ایک درخت کے نیچے تھا کہ کانٹا اس کی آنکھوں پر ایسے گرا کہ اندھا ہوگیا۔ جبریلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: "میں نے آپ ﷺ کا انتقام لے لیا۔"

ایک دفعہ آپ ﷺ گزر رہے تھے، چند لڑکوں نے آپ ﷺ کا مذاق اُڑانا شروع کیا۔ جبریل امین تشریف لائے۔ ان کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے جسموں پر زخم نمودار ہوئے۔ پھر سخت بدبو پھیل گئی، جس کی وجہ سے انہیں بستی سے باہر پھینک دیا گیا، جہاں وہ مر گئے۔ (بخاری، مسلم) ایک نجرانی عیسائی مسلمان ہوگیا۔ اسے وحی کتابت سونپی گئی۔ اس کے بعد دوبارہ عیسائی ہوا تو مذاق اُڑانے لگا۔ ایک دن اس کی گردن ٹوٹی ہوئی پائی گئی۔ لوگوں نے اسے دفن کیا۔ اگلے دن قبر نے لاش باہر پھینک دی۔ اگلے دن وہ دوبارہ دفن کیا، لاش پھر باہر پڑی ملی۔ کئی دفعہ ایسا کرنے کے بعد اسے صحرا میں پھینک دیا گیا۔ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جس کسی نے توہین رسالت کی، اس کی گردن اُڑا دی گئی، بلکہ کعب بن اشرف کی بابت ارشاد فرمایا، کون ہے جو اس کو قتل کرے گا؟ کون ہے جو مجھے اس سے پہنچنے والی اذیت سے نجات دلائے گا؟ اسے محمد بن مسلمہ نے باقاعدہ آپ ﷺ سے اجازت لے کر قتل کیا تھا۔

یہ میرا موضوع نہیں کہ ایک طویل فہرست ان لوگوں کی پیش کروں جنہیں خود رسول

اللہ ﷺ کے زمانے میں توہین رسالت پر قتل کیا گیا نہ ہی حسین حقانی صاحب اس قدر "ظالمانہ" فعل کی تفصیل برداشت کر سکتے ہیں، لیکن ایک بات عرض کرتا چلوں، آپ کو اپنے بارے میں میرے کالم میں لکھی گئی ایک سطر برداشت نہ ہو سکی اور آپ دنیا کے ہر میڈیا پر چلانے لگے کہ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ کیوں اہمیت دی میرے جیسے گمنام لکھنے والوں کو؟ شاید اس لیے کہ آپ کے ہاں حسین حقانی کی توہین، رسول اللہ ﷺ کی توہین سے بڑا جرم ہے۔ اگر مسلم اُمہ آپ کے مشورے پر عمل کر لیتی، اپنے بطن سے غازی علم دین جیسے لوگ پیدا نہ کرتی جس کا جسد خاکی کئی مہینوں بعد میانوالی سے لاہور گیا تھا تو وہ اسی طرح تروتازہ تھا۔ اگر ایسے دیوانے اور فرزانے نہ ہوتے تو جس طرح آج حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے کردار، اخلاق اور شخصیت کا تمسخر اُڑاتے لطیفے اور کارٹون سرعام میسر ہیں، شاید ایسا ہی مسلمانوں کے ساتھ ہوتا۔ حقانی صاحب! اس اُمت کا تو کُل سرمایہ ہی عشقِ رسول ﷺ ہے۔

محبوب الحق عاجز

اظہار رائے کی آزادی بے لگام نہیں

اقوام متحدہ کے 67 ویں سالانہ اجلاس میں امریکی صدر باراک اوباما نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ (توہین رسالت پر مبنی) گستاخانہ فلم نے مسلم دنیا میں بے چینی پیدا کی، ہم گستاخانہ فلم جیسے اقدامات کی مذمت کرتے ہیں۔ توہین آمیز فلم سے امریکہ کا کوئی تعلق نہیں۔ فلم امریکہ کی بھی بے عزتی ہے۔ یہ لاکھوں امریکی مسلمانوں کے لیے بھی اشتعال کا باعث ہے۔ مسلمانوں کو عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں سے لڑانے کی سیاست دنیا کو آزادی نہیں دلا سکتی۔ لیکن یہ فلم پرتشدد مظاہروں کا جواز نہیں بن سکتی۔ گستاخانہ فلم کی مذمت کرنے والے چرچ جلانے کی بھی مذمت کریں۔ امریکی سفارتخانوں پر حملوں اور پاکستان میں ہلاکتوں کا کوئی جواز نہیں۔ ہم مذہبی آزادی اور مذہبی تحفظ پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم تحمل، برداشت اور مفاہمت کے رویوں کے حامی ہیں۔ دنیا میں تشدد اور عدم برداشت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تمام ممالک انتہا پسندی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ مسلمانوں کے پیغمبر کی توہین کرنے والوں کے لیے مستقبل میں کوئی جگہ نہیں، تاہم امریکی آئین کی پہلی ترمیم یا آزادی رائے کی وجہ سے ہم گستاخانہ فلم پر پابندی نہیں لگا سکتے۔

امریکی صدر کی طرف سے توہین رسالت مآب ﷺ پر مبنی گستاخانہ فلم کی مذمت قابل تحسین ہے۔ ایسا کر کے انہوں نے دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زائد فرزندان توحید کے شدید غم وغصہ اور اشتعال و اضطراب کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جو اسرائیلی نژاد ابلیس صفت نکولا باسل نے اپنی شرمناک فلم کے ذریعے اُن میں پیدا کیا ہے، تاہم یہ مذمت یکسر ناکافی ہے۔ یہ مذمت تو امریکہ کی طرف سے پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ مسلمانوں نے اوباما سے یہ مطالبہ تو کیا ہی نہیں تھا کہ امریکی صدر اس شیطانی فعل کی مذمت کر لیں تو ہم مطمئن ہو جائیں گے بلکہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ نہ صرف گستاخانہ اور بے ہودہ فلم پر پابندی لگائی جائے بلکہ اس

کے بنانے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے اور ایسی قانون سازی کی جائے کہ جس کی رو سے پیغمبر اسلام ﷺ اور دوسرے مذاہب کے پیغمبروں کی توہین کو جرم قرار دیا جائے۔ امریکی صدر نے آزادی اظہار رائے کی آڑ میں گستاخانہ فلم پر پابندی لگانے سے بھی انکار کر دیا اور عصمت انبیا کے بارے میں قانون سازی کا بھی ذکر نہیں کیا۔

اظہار رائے کی آزادی انسان کا حق ہے۔ کوئی بھی معقول انسان اور مہذب معاشرہ اس کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے اس حق کی جس قدر حفاظت کی ہے، دنیا کا کوئی بہترین خیال کیا جانے والا نظام یا ازم بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ دنیا کے شائد عمدہ سے عمدہ جمہوری ماڈل میں بھی یہ آزادی کسی کو حاصل نہ ہوگی کہ آدمی بھری محفل میں اپنے حکمران سے اُس کے لباس کے بارے میں سوال کر سکے کہ یہ کہاں سے آیا؟ مگر اسلام کے دورِ خلافت راشدہ میں ایک عام آدمی اُٹھ کر خلیفہ سے یہ سوال کرتا ہے کہ میری طرح آپ کو بھی بیت المال سے ایک چادر ملی تھی، جس سے آپ کا لباس نہیں بن سکتا تھا، پھر یہ کیسے بن گیا؟ اور خلیفہ اُس کو ٹوکنے یا خاموش کرانے کی بجائے بیٹے کے توسط سے اطمینان بخش جواب دیتے ہیں۔ یہ تو ایک مثال ہے، اس طرح کی کئی مثالیں اسلامی تاریخ سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

آزادی رائے کی اہمیت اپنی جگہ، تاہم امریکی صدر، مغربی بقراطوں اور مسلم دنیا کے ان نام نہاد دانشوروں کو جو آزادی اظہار کی من مانی تعبیر کر کے اس کا دفاع کرتے ہیں، یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کی کوئی بھی تہذیب یافتہ سوسائٹی اظہار رائے کی مطلق آزادی کی روادار نہیں ہو سکتی۔ آزادی اظہار رائے کے لیے ہر نظام فکر حدود و ضوابط کا تعین کرتا ہے۔ آزادی اُسی حد تک ہوتی ہے جہاں تک دوسروں کی آزادی متاثر نہ ہو۔ یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ خیالات کا اظہار کس حد تک کیا جائے کہ اخلاقی قیود پامال نہ ہوں، ریاستی مفادات کو زک نہ پہنچے، معاشرے میں انتشار نہ پھیلے، دوسروں کی دل آزاری نہ ہو۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں جہاں آزادی اظہار رائے کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ ''اپنے خیالات، معلومات اور آرا کو گورنمنٹ کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اظہار کرنا اظہار رائے کہلائے گا۔'' وہاں ساتھ ہی ہر اُس گفتگو یا رائے پر پابندی کی بات کی گئی ہے جو واضح اور حقیقی خطرے کی موجب ہو یعنی (1) کسی پر بہتان لگایا گیا ہو (2) فحاشی کی موجب ہو (3) کسی پر دباؤ ڈال کر مجبور کرنے کی کوشش ہو۔

اقوام متحدہ جو بظاہر قیام امن کے لیے معرض وجود میں لائی گئی ہے، کے ''اعلامیہ برائے سیاسی وسماجی حقوق'' جو جنرل اسمبلی نے 1966ء میں منظور کیا تھا، کے آرٹیکل 60 میں تشدد کے فروغ، نسلی تعصب، مذہبی منافرت اور کسی بھی قسم کی امتیازی رویے پر مبنی تقریر وتحریر پر پابندی کی بات کی گئی ہے۔ 2010ء اور 2011ء میں بھی اقوام متحدہ کی ''حقوق انسانی کونسل'' نے مذاہب، مذہبی علامات، محترم شخصیات حتیٰ کہ اسلام یا مسلمانوں کی توہین کو روکنے یا انہیں بدنام کرنے کے حوالے سے دو قراردادیں منظور کی تھیں۔ اول الذکر قرارداد کا عنوان ''توہین مذاہب کے خلاف جنگ'' تھا۔ اس قرارداد میں خاص طور پر اس بات پر شدید تشویش کا اظہار کیا گیا تھا کہ ''اسلام کو اکثر و بیشتر اور غلط انداز سے حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں اور دہشت گردی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے اور مسلم اقلیتی برادری کی نگرانی کے لیے جو قوانین بنائے اور انتظامی اقدامات کیے جاتے ہیں، اُن کی مدد سے انہیں (مسلمانوں کو) نشانہ بنایا جاتا ہے۔ قرارداد میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے متعصبانہ اقدامات پر اظہار افسوس کیا گیا اور مذہبی منافرت پھیلانے کی مذمت کی گئی۔ مزید کہا گیا کہ ہر ایک کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے لیکن یہ کام خصوصی ذمہ داری اور احتیاط سے کرنا چاہیے۔ اس میں دوسروں کی عزت، قومی سلامتی، امن عامہ اور اخلاقیات کا خیال رکھنا چاہیے۔ ثانی الذکر قرارداد کا عنوان ''عدم برداشت، مذہب کے متعلق دقیانوسیت، مذہب یا عقائد کی بنیاد پر تشدد کے لیے اکسانے یا پھر توہین کرنے کے خلاف جنگ'' تھا۔ اس قرارداد میں مذاہب کو بدنام کرنے، انتہا پسند تنظیموں کے اقدامات اور میڈیا کے رویے، اقدامات اور ایسے پروگراموں پر شدید تحفظات کا اظہار کیا گیا تھا جو مذاہب یا عقائد کے خلاف ہوتے تھے۔

مغربی جمہوری ممالک آزادی رائے کے سب سے بڑے علمبردار سمجھے جاتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ سرد جنگ کے زمانے میں اشتراکیت کے زیر اثر ممالک اور عرب ممالک میں آزادی اظہار پر سخت بندشیں عائد کر کے اُس کا گلا گھونٹا گیا۔ اس کے مقابلے میں مغربی دنیا نے انفرادی آزادیوں کا تحفظ کیا۔ اظہار رائے کی آزادی دی، یہاں تک کہ فرد کی آزادی کے دائرے کو اس قدر بڑھایا گیا کہ فرد اور اجتماعیت کا فطری توازن بھی قائم نہ رہ سکا جس نے مغربی سماج میں خوفناک نتائج پیدا کیے۔ خاندانی نظام تباہ ہوگیا اور سماجی اقدار ملیا میٹ ہوگئیں۔ تاہم اس سب کے باوجود مغربی معاشروں اور مملکتوں میں اظہار رائے کی آزادی کو

کلیتاً بے لگام نہیں چھوڑا گیا بلکہ مقامی ماحول اور حالات کے مطابق اس کی حدود مقرر کی گئیں اور اس پر قدغنیں لگائی گئیں۔ اس لیے کہ رائے کے اظہار کی بے مہار آزادی دینے کا مطلب نسلی، لسانی، علاقائی اور مذہبی مناقشت اور جنگ و جدل کا بازار گرم کرنا اور معاشرہ کو انتشار، لاقانونیت اور انارکی کی آگ میں جھونکنا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں ان کے دستور، اقتدار اعلیٰ، اور خارجہ پالیسیوں پر کوئی کھل کر بات نہیں کرسکتا۔ دستور یا اقتدار اعلیٰ کے متعلق باغیانہ اظہار رائے کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔ مقدس مقامات، مقدس ہستیوں اور مقدس اشیا کی توہین پر سزا اکثر ممالک میں موجود ہے۔ مغربی دنیا بے حیائی اور فحاشی و عریانی کی دلدل میں غرق ہے، مگر وہاں بچوں میں جنسی ہیجان پیدا کرنے والی فحش نگاری پر پابندی ہے۔ قانونی طور پر مذہبی و نسلی منافرت پھیلانے والی تحریر و تقریر جرم ہے۔ جرمنی، آسٹریا، سپین سمیت کئی ممالک میں گستاخانہ کلمات پر سزا اور اس کی حوصلہ شکنی کے لیے قوانین موجود ہیں۔ کینیڈا میں عیسائیت کی تنقیص و تضحیک اور آئرلینڈ میں مذہب کے خلاف نفرت پھیلانا جرم ہے۔ برطانیہ میں ایونجلیکل مسیحی فرقہ کی توہین جرم ہے۔ اسی طرح توہین مسیح یا کتاب مقدس کی سچائی سے انکار "Blasphemy" (توہین مذہب) ہے، جس کی سزا تخت و تاج برطانیہ یا حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم کے مطابق عمر قید تک دی جاسکتی ہے۔ یورپ و امریکہ کے علاوہ پوری دنیا میں ہتک عزت اور توہین عدالت کے قوانین موجود ہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک میں Blasphemy قانون پایا جاتا ہے۔ چین میں جو لامذہب ریاست ہے، مہاتما بدھ کے مجسمے کی توہین فوجداری جرم ہے۔ یہودیوں کے ہاں خدا، رسول اور یوم سبت کی توہین جرم ہے۔ ہندومت میں ویدوں کی توہین کرنے والا ''ناستک'' (مذہب بیزار) ہوتا ہے اور اسے تباہ و برباد کرنے، قتل کرنے اور جلا دینے کا حکم ہے۔ دنیا کی کئی ریاستوں میں ریاست سے غداری کی سزا موت ہے۔ کہیں سربراہ مملکت کی توہین اور آئین کی توہین پر بھی سزائے موت رکھی گئی ہے۔

اظہار رائے کی آزادی اگر مطلق اور بے لگام ہوتی تو متذکرہ قواعد اور بندشیں کبھی نہ لگائی جاتیں۔ اس لیے کہ پھر ان قوانین کا بنانا آزادی اظہار کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہوتا۔ اگر آزادی اظہار ہر قسم کی قیود سے آزادی کا نام ہے تو پھر ان قوانین کو ختم کر دینا چاہیے تاکہ جو جس کے جی میں آئے بکتا جائے اور اسے کسی قانونی پابندی کا خوف نہ ہو۔ آزادی اظہار

رائے کے وکیل کیا اس کی حمایت کریں گے؟

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اظہار خیال کی آزادی اگر ہر قسم کی قید اور ضابطے سے آزاد ہے تو پھر حال ہی میں آئرلینڈ کی ایک عدالت نے پرنس ہیری کی متنازعہ تصاویر کی اشاعت پر اخبار "The sun" کے ایڈیٹر کو کیوں معطل کیا؟ اخبار کو جرمانہ کیوں کیا؟ پھر 1993ء میں ایک عراقی خاتون کو محض اس لیے سزا کیوں دی گئی کہ اس نے ہوٹل کے فرش پر اس وقت کے امریکی صدر بش سینئر کا توہین آمیز کارٹون بنایا تھا جس پر سے گزر کر لوگ ہوٹل کے اندر جاتے تھے؟ آزادی اظہار رائے اگر اتنی ہی مقدس تھی تو پھر محمد علی (کلے) سے امریکہ کی ویت نام پالیسی پر تنقید کی وجہ سے عالمی چیمپئن کا اعزاز کیوں چھین لیا گیا؟ کیلی فورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ کو جنھوں نے امریکہ میں اسرائیلی سفیر مائیکل اورن کے خطاب پر احتجاج کیا تھا، ایک سال کے لیے یونیورسٹی سے کیوں نکال دیا گیا؟ الجزیرہ ٹی وی چینل کی طرف سے 6 امریکی فوجیوں کی لاشیں دکھانے پر احتجاج کیوں کیا گیا اور پھر کیوں اس کی پاداش میں اُس کے آفس پر حملہ کر کے عملے کے لوگوں کو شہید کیا گیا؟

جنرل اسمبلی کے جس اجلاس میں اوباما نے نام نہاد اظہار رائے کی آزادی کا دفاع کیا، وہیں امریکی صدر کے خطاب کے فوری بعد وکی لیکس کے بانی جولین اسانج نے بھی ٹیلیفونک خطاب کیا۔ امریکہ، برطانیہ اور یورپ کی کئی حکومتوں نے امریکی حکومت، اس کے سفارتی نمائندوں، فوجی جرنیلوں اور سی آئی اے کے گھٹیا منصوبوں اور اُن کے پاکستانی سیاستدانوں سے خفیہ تعلقات کے بارے میں انکشافات کے بعد اسانج کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر رکھے ہیں۔ اس سال جون میں اسانج لندن پولیس کو چکمہ دے کر ایکواڈور کے سفارتخانے میں داخل ہو گئے اور سیاسی پناہ کی درخواست دے دی۔ تب سے وہ اسی سفارتخانے کے کمپاؤنڈ میں محصور ہیں۔ اسانج نے اپنے خطاب میں اوباما کے آزادی اظہار کے دعوؤں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "امریکی صدر نے آزادی اظہار رائے پر مجرمانہ قدغن لگائی ہے، جس کا جیتا جاگتا ثبوت میرا یہ خطاب ہے جو میں اس پنجرے سے کر رہا ہوں۔" انہوں نے مزید کہا "اگر اوباما آزادی اظہار کے ایسے ہی حامی ہیں تو ان کے خصوصی حکم پر وکی لیکس کی ویب سائٹ کیوں بند کی گئی"۔

مطلق آزادئ رائے کے تصور کی نفی کی سب سے نمایاں مثال یورپ و امریکہ میں

ہولوکاسٹ کے حوالے سے قانون سازی ہے۔ یہ قانون مغربی دنیا کے اکثر ممالک میں موجود ہے کہ ہٹلر کے ہاتھوں 60 لاکھ یہودیوں کے قتل عام کو جھٹلانا قابل سزا ہے، بلکہ اسے مبالغہ آمیز قرار دینا بھی جرم ہے۔ یہاں تک کہ 16 اکتوبر 2004ء کو صدر بش نے یہودی لابی کے پیش کردہ ''اینٹی سیمی ٹزم ریویوایکٹ'' پر دستخط کیے۔ یہ قانون امریکی وزارت خارجہ کو پوری دنیا میں ایسے معاملہ میں مداخلت کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے جو یہودیوں کے لیے نقصان کا باعث ہو۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں کہ مغرب کی زمام کار کے اصل مالک یہودی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں یہودیوں نے anti semetism اور Holocast کے خلاف بات کرنے کو قانوناً جرائم کی فہرست میں شامل کرایا ہے، لہٰذا کوئی شخص جرأت نہیں کرسکتا کہ وہ ہولوکاسٹ افسانے کو جھٹلائے۔ جس نے بھی یہ جرأت کی، اس کو سزا بھگتنا پڑی ہے۔ اس کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے اس ''جرم'' کی پاداش میں کینیڈا کے شہری ارنسٹ رنڈل کو 15 ماہ قید کی سزا ہوئی۔ 2006ء میں آسٹریا کے عیسائی محقق ڈیوڈ ارونگ کو ہولوکاسٹ کو مبالغہ آمیز کہنے کی پاداش میں تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔

امریکی صدر اوباما نے امریکی آئین میں ہونے والی پہلی ترمیم کے حوالے سے آزادی اظہار رائے کا دفاع کیا، حالانکہ امریکی آئین بھی اظہار رائے کی آزادی کو بے لگام ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ خود امریکی عدالتوں نے اس حق کو محدود اور مقید کیا ہے۔ 1919ء میں ایک امریکی عدالت نے ایک امریکی شہری شینک کی طرف سے فوج میں بھرتی کی حوصلہ شکنی پر مبنی پمفلٹ کی اشاعت اور تقسیم کے مقدمے میں شینک کو اظہار رائے کے قانون کا تحفظ دینے سے یہ کہہ کر صاف انکار کردیا تھا کہ اگر کوئی تھیٹر میں آگ لگانے کی جھوٹی خبر پھیلا کر لوگوں کو دہشت زدہ کرے تو اُسے آزادی اظہار رائے کے تحت تحفظ نہیں دیا جاسکتا۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں مزید لکھا کہ ہر معاملے میں سوال یہ ہوتا ہے کہ جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، کیا اُن کی نوعیت ایسی ہے کہ جن سے ایسی محسوس اور ٹھوس خرابی کو جنم دینے کا خطرہ رونما ہوتا ہو، جسے روکنے کا حق کانگریس کو حاصل ہے۔

متذکرہ حقائق اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ اظہار رائے کی آزادی خود مغربی دنیا میں بھی مطلق نہیں ہے، بلکہ اس کو حدود وضوابط کا پابند بنایا گیا ہے۔ توہین مذہب کے حساس معاملے کے علاوہ تمام ریاستی وسیاسی اور سماجی معاملات میں اس پر قدغنیں لگائی گئی ہیں، بلکہ

یورپ میں اظہار خیال کے حوالے سے بعض ایسی نامعقول قانونی بندشیں بھی عائد کی گئی ہیں جن کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ پھر کیا اسلام اور اس کے معتقدات ہی ایسے رہ گئے ہیں کہ ان پر ہر دریدہ دہن اور گھٹیا ذہن زبان درازی کر سکتا ہے؟ کیا آزادی اظہار رائے کا قانون محض مسلمانوں کے دین، اُن کے عظیم المرتبت نبی ﷺ اور اُن کی مقدس کتاب کی شان میں گستاخی کرنے والوں کے لیے باقی رہ گیا ہے؟ کیا یہ ایسے ہی شیطان صفت کرداروں کو سزا سے بچانے کے لیے حرکت میں آتا ہے؟ یہ دُہرا معیار اور اوباما، اس کے صیہونی مسیحی دوستوں اور ابلیس کے ایجنٹ یہودیوں ہی کو زیب دیتا ہے، ورنہ کوئی بھی معقول انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اظہار رائے کی آزادی اور مقدس ہستیوں کی توہین بالکل دو الگ معاملے ہیں۔ کوئی بھی مہذب سماج اور اور انسان دوست سوسائٹی مخالف مذہب کی توہین اور انبیا علیہ السلام کی گستاخی کی شرمناک حرکات کی اجازت نہیں دے سکتی۔

ہم امریکی صدر پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ توہین رسالت محض بنیادی حقوق کی سنگین خلاف ورزی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ مسلمانوں کے ایمان اور ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ تو نبی آخر الزمان اور امام الانبیا ہیں۔ آپ ﷺ سے قلبی اور روحانی تعلق مسلمانوں کا اہم ترین عقیدہ ہے۔ مسلمانوں کے کلمہ میں جو وجود اُن کی زندگی کو دستوری اور معاشرتی ہدایت کا سبق دیتا ہے، وہ حضور رسالت مآب ﷺ کی بے عیب ذات ہے، جو صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، تمام انسانیت، بلکہ تمام جہانوں کے لیے رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ ﷺ سے دنیا و مافیہا سے بڑھ کر محبت و عقیدت مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے بغیر اس کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ ذات محمد ﷺ مسلمانوں کے دلوں میں بستی ہے۔ ان کی جان اسم محمد ﷺ ہے۔ ان کی غذا عشق مصطفیٰ ﷺ ہے۔ وہ اپنی جان، ماں باپ، مال و اولاد سب کچھ آپ ﷺ کی حرمت پر قربان کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ کیوں نہ ہوں یہی تو ایمان کی شرط اول ہے۔ حب رسول کریم ﷺ کا رشتہ ہی حاصل زندگی ہے۔

محمد ﷺ کی محبت دین حق کی شرط اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے
محمد ﷺ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

محمد ﷺ کی محبت آن ملت، شان ملت ہے
محمد ﷺ کی محبت روح ملت، جان ملت ہے
محمد ﷺ کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے
محمد ﷺ ہے متاع عالم ایجاد سے پیارا
پدر، مادر، برادر، مال، جان، اولاد سے پیارا

مسلمان اس زندگی کے علاوہ قبر اور حشر میں بھی اس تعلق سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ اس رفیع الشان ہستی کی شان میں گستاخی پر وہ کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں، مگر اپنے نبی مہربان ﷺ کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتے اور اپنی جان پر کھیل کر بھی آپ ﷺ کی ناموس کی حفاظت کرتے ہیں:

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ بطحا ﷺ کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کہ کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

شاتم رسولؐ دوسروں کے دلوں میں رسول خدا ﷺ کی عظمت و توقیر کو گھٹانے کی کوشش کرتا ہے اور ان میں کفر و نفاق کے بیج بوتا ہے، اس لیے توہین رسالت کو برداشت کر لینا اپنے ایمان سے ہاتھ دھونے اور دوسروں کے ایمان کے لیے خطرات پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ جو زبان آپ ﷺ پر طعن کے لیے کھلتی ہے، اگر اُسے کاٹا نہ جائے اور جو قلم آپ ﷺ کی ناموس کی بے حرمتی کے لیے اٹھتا ہے، اگر اسے توڑا نہ جائے تو اسلامی معاشرہ فساد اعتقادی و عملی کا شکار ہو کر رہ جائے گا، اسی لیے شاتم رسول کا جرم ناقابل معافی ہے اور وہ توبہ کے باوجود سزائے موت سے نہیں بچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ پر عام معافی کا اعلان فرمایا، مگر شاتمین رسول کا خون رائیگاں قرار دیا۔ انہیں معاف نہیں کیا۔

امریکی صدر نے جنرل اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران بجا طور پر یہ کہا کہ یہ گستاخانہ فلم امریکہ کی بھی بے عزتی ہے۔ اس سے لاکھوں امریکی مسلمانوں کی بھی دل آزاری ہوئی ہے۔ ہم اُن سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ امریکہ نے عزت کا راستہ کب اختیار کیا ہے اور دل آزاری کا کون سا موقع گنوایا ہے؟ اپنی استعماری پالیسیوں، احساس برتری اور نامنصفانہ رویوں کے سبب آج وہ دنیا بھر میں نفرت کی علامت بنا ہوا ہے۔ وہ ایک محدود شر پسند صہیونی

اقلیت کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے جس طرح اسلام اور اسلامی تہذیب پر حملہ آور ہے، کیا اس سے دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زیادہ مسلمانوں اور دنیا بھر کے منصف مزاج انسانوں کے دل و دماغ میں اس کے لیے عزت و احترام کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں؟ کیا اس رویہ سے دنیا کے دل جیتے جاسکتے ہیں؟

امریکی صدر کا یہ تجزیہ بہت خوب ہے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں سے لڑانے کی سیاست دنیا کو آزادی نہیں دلا سکتی، مگر کیا وہ اس بات کا جواب دیں گے کہ وہ اقلیت جو دنیا کو آگ کے شعلوں میں جھونکنے کی پلاننگ امریکہ کے ذریعے آگے بڑھا رہی ہے، اس کو روکنے اور اس کے آگے بند باندھنے کے لیے انہوں نے کیا کیا ہے؟ ان کے پیش رو صدر بش نے نائن الیون کی تیار کردہ صہیونی سازش کے تحت امارت اسلامی افغانستان پر حملہ کیا، محض اس جھوٹے الزام کی بنیاد پر کہ یہ سازش اسامہ بن لادن نے تیار کی تھی۔ اوباما تبدیلی کے نعرے کے تحت برسراقتدار آئے تھے۔ انہوں نے اسلام کے خلاف شروع کی گئی اس صلیبی (درحقیقت صہیونی) جنگ کی پالیسی تبدیل کیوں نہ کی؟

کون باشعور شخص نہیں جانتا کہ نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے عنوان سے لڑی جانے والی یہ جنگ سراسر اسلام کے خلاف جنگ ہے، جس کا اظہار اس وقت کے امریکی صدر بش نے Crusade (صلیبی جنگ) کا لفظ استعمال کر کے کر دیا تھا۔ امریکہ کی قیادت میں عالم کفر کے متحدہ لشکر کی یہ یلغار تیسری عالمی جنگ کا نکتہ آغاز تھی اور افغانستان کو اصل ہدف اس لیے بنایا گیا تھا کہ یہاں سے خلافت اور اسلامی جہادی تحریک (جنرل مرزا اسلم بیگ کے الفاظ میں اسلام کی مزاحمتی قوت) اور احیا ہو رہا تھا جو مستقبل میں امریکہ کے سرپرستوں کے لیے خطرہ بننے والی تھی، چنانچہ اسی بات کا اظہار صہیونی اور صہیونی مسیحی کر رہے تھے۔ بہت عرصہ پہلے یہودی ربیوں اور عیسائی پادریوں نے امریکی انتظامیہ کو یہ یقین دلایا تھا کہ ہمیں اصل خطرہ خراسان سے ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں حیران کن طور پر انہوں نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے 1400 سال پہلے یہ بات فرمائی تھی کہ جب تم خراسان کی جانب سے سیاہ جھنڈے آتے ہوئے دیکھو تو ان میں شامل ہو جاؤ، کیونکہ اس میں خلیفۃ اللہ امام مہدی ہوں گے اور یہ (بھی فرمایا تھا) کہ خراسان سے سیاہ جھنڈے نکلیں گے۔ انہیں کوئی نہیں روک سکے گا، یہاں تک کہ بیت المقدس میں نصب ہوں گے۔

یہودی ربیوں کے مطابق سیاہ جھنڈے والا یہ لشکر طالبان ہیں، ان کا خاتمہ کرنا بہت ضروری ہے۔ امریکی صدر سینئر بش کے دوست مائیک ریونس نے بھی یہی بات کہی تھی۔ بقول اُس کے: ''امریکہ کی بقا کے لیے اسرائیل کا ہونا ضروری ہے اور خود اسرائیل کی بقا کو دنیا بھر میں اگر کہیں سے چیلنج کا سامنا ہوسکتا ہے تو وہ ''خراساں'' کے مسلمان ہیں۔ تھامس فرائیڈمین نے تو بڑی وضاحت سے کہا تھا کہ یہ جنگ انسداد دہشت گردی کے لیے نہیں، اسلامی نظریے کے خاتمے کے لیے ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر نائن الیون کا سانحہ فی الواقع تیسری عالمی جنگ کا آغاز تھا تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ جنگ کس کے لیے ہے؟ ہم دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے نہیں لڑ رہے۔ دہشت گردی تو محض ایک ذریعہ ہے۔ ہم ایک نظریے کو شکست دینے کے لیے برسرپیکار ہیں۔ دوسری عالمی جنگ اور سرد جنگ سیکولر مطلق العنانیت، نازی ازم اور کمیونزم کی شکست وریخت کے لیے لڑی گئی تھی۔ اب تیسری عالمی جنگ مذہبی مطلق العنانیت کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔ یہ دنیا کے بارے میں ایک ایسا نظریہ ہے جو کہتا ہے کہ صرف میرے ہی دین کو سب پر بالادستی حاصل ہونی چاہیے اور ایسا اُسی صورت میں ہوسکتا ہے جب دنیا کے دیگر تمام مذاہب کے بطلان کا اعلان ہوجائے۔ یہی بن لادن ازم ہے، لیکن نازی ازم کے برعکس مذہبی مطلق العنانیت کے خلاف جنگ صرف فوجیں ہی نہیں لڑسکتیں۔ یہ جنگ سکولوں، مسجدوں، گرجوں اور صومعوں میں لڑی جائے گی اور اس نظریے کو شکست دینے کے لیے اماموں، پادریوں اور یہودی سکالروں سے بھی مدد لینی پڑے گی''۔ (بحوالہ نیویارک ٹائمز 27 نومبر 2001ء)

اوباما نے اپنے دور اقتدار میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کھلی ناانصافی کی جنگ سے امریکہ کو کیوں نہیں نکالا۔ عسکری محاذ پر لڑی جانے والی اس جنگ کو میڈیا کی بھرپور معاونت حاصل رہی۔ مغربی میڈیا نے جس طرح اصل حقائق کو دنیا کے سامنے آنے سے روکے رکھا، یہ جھوٹ، دھاندلی اور بے ایمانی کی بدترین مثال ہے۔ اب یہی میڈیا اس جنگ کو اپنے ہاں زیادہ شدت کے ساتھ آگے بڑھا رہا ہے۔ توہین رسالتؐ پر مبنی کارٹونوں کی اشاعت کے بعد گستاخانہ فلم نے شیطنت اور ابلیسیت کی تمام حدیں پار کرلی ہیں۔ اوباما کی عین ناک تلے یہ سب کچھ ہورہا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ عیسائیت اور اسلام کو لڑانے والے ''سیاست کار'' اپنے مذموم مقاصد، اپنی عالمی بالادستی، گریٹر اسرائیل کے قیام کے ایجنڈے اور مسجد اقصیٰ

کوشہید کر کے تھرڈ ٹمپل بنانے کے منصوبے کے تحت یہ سب کچھ کر رہے ہیں، مگر وہ ان کا راستہ روکنے کی بجائے ان سے پوری طرح مفاہمت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ امریکی سیاست کی تشکیل اور پالیسی سازی کے پس پردہ مسیحی صہیونی عناصر اور تحریکوں کا بنیادی کردار ہے، جن کا عقیدہ ہے کہ "یہودی اللہ کے چنے ہوئے لوگ ہیں"۔ لہٰذا وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی مدد کرنا محض ایک سیاسی عمل نہیں، بلکہ ایک مذہبی فرض ہے۔

تہذیبی تصادم کے شعلوں کو ہوا دینے کے لیے "عالمی راہزن" اور ان کے صلیبی گماشتے گستاخانہ فلم پر اپنی حکومت کی خاموشی (بلکہ حمایت) سے شہ پا کر اب پوری مغربی دنیا میں نہایت جارحانہ انداز سے اسلام مخالف مہم شروع کر چکے ہیں۔ میڈیا ان کی پشت پر ہے۔ امریکی و مغربی میڈیا کا ایک سرسری جائزہ بتاتا ہے کہ ایک منظم اور مربوط انداز میں ان تمام اسلام مخالف اور گستاخ رسولؐ افراد کو مغربی میڈیا کے ذریعے سامنے لایا جارہا ہے جو حال و ماضی میں گستاخانہ حرکات کے مرتکب ہوئے ہیں۔ شاتمین اسلام امریکی پادری ٹیری جونز، ڈچ رکن پارلیمان گیرٹ ویلڈر، پامیلا گیلر، ویلسٹر گارٹ اور سلمان رشدی سے رابطے کر کے ان کے انٹرویو شائع کیے جارہے ہیں۔ نیویارک کے اسٹیشنوں اور شہر بھر کی ٹیکسیوں پر اسلام اور جہاد مخالف اشتہار لگائے گئے ہیں اور یہ سلسلہ روز بروز دراز ہوتا جارہا ہے۔ امریکہ کی مختلف ریاستوں میں اسلام اور جہاد مخالف مہم میں امریکی یہودیوں کی تنظیم جیوش کانگریس اور دوسری انتہا پسند تنظیمیں پیش پیش ہیں۔ نیویارک کی عدالت نے بھی ایسے اشتہارات ہٹانے کی درخواست رد کردی ہے۔

امریکی صدر مردان کے ایک چرچ پر ہونے والے حملے پر تو چراغ پا ہیں جو ممکنہ طور پر غصے سے بھرے مخلص مسلمانوں یا پھر امریکی ایجنٹوں کی کارروائی ہو سکتی ہے اور پھر تمام ممالک کو دعوت دیتے ہیں کہ "انتہا پسندی" کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ مگر انہیں امریکہ و یورپ میں اسلام کی بے حرمتی، مذہبی حقوق کی پامالی، اسلامی شعائر کی بے حرمتی، حجاب پر پابندی، میناروں کی تعمیر کی مخالفت، جہاد کے خلاف مہم، اسلام کے نظام زندگی اور اس کی درخشاں تہذیب کے خلاف ریاستی اقدامات اور میڈیا وار نظر نہیں آتی۔ کیا کبھی اس پر بھی ان کے جذبات بھڑکیں گے؟

میں اس صورتحال پر غور کرتا ہوں تو مجھے "The Clash of Civilizations" کے مصنف پروفیسر ہنٹنگٹن کے سچائی سے مملو یہ الفاظ یاد آجاتے ہیں کہ "مغرب کے لیے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی (دہشت گردی) نہیں خود اسلام ہے"۔ لیکن معاً میرا ذہن اللہ تعالیٰ کے ان الفاظ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو قرآن میں آئے ہیں:

ترجمہ: "پیروان باطل چاہتے ہیں کہ حق و صداقت کا جو نور الٰہی روشن کیا گیا ہے، اسے اپنی مخالفت کی پھونک مار کر بجھا دیں، مگر وہ یاد رکھیں کہ اللہ اپنے اس نور (صداقت کی روشنی) کو درجہ کمال تک پہنچا کر چھوڑے گا، اگرچہ کافروں (باطل پرستوں) کو بُرا لگے"۔ (الصف:8)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

ترجمہ: "جو جھاگ ہے، وہ بے مصرف سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور جو (پانی) انسانوں کے لیے نافع ہے، وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے"۔ (الرعد:17)

جناب اوباما! اسلام سچائی ہے اور سچائی روشنی۔ روشنی تیز تر ہوتی رہے گی، اسے جبر کی قوت سے بجھایا نہیں جاسکتا کہ اس روشنی کا محافظ خود خدا ہے، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور خدا و رسول ﷺ کے وفادار وہ عالمی شمشیر زن ہیں، جن کی شاندار مزاحمت اور حیران کن استقامت سے نہ صرف واشنگٹن اور دیگر نیٹو دارالحکومتوں میں کرسی ہائے اقتدار پر براجمان کٹھ پتلیوں پر لرزہ طاری ہے، بلکہ اسلام کے خلاف گیم کے اصل منصوبہ ساز عالمی رہزن بھی سکتے میں ہیں۔ بلاشبہ:

"اسلام" کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دو گے

قاری محمد حنیف جالندھری

آزادی اظہار رائے اور توہین میں فرق

شر انگیز، دل آزار اور گستاخانہ فلم کے معاملے میں عالم اسلام میں بیداری کی جو لہر اٹھی ہے، وہ حوصلہ افزا بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ حوصلہ افزا اس لحاظ سے کہ دینی اقدار و روایات، قابل احترام مذہبی شخصیات اور پیغمبر آخر الزمان ﷺ کے معاملے میں دنیا بھر کے اہل ایمان اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ابھی تک جس حساسیت اور ایمانی غیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس سے لگتا ہے کہ ابھی اس امت کی خاکستر میں بہت سی چنگاریاں باقی ہیں۔ انہی چنگاریوں سے چراغ بھی روشن ہوتے ہیں اور انہیں چنگاریوں سے الاؤ بھی جل اٹھتے ہیں۔ اس لیے یہ بیداری ایک لحہ فکریہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے، کہ کئی جگہوں پر یہ صورتحال دیکھنے میں آئی ہے کہ مسلمانوں کے سینوں میں دبی عشق رسالت ﷺ کی چنگاریوں سے چراغ جلنے اور پھر چراغوں سے مزید چراغ جلنے کی بجائے الاؤ سے بڑھک اٹھے ہیں۔ ہمیں اس وقت یہ کوشش کرنی ہے کہ ان چنگاریوں سے جو الاؤ بڑھکیں، ان سے اپنا نقصان نہ ہو، اپنی املاک نذر آتش نہ ہوں، اس دہکتے الاؤ کے شعلے محض وقتی نہ ہوں بلکہ امت مسلمہ کی اس بیداری کو ایک مستقل تحریک کی شکل دینے کی ضرورت ہے اور تسلسل کے ساتھ اس فکر کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ دنیا مذاہب کے احترام، قابل احترام ہستیوں کے تقدس اور مذہبی شعائر کے ادب کے حوالے سے سر جوڑ کر بیٹھے اور باقاعدہ طور پر قانون سازی کی جائے اور ایک ایسا حل تلاش کیا جائے، کوئی ایسا ضابطہ اور قاعدہ تشکیل دیا جائے کہ انسانی حقوق اور آزادی اظہار رائے کے نام پر کسی کو دنیا کا امن وسکون خطرے میں ڈالنے اور کروڑوں لوگوں کی دل آزاری کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔

یاد رہے کہ یہ پہلا موقع ہے جب اہل مغرب اور اہل باطل پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ دلیل کے میدان میں ان کی شکست واضح دکھائی دے رہی ہے۔ ایسے میں عوامی سطح پر بھی اور حکومتی سطح پر بھی مسلسل یہ آواز اٹھانے کی ضرورت ہے کہ دنیا کے امن وسکون کو

بچانے کے لیے اور تہذیبوں کے تصادم کا راستہ روکنے کے لیے ایسے قوانین انتہائی ضروری ہیں جن کی وجہ سے قابل احترام ہستیوں اور مذہبی شعائر کو ہدف تنقید بنا کر دوسروں کے جذبات سے کھیلنے اور گوشہ سکون و عافیت میں بیٹھے لوگوں کو آتش فشاں بنا دینے کی جسارت کرنے والوں کو لگام دی جا سکے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ عرصے سے پاکستان کا انسدادِ توہین رسالت کا قانون دنیا بھر کے اہل باطل کی نظروں میں بری طرح کھٹک رہا ہے۔ وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے اس قانون کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں، اس قانون کے غلط استعمال کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور اس حد تک اس قانون کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں کہ انسان کو حیرت ہوتی ہے اور دوسری طرف آزادی اظہار رائے کی مالا اس تسلسل کے ساتھ جپتے چلے جاتے ہیں کہ "آزادی اظہار رائے" کوئی آسمانی اور الہامی قانون محسوس ہونے لگتا ہے لیکن حالیہ گستاخانہ فلم "آزادی اظہار رائے" کے قانون کے غلط استعمال کی ایک تازہ مگر بدترین مثال ہے اور اس قسم کی کئی مثالیں اس سے پہلے بھی موجود ہیں۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل جب ایک برطانوی شہزادی کی برہنہ تصاویر ایک فرانسیسی میگزین میں چھپ گئیں تو اس پر ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اسی طرح ہولوکاسٹ کے معاملے میں کہیں سے کوئی آواز اٹھے تو ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ شہزادی کی تصویر کا قضیہ ہو یا ہولوکاسٹ کا تاریخی واقعہ، اس طرح کے مواقع پر مغرب "آزادی اظہار رائے" کے فلسفے کو فراموش کر بیٹھتا ہے لیکن بدقسمتی سے پیغمبر اسلام ﷺ کی بے حرمتی ہو یا قرآن کریم کی توہین، ازواج مطہرات پر انگلی اٹھانے کا معاملہ ہو یا صحابہ کرامؓ کے حوالے سے ہرزہ سرائی، مغرب اور اہل باطل کو آزادی اظہار رائے کا قانون یاد آ جاتا ہے۔ اس لیے ہماری دانست میں اب وہ وقت آ گیا ہے کہ دنیا کو عالمی سطح پر ایسا کوئی ضابطہ، ایسا کوئی قانون بنانا ہی ہوگا جس کے ذریعے آزادی اظہار رائے اور توہین میں تفریق کی جا سکے، کوئی ایسی لکیر کھینچنا ہی ہوگی جو توہین اور آزادی اظہار رائے کے مابین حد فاصل قرار دی جا سکے اور یہ منزل حاصل کرنے کے لیے باقاعدگی اور مستقل مزاجی سے محنت کرنے کی ضرورت ہے، عوامی سطح پر بھی اور حکومتی سطح پر بھی۔ ملکی اور بین الاقوامی دائروں میں مسلسل اس طرح کے قانون کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر انیس احمد

آزادی اظہار کا دوہرا معیار

ہر انسان کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے اور اگر چیز قابلِ تنقید ہو تو اس پر تنقید بھی کرے، لیکن کسی بھی انسان کو آزادیِ قلم اور حریت بیان کے بہانے یہ آزادی نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی دوسرے فرد کی عزت، ساکھ، معاشرتی مقام اور کردار کو نشانہ بنا کر نہ صرف اس کی بلکہ اُس سے وابستہ افراد کی دل آزاری کا ارتکاب کرے۔

اگر یورپ کے بعض ممالک میں (مثلاً ڈنمارک، اسپین، فن لینڈ، جرمنی، یونان، اٹلی، آئر لینڈ، ناروے، نیدر لینڈ، سوئٹزر لینڈ، آسٹریا وغیرہ) آج تک Blasphemy یا مذہبی جذبات مجروح کرنے پر قانون پایا جاتا ہے اور برطانیہ جیسے رواداری والے ملک میں ملکہ کے خلاف توہین Blashemy کی تعریف میں آتی ہے، تو کیا کسی کارٹونسٹ یا کم تر درجے کے ادیب یا ادیبہ بلکہ کسی بھی فرد کو یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ گھٹیا ادب کے نام پر جو ہرزہ سرائی چاہے کرے؟ معاملہ تحریر کا ہو یا تقریر کا، ہر وہ لفظ اور ہر وہ بات جو ہتک آمیز ہو، اسے ''آزادیِ رائے'' کے نام پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا انکار کوئی عقل کا اندھا ہی کر سکتا ہے۔ کسی بھی مہذب معاشرے میں آزادیِ رائے کے نام پر کسی دوسرے کے حقِ شہرت، حقِ عزت کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو یہ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔

سیکولر اور آزاد خیال دنیا جس چیز کو اہم سمجھتی ہے، اس پر حرف گیری کو جرم قرار دیتی ہے اور عملاً اپنے پسندیدہ تصورات اور واقعات پر تنقید، محاسبے اور بحث و استدلال تک کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آج جو لوگ اللہ کی مقدس کتابوں کی تحقیر و تذلیل اور اللہ کے پاک باز رسولوں کو سب و شتم کا نشانہ بنانے سے روکنے کو آزادیِ رائے اور آزادیِ اظہار کے منافی قرار دیتے ہیں اور ان گھناؤنے جرائم کے مرتکبین کو پناہ دینے میں شیر ہیں، ان کا اپنا حال یہ

ہے کہ جرمنی میں ہٹلر کے دور میں یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے گئے اور جنھیں بین الاقوامی قانون اور سیاست کی اصطلاح میں ''ہولوکاسٹ'' کہا جاتا ہے محض یہودیوں اور صہیونیت کے علمبرداروں کو خوش کرنے کے لیے ان پر تنقید کو اپنے دستور یا قانون میں جرم قرار دیتے ہیں۔ ایسے محققین، مؤرخین اور اہلِ علم کو جو دلیل اور تاریخی شہادتوں کی بنا پر ''ہولوکاسٹ'' کا انکار نہیں صرف اس کے بارے میں غیر حقیقی دعووں پر تنقید و احتساب کرتے ہیں، نہ صرف انہیں مجرم قرار دیتے ہیں بلکہ عملاً انہیں طویل مدت کی سزائیں دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آسٹریا کا قانون National Socialism prohibition Law 1947 amended 1992 کی رُو سے جو مندرجہ ذیل جرم کا ارتکاب کرے گا:

"Whoever denies, grossly plays down, approves, or tries to excuse the National Socialist genocide or other National Socialist crimes against humanity in print publication, in broadcast or other media. will be punished with imprisonment from one to ten years, and in cases of particularly dangerous suspects of activity be punished with upto twenty years imprisonment."

جو کوئی طباعتی، نشری یا کسی اور میڈیا میں انسانیت کے خلاف قومی سوشلسٹ جرائم یا قومی سوشلسٹ نسل کشی کا انکار کرتا ہے، یا اسے بہت زیادہ کم کر کے بیان کرتا ہے یا اس کے لیے عذر فراہم کرتا ہے، اسے ایک تا 10 سال کی سزائے قید اور خصوصی طور پر خطرناک مجرموں کو یا سرگرمیوں پر 20 سال تک کی سزائے قید دی جا سکے گی۔

آسٹریا میں یہ قانون، کتابِ قانون کی صرف زینت ہی نہیں ہے بلکہ عملاً دسیوں محققین، اہلِ علم، صحافیوں اور سیاسی شخصیات کو سزا دی گئی ہے اور برسوں وہ جیل میں محبوس رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور مقدمات میں مارچ 2006ء میں برطانوی مؤرخ ڈیوڈ ارونگ کو ایک سال کی سزا اور جنوری 2008ء میں وولف گینگ فرولچ کو ساڑھے چھ سال کی سزا دی گئی اور عالمی احتجاج کے باوجود انہیں اپنی سزا بھگتنی پڑی۔ حقوقِ انسانی کے کسی علم بردار ادارے یا ملک نے ان کی رہائی کے لیے احتجاج کیا اور نہ سیاسی پناہ دے کر ہی انہیں اس سزا سے نجات دلائی۔ یورپ کے جن ممالک میں محض ایک تاریخی واقعے کے بارے میں اظہار یا

تخفیف کے اظہار کو جرم قرار دیا گیا، ان میں آسٹریا کے علاوہ بیلجیم، چیک ری پبلک، فرانس، جرمنی، سوئٹزر لینڈ، لکسمبرگ، ہالینڈ اور پولینڈ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی طرح اسپین، پرتگال اور رومانیہ میں بھی قوانین موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایک عام آدمی کی عزت کی حفاظت کے لیے Law of Libel and Slander آزادیٔ اظہار کے خلاف نہیں اور ہولوکاسٹ کے انکار یا بیان میں تحقیر یا تخفیف کو جرم قابلِ سزا تسلیم کیا جاتا ہے تو اللہ کے رسولوں اور انسانیت کے محسنوں اور رہنماؤں کی عزت و ناموس کی حفاظت کے قوانین نعوذ باللہ ''کالے قوانین'' کیسے قرار دیے جاسکتے ہیں؟

رہی آج کی مہذب دنیا جو انسانی جان، آزادی اور اظہار رائے کی محافظ اور علمبردار بن کر دوسرے ممالک اور تہذیبوں پر اپنی رائے مسلط کرنے کی جارحانہ کارروائیاں کر رہی ہے، وہ کس منہ سے یہ دعویٰ کر رہی ہے جب اس کا اپنا حال یہ ہے کہ محض شبہے کی بنیاد پر دو چار اور دس بیس نہیں لاکھوں انسانوں کو اپنی فوج کشی اور مہلک ہتھیاروں سے موت کے گھاٹ اُتار رہی ہے۔ بیسویں صدی انسانی تاریخ کی سب سے خوں آشام صدی رہی ہے جس میں صرف ایک صدی میں دنیا کی کُل آبادی کا 7.3 فیصد استعماری جنگوں اور مہم جوئی کی کارروائیوں میں لقمۂ اجل بنادیا گیا ہے اور اکیسویں صدی کا آغاز ہی افغانستان اور پاکستان میں بلا امتیاز شہریوں کو ہلاک کرنے سے کیا گیا ہے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

سجاد میر

ناموس رسالت ﷺ یا آزادیٔ اظہار

بے شمار بحثیں ہیں جو اس سے جنم لیتی ہے۔ ہر بحث کے لیے تیار ہیں۔ ان کا اصرار اس بات پر ہے کہ پرامن رہا جائے، خاموش احتجاج کیا جائے، اشتعال میں نہ آیا جائے۔ یہ تو خیر وہ بھلے لوگ ہیں جو یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتے کہ سب کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔ اگر فلم بن گئی تو کیا ظلم ہے۔ ایسے بھی بدبخت ہمارے درمیان موجود ہیں جو یہ دوسرے والا مؤقف رکھتے ہیں۔ وہ یہ بحث آزادی اظہار کے نام پر جیتنا چاہتے ہیں۔
ہمارے حکیم الامت تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہتے ہیں:
ترکھاناں دا منڈی بازی لے گیا۔ یہ معمولی یا جذباتی فقرہ نہیں، ایسے فقرے گہرے تہذیبی شعور کے بطن سے پھوٹتے ہیں جسے کوئی ہمہ شما نہیں، حکیم الامت جیسا دماغ ہی سوچ سکتا ہے۔ ذرا آپ بھی اس پر غور کیجیے۔ اگر ذہن کہیں اٹکے تو مزید گفتگو کے لیے حاضر ہیں۔
میں اپنے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اہل مغرب یہی سمجھا رہے ہیں، ساتھ ہی وہ یہ بحث بھی کر رہے ہیں کہ آخر آزادی اظہار سب کا حق ہے۔ تف ہے تم پر کہ تم آزادی اظہار کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ چلئے چھوڑیئے، ایک نکتہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ آزادی اظہار کا اتنا شوق ہے تو ہولوکاسٹ کے حوالے سے کھلی بحث کرنے کی اجازت مرحمت فرمایئے۔ بھئی، یہ تو ایک تاریخ کا معاملہ ہے، ہماری حالیہ تاریخ۔ تم کہتے ہو 60 لاکھ یہودی ہٹلر نے مار ڈالے، جلا کر بھسم کر ڈالے۔ کوئی اگر کہتا ہے یہ جھوٹ ہے یا یہ تعداد مبالغہ آمیز ہے تو اس میں کیا قیامت آ جائے گی کہ تم ایسا کہنے والوں کو پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس دیتے ہو۔ کہاں گئے تمہارے آزادی اظہار کے دعوے۔ بھئی، یہ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کے گرد کوئی مذہبی تقدس ہو۔ کیوں چیخ اٹھتے ہو اس پر۔ پورا عالم آپ کی رائے پر صاد کرتا ہے، کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

بیسیویوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اس بات کو مگر ہمارے حکیم الامت خوب سمجھے تھے،
مگر ذرا رکیے، ایک آدھ بات اور کیے لیتے ہیں، پھر شاعر مشرق کے خیالات پر بات کرتے ہیں۔

یقیناً میں نہیں کہتا کہ امریکی سفیر درست طور پر قتل کیا گیا۔ بالکل نہیں، اب یہ بحث
شروع کردی گئی ہے کہ یہ تو پہلے سے طے تھا کہ 11 ستمبر کے دن نائن الیون کی یاد میں
قیامت بپا کی جائے گی۔ آپ اپنے مائنڈ سیٹ سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں دکھائی دیتے!
آپ کو ڈر ہے تو اس بات کا کہ افغانستان میں امریکی فوجیوں کا کیا بنے گا؟ افغان اشتعال
میں آگئے تو کیا ہوگا؟ پہلے ہی افغان فوجی امریکیوں کو بھون رہے ہیں۔ کہیں اس میں اضافہ تو
نہیں ہوجائے گا؟ مشورے ہو رہے ہیں کہ مسلمان ممالک میں امریکی فوج بھجوا دی جائے،
سفارت خانوں اور امریکی مفادات کی حفاظت کے لیے اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے
نے اچھا کیا کہ چار دن کے لیے چھٹی کرلی۔ امریکیوں کو اگر دنیا بھر میں مسلمانوں سے خطرہ
محسوس ہو رہا ہے تو انہیں ضرور اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے نامہ اعمال کا جائزہ لینا
چاہیے۔ آخر مسلمان ان کا نام سنتے ہی کیوں بھڑک اٹھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، انہیں یہ مشورہ بھی
دیا جائے کہ وہ جگہ جگہ فوجیں بھیجنے کے بجائے اپنا ہی بوریا بستر گول کر جائیں یا اگر وہ معتدل
مشورہ سننے کے عادی ہوں تو کہا جائے کہ اپنا رویہ بدلیں۔

مسلمانوں کو بھی اپنا رویہ بدلنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم نہیں سمجھا
سکتے کہ ہمارے ہاں ناموس رسالت ﷺ کا مطلب کیا ہے یا یہ کہ ہم اپنی زندگیوں میں دین کی
کیا اہمیت سمجھتے ہیں؟ مغرب والوں کو چھوڑیئے، ہمارے ہاں بھی پیراڈائم شفٹ کی بات کی
جاتی ہے۔ مجھے ان لوگوں کی نیتوں پر شک نہیں، البتہ بعض اوقات یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ان
کے خیالات اپنے ماحول کی پیداوار ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں رہنے والے
مسلمانوں میں کوئی وحید الدین خاں یہ کہتا ہے کہ پاکستان بنانے کے جرم پر مسلمانوں کو اجتماعی
طور پر ہندوؤں سے معافی مانگنا چاہیے تو میں انہیں معذور سمجھوں گا۔ بابری مسجد پر وہ اگر
مدافعانہ مؤقف اپناتے ہیں اور ہر زیادتی کو سہہ جانے یا نظرانداز کرنے کی ترغیب دیتے ہیں تو
یہ ان کے حالات ہیں۔ ایک دوسری مثال بھی ہے، وہ مسلمان اہل علم جو مغرب یا امریکہ میں
کام کررہے ہیں یا وہاں رہ رہے ہیں، ان کے ہاں اگر یہ رویہ پایا جاتا ہے کہ ہمیں ہر حال میں
تحمل سے کام لے کر مغربی معاشرے سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنا چاہیے تو یہ سب کچھ

ان کی علمی بددیانتی ہے، نہ شاید مصلحت بینی بلکہ حالات کے دباؤ میں یہ ان کی دیانتدارانہ فکر ہی ہوگی۔ اسے میرا حسن ظن سمجھ کر یہ بات کہنے پر مجھے بھی معاف کیجیے۔ سچ پوچھیے تو ایسے مواقعوں پر مجھے اچھے اچھے صالح مسلمانوں کی ایسی تحریریں پڑھ کر غصہ آتا ہے، مگر علمی رواداری کے نام پر خاموش رہتا ہوں۔ ویسے بھی ان کے ابدوجد کا احترام بھی مقصود ہوتا ہے۔ حسن البنا کے نواسے کی تحریریں بھی، میں اسی ذیل میں رکھ کر دیکھتا ہوں اور ان کے لیے دعا کرتا ہوں اور وہ لوگ جو مغرب میں مسلمانوں کی بہبود کی تنظیمیں چلا رہے ہیں وہ تو دل کی گہرائیوں سے ایسے ہی "رواداز" واقع ہوئے ہیں مگر میں آزاد مسلم دنیا میں رہنے والا تو اس کا پابند نہیں ہوں کہ اپنے آزادانہ خیالات پر جبر کے شکنجے کس لوں۔

خیال آیا کہ میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا کہ آزادی اظہار پر حکیم الامت سے استفادہ کروں گا۔ یہ مغرب والے جو آزادی اظہار یا آزادی افکار کی بات کرتے ہیں، اسے سمجھنے کے لیے اقبال کے چار شعر سن لیجیے پہلے آخری دو اشعار:

اس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
جس قسم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

کچھ پلے پڑا، خود مغرب والے بھی اس کے قائل ہیں۔ اس لیے ہم ایشیاء والوں کے بارے میں کہتے رہتے ہیں کہ ابھی وہ جمہوریت کے اہل نہیں ہوئے۔ میں یہ بات اکثر کہا کرتا ہوں کہ دنیا میں آزادی کا کوئی تصور ذمہ داری کے تصور سے ہٹ کر نہیں۔ آپ ذمہ دار ہیں تو آپ آزاد ہیں اور آپ آزاد ہیں تو آپ کو ذمہ دار بننا پڑے گا۔ یہ بات میں نے بیسویں صدی میں آزادی کے سب سے بڑی مبلغ ژاں پال سارتر سے سیکھی ہے۔ یہ اور ان جیسے فلسفیوں کی غلط تعبیر کر کے مغرب میں ہپی کلچر اور اس نوع کے عذاب آئے۔ اب بھی جو لوگ آزادی کے غلط معنی لے رہے ہیں وہ ایسی ہی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ جس قوم یا تہذیب میں یہ بیماری سرایت کر جائے، اسے آزادی اظہار کی بات نہیں کرنا چاہیے، مغرب اس پر غور کرے۔ اب حکیم الامت کے پہلے دو شعر بھی سن لیجیے:

جو دونی فطرت سے نہیں لائق پرواز
اس مرغک بیچارہ کا انجام ہے افتاد

اگلا شعر سنیے اور بات کی تہہ تک پہنچ جایئے:

ہر سینہ نشیمن نہیں جبریل امیں کا
ہر فکر نہیں طائر فردوس کا صیاد

یہ بات اقبال جیسا روشن ضمیر ہی سمجھ سکتا تھا، آپ اگر نہیں سمجھتے کہ ہماری تہذیب میں بعض دینی قدروں اور نشانیوں کی کیا اہمیت ہے تو یہ تو سمجھ جایئے کہ آزادی اظہار کی حدود کیا ہیں؟ ہمارے پیمانوں سے نہیں، اپنے ہی معیاروں سے جانچ لیجیے۔ وگرنہ آپ بوسیمن یا ہپی تو پیدا کر سکتے ہیں، اس رویے سے انسانوں کی ذمہ دار نسل پیدا نہیں ہو سکتی۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ ماریئے۔ میرے ایک استاد تھے ڈاکٹر غلام علی چودھری، استاد تو وہ انگریزی ادبیات کے تھے اور افسانہ نویس بھی خوب تھے۔ مشہور ہے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں مغرب کا وقت ہوا تو اٹھ کر اذان دے ڈالی۔ ان کی مشہور برطانوی مورخ ٹائن بی سے خط و کتابت اس زمانے میں پاکستان ٹائمز میں چھپی تھی جس میں ڈاکٹر چودھری نے عظیم برطانوی مورخ سے کہا تھا کہ مغرب ابھی تک صلیبی جنگوں کے نفسیاتی عارضے Crusade Complex میں مبتلا ہے، ٹائن بی اس سے انکار نہ کر سکے۔ یہ ذہنی مرض اب تہذیبوں کے تصادم کے پردے میں چھپا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اس وقت بھی مغرب کے خون اور گودے میں شامل ہے۔ میں جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں، مجھے اس کے ثبوت بھی ملتے جاتے ہیں اور اس پر یقین بھی آتا جاتا ہے۔ اس مرض کو جس طرح اہل یہود نے استعمال کیا ہے، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے بھی تجزیے کی ضرورت ہے۔ یہودی ہر روز کسی نہ کسی مغربی ملک سے معافی منگواتے ہیں کہ ہم نے بھی فلاں موقع پر یہودیوں پر ہٹلر کے زیر اثر ظلم کیے تھے۔ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ کاش ہٹلر کو اور وقت مل جاتا تو انسانیت اس گند سے پاک ہو جاتی۔ کبھی کبھی تو شک گزرتا ہے کہ یہ ہٹلر نہیں تھا، مغرب بلکہ اس وقت دنیا کی اکثر قوموں کی یہودیوں سے نفرت تھی جو اپنا رنگ انتہا پسند تشدد سے دکھا رہی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ اس سے مبرا رہے۔

پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ تاریخ کے بہت پیچیدہ سوال ہیں جن کا جواب چاہیے۔ مجھے کوئی ایسا لبرل شوق نہیں ہے کہ خود پر تبرا بھیجنے لگوں۔ خدا ہمیں بھی اور مغرب کو بھی معاملات کی تہہ تک اترنے کی توفیق دے۔

اوریا مقبول جان

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ بطحا ﷺ کی حرمت پر

جن لوگوں کو اس بات کا غم کھائے جا رہا ہے کہ ہم ایک فیس بک کو بند کر کے پوری دنیا کے علم کے دروازے اپنے اوپر بند کر رہے ہیں۔ جو اپنی نجی محفلوں میں اس بات کا ماتم کرتے ہیں کہ پتہ نہیں یہ سارا جنون، عدم برداشت اور اسلام کی فکر صرف پاکستانیوں ہی میں کیوں ہے؟ جن کو یہ فکر لاحق ہے کہ دنیا بھر میں ہم روشن خیال، آزادی اظہار کا احترام کرنے والے اور مذہب سے بالاتر ہو کر سیکولر سوچ کے حامل کیوں نہیں بن جاتے۔ یہی تو ترقی کا راز ہے۔ جب سے یورپ نے اپنی ریاست کے قوانین سے مذہب کو نکالا، اس وقت سے اب تک دیکھو کیسا پرامن ہو گیا، ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ مذہب تو لوگوں کو آپس میں تقسیم کرنے کے سوا سکھاتا کیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ میرے یہ کرم فرماء اور دانشور مجھ سے راہ چلتے، محفل میں، خطوط کے ذریعے اور ای میل کے توسط سے الجھتے رہتے ہیں۔ خبطی، پاگل، جنونی اور دقیانوسی خیالات کا الزام میرا اعزاز ہے اور مجھے اس اعزاز پر سوائے اپنے رب کے سامنے سجدۂ شکر ادا کرنے کے اور کچھ نہیں کہنا۔

پہلا سوال یہ کہ اسلام کی فکر اور جنون اور سید الانبیاء ﷺ کی حرمت پر کٹ مرنے کا جذبہ صرف پاکستان ہی میں کیوں ہے؟ یہاں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ روز محشر جب ساری امت شافع محشر ﷺ کے حضور شفاعت کی طلب گار ہو گی تو کیا کوئی وہاں یہ عذر پیش کر سکے گا کہ یا رسول اللہ ﷺ جب آپ کی حرمت اور عزت پر حرف آ رہا تھا تو دنیا کے سارے اسلامی ملک بھی خاموش تھے، ہم کیا کرتے؟ سب نے اپنی فرد عمل کا حساب دینا ہے اور اپنا اپنا توشہ آخرت میں لے کر جانا ہے۔ یہ کیا کم سعادت ہے کہ اللہ نے یہ توفیق میرے ملک کے عوام کو عطا کی۔ دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ فیس بک کے سوشل کلب سے کٹ کر ہم علم کے دروازے سے دور ہو جائیں گے۔ اس بات کو ہر وہ شخص بخوبی جانتا ہے جو فیس بک استعمال کرتا ہے۔

کتنی عالمی تحقیقیں، ایجادات، ناول، شاعری یا عظیم کارنامے صرف اس بنیاد پر ہوئے کہ وہ لوگ فیس بک استعمال کرتے تھے۔ بلکہ جو لوگ علم کے دریا میں غوطہ زن ہوتے ہیں، انہیں تو فیس بک پر جانے کی فرصت تک نہیں۔ اکثر ایسے ہیں جن کے مداحین نے ان کی اجازت سے یا بغیر اجازت فیس بک پر ان کا اکاؤنٹ بنایا ہوا ہے اور اسے چلا رہے ہیں۔ تیسرا سوال یہ کہ مذہب سے آزادی اور ریاست کو مذہب سے جدا کرنے کے بعد یورپ پر امن ہو گیا تو اس سے بڑا جھوٹ تاریخ میں نہیں بولا جا سکتا۔ مغرب انقلاب فرانس کے بعد یعنی انیسویں صدی کے آغاز میں مذہب سے آزاد ہوا اور پھر اس نے بیسویں صدی میں دو عالمی جنگیں لڑیں۔ کروڑوں لوگ موت کی وادی میں چلے گئے، ہزاروں شہر برباد ہو گئے، اس وقت تو تمام یورپی ممالک میں سیکولر حکومتیں تھیں۔ کوئی ملا، پادری یا پنڈت، ان کے سر پر سوار نہیں تھا کہ تم دین کی سربلندی کے لیے لڑو، پھر بھی ایسے لڑے کہ دنیا کی تاریخ میں ایٹمی ہتھیار بھی استعمال ہوئے اور نسلوں کی نسلیں بھی صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم جو سیدالانبیاء ﷺ کی حرمت اور تقدس کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی اور نرالی جنگ ہے جس کا روشن خیال مغرب میں کوئی وجود نہیں۔ 27 اگست 70 عیسوی میں جب رومن فوجیں یروشلم میں داخل ہوئیں تو انہوں نے اسے کھنڈر بنا دیا اور معبد سلیمانی کو آگ لگا دی۔ 131 عیسوی میں انہیں عبادات سے روکا گیا۔ انہوں نے رومنوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور 135 عیسوی میں یہ بغاوت کچل دی گئی اور یہودی وہاں سے نکل کر یورپ کے ہر ملک میں پھیل گئے اور 1800 سال تک جلاوطن رہے لیکن وہ جہاں بھی جا کر آباد ہوئے، اپنی حرکتوں کی وجہ سے نفرت کی علامت کے طور پر جانے جاتے رہے۔ جس ملک میں رہتے، اسی کے خلاف سازشیں کرتے۔ یورپ میں ان کے خلاف نفرت کو Antisemitism کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وہ غصہ تھا اور ان کی اپنے ملک سے غداری تھی جس نے ہٹلر کو ان کے خلاف کر دیا۔ لیکن برطانیہ نے انہیں ایک خفیہ معاہدے کے تحت 1948ء میں عربوں کے فلسطین میں آباد کیا اور امریکہ کی پشت پناہی سے انہوں نے دنیا کے ہر مغربی ملک میں ایسے قانون بنوائے جن کے تحت یہودیوں کے خلاف گفتگو کرنے، نفرت پھیلانے، انہیں برا بھلا کہنے کو جرم قرار دیا گیا۔ یہ سب انہوں نے بزور طاقت اور میڈیا پر

ایک نہ ختم ہونے والے پراپیگنڈے سے کیا۔ آج دنیا بھر کے مغربی ممالک میں ایسے قوانین موجود ہیں جو فیس بک تو دور کی بات ہے، نجی محفل میں بھی یہودیوں کیخلاف بات کرنے کو قابل دست اندازیٔ پولیس خیال کرتے ہیں۔ نہ وہاں کوئی روشن خیالی کی بات کرتا ہے اور نہ آزادیٔ اظہار کا نوحہ تحریر کرتا ہے۔ آیئے ایک جھلک ان قوانین کی دیکھیں:

رومانیہ کے آئین کے آرٹیکل 3 کے تحت یہودیوں سے نفرت پر اکسانا، تنظیم بنانا، ملکی سیکورٹی کے خلاف سازش ہے۔ یہ قانون 1991ء میں بنایا گیا۔ سپین کے قانون تعزیرات میں 2 مئی 1996ء میں آرٹیکل 22 شامل کیا گیا جس میں یہودیوں کے خلاف نفرت کی تعریف کی گئی اور آرٹیکل 510 کے مطابق اس کی سزا تین سال مقرر کی گئی۔ میکسیکو میں 2003ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کے آرٹیکل 4 کے مطابق یہودیوں کے خلاف نفرت پھیلانے کو جرم قرار دیا گیا۔ سوئٹزرلینڈ میں قانون تو پہلے سے موجود تھا لیکن 2001ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعے یہودیوں کے خلاف نفرت کم کرنے کو نصابی تعلیم کا حصہ بنایا گیا۔ سویڈن کے آئین میں تو کئی سیکشن صرف یہودی نفرت کے علمبرداروں کیخلاف ہیں۔ ان تمام قوانین کے علاوہ گزشتہ پچاس سال سے مغربی ممالک کے آئین میں اس بات کی ممانعت ہے کہ کوئی شخص اس بات پر گفتگو نہ کرے کہ ہٹلر نے یہودیوں پر جو ظلم کیے تھے، وہ ایک پراپیگنڈہ ہے اور جھوٹ کا پلندہ ہے۔ آسٹریا کے آئین کا آرٹیکل 3 ان تمام مطبوعات، انٹرنیٹ، ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات کو خلاف قانون قرار دیتا ہے جو یہ نفرت پیدا کریں۔ بیلجیئم کا Law of Holocaust Denial اس نفرت اور اس کے بارے میں چھان بین کو بھی جرم قرار دیتا ہے۔ جرمنی کا قانون جو 1985ء میں بنا، اس کے آرٹیکل 21، 194 میں یہودیوں کے خلاف نفرت کو انسانی وقار کے منافی قرار دیا گیا اور 1994ء میں اس میں ترمیم لاکر اسے قابل دست اندازیٔ پولیس بنا دیا گیا۔ فرانس میں ایسا قانون 1990ء میں بنایا گیا جس کے آرٹیکل 24-B کے تحت یہودیوں سے نفرت کرنا اور اس کا اظہار کرنا جرم ہے۔ سلوویکیا میں 2001ء، پولینڈ میں 1999ء، اٹلی میں 1963ء، لکسمبرگ میں 1997ء، برازیل میں 1989ء، ڈنمارک میں 1996ء، برطانیہ میں 1997ء، ناروے میں 2000ء، ہالینڈ میں اکتوبر 2003ء، آسٹریلیا میں 2004ء، لیتھویا میں 19 ستمبر 1990ء

اور سب سے بڑھ کر اقوام متحدہ نے 1992ء میں یہ قرارداد منظور کی۔

"Against Antisimitism Must Be Recongnised as a Danger and be Fought"

یہودیوں کے خلاف نفرت کو ایک خطرے کے طور پر جانا جائے اور اس کے خلاف جنگ کی جائے۔ یہی نہیں بلکہ اگست 2005ء میں یہ بل امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور اسرائیل نے اقوام متحدہ سے پاس کروایا کہ 27 اگست کو عالمی ہالوکوسٹ دن کے طور پر منایا جائے۔ یہ وہی دن تھا جب 70 عیسوی میں رومن فوجوں نے یروشلم کے یہودی شہر کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ کالم کی تنگ دامنی مجھے وہ تفصیل درج کرنے نہیں دے رہی کہ ان قوانین کے تحت کتنے لوگ گرفتار ہوئے، کتنے اخبار بند ہوئے، کتنے ریڈیو اور ٹی وی چینل پابندی کا شکار ہوئے اور کتنی انٹرنیٹ کی سائٹس پر پابندی لگائی گئی۔ اگر میرے ملک کی ہائی کورٹ اس ملک کے شہریوں پر ایک سوشل کلب کی سائٹ پر اس لیے پابندی لگاتی ہے کہ اس نے اس امت کے کروڑوں دلوں کو دکھی اور آنکھوں کو آبدیدہ کیا ہے، تو یہ میرے ملک کا اعزاز ہے۔ یہ ہم ہیں کہ جن کی عقیدتوں، محبتوں اور جانثاریوں پر سیدالانبیاء ﷺ کو انشاء اللہ قیامت کے دن فخر ہوگا۔ ہمیں کسی کے اعمال سے کیا غرض، ہم تو اپنے لیے نظر کرم کے طالب ہیں۔ اپنی گناہوں سے بھری زندگی پر شرمندہ اور دامن رحمت سے معافی کے طلبگار ہیں۔ یہ اسی قوم کے شاعر ظفر علی خان نے کہا تھا اور جو اس قوم نے اپنا شعار بنا لیا ہے۔

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا، زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ بطحا ﷺ کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل مرا ایماں ہو نہیں سکتا

رانا محمد شفیق خان پسروری

حرمت رسول ﷺ اور آزادیٔ رائے

آج کل پوری دنیا کے مسلمان ایک ملعون امریکی کی بنائی ہوئی فلم ''اینوسنس آف اسلام'' میں بعض ناروا اور ناگفتہ بہ فقرات وکلمات کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ پوری دنیا کے مسلمان اپنے جانوں کے نذرانے ہتھیلیوں پہ لیے گلی و بازار میں اضطراب کی انتہاؤں کو پہنچے ہوئے ہیں۔ مگر انسانی حقوق کے نام نہاد علم بردارتس سے مس نہیں ہو رہے۔ جگہ جگہ لوگ مر رہے ہیں، آگ لگ رہی ہے، دھوئیں اٹھ رہے ہیں مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ان کو اس بات کا قطعاً کوئی احساس نہیں کہ دنیا بھر کے ایک ارب باسٹھ کروڑ مسلمانوں کے کلیجے چھلنی ہو چکے ہیں۔ یہ بد باطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزادی اظہار رائے کے نام پر فلم بنانے والے بدباطنوں کی وکالت کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی طبقے کی دل آزاری اور دنیا بھر کی بہت بڑی تعداد کی عقیدت ومحبت کے پرخچے اڑا دینے کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ آزادیٔ رائے کے من پسند معانی کا دامن تھام کر صرف مسلمانوں کو آزار پہنچانا چاہتے ہیں۔

گستاخانِ یورپ گاہے بگاہے کائنات کی سب سے عظیم و افضل ہستی کی شانِ اقدس میں گستاخی کی جسارت کر کے دنیا میں سب سے زیادہ بسنے والے مسلمانوں کی دل آزاری کرتے ہیں اور پھر اس کو ''آزادیٔ اظہار رائے'' کے نام سے جاری رکھنے پر اصرار بھی کرتے ہیں حالانکہ رائے کی آزادی اور کسی کی دل آزاری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دنیا کے کسی معاشرے میں رائے کے اظہار کی ایسی آزادی نہیں کہ جس کی چاہا عزت خاک میں ملا دی اور جس کے چاہا دل کے پرخچے اڑا دیے۔ ہر معاشرے نے اپنے اپنے حالات کے مطابق اظہار رائے کی حدود مقرر کی ہیں۔ حقائق تک کو بیان کرنے کے لیے بھی حدود و قیود پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یورپ وامریکہ میں بھی جہاں فحاشی وعریانی عروج پر ہے، بچوں میں جنسی ہیجان پیدا کرنے والی فحش نگاری، مذہبی ونسلی منافرت پھیلانے والی تحاریر وتقاریر پر

پابندی ہے۔ آسٹریا، بیلجیئم، چیک ری پبلکن، فرانس، جرمنی، اسرائیل، ایتھوپیا، پولینڈ، رومانیہ، چیکوسلواکیہ، سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں عالمی جنگوں کی تباہی کے انکار کو فوجداری جرم قرار دیا گیا ہے۔ یورپ کے اکثر ممالک میں ''ہولوکاسٹ'' کے انکار بلکہ اس کے بارے میں یہ تک کہنے کی اجازت نہیں کہ: ''اس میں ہلاک شدہ یہودیوں کی تعداد مبالغہ آمیز ہے۔'' حالانکہ ہولوکاسٹ محض ایک پروپیگنڈا ہے جس کا بہانہ بنا کر فلسطین میں اسرائیل نامی ملک بنایا گیا تھا۔ اگر ہولوکاسٹ پر بحث کا دروازہ کھل گیا اور جھوٹ ثابت ہو گیا تو اسرائیل کا وجود ناجائز قرار پا جائے گا۔

1984ء میں ایک سکول ٹیچر ''جیمز کنگ'' نے ہولوکاسٹ کے بارے میں چند الفاظ کہے تھے، اس کو نوکری سے برخاست کر کے سزا دی گئی۔ کینیڈا کے ''ارنسٹ رنڈل'' کو ہولوکاسٹ کے بارے میں تضحیکی انداز اپنانے پر 15 ماہ قید کی سزا ہوئی۔ کینیڈا ہی کے ''کن میک وے'' کو انٹرنیٹ پر اس حوالے سے مضمون لکھنے پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ آسٹریا کے ایک لکھاری ''ڈیوڈ ڈارونگ'' نے لکھ دیا کہ 60 لاکھ یہودیوں کی ہلاکت کی بات مبالغہ آمیز ہے۔'' اس کو 17 سال بعد (فروری 2006ء میں) گرفتار کر کے تین سال کی سزا دی گئی۔ ایران کے صدر احمدی نژاد نے ''ہولوکاسٹ'' کے بارے میں تقریر کی تو پورے یورپ نے احتجاج کیا تھا۔ یورپ کے بعض ممالک میں ''ہولوکاسٹ'' کے انکار پر 20 سال تک کی سزا مقرر ہے۔ ایرانی صدر احمدی نژاد کی تقریر پر یہودی تنظیم کے صدر کا بیان شائع ہوا تھا کہ ''ہولوکاسٹ'' کے انکار کا مطلب 60 لاکھ یہودیوں کو دوبارہ قتل کرنے کے مترادف ہے۔''

اظہار رائے کی آزادی کی بات کرنے والے یورپ و امریکہ کی اپنی حالت یہ ہے کہ ''وہاں بھی کوئی کھل کر ان کے دستور، اقتدار اعلیٰ یا پالیسیوں پر بات نہیں کر سکتا۔ صرف یورپ و امریکہ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہتک عزت، توہین عدالت کے قوانین موجود ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں وہاں کے دستور یا اقتدار اعلیٰ سے بغاوت یا باغیانہ اظہار رائے کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے اور مجرموں کے لیے موت تک کی سزا موجود ہے۔ اسی طرح مقدس ہستیوں، مقدس مقامات اور مقدس اشیا کی توہین پر سزا کا قانون بھی اکثر (بلکہ تمام) ممالک میں موجود ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اکثر ممالک میں بلاس فیمی لاء Blasphemy Law موجود ہے۔ خصوصاً آسمانی صحائف اور آسمانی ادیان سے تعلق رکھنے والی اقوام میں انبیاء و

رسلؑ کی توہین قابل سزا جرم ہے۔ قدیم ایران میں تین قسم کے جرم تھے:

1- خدا کے خلاف، 2- بادشاہ کے خلاف، 3- انسانوں کے ایک دوسرے کے خلاف

ہندومت میں ستیارتھ پرکاش (چھوتی 71-71) صفحہ 297 کے مطابق "ناستک (مذہب بیزار) کے لیے خشک لکڑی کی طرح جلا کر اس کی جڑ ختم کر دینے کا حکم ہے۔"

چین جہاں آج کل کوئی دینی و مذہبی حکومت نہیں، وہاں بھی مہاتما بدھ کے مجسمے کی توہین فوجداری جرم ہے۔ 29 مارچ 1990ء کو چین کے صوبے سی چوان میں وانگ ہونگ نامی شخص جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مہاتما بدھ کے مجسمے کا سر کاٹا تھا، سزائے موت سنائی گئی تھی۔ افغانستان میں طالبان نے بدھ کے مجسمے کو گرایا تو یورپ و امریکہ نے کتنا شور مچایا تھا؟

یہودیوں کے ہاں خدا، رسولؑ، یوم سبت اور ہیکل کی توہین جرم تھی اور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سردار کاہن نے اسی طرح کا الزام لگا کر پھانسی کی سزا کا مطالبہ کیا تھا۔ تفصیل (کتاب مقدس احبار باب 24 فقرہ 16 اور متی کی انجیل باب 26 فقرہ 25-63) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ "رسولوںؑ کے اعمال" کے مطابق مسیحی مبلغ مقنس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پولس پر یلغار انہی الزامات کے بہانے کی گئی تھی۔ رومن ایمپائر میں جب شہنشاہ جینن (قسطنین) عیسائی ہوا تو قانون میں انبیائے بنی اسرائیل کی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین جرم قرار پایا۔ روس میں بھی یہ قانون جاری رہا۔ انقلاب کے بعد مقدس انبیاؑ کی جگہ سٹالن نے لے لی۔ لینن کے ساتھ ٹرانسکی کا المناک انجام اس کی مثال ہے جو بھاگ کر امریکہ چلا گیا مگر وہاں بھی جان نہ بچ پائی۔ برطانیہ کا کامن لاء توہین مسیحؑ، بائبل کی اہانت وغیرہ کو "بلاس فیمی لاء" کے زمرے میں قابل سزا جرم قرار دیتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین جلد 2، صفحہ 242، بائبل آف میتھیو (Mathew) یعنی متی کی انجیل (12-28) کے حوالے سے اور بائبل، کتاب استثنا باب 17 کے مطابق "انبیاؑ اور ان کے ساتھیوں کی توہین کرنے والے کی سزا موت ہے۔" چنانچہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کو جان سے مارا جاتا رہا ہے۔ مثلاً 1553ء میں برطانیہ (الزبتھ دور) میں پانچ افراد کو، 1553ء میں ہنگری میں ڈیوڈ نامی پادری، 1600ء میں روم کے برونو نامی شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ برطانیہ میں 1821ء سے 1834ء تک 73 افراد کو مار دیا گیا۔ یہ سزا امریکہ میں بھی دی جاتی رہی۔ 1968ء کے بعد امریکہ میں کوئی مقدمہ دائر نہیں ہوا کہ مذہبی

اور عدالتی امور الگ الگ کر دیے گئے تھے۔ پھر بھی چند سال قبل ڈیوڈ نامی شخص کو اس کے 300 ساتھیوں سمیت اس لیے جلا دیا گیا کہ اس نے دعویٰ کیا تھا: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح اس میں حلول کر گئی ہے۔''

برطانیہ کے ڈینس لی مون نے (جو کہ گے نیوز کا ایڈیٹر تھا) ایک مزاحیہ نظم لکھی، پھر معافی بھی مانگی اور وضاحت کی کہ محض تفریح طبع کی خاطر ایسا کیا۔ پھر بھی جیوری نے اس کو سزا سنادی۔ وہ اپیل لے کر ہاؤس آف لارڈز میں گیا مگر سزا بحال رہی۔

27 جنوری 2003ء میں ٹیلی گراف میں اسرائیلی وزیر اعظم کا کارٹون شائع ہوا کہ وہ فلسطینی بچوں کی کھوپڑیاں کھا رہا ہے۔ یہودیوں کے احتجاج پر معذرت کی گئی۔ اٹلی کے وزیر اعظم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشابہہ حکومت کی بات کی، پھر اس پر معذرت کی۔ محمد علی (کلے) نے ویت نام جنگ کے متعلق امریکی پالیسی پر بیان دیا، اس کا عالمی چیمپئن کا ٹائٹل چھین لیا گیا۔ الجزیرہ ٹی وی نے 6 امریکی فوجیوں کی لاشیں دکھائیں، احتجاج کیا گیا بلکہ اس کے آفس پر بمباری کر کے تباہ کر دیا گیا اور عملے کے لوگوں کو شہید کر دیا گیا۔ اسرائیل کے لبنان پر حملے کے بعد کونڈا لیزا رائس نے ''گریٹر اسرائیل'' کی بات کی، اس پر ایک فلسطینی اخبار نے کارٹون بنا کر کونڈا کا مذاق اڑایا تو امریکی محکمہ خارجہ نے شدید احتجاج کیا، ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔

15 اپریل 2008ء کو فرانس کی پارلیمنٹ نے خواتین کو وزن کم کرنے پر ابھارنے والے اشتہارات شائع کرنے کو جرم قرار دیا اور اس کی خلاف ورزی پر 3 سال قید اور 30 ہزار یورو جرمانے کی سزا قرار دی اور اگر کوئی خاتون مر گئی تو اشتہاری کمپنی یا میگزین و اخبار کے ایڈیٹر کو 3 سال قید اور 45 ہزار یورو کی سزا کا اعلان کیا۔ فرانس کے وزیر صحت نے اس موقع پر کہا ''نوجوان لڑکیوں کو وزن گھٹانے کے لیے کم خوراکی پر مائل کرنا، اظہار رائے کی آزادی نہیں بلکہ ایسے پیغامات، موت کے پیغامات ہیں۔''

19 ستمبر 2012ء کے اخبارات نے یہ خبر شائع کی کہ برطانیہ میں کثیر الاشاعت آئرش اخبار ''دی سن'' کے ایڈیٹر مائیکل اوکینی کو محض اس لیے معطل کر دیا گیا کہ اس کے اخبار میں برطانوی شہزادہ ہیری کی متنازعہ تصاویر شائع ہوئی ہیں۔ پاکستان کے وزیر ریلوے غلام احمد بلور نے گستاخ رسول کو قتل کرنے والے کے لیے انعام کا اعلان کیا ہے تو امریکی

عہدیداروں اور امریکہ کے غلاموں نے احتجاج اور مذمت شروع کر دی ہے۔

15 مئی 2010ء یونان کے شہر سیلونیکا میں ایک یہودی قبرستان کے باہر یہودیوں کے خلاف نعرے لکھنے پر تین افراد کو گرفتار کیا گیا جن میں ایک 17 سالہ بچہ بھی شامل تھا۔ اسی دن یعنی 15 مئی کو پولینڈ کے جنوب میں ایک فٹ بال سٹیڈیم سے پانچ شائقین کو گرفتار کیا گیا جنہوں نے یہودیوں کے بارے میں ایک بینر پر ایک بڑا سا کارٹون بنایا تھا جس میں ایک لمبی ناک والا شخص جو یہودیوں کی علامت ہے، اس پر موت کی علامت بنائی گئی تھی۔ 11 مئی 2010ء کو کینیڈا کے ایک 83 سالہ بوڑھے شخص میکس مہر کو چھ ماہ قید سنائی گئی اور دو سال پروبیشن پر رکھنے کو کہا گیا جس نے دیوار پر یہودیوں کے خلاف نعرے لکھے تھے۔ 6 مئی 2010ء کو امریکہ کے شہر نورفوک کی عدالت نے ایک شخص کرسٹوفر بروکس کو پانچ سال قید کی سزا سنائی جس نے ساٹھ سٹکروں پر یہودیوں کے خلاف نعرے لکھے اور انہیں گرجے کی دیواروں پر لگایا۔ 3 مئی 2010ء کو ناروے کی وزارت ثقافت نے ایک مصری ٹیلی ویژن "الرحمۃ" کی نشریات پر پابندی لگا دی کیونکہ وہ یہودیوں کے خلاف نفرت ابھارتا تھا۔ اسی ٹیلی ویژن چینل پر فرانس میں 31 اکتوبر 2004ء کو اس وقت پابندی لگائی جب اس نے ایک مصری عالم دین کی یہودیوں کے خلاف تقریر نشر کی۔ 30 اپریل 2010ء کو برطانیہ کی نیوکاسل عدالت نے 19 سالہ نکی ڈیوسن جو ایک دودھ بیچنے والا نوجوان ہے، اس کو اس بات کا مجرم قرار دیا گیا کہ اس نے انٹرنیٹ پر یہودیوں کے خلاف آرین سڑائک نامی گروپ بنایا تھا۔ اس سارے فیصلہ کی سماعت صرف پچاس منٹ میں مکمل ہو گئی۔ 16 اپریل 2010ء کو جرمنی کے شہر ریگن برگ کی ایک عدالت نے ایک عیسائی بشپ رچرڈ ولیم سن کو اس بات پر سزا سنائی کہ اس نے سویڈن کے ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ جنگ عظیم دوم میں یہودیوں کا قتل عام ہوا تھا۔ 14 اپریل 2010ء کو فرانس کی حکومت نے وہاں کے ایک سیٹلائٹ آپریٹر کو حکم دیا کہ وہ ایک مصری چینل کی نشریات مکمل طور پر بند کر دے کیونکہ یہ یہودیوں کے خلاف نفرت پھیلاتا ہے۔ 12 اپریل 2010ء کو اٹلی کی ایک عدالت نے ایک شخص پاؤلومنزی کو اس بات پر مجرم قرار دیا کہ اس نے انٹرنیٹ پر ایک بلاگ بنایا تھا جس میں 162 یونیورسٹی پروفیسروں کی لسٹ شائع کی تھی جو متعصب یہودی ہیں۔ کینیڈا کی یارک یونیورسٹی نے یکم اپریل 2010ء کو ایک طالب علم کو یونیورسٹی سے نکال دیا جس نے

یہودیوں کے خلاف ایک ویب سائٹ بنائی تھی۔ اس وقت وہ شخص پولیس کی تحویل میں ہے۔ 25 مارچ 2010ء کو امریکہ کے شہر یوجین کی پولیس نے ایک شخص مائیکل رسٹر کو گرفتار کیا جو بازاروں میں یہودیوں کے خلاف نعرے لگاتا تھا۔ 18 مارچ 2010ء کو امریکہ کی ریاست ٹیکساس کی عدالت نے ایک فرم بردار سکاٹ کو ایک لاکھ پندرہ ہزار ڈالر جرمانہ کیا تھا کیونکہ اس کے اعلیٰ افسران اکثر گندے یہودی "Dirty Jew" جیسے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ 18 مارچ 2010ء کو کینیڈا کے شہر کالگری میں ایک 17 سالہ لڑکے کو گرفتار کیا گیا جو دیواروں پر یہودیوں کے خلاف نعرے لکھتا تھا۔ 9 مارچ 2010ء کو سپین کے شہر بارسلونا کی عدالت نے ایک شخص پیڈرو ویریلا کو دو سال نو ماہ قید کی سزا سنائی۔ یہ شخص ایک کتابوں کی دکان یوروپا بک سٹور کا مالک تھا اور یہودیوں کے خلاف کتابیں بیچتا تھا۔ 20 فروری 2010ء کو امریکہ کے شہر بوکارائن کی پولیس نے 15 سے 16 سال کی عمر کے تین لڑکوں کو گرفتار کیا جنھوں نے ایک یہودی عبادت گاہ کے پاس کھڑے ہو کر انہیں برا بھلا کہا تھا۔ 18 فروری 2010ء کو چیک ریپبلک کی سپریم کورٹ نے ایک سیاسی پارٹی ''ورکرز پارٹی'' پر پابندی لگائی کیونکہ وہ یہودیوں کے خلاف نظریات رکھتی تھی۔ 13 فروری 2010ء کو برطانیہ کی لبرل ڈیموکریٹ کی رکن اور ترجمان بیرنس جینی ٹونگے کو پارٹی سے برطرف کر دیا کیونکہ اس نے صرف یہ بیان دیا تھا کہ اسرائیلی افواج نے ہیٹی کے زخمیوں کے اعضاء فروخت کر ڈالے تھے۔ 11 فروری 2010ء کو برطانیہ کے کلیمنگ علاقے کے جج نے 18 سالہ جورڈن بوکٹن کو مجرم قرار دیا کیونکہ اس نے ایک نوکری دینے والے ادارے میں یہ نعرہ لگایا تھا ''یہودی کے لیے موت''! اسے بارہ ماہ کی سزا سنائی گئی۔ 5 جنوری 2010ء کو نیو یارک کے علاقے بروک لین کے ایولوا یونو کو اس جرم پر 18 سال قید کی سزا سنائی گئی کہ اس نے 23 شہر پیٹرز برگ کے اخبار آرتھوڈکس رشیا کے چیف ایڈیٹر کانٹیٹن ڈرشبود کو تین سال سزا سنائی کیونکہ اس نے اپنے اخبار میں یہودیوں کے خلاف لکھا تھا۔

ہر ملک میں اظہار رائے کے لیے حدود متعین ہیں، اس لیے گستاخان یورپ کی خباثتوں اور مسلمانوں کی دل آزاری کے اقدامات پر اس بہانے کو استعمال کرنا ایک طرح کی واضح دہشت گردی ہے۔ خود ڈنمارک کے اسی اخبار (جیلنڈ پوسٹن) جس نے خاکے اڑانے کی جسارت و سازش کی تھی، 2004ء میں اس کے کارٹونسٹ ''کرسٹوفر زیلر'' نے حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے خاکے بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ''اس سے عیسائیوں کے جذبات مجروح ہوں گے''۔ یعنی یورپ و امریکہ کے گستاخ جان بوجھ کر مسلمانوں کو آزار پہنچاتے ہیں۔

مذہبی عقیدتیں نازک اور حساس ہوتی ہیں، ان کا تعلق دماغ سے زیادہ دل کے ساتھ ہوتا ہے۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبریل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

دل کے ہاتھوں مجبور عقیدت مند کبھی اپنی مقتدا اور مقدس ہستیوں پر حرف زنی و حرف گیری قبول نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ انعام میں ہے ''معبودان باطلہ کو بھی گالی نہ دو کہ کہیں ان کے ماننے والے سچے اللہ کو بے علمی میں گالی نہ دے دیں۔''

دنیا میں جہاں بھی مذہب اپنے زندہ شعور کے ساتھ موجود ہے۔ وہاں اس مذہب کے بانیان و مقتدا کی توہین پر کڑی سے کڑی سزائیں رکھی گئی ہیں۔ البتہ اگر کسی جگہ عیاشی ہی کو بطور مذاہب اپنا لیا جائے تو سوچ کے دھارے بدل جائیں گے اور وہاں کے مردہ ضمیر ''آزادیٔ رائے'' کے نام پر سب کچھ سہہ جاتے اور قبول کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک ہمیں بتاتا ہے کہ ''نمرود کے دور میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آذر سے بتوں کے بارے میں جب کہا: ''اے میرے باپ! ان کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی آپ کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟ (مریم)

تو اس نے کہا تھا: ''اگر تو باز نہ آیا تو تجھے پتھروں سے مار ڈالوں گا۔'' (مریم)

پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو توڑ ڈالا تو بت پرستوں نے مشورہ کیا کہ کیا سزا دی جائے تو وہ لوگ پکار اٹھے: '' کہنے لگے اسے جلا دو۔'' (انبیاء)

گویا اگر مذہبی عقیدتیں باقی ہوں تو جھوٹے مذہب بھی اپنی مقتدا ہستیوں کی توہین پر سنگسار کرنے اور جلانے پر تلے نظر آتے ہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں ایران میں بہرام اول کے دور میں مانی کو مذہبی عقائد کی توہین کرنے کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی کھال اتار کر اور اس میں بھس بھر کر جندلی شاہ پور کے دروازے پر لٹکا دیا گیا بلکہ مانی کے بارہ ہزار پیروکار بھی قتل کر دیے گئے۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر کیوں مجبور کیا گیا تھا؟ انہی مذہبی عقائد کی خلاف ورزی پر عیسائی ادوار میں گلیلیو کو سزائے موت کا حکم کیوں ہوا؟ جادوگرنیوں کے نام

پر ہزاروں عورتوں کو کیوں جلایا گیا؟ محض اسی باعث ہندوؤں کے ہاں "ویدوں کی نندنا یعنی بے قدری کرنے والا ناستک ہے" اور "جو ناستک ویدوں کے علم کا مخالف ہو، اس بدذات کو جڑ بنیاد کے ساتھ ناس (تباہ) کر دیا جائے۔" بائبل کتاب "خروج" میں ہے "تم سب کو ماننا، وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کی بے حرمتی کرے گا وہ ضرور مارڈالا جائے گا۔" (اعمال باب 21، فقرہ 27-36) بائبل کی کتاب "استثناء میں ہے، "اگر کوئی گستاخی سے پیش آئے اور کاہن کی بات اور قاضی کا کہا نہ مانے، وہ شخص مارڈالا جائے۔"

اٹھارویں صدی تک برطانیہ وغیرہ میں توہین مسیح کی سزا موت ہی رہی ہے۔ چند مثالیں جو ہمارے سامنے آئی ہیں، 1553ء (الزبتھ دور) میں 7 افراد کو موت کی سزا دی گئی۔ 1559ء میں ہنگری میں ڈیوڈ نامی پادری کو سزائے موت ملی۔ 1600ء میں روم میں برونو نام کے شخص کو مارڈالا گیا۔ 1833ء تک تھوڑے عرصے میں برطانیہ میں 72 افراد اس جرم کی سزا میں مارے گئے۔ اب اگرچہ برطانیہ میں کامن لا Common Law ہے پھر بھی اس کی رو سے جو توہین مسیح یا کتاب مقدس کی سچائی کا انکار کرے، وہ بلاس فیمی Blasphemy کا مرتکب ہوگا اور اس کی سزا تخت و تاج برطانیہ یا حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم کے مطابق عمر قید تک ہو سکتی ہے۔

لندن کے اخبار The Times کے مطابق برطانوی عدالت نے 27 اگست 1988ء کو Gay News کے ایڈیٹر "ڈینز لیموز" (جس نے 1987ء کو ایک فیصلہ سناتے ہوئے کہا: "خلوص اور احترام کا ماحول ہی بلاس فیمی کے منافی نہیں، دیکھنا پڑتا ہے کہ اس طرح کے الفاظ و اقدامات سے عیسائی مذہب کے ماننے والوں کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں؟ اس بارے میں واضح قانون موجود ہے، ہر وہ پبلی کیشن، بلاس فیمی متصور ہوگی جو خدا، یسوع مسیح یا بائبل کے بارے میں دشنام طرازی، توہین آمیز اور مضحکہ خیز مواد پر مشتمل ہو۔ قانون آپ کو یہ اجازت دے سکتا ہے کہ عیسائی ملک پر حملہ کریں، تختہ الٹ دیں یا عیسائی مذہب کا انکار کر دیں لیکن مذہب کے بارے میں "نازیبا" اور "غیر معتدل" الفاظ و اقدام کی اجازت ہرگز نہیں۔"

گستاخانہ کلمات اور بے ادبی کی سزا اور حوصلہ شکنی کے لیے دنیا کے کئی ممالک میں قوانین موجود ہیں، مثلاً:

1- آسڑیا (آرٹیکل 188-189 کریمنل کوڈ)

2- فن لینڈ (سیکشن 10 چیپٹر 17 پینل کوڈ)

3- جرمنی (آرٹیکل 116 کریمنل کوڈ)

4- ہالینڈ (آرٹیکل 147 کریمنل کوڈ)

5- سپین (آرٹیکل 525 کریمنل کوڈ)

6- آئرلینڈ (آئرلینڈ کے دستور کے آرٹیکل 40,6,1,i کے مطابق کفریہ مواد کی اشاعت ایک جرم ہے۔ منافرت ایکٹ 1989ء کے امتناع میں ایک گروہ یا جماعت کے لیے مذہب کے خلاف نفرت بھڑکانا بھی شامل ہے۔

7- کینیڈا (سیکشن 296 کینیڈین کریمنل کوڈ) کہ عیسائی مذہب کی تنقیص و تضحیک ایک جرم ہے۔

8- نیوزی لینڈ (سیکشن 123 نیوزی لینڈ کرائمنز ایکٹ 1961) مثال کے طور پر عیسائی دنیا میں گرجوں کی تقدیس کو قانون کا درجہ حاصل ہے، بعض یورپی ممالک کے دساتیر میں ان کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ ڈنمارک کے دستور کی سیکشن 4 (سٹیٹ چرچ) کی مثال موجود ہے جس میں کہا گیا ہے: ایونجیلیکل لوتھرن (پروٹسٹنٹ) چرچ ڈنمارک کا ریاستی قائم کردہ چرچ ہوگا اور اس کی مدد واعانت ریاست کے ذمہ ہوگی۔''

آزادی تقریر وتحریر ایک بنیادی حق تو ہے مگر مطلق حق نہیں۔ اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے ڈنمارک اور ناروے کے گستاخوں کی طرف سے خاکوں کی اشاعت پر کہا تھا: ''میں بھی آزادی تقریر وتحریر کا احترام کرتا ہوں مگر یہ آزادی مطلق نہیں ہوتی۔'' سابق برطانوی وزیر خارجہ جیک اسٹرا نے کہا تھا: ''آزادی رائے کا ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن بے عزتی اور اشتعال انگیزی کی کوئی چھوٹ نہیں دی جاسکتی، میرے خیال میں ان خاکوں کی اشاعت زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔

امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے بیان جاری ہوا تھا: ''یہ خاکے واقعی توہین آمیز اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا موجب ہیں۔'' ان تمام کے باوجود گستاخان یورپ وامریکہ مسلمانوں کے دل خون کر رہے ہیں اور مسلسل دل آزاری کرتے چلے جارہے ہیں، کیوں؟

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق ''اپنے خیالات، معلومات اور آرا کا گورنمنٹ کی پابندیوں سے آزاد ہوکر اظہار کرنا، آزادئ اظہار رائے کہلائے گا۔'' کینیڈین

سپریم کورٹ نے آزادی رائے کے بارے میں اہم مقاصد بیان کیے کہ 1۔ جمہوریت کے فروغ کے لیے، 2۔ ریاستی یا گروہی زیادتیوں کی روک تھام کے لیے، 3۔ حقیقت کی تلاش کے لیے ہر فرد آواز اٹھا سکتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا، آزادیٔ رائے کی تعریف کے ساتھ ساتھ ہر اس گفتگو یا رائے پر پابندی کی بات کرتا ہے جو واضح حقیقی خطرے کی موجب ہو، یعنی 1۔ کسی پر بہتان لگایا گیا ہو، 2۔ فحاشی کی موجب ہو، 3۔ کسی پر دباؤ ڈال کر مجبور کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔'' اس طرح اقوام متحدہ کے ''اعلامیہ برائے سیاسی وسماجی حقوق'' جو جنرل اسمبلی نے 1966ء میں منظور کیا تھا، کا آرٹیکل 20 تشدد کے فروغ، نسلی تعصب، مذہبی منافرت اور کسی بھی قسم کے امتیازی رویے پر مبنی تقریر وتحریر پر پابندی کی بات کرتا ہے۔

اظہار رائے کی بے مہار اور کھلی آزادی، نسلی، گروہی، لسانی وعلاقائی عصبیتوں کے فروغ اور باہمی فساد وجدال کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کے ذریعے کسی کے عقائد اور مذہب کی تضحیک کے ذریعے قتل وغارت گری کی راہ بھی کھل سکتی ہے۔ اسی لیے تقریباً ہر جمہوری ملک میں اسے قانونی طور پر روکا گیا ہے اور قابل تعزیر جرم گردانا گیا ہے۔ خود ڈنمارک (جہاں سب سے پہلے خاکوں کی بدطینتی سامنے آئی تھی) کا قانون بھی خاموش نہیں۔ وہاں بھی ناموس مذہب کا قانون ''بلاس فیملی لا'' عرصے سے موجود ہے اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ 140 کے مطابق، ''جو لوگ کسی مذہبی برادری کی عبادات اور مسلمہ عقائد کا کھلا مذاق اڑائیں یا ان کی توہین کریں، ان کو جرمانے اور قید کی سزا دی جائے گی''۔

یورپ وامریکہ کو اپنی تہذیب وتمدن پر بہت ناز ہے۔ ایک طرف تو وہ پرندوں اور جانوروں کے تحفظ اور آرام کا خیال کرتے نظر آتے ہیں لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کا معاملہ آجائے تو ان کے بعض شہریوں کی سوئی ہوئی حیوانیت کیوں جاگ اٹھتی ہے؟ پیارے رسول ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کے ذریعے صرف مسلمانوں کے کلیجے کو ہاتھ ڈالنا، مضطرب کرنا اور زندگی تلخ تر بنانا ہی ان کا مقصد کیوں بن جاتا ہے؟
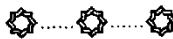
منظور احمد میو راجپوت ایڈووکیٹ

آزادیٔ اظہار رائے یا بغض و عناد؟

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ''قوانین ضبط الحاذ'' جنہیں انگریزی میں "Blasphemy Laws" کہا جاتا ہے، وجہ بحث وتنقید ہیں۔ خاص طور سے پاکستانی قوانین ہمیشہ ہی سے اہلِ مغرب اور مغربی نقاد، دانشوروں اور صحافیوں کی نظروں میں کھٹکتے رہے ہیں، وہ اپنی تحریروں، تقریروں، اخبارات، میگزین، ویب سائٹس اور ٹی وی کے ذریعے مسلمانوں کی دل آزاری کرتے رہتے ہیں اور اس کو آزادیٔ تحریر وتقریر کا نام دیتے ہیں۔ یہ قوانین زیادہ شدت سے اس وقت زیر بحث آئے جب ایک ڈنمارک کے اخبار "Jylland Posten" نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تضحیک آمیز خاکے چھاپے۔ اس کی وجہ سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں اضطراب، غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ جلسے جلوس، احتجاجی مظاہرے، قونصلیٹ کا جلاؤ گھیراؤ، ہڑتالیں، پرتشدد مظاہرے۔ یہ سب کچھ ہوئے مگر اہلِ مغرب کے کانوں پر جوں نہ رینگی، بجائے اس کے کہ وہ اپنے ملکی قوانین کے مطابق ذمہ داروں کا محاسبہ کرتے اور مجرمین کو قرار واقعی سزا دیتے۔ الٹا پورے یورپ نے ''آزادیٔ تحریر و تقریر'' کا راگ الاپنا شروع کردیا اور مسلمانوں کے جذبات اور احساسات سے نظر پوشی کی گئی اور یہی نہیں بلکہ اس اخبار سے اظہار یکجہتی کے لیے دوسرے اخبارات نے بھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے ایسے ہی کارٹون شائع کردیے۔

30 ستمبر 2005ء سے لے کر 20 مارچ 2007ء کے درمیانی عرصے میں کم وبیش 45 ممالک کے مختلف اخبارات، میگزین، ٹی وی چینلز اور ویب سائٹس پر 70 بار ایسے ہی کوشش کی گئی، ان لگاتار تضحیکانہ کوششوں کے درمیان بہت سارے اخبارات نے باضابطہ معافی بھی مانگی، مگر مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لیے دوبارہ ان گستاخانہ خاکوں

کو شائع کر دیا۔ اسی دوران جب ان کارٹونوں پر مسلمانوں میں اضطراب کی لہر اٹھی اور مغربی طاغوتوں کو مالی و ذہنی نقصان ہوا تو ان کے حقوق کی محافظ تنظیم ''اقوامِ متحدہ'' نے معاملے کو دبانے کی خاطر 24 نومبر 2005ء کو ڈنمارک سے معاملے سے متعلق رپورٹ طلب کر لی۔

23 جنوری 2006ء کو ڈنمارک کی حکومت نے اقوام متحدہ کو اپنا جواب دیا جس میں اس نے آزادئ تحریر وتقریر کا راگ الاپا اور مسلمانوں کے جذبات واحساسات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا جبکہ 28 جنوری 2006ء کو سعودی عربیہ میں موجود ڈنمارک کے سفیر نے ایک امریکی ٹی وی چینل AP.Tv کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ڈنمارک کے اخبار "Jylland Posten" نے ایسا اسلام سے متعلق کم علمی کی بنیاد پر کیا ہے۔ ذرا غور کیجیے ڈنمارک کے سفیر ایک طرف تو اخبار کو ہدف تنقید بنا رہے ہیں تو دوسری طرف ان کی حکومت مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کرتی رہی۔ اسی دن اسلامی کانفرنس تنظیم O.I.C نے ڈنمارک کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ واقعات کا سختی سے نوٹس لے، مگر: ''نقار خانے میں طوطی کی آواز'' کون سنے؟ اس پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔

مسلم دنیا کا اضطراب مسلسل بڑھتا ہی جارہا تھا مگر یورپی اقوام و اخبارات اشاعت تسلسل سے کام لیتے رہے، ایسے میں 31 جنوری 2006ء کو ڈنمارک کے وزیر اعظم نے ایک پریس کانفرنس میں مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں اور ڈنمارک کی حکومت اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ اخبارات کے خلاف کوئی کارروائی کرے کیونکہ ڈنمارک کے آئین نے ان کو تحریر وتقریر کی آزادی دے رکھی ہے، اس لیے اگر کسی کو پسپا ہونا ہے تو وہ مسلمانوں کو ہی ہونا ہے۔ اسی دن الجزیرہ ٹی وی چینل نے ڈنمارک کے وزیر اعظم کو دعوت دی کہ وہ اپنے موقف کا اظہار ان کے چینل پر کریں تاکہ مسلمانوں کا غصہ ٹھنڈا کیا جاسکے مگر وزیر اعظم نے اپنے لہو میں شامل تکبر اور مسلمانوں کے خلاف بغض وعناد کے باعث جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ وہ خاموش لفظوں میں اعلان کر رہے تھے کہ ہمیں مسلمانوں کے احساسات وجذبات سے کوئی سروکار نہیں، ہمارا مقصد تو فقط اپنی تجارت کو بچانا ہے، جو انہی بے وقوف مسلمانوں کے فنڈز سے چلتی ہے۔

اسی واقعہ کے دوران روس کے آرتھوڈکس چرچ اور مسلمان مفتیان نے زبانی جمع خرچ کے طور پر خاکوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور مذمت کی، مگر عملی قدم اٹھانے سے گریز کیا۔

مسلمانوں اور اسلام سے بغض وعناد صرف اخبارات یا ٹی وی چینلوں تک ہی محدود نہ رہا بلکہ نام نہاد روشن خیال اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوری طاقت کی سیاست میں بھی سرائیت کر گیا اور اسلام دشمنی کھل کر سامنے آ گئی۔ چنانچہ 2 فروری 2006ء کو ''برٹش نیشنل پارٹی'' نے اپنی ویب سائٹس پر تضحیک آمیز خاکے شائع کر دیے۔

یہ تضحیک آمیز سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ بیلجیئم کی ایک قابل ذکر شخصیت "Etienne Vermeersh" نے بیلجیئم کے اخبارات کو یہ مشورہ دیا کہ ان خاکوں کو بارہا شائع کرو تاکہ مسلمان اس کے عادی ہو جائیں۔ ذرا غور کیجیے یہ مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی کس قدر تذلیل کی جا رہی ہے؟ تاریخ گواہ ہے کہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ سے متحد رہے ہیں، دونوں اقوام اسلام اور مسلمانوں کی کٹر دشمن رہی ہیں۔ زبانی کلامی شیر و شکر میں ڈوبی زبان استعمال کرتے ہیں مگر حقیقتاً اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

4 فروری 2006ء کو "Holy See" کے کرتا دھرتاؤں نے کہا کہ آزادی تحریر کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کسی کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا جائے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور سمجھنا چاہیے کہ اس کا ذمہ دار حکومتوں کو نہ ٹھہرایا جائے، اب بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ حکومت اگر اپنی رٹ قائم نہیں کر سکتی تو ایسی حکومت کا فائدہ کیا؟ اور ان حکومتوں کے پاس ان اخبارات کی اشاعت کو روکنے کے لیے قانون موجود تھا، مگر انہوں نے جانتے بوجھتے ان کو استعمال نہ کیا، امریکا نے شام پر یہ الزام لگایا کہ شامی حکومت نے دمشق میں موجود ڈنمارک کے قونصلیٹ کو صحیح طور سے تحفظ فراہم نہیں کیا، اس لیے اس کو مظاہرین نے آگ لگادی اور امریکا ان بُرے حالات میں ڈنمارک اور اپنے یورپی حلیفوں کے ساتھ ہے اور ان سے اظہار یکجہتی کرتا ہے۔

برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور ناٹو کے جنرل سیکریٹری جیپ ڈی ہوپ بھلا اپنے نصرانی خون سے کیسے بے وفائی کرتے؟ انہوں نے بھی ڈنمارک کی حکومت سے اظہار یکجہتی کیا اور دنیا کی سستی شہرت اور آخرت کی ہمیشہ رہنے والی ذلت اپنے دامن میں سمیٹ لی۔

مسلمان ابھی تک غم و غصہ کی حالت میں تھے اور ان کا مطالبہ فقط یہ تھا کہ مذکورہ اخبارات میں تضحیک آمیز خاکوں کی اشاعت کو روکا جائے اور ان کے ذمہ داروں سے معافی مانگنے کا مطالبہ تھا مگر ان کی آواز پر کان دھرنے کی بجائے، امریکی نائب وزیر خارجہ ڈینئل

فرائیڈ نے کہا: ''ڈنمارک میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا کہ جس کی معافی مانگی جائے''، البتہ 7 فروری 2006ء کو ایک امریکن این جی او ''ایمنسٹی انٹرنیشنل'' سے یہ بیان دلوادیا گیا کہ آزادیٔ تحریر وتقریر مطلق نہیں ہونی چاہیے۔ اسی دن امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے ڈنمارک کے نمائندے انڈریس فوگ کو بلا کر ڈنمارک سے اظہار یکجہتی کر کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کی اور یقین دلایا کہ وہ اس موقع پر ڈنمارک کے ساتھ ہیں۔

13 فروری 2006ء کو ہی اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی کو یاد آیا کہ'' قانونی طور پر ہر ملک'' بین الاقوامی معاشرتی وسیاسی حقوق کے کنونشن کا پابند ہے جس کا آرٹیکل نمبر 3 مذہب اور حق رائے دہی کے تعلق کو بیان کرتا ہے جبکہ اس کا آرٹیکل 18 مذہبی آزادی کو تحفظ فراہم کرتا ہے، لیکن یہ آزادی مطلق نہیں، بلکہ عوامی تحفظ کی بنیاد پر اور بنیادی حقوق سے مشروط ہے۔ ((3)18) جبکہ آرٹیکل نمبر 19 آزادی تحریر وتقریر سے متعلق ہے، لیکن یہ آزادی بھی مطلق نہیں بلکہ اس کی بھی حدود مقرر ہیں کہ اس سے کسی کی ذات کو یا کسی کی عزت نفس کو تکلیف نہ پہنچے۔ (19(3)(a)) جبکہ آرٹیکل نمبر 20 ایسے تمام اقدامات سے منع کرتا ہے جو نسلی یا مذہبی امتیاز کی بنیاد پر کیے جائیں یا جن سے معاشرے میں عدم برداشت اور تشدد کو ہوا ملے۔''

قرآن کہتا ہے کہ یہ یہودی اور نصرانی تمہارے دوست قطعی نہیں ہو سکتے۔ یہ افراد مسلمانوں کو طرح طرح سے تکالیف دینا نہیں بھولتے۔ مگر ہم ہیں کہ ان کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، اتنا سب کچھ ہونے کے بعد 14 فروری 2006ء کو ''اٹلی'' کے ایک منسٹر "Roberto Calderol" ایک ایسی "T.Shirt" پہنے جلوہ گر ہوئے جس پر آپ ﷺ کی فرضی تصویر تھی اور اس نے جو کہا وہ ہم مسلمانوں کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں، اس نے کہا:

''میرے پاس یہ شرٹ موجود ہے اور میں آج سے اس کو پہننا شروع کروں گا جس نے پورے اسلام کو مضطرب کردیا ہے، ہمیں اب اس کہانی کو ختم کرنا ہی ہوگا، یہ (مسلمان) صرف ہمیں دبانا چاہتے ہیں، انہیں کہو کہ بس اب رک جاؤ، یہ ہمارا زمانہ ہے اور تمہارا قصہ پارینہ ہے۔''

کیا آزادیٔ تحریر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی دل آزاری کی جائے اور اس وزیر کو تو یوں لگتا ہے کہ انہیں مسلمانوں سے برسوں کا بیر ہو، ان کی اس تقریر پر کسی ''یورپی مہذب'' شخص نے اعتراض نہیں کیا، کسی اسرائیلی نژاد اقوامِ متحدہ کے ذمہ دار کا بیان نہیں آیا کہ کم از کم

ان صاحب کو تنقید کا نشانہ بنایا ہو جائے، بلکہ الٹا ہر معاملے میں مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ مزید ستم ملاحظہ کیجیے کہ 16 فروری 2006ء کو یورپین پارلیمنٹ نے ڈنمارک سمیت تمام یورپین ممالک سے اظہار یکجہتی کی قرارداد پاس کی اور اس میں کہا گیا:

''اگرچہ مسلمانوں کو احتجاج کا حق حاصل ہے مگر ہم آزادیٔ تحریر و تقریر پر کوئی پابندی برداشت نہ کریں گے۔''

22 فروری 2006ء کو پولینڈ کی ایک تنظیم ''سینٹ بینڈکٹ فاؤنڈیشن'' نے ایک مہم شروع کی، جس میں انہوں نے ان خاکوں کو گلی گلی، محلے محلے نمائش کروائی اور یہ موقف اختیار کیا کہ: ''وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں (خاکوں کی صورت میں) وہ سب حقیقت ہے اور یہ مسلمان جو احتجاج کر رہے ہیں، وہ فقط اسی لیے کر رہے ہیں کہ ان کا مذہب ان کو ایسا کرنے پر ابھارتا ہے ورنہ مذہبی آزادی کا خیال تو خود مسلم ممالک میں بھی نہیں رکھا جاتا۔''

جس اخبار نے 30 جنوری 2006ء کو معافی مانگی تھی، جس کی وجہ سے یہ قضیہ کھڑا ہوا، اس نے پھر سے وہی خاکے شائع کر دیے اور ایسا کیوں نہ ہوتا، اس کو، اسی ''کارنامے'' پر تو ایوارڈ اور تعریفوں سے نوازا گیا تھا، یہی نہیں 15 مارچ 2006ء کو ''ڈائریکٹر آف پبلک پراسیکیوٹر آف ڈنمارک'' اور ''لوکل پراسیکیوٹر'' دونوں اس بات پر متفق ہوئے کہ "Jylland Posten" نے کسی ڈنمارکی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اب اگر اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی مسلمان احتجاج نہ کریں تو کیا کریں؟ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر حرمت رسول ﷺ یا حرمتِ اسلام پر بات آئے کبھی گوارا نہیں کر سکتا اور بات جب مذہب اور حمیت کی آئے تو کمزور سے کمزور مسلمان بھی فولاد کی چٹان ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ 20 مارچ 2006ء کو برلن کی پولیس نے ایک پاکستانی طالب علم ''عامر چیمہ'' کو اس وقت گرفتار کیا جب وہ اخبار "Die Wett" کے دفتر میں داخل ہوا، اس پر الزام یہ لگایا گیا کہ اس کا مقصد چھری سے اخبار کے مدیر کا خاتمہ کرنا تھا کیونکہ اس نے خاکے شائع کیے تھے، مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بہرحال برلن کی پولیس نے اس پر بے پناہ تشدد کیا جس کی وجہ سے کیم مئی 2006ء کو جیل کے اندر ہی اس کی موت ہوگئی اس کی نماز جنازہ میں تقریباً پچاس ہزار افراد نے شرکت کی اور وزیر آباد گوجرانوالہ کے قریب دفنایا گیا۔

4 نومبر 2006ء کو یمن کی عدالت نے ''الرائی الم'' کے ایڈیٹر ''کمال الافی'' کو

خاکے چھاپنے پر ایک سال کی سزا سنائی، جبکہ ان کے اخبار کو چھ ماہ کے لیے بند کر دیا گیا، اس دوران ان کی ذاتی تحریروں پر بھی پابندی عائد کر دی گئی جبکہ یمن کی ہی عدالت نے "The Yemen Observer" کے ایڈیٹر "محمد السعدی" کو اس وقت تک جیل میں بند کرنے کی سزا سنائی جب تک کہ وہ پانچ لاکھ ریال کا جرمانہ ادا نہیں کر دیتے۔

مندرجہ بالا حقائق و واقعات سے صاف پتا چلتا ہے کہ مغرب کا چہرہ کتنا مکروہ اور متعصبانہ ہے، بارہا معافی مانگنے کے بعد بھی وہ جرم دوبارہ، سہ بارہ بلکہ بار بار دہرایا گیا، مسلمان دنیا حتی کہ O.I.C کی آواز بھی "نقار خانے میں طوطی کی آواز" کی طرح دب کر رہ گئی۔ مسلمانوں سے ہی کہا گیا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں اور نام نہاد آزادی تحریر کی عزت و تکریم کریں۔ اگرچہ مسلمانوں کے احتجاج اور مصنوعات کے بائیکاٹ کی وجہ سے یورپ کو بہت نقصان برداشت کرنا پڑا، مگر وہ "کتے کی دم کی طرح ٹیڑھی کی ٹیڑھی" والی مصداق اپنے موقف سے پیچھے نہ ہٹا، اور مسلمان حق بجانب ہوتے ہوئے بھی کچھ عرصے کے بعد اس تذلیل کو بھول گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر "قانونِ ضبط الحاد" ہے کیا؟ اس کی تاریخی حقیقت کیا ہے؟ کیا واقعی یہ قانون "قانونِ آزادی تحریر و تقریر" سے متصادم ہے؟ کیا یہ قوانین صرف پاکستان میں ہی ہیں یا دوسرے ممالک میں بھی اس طرح کے قوانین رائج ہیں؟ کیا پاکستان میں یہ قوانین اقلیتوں کے خلاف استعمال ہوتے ہیں؟ کیا ان کو ختم کر دینا چاہیے؟

قدیم انگریزی زبان میں اس کے لیے لفظ "Blasfemen" قدیم فرانسیسی زبان میں "Blasfemer" اور قدیم لاطینی زبان میں "Blasphemare" استعمال ہوا ہے، جس سے مراد: "کسی کی عزت خراب کرنا، الزام تراشی کرنا یا بدنام کرنا" لیا جاتا ہے۔ عمومی معنوں میں اس سے مراد مقدس ہستیوں، مذہبی رواجات و عقائد اور خود مذہب سے متعلق دشنام طرازی لیا جاتا ہے۔ خدا کی ذات پر تنقید کرنا بھی اسی کے زمرے میں آتا ہے، حتی کہ اس کا دائرہ مذہبی اشکال، مہر یا مذہبی نشانات کے استعمال تک پھیلا ہوا ہے۔

اس کا استعمال سب سے پہلے 1200ء میں نظر آتا ہے، جب "Ancrena Riwle" نامی مذہبی کتاب منظر عام پر آئی، جس سے مراد "ملحدانہ الفاظ" ہے۔ "Johnwycliff" ان الفاظ کا استعمال صرف حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات تک ہی محدود

رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"Freres by gobbling blaspheme upon Christ"

یعنی: ملحدوں نے فضول بکواس کرتے ہوئے مسیح ؑ کے خلاف الحاد بکا۔"

جبکہ 16ویں صدی میں اس لفظ کا عام استعمال شروع ہوا اور اس سے مراد عام گالی، دشنام طرازی وغیرہ کے معنوں میں لیا جانے لگا، جبکہ ڈاکٹر جانسن (Dr. Johnson) نے اس کی حدود اقنوم ثلاثہ: باپ، بیٹا، روح القدس، تک بڑھا دیں، چاہے ان الفاظ کا استعمال زبانی ہوا ہو یا تحریری۔

"انگلش کامن لاء" میں کسی بھی معاملے کو "الحاد" اس وقت تسلیم کیا جاتا ہے کہ جب وہ عیسائیت کی حقانیت سے انکاری ہو یا بائبل یا عام دعائیہ کتب یا وجود باری تعالیٰ کے خلاف ہو۔

تمام آسمانی مذاہب "الحاد" کو گناہِ عظیم قرار دیتے ہیں اور قابل تعزیر گردانتے ہیں، یہودی مذہب میں پڑھی جانے والی موجودہ توراۃ میں (عیسائیوں کی بائبل میں موجود پرانے عہد نامے کی توراۃ سے مختلف ہے) بے شمار مقامات پر اس کا ذکر ملتا ہے اور تعزیر کا احوال بھی درج ہے، جیسے:

- تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ نہ لینا کیونکہ جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے، خداوند اسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔ (خروج باب:20، فقرہ:7)
- اور تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھانا، جس سے تو اپنے خدا کے نام کو ناپاک ٹھہرائے، میں خداوند ہوں۔ (احبار، باب:19، فقرہ:12)
- تم میرے پاک نام کو ناپاک نہ ٹھہرانا، کیونکہ میں بنی اسرائیل کے درمیان ضرور ہی پاک مانا جاؤں گا، میں خداوند تمہارا مقدس کرنے والا ہوں۔ (احبار، باب:22، فقرہ:32)
- اور اسرائیلی عورت کے بیٹے نے پاک نام پر کفر کیا اور لعنت کی، تب لوگ اسے موسیٰ کے پاس لے گئے، اس کی ماں کا نام سلومیت تھا جو دبری کی بیٹی تھی جو دان کے قبیلے کا تھا اور انہوں نے اسے حوالات میں ڈال دیا، تاکہ خداوند کی جانب سے اس بات کا فیصلہ ان پر ظاہر کیا جائے، تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اس لعنت کرنے والے کو لشکر گاہ سے باہر نکال کر لے جائے اور جتنوں نے اسے لعنت کرتے سنا، وہ سب اپنے اپنے ہاتھ اس کے سر پر رکھیں اور ساری جماعت اسے

سنگسار کرے اور تو بنی اسرائیل سے کہہ دے جو کوئی اپنے خدا پر لعنت کرے، اس کا گناہ اسی کے سر لگے گا اور جو خداوند کے نام پر کفر بکے ضرور جان سے مارا جائے، ساری جماعت اسے قطعی سنگسار کرے، خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی۔ جب وہ پاک نام پر کفر بکے تو وہ ضرور جان سے مارا جائے۔ (احبار، باب:24، فقرہ:11-16)

- تب داؤد نے ناتن سے کہا کہ خداوند نے بھی تیرا گناہ بخشا، تو مرے گا نہیں، تو بھی چونکہ تو نے اس کام سے خداوند کے دشمنوں کو کفر بکنے کا بڑا موقع دیا ہے، اس لیے وہ لڑکا بھی جو تجھ سے پیدا ہوگا، مر جائے گا۔ (2 سموئیل باب:12، فقرہ:13، 14)

عیسائیت میں بھی کم وبیش اسی طرح کے عقائد ملتے ہیں، موجودہ بائبل کے نئے عہد نامہ میں کئی فقرے کفر والحاد کو روکتے نظر آتے ہیں، چنانچہ لکھا ہے:

- اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ آدمیوں کا ہر گناہ اور کفر تو معاف کیا جائے گا مگر جو کفر روح کے حق میں ہو وہ معاف نہ کیا جائے گا۔ (متی کی انجیل، باب:12، فقرہ:31)
- اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے، اب ہم کو گواہوں کی کیا حاجت رہی۔ (متی کی انجیل، باب:26، فقرہ:65)
- تم نے یہ کفر سنا، تمہاری کیا رائے ہے، ان سب نے فتویٰ دیا کہ وہ قتل کے لائق ہے۔ (مرقس کی انجیل، باب:14، فقرہ:64)
- اس پر فقیہی وفریسی سوچنے لگے کہ یہ کون ہے جو کفر بکتا ہے، خدا کے سوا اور کون گناہ معاف کر سکتا ہے۔ (لوقا کی انجیل، باب:5، فقرہ:21)
- یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب سے تجھے سنگسار کرتے ہیں اور اس لیے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے۔ (یوحنا کی انجیل باب:10، فقرہ:33)
- اور اس نے خدا کی نسبت کفر بکنے کے لیے منہ کھولا کہ اس کے نام اور اس کے خیمہ یعنی آسمان کے رہنے والوں کی نسبت کفر بکے۔ (مکاشفہ، باب:13، فقرہ:6)

عیسائی تحریروں اور عالموں کے نزدیک بلاسفیمی ایک انتہائی سنگین جرم رہا ہے اور بہت سے مقامات پر اس کا ذکر "ناقابل تلافی جرموں" کے ساتھ کیا گیا ہے جس کی معافی نہیں ملتی۔

تھامس ایکوینس کہتے ہیں: یہ بات انتہائی صاف اور واضح ہے کہ بلاسفیمی جو کہ

برائے راست خدا کے خلاف کفر ہے، قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے اور قتل بھی وہ جو اپنے ہی پڑوسی کا کیا جائے۔ (Summa Theolgica)

ایک اور مشہور کتاب "The Book of Concord The Large Catechism" میں بلاسفیمی کو عظیم ترین گناہ کہا گیا ہے۔ عیسائیوں کے ایک فرقے "اصطباغی" "Beptict" کے عقائد کی کتاب "The Beptist Confession of faith" میں لکھا ہے:

"چنانچہ، خدا کے پاک اور مقدس نام سے جھوٹی قسم کھانا عظیم گناہ ہے اور قابل کراہت فعل ہے اور ایسا کرنے سے خدا کو اشتعال آتا ہے اور زمین ان کے فعل پر ماتم کرتی ہے۔"

"The Heidelberg Catechism" نامی کتب میں عیسائی عقائد سے متعلق سوالات کے جوابات دیتے ہوئے "بلاسفیمی" سے متعلق لکھا ہے: "اس سے زیادہ بڑا اور عظیم گناہ نہیں ہوسکتا کہ خدا کے ناموں سے متعلق کفر بکا جائے۔" (سوال:100)

"Jean Calvion" لکھتے ہیں: "یہ ناقابل برداشت ہے کہ کوئی شخص خدا کے نام پر کفر بک کر یہ کہے کہ اس کو غصہ آیا اور وہ جذبات میں بہہ گیا، کیونکہ جب خدا کو غصہ آتا ہے تو وہ یقیناً اس کی سزا دیتا ہے۔" (Harmony of the Law Vol:4)

بدھ ازم میں اگرچہ کوئی خاص نظریہ اس سے (بلاسفیمی) متعلق نہیں ملتا۔ ان کے مطابق دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو بھی ان کے اچھے اعمال کا بدلہ دنیا و آخرت میں ملتا ہے۔ بدھسٹ تعلیمات کے مطابق جزا کا تعلق قدرتی قانون سے ہے اور یہ بغیر کسی مذہبی تعلق کے ملتی ہے۔ ان کے مطابق دنیا آخرت کی کھیتی ہے، اسی لیے بدھسٹ افراد کا عقیدہ ہے کہ دوسرے مذاہب و عقائد پر تنقید نہ کی جائے۔ بدھسٹ عقائد میں موجود بنیادی "ہشت ارکان" اپنے ماننے والوں کو "درست تقریر" اختیار کرنے کا درس دیتا ہے جس سے مراد گالی، جھوٹ، لغویات اور دشنام طرازی سے باز رہنا ہے، اس لیے اگر کوئی بدھ مت کا ماننے والا، کسی بدھسٹ رہبر یا کسی دوسرے مذہب کے پیشوا یا عقائد کے خلاف بولتا ہے تو وہ اپنے بنیادی عقائد کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ہندوازم میں بلاسفیمی سے متعلق قطعی کوئی ذکر نہیں اور بہت سے ہندوؤں کے نزدیک یہ مقتدر آزادی باعث سکون ہے اور یہ اپنے ماننے والوں کو اس سے متعلق کوئی روک

نہیں لگاتا کہ وہ اپنے مذہب کے بنیادی عقائد سے متعلق سوال کریں، حتیٰ کہ ہندو اگر چاہیں تو کوئی نیا وید بھی تخلیق کر سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو کوئی بھی عقیدہ اختیار کرنے سے رک سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے مہاتما گاندھی کہتے ہیں: ''ایک دہریہ بھی خود کو ہندو کہہ سکتا ہے۔'' اس سے قطع نظر کہ ہندو ازم کے ماننے والوں کا عام رجحان کیا رہا ہے اور کثرت بتان کی وجہ سے کیا اثر نکلتا ہے۔ وید دوسرے عقائد کے خلاف کفر بکنے سے منع کرتا ہے اور اسے ''ناستیکا'' قرار دیتا ہے۔

جین ازم میں بلاسفیمی سے مراد جھوٹے عقائد کا پرچار کرنا اور حق مذہب کی تبلیغ میں رکاوٹ ڈالنا، روحانی رہنماؤں کے خلاف بولنا، خداؤں کے مجسموں کے خلاف عقائد رکھنا، جین مت کے ماننے والوں کے خلاف عمل کرنا، بنیادی عقائد اور مذہبی رسومات و علامات کے خلاف بولنا شامل ہیں۔ ان سب کو ملا کر ''دارسنا موہنا کہ'' کہا جاتا ہے جس سے مراد مذہب حق کے بنیادی عقائد کو خراب کرنا ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر منگلور، انڈیا میں "Kannada" نامی اخبار کے مدیر ''بی وی سیتھا رام'' نے جین مت کے رہنما منشیر تارن سگر'' کے خلاف لکھا تھا۔

اسلام میں بلاسفیمی سے متعلق واضح احکامات موجود ہیں۔ قرآن مجید کفر و الحاد کو روکتا ہے اور شریعت اس جرم پر سزائیں سناتی ہے۔ ان سزاؤں میں، جرمانہ، قید، کوڑوں کی سزا، یا موت کی سزائیں شامل ہیں۔ ارشاد ہے:

- ❑ یقیناً اللہ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشے گا اس کے علاوہ جس کو چاہے بخش دے گا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا یقیناً بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ (النساء: 48)
- ❑ یقیناً تیری طرف بھی اور تجھ سے پہلے کے تمام نبیوں کی طرف بھی وحی کی گئی ہے۔ اگر تو نے شرک کیا تو بلاشبہ تیرا عمل ضائع ہو جائے گا اور یقیناً تو زیاں کاروں میں ہو جائے گا۔ (الزمر: 65)
- ❑ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔ (المائدہ: 72)
- ❑ پس تو یکسو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف متوجہ کر دے۔ خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کے بنائے کو بدلنا نہیں، بس سیدھا دین یہی ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ (الروم: 30)
- ❑ اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جو خدا کی مسجدوں میں خدا کا ذکر کرنے سے

روکے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے۔ (البقرہ:114)

- جنہوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو تکلیفیں پہنچائیں اور توبہ نہ کی ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔ (البروج:10)
- اب جو لوگ حکم رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں، ان کو اس سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آفت آن پڑے یا ان پر کوئی دردناک عذاب نازل ہو جائے۔ (النور:63)
- جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے اس کا وہ دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔ (آل عمران:85)
- جو لوگ مسلمانوں میں بُرائی پھیلانے کے آرزو مند رہتے ہیں، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ (النور:19)
- جن لوگوں کو یہ مشرک خدا کے سوا پکارتے ہیں، ان کو بُرا نہ کہنا کہ یہ بھی کہیں خدا کو بے سمجھے بوجھے بُرا نہ کہہ بیٹھیں۔ (الانعام:108)
- اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو، یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور بھید نہ ٹٹولا کرو اور تم میں سے نہ کوئی کسی کی غیبت کیا کرے، کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا، تم کو اس سے گھن آئے گی اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات:12)
- ہدایت معلوم ہو جانے کے بعد جو انسان رسول (ﷺ) کی مخالفت کرے اور مومنوں کی جماعت سے علیحدہ چلے تو ہم اس کو ادھر ہی جانے دیتے ہیں، جدھر وہ جا رہا ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بُری جگہ ہے۔ (النساء:115)

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کسی بھی مذہب کے پیروکاروں کا، ان کے بانیان سے جذباتی تعلق ہوتا ہے جو کسی مادیت سے بالاتر ہو کر صرف دل سے قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم مسلمانوں کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ہستیاں انتہائی قابل احترام ہیں اور ان کی تعظیم و تکریم کی خاطر ہمیں کسی دنیاوی قانون کی ضرورت نہیں۔ ہم ان کی عزت و احترام بلا کسی تردد یا قانون کو خاطر میں لائے بغیر کرتے ہیں اور یہ عین فطری ہے بالکل اسی طرح جیسے کٹر عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کے لیے انتہائی

عقیدت مندانہ جذبات رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب انطاکیہ کے بشپ "ساؤل" نے عیسائی نظریے سے ہٹ کر حضرت مسیح علیہ السلام کو فقط ایک عام انسان مان لیا اور اس کی تبلیغ کرنا شروع کی تو 269ء میں 70 سے زائد مذہبی رہنماؤں نے اس کے خلاف تحریک چلائی اور اس کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا کیونکہ اس کی تعلیمات کی وجہ سے ان کے مذہبی جذبات پر ضرب پڑتی تھی۔ اسی طرح آریئس (250-336-AD) حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم نہ کرتا تھا، اس کو بھی اپنے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ پولیکن کو 290ء میں ایسے ہی عقائد رکھنے پر سنگسار کر دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ عقائد و جذبات کی بنیاد پر کیا گیا۔ گرچہ بعد میں عدالتیں بھی ان کی سزاؤں یا معزولی میں شامل ہو گئیں تھیں مگر اصل میں مذہبی جذبات ہی کارفرما تھے۔

موجودہ انگریزی قانون میں بلاسفیمی سے ملتے جلتے اور بھی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کو مجموعی طور پر "Criminal Libels" کہا جاتا ہے، ان میں ایک تو خود بلاسفیمی ہے۔ دوم (Obscenity) جس سے مراد اخلاقی پستگی یا گراوٹ ہے اور سوم (Sedition) جس سے مراد ریاست کے خلاف غداری ہے، ان تینوں جرائم میں عموماً مدعی ریاست ہوتی ہے۔ عام (Defamation) اور کرمنل لیبل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کرمنل لیبل کو مجرم، سچ "یا" قانونی استثنیٰ حاصل ہونے کا عذر استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر عدالت یہ سمجھتی ہے کہ کسی کا ادا کردہ جملہ چاہے وہ پارلیمنٹ یا عدالتی کارروائی کے دوران ادا کیا ہو، کرمنل لیبل کے زمرہ میں آتا ہے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

دنیا کے بیشتر ممالک میں بلاسفیمی سے متعلق قوانین موجود ہیں مگر مغربی ممالک میں یہ قوانین آزادئ تحریر و تقریر کے قوانین سے متصادم نظر آتے ہیں۔ مغربی ممالک میں جتنی بھی کوششیں کی گئیں کہ یہ تصادم کم سے کم ہو، اتنا ہی زیادہ بلاسفیمی کے جرم سامنے آنے لگے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغربی ممالک کی عدالتوں نے اکثر مجرمین کو "آزادئ تحریر و تقریر" کی بنیاد پر باعزت بری کر دیا اور بعض وقوعات میں شک کا فائدہ دے کر یہ موقف اختیار کیا کہ "اس فعل" سے مذہبی جذبات کے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

1951ء میں اٹلی کے روبرٹو روسیلنی کی فلم "The Miracle" میں فلم کے ایک کردار کو "حضرت مریمؑ" بنا کر پیش کیا گیا۔ اس فلم کے ریلیز ہونے پر دنیا بھر میں عیسائیوں کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ اس دوران جو کتبے اور سائن بورڈ اٹھا رکھے تھے، اس پر جو لکھا تھا

وہ ملاحظہ ہو"فلم ہر معزز عورت کی بے عزتی ہے"! "دہریئے مت بنو"! "شیطانی کام"! وغیرہ وغیرہ۔ کیتھولک چرچ کے دباؤ میں آ کر فلم بورڈ نے اسے مذہبی منافرت پھیلانے کے جرم میں بند کرنے کا حکم جاری کردیا، اس کا لائسنس منسوخ کردیا گیا اور فلم کی مزید نمائش روک دی گئی۔ فلم کے ڈسٹری بیوٹر "جوزف" نے اس فعل کو عدالت میں چیلنج کیا۔ 1952ء میں امریکی سپریم کورٹ نے فلم بورڈ کے فیصلے کو غیر آئینی قرار دے دیا اور فلم کی نمائش دوبارہ جاری کروادی۔

بی بی سی کے پروگرام "The Opera" میں ایک ایکٹر نے خود کو مسیح بنا کر پیش کیا اور اس دوران اس نے قابل اعتراض لباس پہن رکھا تھا۔ برطانیہ میں عیسائیوں نے بڑے ہی مظاہرے کیے۔ ایک اخبار "Christian Voice" نے بی بی سی کے عہدیداروں کے گھر کے پتے اور فون نمبر شائع کیے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ ایک مسیحی تنظیم "Christian Institute" نے بی بی سی پر بلاسفیمی چارج لگا کر مقدمہ دائر کیا، لیکن ہائی کورٹ نے اس کو خارج کردیا۔

2004ء میں حضرت مسیح کو ایک کارٹون فلم میں قابل اعتراض کردار کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس پر کمپنی کو 250,000 درخواستیں موصول ہوئیں، آخر کار کمپنی کو کردار بدلنا پڑا۔

2008ء میں سویڈن میں ایک اخباری اشتہار نے اس وقت مظاہرے شروع کروا دیے، جب اس اشتہار میں حضرت مسیح کو شیطان سے جنگ کرتے اور ہارتے دکھایا گیا تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر ان چیف کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھی وصول ہوئیں۔

مندرجہ بالا ساری مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مذہب یا مذہب سے جڑے افراد کی تعظیم کا معاملہ قانونی نہیں، جذباتی ہے۔ قانون تو فقط جذبات کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ مسیحی افراد اپنے جذبات کے مجروح ہونے پر احتجاج کرتے رہے، مگر دہریے اس کی تشہیر کرتے رہے ہیں۔ اسلام یا مسلم افراد سے متعلق تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ہمارے خلاف تو تمام غیر مسلم، کفار اور دہریے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہوجاتے ہیں اور کوئی بھی ایسا موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کہ جس میں مسلمانوں کی دل آزاری ہو۔ اسلام کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ ہی سے متعصبانہ رہا ہے۔ انہیں اس بات سے قطعی کوئی غرض نہیں کہ مسلمان کیسا محسوس کرتے ہیں اور ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟

9 مارچ 1977ء کو واشنگٹن ڈی سی کو 12 افریقی وامریکی مسلمانوں نے قبضے میں

لے لیا۔ ان کا اصل مطالبہ یہ تھا کہ فلم "Muhammad Messenger of God" پر پابندی لگائی جائے۔ 39 گھنٹوں کی طویل جدوجہد کے بعد آخرکار امریکی پولیس نے بلڈنگ کو آزاد کروالیا۔ 2001ء میں ایک امریکی میگزین "Time" نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل علیہ السلام کی خیالی تصویر شائع کی جس پر دنیا بھر میں احتجاج شروع ہوگیا۔ آخرکار میگزین کو معافی مانگنا پڑی۔ دسمبر 2002ء میں میگزین "Pulitzer Prize" نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر شائع کی جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اسلام دنیا میں دہشت گردی کا ذمہ دار ہے جس پر دنیا بھر سے تقریباً 4500 ای میلو بھیجیں گئیں جس میں جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی شامل تھیں۔ ڈچ سیاست دان "Grert Widers" کی فلم فتنہ پر نزاع کا معاملہ رہا۔ اس پر قتل کا فتویٰ بھی جاری ہوا۔ اس فلم میں قرآن کو دہشت گردی سے جوڑا گیا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دینی جذبات کے مجروح ہونے پر قانون موجود ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بنیادی طور پر قانون ہر شخص کی جان، مال، عزت و احساسات کا تحفظ فراہم کرتا ہے مگر یہ شخصی ذمہ داری بھی ہے کہ کوئی بھی ایسا عمل نہ کیا جائے جس سے دوسرے کے مذہبی جذبات مجروح ہوں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں بلاسفیمی سے متعلق قوانین موجود ہیں مگر ان قوانین پر عمل درآمد کا طریقہ، تعبیر وتشریح اور سزا مختلف ہیں۔

29 جون 2007ء میں یورپین کونسل کی پارلیمنٹ نے مذہب کی بنیاد پر تضحیک اور تحریر سے متعلق قرارداد نمبر 1805/07 منظور کی جس میں بلاسفیمی کو فوجداری جرم کی فہرست سے نکال دیا گیا۔

23 اکتوبر 2008ء ویانا کمیشن کی یورپین مشاورتی کونسل نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ پورے یورپ میں آسٹریا، ڈنمارک، فن لینڈ، یونان، اٹلی، لتھوانیا، نیدرلینڈ اور سین مارینو، وہ ممالک ہیں جہاں بلاسفیمی ایک فوجداری جرم ہے۔ ایسا نہ ہم چاہتے ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ بلاسفیمی کو ایک فوجداری جرم بنا دیا جائے۔

کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ قوانین کی موجودگی کے باوجود اس پر عمل درآمد نہ کیا جائے اور ایسے سنگین جرم کو صرف اس لیے تحفظ فراہم کیا جائے کہ اس سے نام نہاد ''تحریر و تقریر'' کی آزادی پر ضرب پڑتی ہے۔ کیا جذبات و احساسات کا تحفظ فراہم کرنا یہ بنیادی

حقوق میں شامل نہیں؟ اور صرف یہی نہیں، بلاسفیمی سے متعلق تو خود تورات وانجیل اور وید وغیرہ قابل تعزیر جرم قرار دیتی ہیں تو کیا یورپی ممالک اپنے ہی مذہبی عقائد کے برخلاف قوانین بنانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ ان کی مذہبی کتابوں میں درج ہے، اس کا ''شعشہ تک قیامت تک نہ ٹل پائے گا''! میرے خیال سے ایسا کرنے سے خود ان کے اپنے مذہب کی تذلیل ہورہی ہے اور انہیں اپنی تھوڑی سی عقل سلیم اس طرف بھی خرچ کرنا چاہیے۔

پاکستان ایک نظریاتی واسلامی مملکت ہے۔ دنیا کا وہ واحد ملک جس کی اساس دین پر ہے۔ یہ بات واضح کردی جائے کہ آج کل یہ وبا عام پھیلی ہوئی ہے کہ لوگ اسرائیل کو بھی نظریاتی مملکت کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کی بنیاد خالصتاً نسلی بنیاد پر ہے۔ بہرحال پاکستان میں بلاسفیمی قوانین کا بنیادی مقصد اسلامی احکامات، عقائد ورسومات کا تحفظ ہے۔ پاکستان میں بلاسفیمی آرٹیکل 2 کے مطابق اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے۔ آرٹیکل 31 کے مطابق یہ ریاستی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کو اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کے لیے مناسب اقدامات کرے گی، جبکہ آرٹیکل 33 شہریوں کے مابین تفریق کا خاتمہ کرتا ہے۔

بلاسفیمی سے متعلق قانون کو تعزیرات پاکستان 1860ء میں ''مذہب سے متعلق جرائم'' کے عنوان سے قلم بند کیا گیا ہے۔ دفعہ 295 تعزیرات پاکستان سے متعلق ہے۔ اس دفعہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

دفعہ 295 کسی فرقے کے مذہب کی بے عزتی کی نیت سے
عبادت گاہ کو نقصان پہنچانا یا نجس کرنا:

''جو کوئی کسی عبادت گاہ یا کسی شے کو جسے لوگوں کا کوئی فرقہ متبرک سمجھتا ہو، تباہ کرے یا نقصان پہنچائے یا نجس کرے، اس نیت سے کہ وہ اس طرح لوگوں کے کسی فرقے کی مذہب کی توہین کرے یا اس احتمال کے علم سے لوگوں کا کوئی فرقہ اس تباہی، نقصان یا نجس کرنے کو اپنے مذہب کی توہین سمجھے گا تو اسے دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی معیاد دو برس تک ہوسکتی ہے یا جرمانہ یا دونوں سزائیں۔''

مندرجہ بالا دفعہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ اس دفعہ میں اسلام کا لفظ کہیں پر بھی

استعمال نہیں ہوا۔ چنانچہ پاکستان میں پنپنے والے تمام مذاہب کے افراد ضرورت پڑنے پر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ سائل کو فقط یہ ثابت کرنا ہوگا کہ:

1 جگہ مذکورہ عبادت کے لیے استعمال ہوتی تھی یا شے مذکورہ متبرک تھی۔

2 وہ جگہ یا شے لوگوں کی کسی جماعت کے نزدیک متبرک تھی۔

3 ملزم نے ان کو تباہ کیا، نقصان پہنچایا یا نجس کیا۔

4 ملزم نے ایسا:

الف: اس نیت سے کیا کہ کسی جماعت کے اشخاص کے مذہب کی توہین ہو یا:

ب: اس علم سے کیا کہ لوگوں کی کسی جماعت کا ایسی تباہی وغیرہ کو اپنے مذہب کی توہین سمجھنے کا احتمال ہو۔

بعد میں فوجداری قوانین میں ترمیم کے ذریعے مندرجہ بالا دفعہ میں اے، بی اور سی ذیلی دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

دفعہ 295-A: دانستہ و معاندانہ افعال جن کا منشا کسی فرقے کے مذہبی احساسات کی، اس کے مذہب یا مذہبی عقائد کی توہین کر کے بے حرمتی کرنا ہو۔

''جو کوئی دانستہ اور معاندانہ نیت سے پاکستان کے شہریوں کے کسی فرقے کے مذہبی احساسات کی تذلیل کی غرض سے بذریعہ الفاظ، خواہ تقریر ہوں یا تحریری، یا اشاروں سے، اس فرقے کے مذہب یا مذہبی عقائد کی توہین کرے یا توہین کا اقدام کرے، اسے دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی، جس کی میعاد 10 سال تک ہو سکتی ہے یا جرمانہ یا دونوں سزائیں۔''

دفعہ 295-B: قرآن پاک کی بے حرمتی وغیرہ:

''جو کوئی قرآن پاک یا اس میں سے کسی اقتباس کی دانستہ بے حرمتی کرے، نقصان پہنچائے یا بے ادبی کرے یا اسے کسی معیوب یا کسی غیر قانونی مقصد کے لیے استعمال کرے تو اسے عمر قید کی سزا سنائی جائے گی۔''

دفعہ 295-C: رسول اکرم ﷺ کی بابت خلاف شان الفاظ استعمال کرنا:

''جو کوئی الفاظ سے، خواہ منہ سے بولے جائیں یا لکھے جائیں یا لکھے گئے ہوں یا

نظر آنے والے نمونوں میں سے یا کسی اتہام، چالاکی یا کنایہ سے، بلاواسطہ یا بالواسطہ مقدس پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبرک نام کی بے حرمتی کرے تو اسے موت کی یا عمر قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔"

اسی طرح تعزیرات پاکستان 1860ء میں اسی عنوان کے تحت مندرجہ ذیل دفعات بھی شامل ہیں:

دفعہ 298: مذہبی احساسات کو مجروح کرنے کی دانستہ نیت سے الفاظ وغیرہ بولنا:

"جو کوئی دانستہ نیت سے کسی شخص کے مذہبی احساسات کو مجروح کرنے کے لیے کوئی بات کہے یا کوئی آواز نکالے جس کو وہ شخص سن سکے یا اس شخص کے پیش نظر کوئی حرکت کرے یا کوئی شے اس کے پیش نظر رکھے، اسے دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی سزا دی جائے گی، جس کی میعاد ایک برس تک ہوسکتی ہے یا جرمانہ یا دونوں سزائیں۔ بعد میں ترمیم کے ذریعے اس میں اے، بی اور سی تین ذیلی دفعات شامل کی گئیں۔"

دفعہ 298-A: معزز اشخاص کی نسبت توہین آمیز رائے زنی کرنا:

"جو کوئی پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بیوی (ام المومنینؓ) یا ان کے ارکان کنبہ یا راست باز خلیفوں (خلفائے راشدینؓ) میں سے کسی کی یا پیغمبر پاک ﷺ کے ساتھیوں (صحابہ کرامؓ) کی الفاظ سے، چاہے زبانی ہوں یا تحریری یا ظاہری اشاروں یا اتہام، طعن زنی یا درپردہ تعریض سے بلاواسطہ یا بالواسطہ بے حرمتی کرے، اسے دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا سنائی جائے گی جس کی میعاد تین برس تک ہوسکتی ہے یا جرمانہ یا دونوں سزائیں۔"

دفعہ 298-B: القاب، حرکات اور خطاب وغیرہ کا غلط استعمال:

(1) "قادیانی یا لاہوری جماعت کا کوئی فرد (جو خود کو احمدی یا کسی دیگر نام سے موسوم کرتے ہیں) جو زبانی یا تحریری الفاظ سے یا ظاہری بیان سے:

(a) کسی شخص کا علاوہ خلیفہ یا پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مصاحب کے، بطور امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، صحابی یا رضی اللہ عنہ کے حوالے دے یا خطاب کرے۔

(b) کسی شخص کا علاوہ زوجہ پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے، بطور ام المومنین دے یا خطاب کرے۔

(c) کسی شخص کا علاوہ پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رکن کنبہ کے بطور اہل بیت کے، حوالہ دے یا خطاب کرے۔

(d) اپنی عبادت گاہ کا بطور مسجد کا حوالہ دے، نام لے یا پکارے۔

(2) قادیانی جماعت یا لاہوری جماعت کا کوئی شخص (جو خود کو احمدی یا کسی دیگر نام سے موسوم کرتے ہیں) جو زبانی یا تحریری الفاظ سے یا ظاہری حرکات سے، اپنے عقیدہ میں پیروی کردہ عبادت کے لیے بلانے کے لئے، کسی طریقہ یا شکل کو بطور اذان کے حوالہ دے یا اس طرح اذان دے جس طرح مسلمان دیتے ہیں تو اسے دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد تین سال تک ہوسکتی ہے اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔"

دفعہ 298-C: قادیانی جماعت وغیرہ کے اشخاص کا خود کو مسلمان کہنا یا اپنے عقیدہ کی تبلیغ یا اشاعت کرنا:

"قادیانی جماعت یا لاہوری جماعت کا کوئی شخص (جو خود کو احمدی یا کسی دیگر نام سے موسوم کرتا ہو) بلاواسطہ یا بالواسطہ خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہو یا اپنے عقیدہ کا بطور اسلام کے حوالہ دیتا ہو یا موسوم کرتا ہو یا دوسروں کو اپنا عقیدہ قبول کرنے کی دعوت دیتا ہو، الفاظ جو چاہے زبانی ہوں یا تحریری یا ظاہری حرکات سے یا کسی طریقے سے خواہ کچھ بھی ہو، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائے، اسے دونوں اقسام میں سے کسی قسم کی سزائے قید دی جائے گی جس کی مدت تین سال تک ہوسکتی ہے اور سزائے جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔"

جہاں تک دفعہ نمبر 295 کا تعلق ہے، کی حدود وسیع ہیں خود دفعہ نمبر 295 اور اس کی ذیلی دفعہ "A" میں لفظ اسلام درج نہیں، اس لیے اس کا افادہ تمام مذاہب لے سکتے ہیں، البتہ دفعہ نمبر 298 کو سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور وہ بھی اسی وجہ سے کہ بین الاقوامی طور پر قادیانی لابی بڑی مضبوط ہے جو نہ تو پاکستان سے مخلص ہے اور نہ اسلام سے بلکہ اسلام سے تو ان کا دور کا واسطہ بھی نہیں۔

ان دفعات کے شامل ہونے کا مقصد صاف اور واضح ہے کہ آئین پاکستان، ریاست پر اسلام اور اسلامی عقائد کے تحفظ کی ذمہ داری عائد کرتا ہے اور یہ دنیا میں کوئی انوکھی

بات نہیں۔ جب سلمان رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' پر مسلمانوں نے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب کی اشاعت پر پابندی لگائی جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہو رہے ہیں تو حکومت برطانیہ نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ: ''برطانوی قانون میں تحفظ صرف ''عیسائی مذہب'' کو ہی حاصل ہے۔'' اب ہم یہ برملا کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی تو بنیاد ہی اسلام پر ہے، ہمارے تو آئین میں ہی سرکاری مذہب اسلام کو مانا گیا ہے۔ برطانیہ نے کیسے یہ قانون بنایا کیونکہ نہ تو وہ مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اور نہ ہی اس کے آئین میں عیسائیت کو بطور سرکاری مذہب لکھا گیا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ قادیانیوں کو ہی کیوں بطور خاص تختۂ مشق بنایا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قادیانی حضرات خود کو مسلمان اور اپنے مذہب کو اسلام ظاہر کر کے نہ صرف سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں بلکہ اصل عقائد اسلامی کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی عقائد اور قادیانی عقائد میں واضح تضاد موجود ہے، اصول یہ ہے کہ اگر اصولِ دین میں اختلاف موجود ہو تو اس کو الگ مذہب مانا جاتا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں آریئس پولیکن اور سوؤل کا ذکر آیا ہے کہ کس طرح ان کے عقائد موجودہ عیسائیت سے علیحدہ ہونے پر ان کو معزول کر دیا گیا۔ اب اگر یہی اصول ہم قادیانیوں پر منطبق کریں تو کون سی انوکھی بات ہوئی اور پھر خود موجودہ عیسائی فرقے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کافی عرصے تک ایک دوسرے کی تکفیر کرتے آئے اور ریاستی حکم کے تحت لاکھوں افراد کا قتل عام کروایا گیا۔ کیتھولک، پروٹسٹنٹ کو اور وہ کیتھولک کو عیسائی ماننے کو تیار نہیں، حتی کہ ان دونوں فرقوں کی بائبل تک میں فرق ہے، اب مغرب اس کا کیا جواز پیش کرے گا؟

باقی رہا یہ سوال کہ اس قانون کا اقلیتوں کے خلاف غلط استعمال ہو رہا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جتنے ممکنات کسی اور قانون کے غلط استعمال سے متعلق ہو سکتے ہیں، اتنے ہی ان قوانین سے متعلق ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے معاشرے میں بلکہ دنیا میں زنا کے جھوٹے مقدمات قائم کر لئے جاتے ہیں۔ چور راستے استعمال کرتے ہوئے جائیدادوں میں ہیر پھیر کر دی جاتی ہے۔ ان پر تو کبھی اتنے شدومد سے آواز نہیں اٹھائی گئی تو پھر آخر ان قوانین کے خلاف دیوانہ وار جدوجہد کیوں کی جا رہی ہے؟ اس کے پیچھے اور کون سے محرکات ہیں؟ ہمارے یہاں جھوٹے اغوا کے مقدمات قائم کیے جاتے ہیں اور ان کو انہی تعزیری قوانین کے تحت چلایا جاتا ہے۔ غیرت کے نام پر قتل کرنے والوں کو انہی قوانین کے تحت معافی دے

دی جاتی ہے اور ہماری پارلیمنٹ صرف قانون سازی کرنے کی خواہش ظاہر کرتی ہے مگر عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ قوانین کبھی بھی غلط طریقے سے استعمال نہیں ہوئے یا استعمال ہو ہی نہیں سکتے، مگر میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ: کسی بھی قانون کو ختم کرنے کی صرف یہ وجہ کافی نہیں کہ اس کا استعمال غلط ہوا ہے بلکہ اس کے طریقۂ استعمال میں جہاں جہاں جو کمی یا کوتاہیاں باقی ہیں، اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قانون ہر شخص کو ایف آئی آر کٹوانے کا حق دیتا ہے، چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو، کسی کو بھی تفتیش کے حق سے محروم نہیں کر سکتے اور اگر پولیس کسی وجہ سے ایف آئی آر درج نہیں بھی کرتی تو عدالتیں A-22 ضابطۂ فوجداری کے استعمال سے اس کے درج کرنے کا حکم دے دیتی ہے۔

یہ بھی قابل غور امر ہے کہ: ''قانون ضرور اندھا ہے''، مگر ''عدالتیں اندھی نہیں''۔ وہ سب کچھ دیکھتی و سمجھتی ہیں پھر ایسے مقدمات یکمشت یا فوری ختم نہیں ہوتے بلکہ اس کے فیصلہ آنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ شہادتیں، گواہیاں پھر جرح کافی طویل عمل ہیں اور اس کے بعد بھی عدالتیں اکثر مقدمات میں ملزمان کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے چھوڑ دیتی ہیں۔

دنیا بھر میں کرمنل ٹرائل کا مصدقہ اصول یہی ہے کہ: ''شبہ کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو ہی جاتا ہے'' لیکن جہاں مقدمہ میں الزام ثابت ہو جائے، وہاں عدالت کو چار و ناچار سزا سنانا ہی پڑتی ہے، جیسے مارچ 2006ء میں پولیس نے ''شفیق لطیف'' نامی شخص کو گرفتار کیا، جس پر یہ الزام تھا کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں اور قرآن پاک کی بے حرمتی کی ہے، جون کے مہینے میں اس کو سزائے موت کی سزا سنادی گئی اور ساتھ میں پانچ لاکھ کا جرمانہ بھی بطور سزا ادا کرنا پڑا۔

اسی طرح 2005ء میں کتاب ''شیطان مولوی'' کے مصنف یونس شیخ کو تاحیات قید کی سزا سنائی گئی جس میں رجم سے متعلق غیر قرآنی ہونے کی دلیل دی گئی تھی اور خلفائے راشدین سے متعلق نازیبا کلمات لکھے ہوئے تھے۔

بالکل اسی طرح کا کیس لندن میں بھی رپورٹ کیا گیا کہ ایک شخص ''جون ولیم'' کو 9 ماہ کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی، کیونکہ اس نے اپنے پمفلٹ میں حضرت مسیحؑ کی آمد یروشلم کی جو کہانی، متی کی انجیل (باب:21، فقرہ:27) میں درج ہے اس کے برخلاف بیان لکھا تھا۔

پاکستان میں ایسے مقدمات میں ضمانتیں دے دینا عام بات ہے کیونکہ ایک تو شبہ کا

فائدہ دے دیا جاتا ہے تو دوسرا نقصِ امن کا خطرہ ہوتا ہے اور اگر یورپ اور مغرب کو ان قوانین سے اتنی ہی نفرت ہے تو پھر ان کے اپنے ریاستی قوانین میں ابھی تک وہ موجود کیوں ہیں؟ ابھی تک وہ ان کو ختم کیوں نہ کر پائے؟ ان قوانین کی موجودگی کے بارے میں پاکستان سے یہ مطالبہ کہ وہ ان قوانین کے خاتمے کی کوششیں کریں چہ معنی دارد؟ اور ویسے بھی ہمیں اپنے ملکی قوانین کے اجرا یا عمل درآمدگی کے لیے مغرب یا کسی اور سے احکامات لینے کی ضرورت نہیں۔

تضحیک آمیز خاکوں کی اشاعت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی اسلام کے خلاف پروپیگنڈا زوروں پر ہے۔ مسلمانوں کی عزتِ نفس پر حملے آج بھی ہو رہے ہیں، ہمارے جذبات کو مجروح آج بھی کیا جا رہا ہے، مگر آج ہمیں اس کی فکر نہیں رہی۔ گردشِ دوراں اور ضرورت فکرِ معاش نے ہمیں آج اتنا جکڑ لیا ہے کہ ہم ان کے اقدامات کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھا سکتے بلکہ ہمارے معاشرے میں "لبرل" اور پڑھے لکھے افراد کا ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو احساس کمتری میں مبتلا ہو کر خود کو ہی غلط سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ قوانین میں ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ اختراعِ دین سے بھی نہیں چوکتے۔ ضرورت امر یہ ہے کہ اپنے مقام کو پہچانیے اور خود کو بے دین دہریوں سے خلط ملط نہ کیجیے۔ ایسا کوئی قدم نہ اٹھایئے اور نہ کسی کو اٹھانے دیجیے جس سے آپ کے دین پر یا آپ کے مذہبی جذبات پر کوئی آنچ آئے۔

محمد اسماعیل قریشی سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

''آزادیٔ اظہار خیال'' اور ''آزادیٔ افکار'' کی فریب کارانہ اصطلاحات

بھارت کے ایک خودرو مولانا وحید الدین خان نے ''شتم رسولؐ کا مسئلہ'' کے عنوان سے مضامین لکھے جن کو سال 1996ء میں شائع کیا گیا جس میں ''رواداری''، ''آزادی''، ''آزادی اظہار خیال'' اور ''آزادی افکار'' کی فریب کارانہ اصطلاحات کا سہارا لے کر گستاخان رسولؐ اور شیطان رشدی کی بھرپور وکالت کی گئی ہے۔ کتاب کا مقصدِ وحید یہ بتلانا ہے کہ توہین رسالت ﷺ سرے سے کوئی جرم ہی نہیں اور اہانت رسول ﷺ پر احتجاج اور ایجی ٹیشن ان کے اپنے الفاظ میں ''احمقانہ مہم'' ہے۔ اپنی کتاب کے باب ''دور آزادی'' میں موصوف فرماتے ہیں: ''قدیم زمانہ میں ''اظہار خیال کی آزادی'' کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ جدید انقلاب تمام تر اسی تصور آزادی کی دین ہے جس کا ذکر ایڈورمیمر (ایک برطانوی صحافی) نے اپنے مضمون رشدی کے بارے میں کیا ہے۔'' رشدی کے خلاف احتجاج کی مذمت کرتے ہوئے صحافی مذکور لکھتا ہے:

''یہ احتجاج ہمارے مذہب پر حملہ ہے۔ مذہب سے مراد ایسا مذہب نہیں جو ایران کا ہے۔ برطانیہ اور آزاد دنیا کا مذہب اپنے وسیع تر معنی میں ''آزادی'' ہے جس کی بنیاد ''لوک''، ''والٹیر''، ''برک'' اور ''امریکن'' دستور کے مصنفین وغیرہ نے رکھی ہے۔''

اس مضمون جس کا اقتباس ہم نے قوسین میں دیا ہے، حوالہ دے کر خان مذکور لکھتے ہیں:

> ''اس آزادی نے تاریخ میں پہلی بار ہر ایک کے لیے اپنے فکر و خیال کے اظہار کے تمام دروازے کھول دیے ہیں۔ آزادی فکر آج ایسا مسلمہ حق بن چکا ہے جس سے انکار نہ کیا جا سکے۔''

فکر و خیال کی اسی آزادی کے حق کو رشدی نے اپنی کتاب ''شیطانی آیات'' میں استعمال کیا ہے۔ شیطان ہر دور میں ایسی نت نئی تراکیب اور اصطلاحات وضع کرتا رہتا ہے جو بظاہر نہایت پرکشش اور دلفریب نظر آتی ہیں لیکن یہ انسان کی ہلاکت اور تباہی کے لیے مہلک ترین حربے ثابت ہوئے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں شیطان نے ''آرٹ برائے آرٹ'' کے نام سے عریانی اور فحاشی کے لیے جواز فراہم کیا۔ جب یہ اصطلاح پرانی اور فرسودہ ہونے لگی تو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اسی کا نام ''آرٹ'' رکھ دیا اور اس کی سرپرستی میں ہر قسم کی بے راہ روی اور عریانی کی نمائش ہوتی رہی۔ اس سے بھی جب شیطان کے عزائم اور مقاصد پورے ہوتے نظر نہیں آئے تو اس نے ایک اور لفظ ''آزادی افکار'' ایجاد کیا جس نے انسان کے خیالات و افکار کو بے لگام کر کے اسے تمام اخلاقی شعور سے بیگانہ کر دیا۔ اقبال کی ایمانی بصیرت نے شروع ہی میں دیکھ لیا تھا کہ یہ فتنہ کہاں سے سر اٹھا رہا ہے۔ اس لیے اس نے ایشیا والوں کو خبردار کیا تھا ''آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد'' یہ آزادی افکار، دین و مذہب و اخلاق و شرافت کے خلاف شیطان کی کھلی جنگ ہے۔ اس کے لیے ابلیس اپنے سورماؤں کو تازہ دم کمک بھیجتا رہتا ہے۔ اس کے ہراول دستہ سے رشدی نے اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ مسلمانوں کے مرکز قلب و روح حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی جسارت کی ہے۔ اس کی حمایت صرف ایک خود ساختہ مولانا نے کی ہے جن کا پیدائشی نام وحید الدین خان ہے۔ مداہنت اور چاپلوسی کو انہوں نے ''رواداری'' اور ذہنی غلامی کو ''آزادی'' کا نام دے رکھا ہے۔ برطانوی صحافی کا ٹائمز آف انڈیا میں مذکور الصدر مضمون دیکھنے کے بعد ''لوک''، ''روسو'' اور دانشوران مغرب کو موصوف اپنا پیشوا سمجھنے لگے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں وہی آزادی کے اولیں علم بردار ہیں۔ مگر ان حضرات کے کرم خوردہ ذہن کی رسائی، حقیقت کبریٰ کی ان بلندیوں تک نہیں ہو سکی جہاں سے آزادی کے اولیں چارٹر کا اعلان حضور ختمی مرتبت ﷺ نے اپنے خطبہ حجتہ الوداع میں کرتے ہوئے رنگ و نسل، زبان اور ملک و نسبت کے سارے امتیازات مٹا دیے اور توحید کے کلمہ گیتی نورد سے عالم انسانی کی وحدت کو استوار کیا۔ اس طرح انسان کو ہمیشہ کے لیے ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا۔ سوئس نژاد فرانسیسی مفکر روسو جسے انقلاب فرانس کا بانی سمجھا جاتا ہے، اس کے بارے میں تاریخی شواہد موجود ہیں کہ اس نے اسلامی تعلیمات کے مطالعہ کے بعد عیسائی مذہب کے عقائد، رسوم اور توہمات جنہوں نے

انسان کو ناروا پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا، کے خلاف بغاوت کر دی تھی جس کی پاداش میں اسے مرتد قرار دے کر فرانس بدر کر دیا گیا تھا۔ اس کی کتاب معاہدہ عمرانی (Due Contract Social) کو انقلاب فرانس کی انجیل کہا جاتا ہے۔ اس میں اسلامی عقائد اور افکار کی گہری چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ خاص طور پر اس کا وہ مقبول عام جملہ "انسان تو آزاد پیدا ہوا تھا مگر ہر جگہ وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے" اسلام ہی سے مستعار لیا ہوا ہے۔

ژاں ژاک روسو اٹھارہویں صدی عیسوی میں بھی انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ رہا ہے لیکن اس سے بارہ سو سال قبل خدا کے پیغمبر اولیں اور آخریں ﷺ نے انسان کو غلامی کی ساری جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا تھا جس کی خود قرآن گواہی دے رہا ہے۔

"ویضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم" (الاعراف:157)

(ترجمہ) "اور وہ (پیغمبر ﷺ) ان سے (ناروا) بوجھ جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان زنجیروں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، آزاد کرتا ہے۔"

آزادی کے لیے یہ پیغمبرانہ طریق کار، کسی خاص گروہ، نسل یا قوم کے لیے نہیں بلکہ سارے انسانوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ یہ تھا آزادی کا وہ دریائے بے کراں جس کی تند و تیز لہریں صحرائے عرب سے اٹھ کر افریقہ اور یورپ تک پہنچیں۔ قرآن کے اسی اعلان کی روشنی میں خلیفہ وقت سیدنا عمر فاروقؓ نے گورنر مصر عمرو بن العاص کو سرزنش کرتے ہوئے کہا تھا:

"عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا ہے جب کہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔"

اسلامی ریاست میں یہی وہ آزادی تھی جس نے افریقہ کے ایک قبطی اور مصر کے عربی گورنر کے بیٹے میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ حضرت عمرؓ کا یہی وہ جملہ تھا جو یورپ نے روسو کی زبان سے اٹھارہویں صدی میں سنا۔ پھر بھی وہ اس معنویت کو ادا نہ کر سکا جو فرمانِ پیغمبر ﷺ اور قولِ عمرؓ کے اندر پائی جاتی ہے۔ کیونکہ روسو اور اس کے ہم عصر اس اخلاقی اور روحانی قدر کو نہ دیکھ سکے جو آزادی کے اندر اسلام کی بدولت کارفرما تھی جس کا مظاہرہ ایک بدوی سفیر عرب صحابیؓ نے ایران کے سپہ سالار اعظم رستم کے دربار میں اس کے استفسار پر کہ "تم کیا چاہتے ہو؟ کہا تھا: "انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں اور بس"۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی، کلیسا اور شہنشاہیت کی ظالمانہ جکڑ بندیوں کے خلاف بغاوت کی

آگ بھڑکانے کے لیے روسو اور اس کے ہم عصر سیاستدانوں نے مطلق اور بے قید آزادی کا نعرہ لگایا جو عوام تک پہنچ کر آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس وقت وہ اس کے خطرناک نتائج اور انجام سے بے خبر تھے جواب انسانیت کے لیے وبال جان بن گیا ہے۔ جب تک افکار و عمل کی آزادی پر اسلام کی اخلاقی پابندیاں عائد نہیں ہوتیں، اس وقت تک انسانیت بغیر کسی اخلاقی نصب العین کے ہلاکت اور تباہی کی مہیب وادیوں میں بھٹکتی پھرے گی اور انسانی ارتقا کا عمل نامکمل رہے گا۔ وحید الدین دو صدی قبل کے مغربی مفکرین کے رومانی تصور کو آزدی کی نیلم پری سمجھ بیٹھے ہیں جس کا حقیقت کی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ یورپ میں خونی انقلاب کی شورشیں ختم ہونے کے بعد وہاں بھی آزادی کے غیر منطقی اور منفی تصور میں کافی مثبت تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ کیونکہ دنیا کو بالآخر پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے اسی فرمان اور اسی قول سیدنا عمرؓ سے رجوع کرنا پڑا جس نے آزادی کی حدود کو متعین کر کے اس کو اخلاقی شعور سے سرفراز کیا تھا۔ جس کے بغیر انسان کی آزادی کی تکمیل ممکن نہ تھی اور نہ اسے ضمیر کی آزادی ہی نصیب ہوتی۔ اس مسلمہ حقیقت کو خان موصوف یکسر فراموش کر چکے ہیں کہ یہ اخلاق ہی کی قوت ہے جو انسان کو حیوانیت کی پست سطح سے اٹھا کر انسانیت کے بلند مقام تک پہنچا دیتی ہے۔

وحید الدین خان کی کتاب ''مسئلہ شتم رسولؐ'' کو پڑھنے کے بعد یہ تاثر یقین میں بدل جاتا ہے کہ موصوف پولیٹیکل سائنس و قانون اور اصول فقہ (Science of Jurisprudence) کی مبادیات سے بھی واقف نہیں۔ ورنہ وہ ایسی احمقانہ غلطی نہ کرتے۔ روسو کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ اس نے کن حالات میں آزادی مطلق کا نعرہ لگایا تھا لیکن اسی کے ہم عصر ''برک'' (Burke) نے دولت مشترکہ کے آئین کو اخلاقی قدر پر قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا اور آزادی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اس نے دارالعوام House of Commons میں کہا تھا کہ آزادی پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی حدود کو متعین کیا جائے۔ ان کا ماخذ بھی دراصل عین اسلامی اصول ہیں۔ ہم یہاں علیٰ وجہ البصیرت بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی آئین یا دستور خواہ وہ تحریری ہو یا غیر تحریری ایسا نہیں جس کی اساس انہی اسلامی اصولوں پر استوار نہ ہوئی ہو جو آزادی کے حدود اور قیود متعین کرتے ہیں اور جس میں اخلاقی پابندی کو شامل نہ کیا گیا ہو۔

ہم یہاں صرف چند معروف دستوروں کا حوالہ دیں گے جو سیکولرازم کے دعویٰ دار

ہیں لیکن ان میں بھی مطلق آزادی کا حق نہیں دیا گیا۔ سب سے پہلے فرانس کے آئین کو دیکھیے۔ اس کے آرٹیکل نمبر 1 میں کہا گیا ہے:

”انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزاد رہے گا اور سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے لیکن سماجی حیثیت کا تعلق مفاد عامہ کے پیش نظر کیا جائے گا۔“

اسی آئین کے آرٹیکل نمبر 4 میں کہا گیا ہے:

”آزادی کا حق اسی حد تک تسلیم کیا جائے گا جب تک کہ اس سے کسی دوسرے شخص کا حق متاثر یا مجروح نہ ہو اور ان حقوق کا تعین بھی قانون کے ذریعہ کیا جائے گا۔“

اسی طرح جمہوریہ جرمنی کے آئین کے آرٹیکل نمبر 1 کی رو سے تکریم انسانی (Dignity of Man) ولقد کرمنا بنی آدم (بنی اسرائیل:70) کو ناقابل تنسیخ حق قرار دیا گیا ہے۔ اسی آئین کے آرٹیکل نمبر 5 میں کہا گیا ہے: ہر شخص کو تحریر، تقریر اور اظہار خیال کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آرٹیکل نمبر 5 کے ذیلی آرٹیکل نمبر 2 میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ حقوق، قانون عام، قواعد وضوابط اور شخصی عزت وتکریم کے دائروں میں رہتے ہوئے استعمال کیے جاسکیں گے۔

امریکہ میں آزادی تحریر وتقریر وہاں کے دستور میں پہلی ترمیم کے بعد حاصل ہوئے لیکن اس میں بھی مطلق آزادی کا کوئی تصور نہیں۔ امریکن سپریم کورٹ کے فیصلوں کے مطابق دستور بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص بھی ایسی غیر ذمہ دارانہ تحریر یا تقریر کرے جو عوام میں اشتعال انگیزی کا باعث ہو۔ اس لیے ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی قاہرانہ طاقت استعمال کر کے ایسی آزادی کو سلب کر لے جو امن عامہ میں خلل انداز ہو یا اس کی وجہ سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہو۔ ملاحظہ ہو (286 US 652) امریکہ کی سپریم کورٹ نے آزادی مذہب کے بارے میں اپنے ایک معرکہ آرا فیصلہ میں لکھا ہے کہ آزادی مذہب کے نام پر توہین مسیح کے ارتکاب کی اجازت نہیں دی جاسکتی کیونکہ اس سے پیروان مسیح کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

برطانیہ میں اگرچہ تحریری دستور موجود نہیں لیکن وہاں کے غیر تحریری آئین میں بھی کسی کو آزادی تحریر وتقریر اور آزادی اظہار خیال کے حق کی بنا پر ایسا کوئی استحقاق حاصل نہیں ہے کہ وہ برٹش لاء کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی زبان یا قلم کو استعمال کرے۔ اس بارے

میں یورپ کے مسلمہ مفکر آئین وقانون ڈائیسی نے لکھا ہے:

''ایسا بیان جو شخصی توہین یا توہین مسیح کی زد میں آئے۔اس کا اظہار خواہ کسی خط یا کارڈ ہی کے ذریعہ کیوں نہ کیا جائے، اس کی حیثیت کسی کتاب یا اخبار میں شائع شدہ بیان ہی کی طرح متصور ہوگی۔ اسی لیے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ برطانیہ میں پریس مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔'' (آئینی قانون۔اے۔وی۔ڈائیسی ص 247)

البتہ برطانیہ میں آزادی تقریر کے لیے کچھ اہتمام کیا گیا ہے وہاں ہائیڈ پارک میں ایک چھوٹا سا گوشہ مختص ہے جو اسپیکر کارنر کے نام سے مشہور ہے۔اس مختصر سی جگہ میں مختص اوقات کے اندر ہر شخص کو جو جی میں آئے کہنے یا بکنے کی چھوٹ دی گئی ہے لیکن یہاں بھی کسی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ یا برطانیہ کی ملکہ معظمہ کی شان میں کسی قسم کی کوئی گستاخی کرے۔

خود انڈیا جہاں کے وحید الدین باشندے ہیں، اپنے آئین کی متعلقہ دفعات (Articles) کو پڑھ لیتے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے تو آزادی اظہار خیال کے بارے اسی طرح کی نامعقول باتیں شاید نہ کرتے۔ انڈین کانسٹی ٹیوشن کا آرٹیکل نمبر 19 آزادی اظہار خیال اور آزادی تحریر وتقریر اور دیگر حقوق سے متعلق ہے۔ آرٹیکل نمبر 19 کی ذیلی دفعہ (2) میں کہا گیا ہے کہ آزادی تحریر وتقریر اور اظہار خیال کے حق سے موجود قوانین متاثر نہیں ہوں گے۔ بالفاظ دیگر یہ آزاد حقوق ان قوانین کے حدود سے تجاوز نہیں کرسکیں گے جو انڈیا میں نافذ العمل ہیں یا ہوں گے۔ ریاست کو ان آزادانہ حقوق پر معقول پابندیاں عائد کرنے کی قانون سازی کا حق حاصل ہوگا جو انڈیا کی بالادستی اور اس کے تحفظ سے متعلق ہوں اور جن کا تعلق ملک کے نظم وضبط، شخصی عزت، تہذیب وشائستگی اور اخلاقی اقدار سے وابستہ ہو۔ شائستگی (Decency) کا لفظ دوسری دستاویز میں واضح طور پر موجود نہیں جس طرح کہ انڈیا کے دستور میں اسے بطور خاص استعمال کیا گیا ہے۔

ہم نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کا ذکر اس لیے مناسب خیال نہیں کیا کہ کہیں موصوف اس کے نام سے ہی بدک نہ جائیں کیونکہ یہ لادینی (Seculer) آئین نہیں ہے۔ آزادی تحریر وتقریر اور آزادی اظہار خیال پر آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آرٹیکل نمبر 19 ہی کے تحت وہی پابندیاں عائد کی گئی ہیں جن کا ذکر انڈیا کے دستور کے متعلقہ آرٹیکل کے تحت آچکا ہے۔ اس میں بھی تہذیب وشائستگی، نظم وضبط اور اخلاق کی پابندی کا بطور خاص

ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سے پہلے کہا گیا ہے کہ عظمت اسلام (Glory of Islam) کے منافی ان آزادانہ حقوق کے استعمال کی کسی صورت اجازت نہیں دی جائے گی۔

چونکہ وحید الدین خان کی ذہنی ساخت سیکولر ہے، اس لیے گمان غالب ہے کہ گلوری آف اسلام کے الفاظ ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکیں گے۔ اس لیے ہم ان کی وضاحت نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ یہ بات ان حضرت کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آزادی تحریر وتقریر اور اظہار خیال کی آزادی دنیا کو سب سے پہلے اسلام نے دی تھی مگر اس کو اخلاقی اقدار، شرافت، شائستگی اور معقول پابندیوں کے ساتھ مشروط بھی اسلام ہی نے کیا تھا جس کو ساری دنیا نے بعد میں تسلیم کر لیا اور اس کو اپنے آئین اور قانون کا جزو لانیفک بنا لیا۔ وگرنہ ان پابندیوں کے بغیر معاشرے میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جاتا اور ان کے بغیر کوئی ریاست، کوئی حکومت اپنا وجود ہی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اس کم علمی کی وجہ سے جو جہالت سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے، وحید الدین خان آزادی کے مکمل مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی قانون، کوئی آئین کسی کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اخلاقی حدود کو پھلانگتے ہوئے اور شرافت اور شائستگی کی اونچی سطح سے اتر کر آزادی کے نام پر دشنام طرازی اور دل آزادی کرے اور اسے آزادی تقریر کا حق سمجھ لے۔ خان صاحب موصوف سے بجا طور پر کہا گیا ہے کہ وہ لال قلعہ کی چھت پر کھڑے ہو کر گاندھی جی، اندرا گاندھی، جواہر لال نہرو یا اپنے راشٹر پتی کو مغلظات سنائیں۔ پھر انہیں پولیس اظہار خیال کی آزادی اور آزادی تقریر کا مفہوم اچھی طرح سمجھا دے گی اور انہیں اس مقام پر پہنچا دے گی جہاں مرفوع القلم (Lunatic) حضرات کو بحفاظت رکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو رواداری کا سبق دینے والے اور انہیں رشدی جیسے دریدہ دہن شخص کی نہایت گندی گالیوں پر صبر کی تلقین کرنے والے ان حضرت میں کیا یہ حوصلہ ہے کہ وہ اس شخص کو برداشت کر لیں گے جو ان کی ماں، بہن، بیٹی، بہو اور بزرگوں کو وہی ننگی گالیاں دیتا پھرے جو شیطان رشدی نے اپنی کتاب ابلیسی خرافات میں جا بجا دی ہوئی ہیں۔

مولانا نے رشدی کے جوش حمایت میں قلابازیوں کے ایسے ایسے کرتب دکھائے ہیں کہ ۔ ناطقہ سر بگریبان ہے اسے کیا کہیے۔ مولانا کا ہدف بیچارہ ''اُردو خوان'' طبقہ ہے خواہ وہ یورپ میں ہو یا امریکہ میں، ہندوستان، پاکستان میں ہو، بنگلہ دیش یا دنیا کے کسی حصہ

میں، ساری شرارت اور کارستانی اسی طبقہ کی ہے جس کی وجہ سے بقول مولانا یہ ''لغو ایجی ٹیشن اور ہنگامہ دار و گیر رشدی کے خلاف دنیا میں جگہ جگہ برپا ہوا۔ اسی لیے مغربی دنیا سلمان رشدی کو اپنا معاملہ بنا کر مسلم دنیا کے خلاف کمربستہ ہے۔ مغربی دنیا کی طرف سے سلمان رشدی کی حمایت کا سبب اسلام دشمنی نہیں ہے۔ جیسا کہ مسلم رہنما سطحی طور پر اس کے بارے میں کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ان کے اپنے مذہب کا دفاع ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح مسلمان اپنے مذہب کے دفاع میں متحرک ہیں۔ اس طرح یہ لڑائی مسلمان بمقابلہ رشدی نہیں رہی بلکہ مسلمان بمقابلہ مغرب بن گئی ہے۔''

مولانا چالیس سال سے پوری قوت اور طاقت کے ساتھ سرگرم عمل ہیں اور یہ مہم چلا رہے ہیں کہ یہ کم نصیب ''اُردو خواں'' طبقہ راہ راست پر آ جائے۔ بھاری بھرکم کتابوں سے اپنی تحریروں، تقریروں اور لٹریچر کے انبار سے اس ''طبقہ'' کو سمجھا رہے ہیں کہ وہ اپنے دین و مذہب پر اس طرح حملہ سے مشتعل نہ ہوں۔ اسلام اور مرکز اسلام کی اہانت، توہین اور دشنام طرازیوں پر غم و غصہ کا اظہار اور ایجی ٹیشن لغو اور بہت بری بات ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ حضور ﷺ رسول رحمت ہیں۔ بلاشبہ آپ ﷺ رحمۃ اللعالمین ہیں مگر مولانا سے کوئی یہ پوچھے کہ حضرت! اللہ میاں بھی تو ارحم الراحمین ہیں لیکن وہ بھی اپنے منکرین اور نافرمان بندوں کو، اپنے رسولوں کے منکرین اور ان کی اطاعت سے انکار کرنے والوں اور ان کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو سخت سزا اور عذاب شدید کی وعید سنا رہے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کا اپنے بندوں کے ساتھ اس طرح سلوک کے بارے میں مولانا کا کیا خیال ہے؟

مولانا جن کا شمار بھارت کا دین و مذہب سے ناآشنا طبقہ چوٹی کے فضلا میں کرتا ہے۔ ملت کے لیے اتنے پاپڑ بیلے ہیں، اس کے باوجود اس ناسمجھ ''اردو خواں طبقہ'' پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ ''سوچنے کی بات'' کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں ''اس کام میں اگرچہ مجھے ''ملت'' کا مطلوبہ تعاون حاصل نہ ہو سکا۔'' جس کی وہ اتنے عرصہ دراز سے آس لگائے بیٹھے تھے اور اسی سوچ اور فکر میں غلطاں اور پیچاں رہے مگر داد دیجیے ان کی ہمت پر کہ اس نامرادی کے باوجود وہ اس شوق فضول سے باز نہیں آئے۔ فرماتے ہیں'' تاہم میں نے اپنی پوری طاقت اس کام میں لگا رکھی ہے۔''

سوچنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ رشدی نے اپنی ابلیسی کتاب انگریزی زبان میں

لکھی ہے۔ ''اردو خواں'' طبقہ نے اس کو کیسے پڑھ لیا۔ اگر پڑھ بھی لیا تو اسے کیسے سمجھ لیا؟ جب کہ وہ مولانا کی اردو میں لکھی ہوئی چالیس سالہ تحریروں کو بھی نہیں سمجھ پائے! ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا کی ''مادری زبان'' کیا ہے؟ مولانا اردو جیسی کم مایہ زبان کی بجائے رشدی کی طرح انگریزی کو آزادی اظہار کا ذریعہ بناتے تو شاید انگریزی داں طبقہ پر رشدی کی کتاب اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوتا۔ ہم نے لفظ شاید اس لیے لکھا ہے کہ انگریزی داں طبقہ نے رشدی کی کتاب اور اس کے اظہار خیال پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ برطانیہ کے انگریزی زبان کے معروف نقاد ابروں واف (Auberon Waugh) نے تو یہ مطالبہ کیا ہے کہ رشدی کو خراب انگلش لکھنے پر سزا دینا چاہیے۔ خود بھارت کے دانشور خشونت سنگھ نے رشدی کی اس کتاب کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ بطور ناول بھی یہ کتاب پڑھنے کے لائق نہیں۔ یہ باتیں مولانا کے علم میں ہیں۔ فیض احمد فیض کا جو انگریزی کے بہت بڑے رائٹر تھے، رشدی کی انگریزی کے بارے میں یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ مغرب کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے کہ رشدی جیسے شخص کو برطانیہ کے ناول نگاروں میں شامل کیا گیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وہ ''اردو داں'' تھے۔ مولانا کے ترکش کا کوئی تیر ایسا نہیں جس کی زد میں آ کر کوئی بچ سکا ہو۔

''ملت'' تو خیر شروع ہی سے ان کے زیر عتاب رہی ہے۔ شاتم رسولؐ رشدی کے خلاف مسلمانوں کے ''شور وغل'' پر مولانا خوب گرجے برسے ہیں مگر اس کو انہوں نے کافی نہیں سمجھا اور ملت کو معاف نہیں کیا بلکہ وہ اس کو سخت سزا دینے کے لیے پوری قوت مجتمع کرتے رہے۔ فرماتے ہیں ''ایجی ٹیشن'' ناجائز ہے، اس لیے انہوں نے ملت اور ملت کے رہنماؤں پر فرد جرم عائد کر دی ہے۔ ''مسلم رہنماؤں کی یہ غلطی صحیح لفظ سرکشی ہے، بلاشبہ آخری حد تک ناقابل معافی جرم ہے۔ یہ جرم (ایجی ٹیشن شور وغل) یقیناً سلمان رشدی کے جرم سے بھی زیادہ سنگین تر ہے۔ سلمان رشدی کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش میں مسلمان رہنماؤں نے خود اپنے آپ کو شدید تر قسم کے مجرمانہ کٹہرے میں کھڑا کیا ہے۔'' اس طرح جرم کو ناقابل معافی قرار دے کر سنگین ترین سزا یعنی اجتماعی سزائے موت کا فیصلہ مولانا نے سنا دیا اور دوسری طرف رشدی کو تمام جرائم سے نہ صرف بری کر دیا بلکہ اسے ادبی ہیرو بنا دیا۔ ''مسلمانوں کے اس احمقانہ اقدام کے آخری نتیجہ میں سلمان رشدی ہیرو بن کر برطانیہ کی شاہی حفاظت میں بیٹھا ہوا ہے۔''

''توہینِ رسالت'' اور ''توہین ریاست'' مولانا کو چونکہ ہمہ دانی کا دعویٰ ہے اس

لیے برطانیہ کے قوانین توہین رسالت (Blasphemy) اور توہین ریاست (Contempt of State) کے فرق کی وضاحت بھی ناگریز مجبوری تھی۔ اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

''برطانیہ میں سترھویں صدی سے ایک قانون موجود ہے جو مسیحیت کے خلاف کفریہ کلمات (Blasphemy) کو قابل سزا جرم قرار دیتا ہے مگر اس تعزیری قانون کے ہوتے ہوئے برطانیہ میں ایک فلم بنائی گئی جو سراسر قانون کے منشا کے خلاف ہے۔ اس فلم کا نام ہے: The Last Temptation of Christ اس فلم میں نعوذ باللہ مسیحؑ کی جنسی زندگی کے مناظر دکھلائے گئے ہیں۔ یہ فلم برطانیہ میں کھلے طور پر دکھائی جا رہی تھی مگر مذکورہ قانون ہونے کے باوجود اس فلم پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی نہ اس کے بنانے والوں کو کوئی سزا دی گئی۔ اسی طرح برطانیہ کی ایک برعکس مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں ''پیٹر رائٹ'' (Peter Wright) ایک انگریز ہے جو ریٹائرڈ ہونے کے بعد آسٹریلیا میں رہتا ہے، وہ برطانیہ کے محکمہ انٹیلی جنس میں اعلیٰ آفیسر تھا۔ اس نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا نام ''اسپائی کیچر'' (Spy Catcher) ہے۔ اس کتاب میں برطانیہ کے محکمہ جاسوسی کے راز بتائے گئے ہیں۔ پیٹر رائٹ نے اپنی یہ کتاب لندن کے ایک پبلشر کے ہاتھ فروخت کی مگر اس کی اشاعت سے پہلے ہی حکومت برطانیہ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے فوراً یہ کہہ کر پابندی لگا دی کہ یہ کتاب سرکاری رازوں کی پردہ داری کے خلاف ہے۔ مصنف اور پبلشر کی تمام کوششوں کے باوجود یہ کتاب چھپ نہ سکی۔ 1988ء میں یہ کتاب ایک بیرونی ملک میں چھاپی گئی تاہم برطانوی حدود میں اس کتاب کا داخلہ ممنوع ہے۔ تقابلی مثال پر غور کیجیے ایک ہی ملک ہے۔ وہاں ''توہین مسیحؑ'' کا واقعہ ہوتا ہے مگر قاعدہ قانون کے ہوتے ہوئے بھی اس پر پابندی نہیں لگائی جاتی دوسری طرف اسی ملک میں توہین ریاست کا واقعہ ہوتا ہے تو حکومت اس کے خلاف فوراً سرگرم ہو جاتی ہے اور پورا ملک اس کو اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کر دیتا ہے''۔ اس فرق کی مولانا توجیہہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ برطانیہ ''توہین ریاست'' کی اہمیت سے واقف ہے مگر ''توہین مسیحؑ'' کی اہمیت کا اسے احساس نہیں۔''

توہین نبوت کے بارے میں وہ یہی ''بے حسی'' مسلمانوں، مسلمان رہنماؤں اور مسلمان ریاستوں کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ توہین نبوت جس پر ان کے ایمان اور

اعتقاد کا دارومدار ہے، اسے قطعی کوئی اہمیت نہ دیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی جس "ریاست" میں ہوں، انہیں صرف اسی ریاست کی اہمیت کا احساس ہونا چاہیے اور وہ ریاست کو پوجمان شے (Fetish) تسلیم کر لیں۔ لیکن مولانا کو غالباً معلوم نہیں کہ مسلمان امن پسند شہری ہیں، وہ جہاں بھی ہوں قانون کے ذریعہ اپنا حق منوانا چاہتے ہیں۔

ایسی لغویات قرآن اور حدیث کی تعلیمات سے صریح انکار ہے۔ جہاں تک قرآن اور حدیث کی تفسیر اور تعبیر کا تعلق ہے، اس بارے میں مسلمہ علمائے دین کے مقابلہ میں ایک خود ساختہ مولوی وحید الدین کے پراگندہ خیالات کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے ہم اس پر مزید کوئی تبصرہ کر کے اپنا اور قارئین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔

جہاں تک ان کی قانونی معلومات کا تعلق ہے اس بارے میں عرض کر چکے ہیں کہ وہ آئین اور قانون کی ابجد سے بھی واقف نہیں جس کا ثبوت خود آئین اور قانون کی زبان میں پہلے بھی کر دیا گیا ہے اور آئندہ بھی جہاں ضرورت ہو پیش کر دیا جائے گا۔

تاریخی استقرا اور فلسفہ تاریخ تو بہت اونچی چیز ہے جو موصوف کے نابالغ ذہن کی دسترس سے باہر ہے۔ لیکن انہوں نے تاریخ اور واقعات کو مسخ کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔

حضرت مسیح کی پاکیزہ زندگی پر ایک سیکسی فلم (The Last Temptation of Christ) کو اسلامی نظریہ حاکمیت الٰہی (Sovereignty of Allah) کے برخلاف اپنے سیکولر نظریہ اقتدار ریاست (Sovereignty of State) کی تائید میں پیش کیا ہے، اس بارے میں ان حقائق کو جان بوجھ کر چھپایا گیا ہے۔ جس سے ان کے سیکولر نظریہ ریاست اور اس الزام کی تردید ہوتی ہے جو انہوں نے مسلمانوں پر لگایا ہے۔ وہ مبینہ الزام ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں:

"شتم (توہین پیغمبر) کے معاملہ میں موجودہ زمانہ کا مسلمان ایک عجیب تضاد میں مبتلا ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ جب مسئلہ بیان کرنا ہو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر پر سب و شتم کرنا یکساں طور پر جرم ہے۔ وہ ہر طرح ایسے شاتم کو واجب القتل قرار دے دیتے ہیں۔ مگر عملی اعتبار سے ان کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اپنے پیغمبر کے سب و شتم پر بھڑ کتے ہیں جہاں تک دوسرے پیغمبروں کا تعلق ہے، ان کے خلاف خواہ کسی قسم کی

بھی گستاخی کی جائے، ان کے اندر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔"

یہ بات سراسر خلاف واقعہ ہے۔ جن دنوں، متذکرہ بالا فلم مسیح کی آخری جنسی ترغیب لندن کے سینما ہال میں دکھلائی جانے والی تھی تو یہ خاکسار لندن میں موجود تھا۔ ہم نے اس فلم کی نمائش کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی۔ 22 ستمبر 1988ء کو سینما ہال کے سامنے احتجاج شروع ہوا جس میں عیسائیوں کا ایک گروہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ ہماری ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس نے برٹش فلمز انسٹیٹیوٹ کو باقاعدہ نوٹس دیا کہ اس فلم کی نمائش روک دی جائے ورنہ فلمساز، سینما کے مالکان اور برٹش فلمز انسٹیٹیوٹ کے خلاف بلاس فیمی (Blasphemy) قانون کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں اس فلم کے خلاف ہمارے انٹرویو کے علاوہ مضامین بھی لندن کے اخبارات میں شائع ہوئے جس کے نتیجہ میں لندن کے زیر زمین اسٹیشنوں سے حضرت مسیحؑ کے ساتھ بازار حسن کی طوائف کے قد آدم پوسٹر ہٹائے گئے اور فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔ اس لیے معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ فلم کا پروڈیوسر برطانوی باشندہ نہ تھا بلکہ ایک امریکن یہودی تھا۔

مسلمان خود کو حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ و ہارونؑ اور عیسیٰؑ اور تمام انبیائے کرام کا وارث سمجھتے ہیں۔ قرآن کے فرمان کے مطابق ان میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے البتہ فضیلت کا معاملہ اور ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی پیغمبر کی توہین برداشت نہیں کر سکتے اور جو کچھ بھی ان کے بس میں ہو، وہ کر گزرتے ہیں۔ برطانیہ کے مسیحی شہریوں کے نوٹس کے بعد فلم کی نمائش ختم ہو گئی۔

مولانا کو غالباً یہ علم نہیں کہ لندن کے ایک رسالہ گے نیوز (Gay News) کے ایڈیٹر لے مون کے خلاف توہین مسیحؑ کے جرم میں 1977ء میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں اس ایڈیٹر کو 1979ء میں سزا دی گئی۔ اس کے خلاف لے مون نے اپیل کی جو خارج ہوئی۔ بالآخر برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت ہاؤس آف لارڈز نے بھی اس کی سزا کو بحال رکھا اور اپیل مسترد کر دی گئی۔ اس کے ایک جج لارڈ ڈپلوک تھے جو مولوی تمیز الدین خاں کیس میں گورنر جنرل غلام محمد کی طرف سے بطور کونسل پیش ہوئے تھے۔

برطانیہ میں کسی ایسی فلم کی نمائش کی بھی اجازت نہیں جس میں حضرت مسیحؑ کی عقیدت مند راہبہ سینٹ ٹریسی کے خلاف بھی جنسی مناظر دکھلائے گئے ہوں۔ برطانیہ کے اس فیصلہ کو سال 1996ء میں یورپی یونین کی سب سے بڑی ہیومن رائٹس کی عدالت نے برقرار

رکھا ہے اور بلاس فیمی لاء کو جائز قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا الزام کی بنیاد وہ عجیب وغریب تضاد بتلاتے ہیں جس میں یہ مسلمان قوم مبتلا ہے۔ حالانکہ خود حضرت کی ذات اوران کی کتاب میں تضاد کے ایسے ایسے نوادرات ملتے ہیں جو اور کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتے۔ ایک طرف تو وہ مسلمانوں پر الزام عائد کر رہے ہیں کہ وہ پیغمبر علیہ السلام کے سوا کسی اور پیغمبر کی اہانت پر خاموش تماشائی بن جاتے ہیں لیکن اگر مسلمانوں نے ایسی کوئی حرکت کی تو اس پر بھی سخت ناراض ہو جاتے ہیں اور اس واقعہ کو ''تخریب کاری'' کے الزام کے تحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''پاکستان کے انگریزی اخبار ''فرنٹیئر پوسٹ'' میں کسی مغربی پرچہ سے ایک مضمون نقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ آدم اور حوا کی ایک تصویر بھی تھی، وہ بھی فرنٹیئر پوسٹ میں چھپ گئی۔ اس کے بعد ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں بپھرے ہوئے مسلمانوں نے اخبار کی وسیع عمارت کو گھیر لیا اور اس کو ساز وسامان سمیت جلا کر خاکستر کر دیا۔ اس قسم کے واقعات ایک یا دوسری شکل میں ہو رہے ہیں جہاں مسلمانوں کو عملی آزادی حاصل ہے۔ مسلمان اپنی اس ملی ہوئی آزادی کو ''تخریب کاری'' میں استعمال کر رہے ہیں یہ سرکشی اللہ تعالیٰ کے یہاں بدترین جرم کی حیثیت رکھتی ہے''۔ پھر خود ہی مصنف بن کر اس جرم کی سزا میں مسلمانوں کے خلاف اجتماعی سزائے موت کا فیصلہ بھی صادر کر دیا جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ مگر اس فیصلہ پر عملدرآمد ان کے یا ان کی سرپرست طاقتوں کے بس کی بات نہیں، اس لیے وہ حضرت ناصح کے بہروپ میں ناسمجھ مسلمان قوم کو سمجھا رہے ہیں کہ وہ رشدی کی گالیوں کا، اس کی خرافات کا کوئی جواب نہ دیں اور اسے کھل کھیلنے کا موقع دیں۔ مگر ناصح مشفق خود ''اردوداں'' طبقہ یعنی مسلمان قوم، مسلمان رہنماؤں، اس کے شہیدوں اور ملت کی برگزیدہ شخصیتوں کے خلاف نہ صرف تہذیب اور شائستگی سے گری ہوئی زبان استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کے خلاف گالیوں کا آزادانہ استعمال جائز بلکہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی طرف تو بے محابا ''احمق، نالائق، نادان، بے عقل'' کے سنگ دشنام پھینکتے ہیں اور ان کے قانونی احتجاج کو ''لغو، فضول، شوروغل، چیخ و پکار'' کہتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اس احتجاج کی وجہ سے اسلام بھی ان کی نظر میں ''وحشت اور بربریت کا مذہب بن چکا ہے''۔ اس لیے انہیں یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ اس کی وجہ سے روئے زمین پر

شاتمین کی قبروں کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دے گا۔ اسلام کی برگزیدہ ہستیوں، مسلمانوں کی محبوب شخصیتوں اور ان کے قائدین کے بارے میں انہوں نے جس طرح اظہار خیال کیا ہے، وہ نہایت قابل مذمت ہے۔

وحید الدین خاں اس دوہرے معیار کے بارے میں کیا ارشاد فرمائیں گے جو برطانیہ اور وہاں کے آزاد پریس کے رویہ سے شہزادی ڈیانا کی حادثاتی موت پر رشدی کے ریمارکس کی وجہ سے دنیا کے سامنے آیا ہے۔ سارا برطانوی پریس رشدی کی اس بات پر کہ "بے قابو جنسی خواہشات نے لیڈی ڈیانا کو مار ڈالا۔" سخت غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ برطانیہ کے کثیر الاشاعت روزنامہ "ٹائمز" نے رشدی کے آرٹیکل کو "شیطانی خیالات" قرار دیا ہے۔ اس پر و ہیں کے ایک ہفت روزہ رسالہ آؤٹ لک (Outlook) نے بڑا صحیح تبصرہ کیا ہے: "رشدی نے جب برطانوی عوام کی محبوب شہزادی کے خلاف کوئی بات لکھی تو اس کے خلاف سخت غم وغصہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ حالانکہ جب اس کی تحریر کردہ کتاب میں نبی رحمت حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے تھے، اس وقت یہی برطانوی عوام (اور ان کے ایک ذہنی غلام وحید الدین خاں) اور پریس آزادی تحریر اور آزادی اظہار خیال کے چیمپین بنے بیٹھے تھے۔ مگر اب برطانوی عوام اور پریس کو معلوم ہوا ہے کہ رشدی واقعی شیطان ہے۔"

مولانا کو خبر نہ تھی کہ برطانوی عوام اور برطانیہ کا آزاد پریس اتنی جلد رشدی کے بارے میں پینترا بدلے گا جب کوئی ان کی پسندیدہ شخصیت پرنس ڈیانا کے متعلق سیکس (Sex) کے حوالہ سے کوئی ایسی بات کرے جو انہیں ناپسند ہو تو وہ اسے ہیرو سے شیطان بنا دیں گے۔ حالانکہ مولانا نے رشدی کے لیے برٹش لاء اور بین الاقوامی قوانین کا تحفظ فراہم کرنے اور اسے دنیائے ادب کا ہیرو بنانے کے بعد اس کو تاریخ کی بڑی "نامور شخصیتوں" اور "شہیدان حق" کی فہرست میں شامل کرتے ہوئے لکھا ہے: "تاریخ میں بہت سے سچے اور بڑے لوگ گزرے ہیں جن کو وقت کے ظالموں نے قتل کیا ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مقتول کا رشتہ ان گزرے ہوئے لوگوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں، اس کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔ اس طرح مخالفین کے ہاتھوں سے قتل ہونا اس کو "شہیدان حق" کی فہرست میں شامل کر

دیتا ہے۔" آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں:

"یہ کوئی فرضی بات نہیں، سلمان رشدی کے اعلان قتل کے بعد عملاً یہی بات پیش آئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی تائید میں ٹائمز آف انڈیا کا ایک مضمون ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس مضمون میں رشدی کو تاریخ کی ان ہستیوں اور شخصیتوں کے ہم پایہ قرار دیا ہے جن کو ان کے مخالفوں نے قتل کر دیا تھا یا قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً سقراط، مسیح، گلیلیو، مارٹن لوتھر وغیرہ۔ حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ (نعوذ باللہ) جن کو مکہ کے لوگوں نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ گلیلیو کو اپنی آخر عمر تک اپنے گھر کے اندر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی مقدر رشدی کا آج ایک نئی صورت میں ہو سکتا ہے۔"

ایسی بے ہودہ، احمقانہ اور شر انگیز باتیں وہی شخص کہہ سکتا اور لکھ سکتا اور اس کی تائید کر سکتا ہے جس میں خیر اور شر کی تمیز باقی نہ رہی ہو۔

"آزادی فکر" اور "اظہار رائے کی آزادی" کو اس زمانہ کی سب سے بڑی قدر اور خیر اعلیٰ کا درجہ دے کر رشدی اور تمام گستاخان نبوت کے لیے ایسی کمین گاہیں تیار کی جا رہی ہیں جہاں سے وہ آزادی کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ اور انبیائے کرام علیہم السلام کی شان میں بے محابا دشنام طرازی کریں تاکہ دین و ایمان کی بنیادیں منہدم اور مسمار ہو کر رہ جائیں۔

"آزادی فکر" اور "آزادی اظہار رائے" کے بارے میں ہم وحید الدین ہی کے مغربی پیشوا اور رہنماؤں کے حوالہ سے تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں اور واضح کیا ہے کہ جس چیز کو وہ "آزادی فکر" اور "آزادی اظہار رائے" سمجھ رہے ہیں، وہ اصل میں ذہنی انتشار اور نظم و ضبط سے عاری افکار ہیں جنہیں کوئی جماعت اور کوئی ریاست اپنے آئین اور قانون میں جگہ دینے اور انہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ "آزادی افکار" اور "آزادی اظہار رائے" کی طرح انہوں نے "خیر اعلیٰ" کو بھی غلط معنی پہنائے ہیں۔ اسلام میں انسان کو اپنی جبلت کے رجحانوں اور اپنے فکر و عمل پر قابو پانے اور ان کو احکام الٰہی کے تابع نظم و ضبط کا پابند کرنے کا نام "خیر اعلیٰ" ہے۔ یہی زمانہ کی ہی نہیں بلکہ زندگی کی وہ سب سے بڑی قدر جو اللہ کے رسول ﷺ کی بدولت انسانیت کو نصیب ہوئی۔ اس لیے وہ کائنات کی ایسی محبوب ترین ہستی ہیں جن کے نام و ناموس پر مسلمان

اپنی ہر عزیز اور محبوب ترین چیز کو قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اس کے نزدیک ان کی ذات گرامی ہی اصل دین اور عین ایمان ہے۔ کفر و دین کی اس حقیقت کو اقبال نے بڑے ہی بلیغ پیرایہ اظہار کے ذریعہ اپنے اس شعر میں نمایاں کیا ہے:

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است
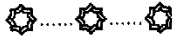
چوہدری غلام جیلانی

آزادی اظہار کا بین الاقوامی رویہ

یورپ کی ظاہری آزاد خیالی کے باطن میں ذرا جھانک کر دیکھیے، سو آپ کو سوائے تنگ نظری، تاریک خیالی اور اندھے تعصب کے اور کچھ دکھائی نہ دے گا۔ اہل مغرب کے نزدیک مہذب معاشرے کی بنیادی صفت آزادی اظہار ہے جس سے پسماندہ مشرق ابھی تک محروم ہے۔ لیکن اگر وہ آزادی اظہار کو بین الاقوامی رویہ تسلیم نہیں کرے گا تو اس معاملے میں اس سے کوئی مصالحت نہیں کی جائے گی۔

یہاں ہم ان سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ براہ کرم واضح کریں کہ آزادی اظہار سے ان کا کیا مفہوم ہے اور بین الاقوامی رویہ کیا ہے؟ آزادی اظہار کا اگر مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کو اظہار کی آزادی ہے تو کیا اس میں کسی کو گالی دینے اور توہین کرنے کی آزادی بھی شامل ہے؟ بلاشبہ اظہار کی آزادی زندگی کی نشوونما کے لیے ضروری ہے لیکن ہر آزادی کی طرح اس کی بھی کچھ حدود ہیں۔ مثلاً آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ زور زور سے بولیں تو آپ کی آزادی میں یہ اجازت تو شامل نہیں کہ آپ مجھے سونے نہ دیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق آپ کے ہاتھ کی حرکت میری ناک کی پھننگ تک ہے، آپ کا ہاتھ اس سے پرے جائے گا تو مداخلت ہوگی جس کا نتیجہ تصادم ہوگا اور یہی بین الاقوامی رویے کی روح ہے۔ جسے اقوام متحدہ کے منشور میں عدم مداخلت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم دانشوران مغرب سے سوال کرتے ہیں کہ سلمان رشدی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ آزادی اظہار کی حدود میں آتا ہے؟ اس ناول کی گندگی کی جانب اشارہ کرنا بھی ہمارے لیے تکلیف دہ ہے، تاہم برطانیہ کے ذمہ داروں سے دریافت کرتے ہیں:

1- ناول میں دنیا کے تین مذہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے جد امجد سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، کیا وہ

آزادی اظہار ہے؟

-2 پیغمبر اسلام ﷺ، وحی، امہات المومنینؓ اور اصحابؓ رسول ﷺ کے بارے میں جو فقرے کسے گئے اور جو دریدہ دہنی کی گئی ہے، کیا وہ ادب یا اظہار رائے کی آزادی کا جائز استعمال ہے؟

ہم ثبوت میں وہ تمام جملے اور الفاظ درج کر دیتے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جاتا کہ اہل مغرب کس کو تحفظ دے رہے ہیں لیکن ہمارا قلم بھی اس کے نقل کرنے سے کانپتا ہے۔ ہم برطانوی وزیر خارجہ سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر آزادئ اظہار کا یہی مفہوم ہے کہ جس پر کسی حالت میں بھی پابندی نہیں لگ سکتی تو پھر توہین عدالت کا برطانوی قانون کیوں ہے؟ پھر اجازت دے دیجیے کہ عدالت کا فیصلہ جس کو نامنظور اور ناگوار ہو وہ سر عدالت جج کو گالی سنا دے، اگر اظہار کی آزادی مطلق ہے تو حدود برطانیہ میں حضرت مسیحؑ کے بارے میں سوءِ ادب کیوں خلاف قانون ہے؟ پچھلے دنوں برطانیہ ہی میں ایک برطانوی انٹیلی جنس افسر کی کتاب پر پابندی لگائی گئی تھی، کیوں؟ کیا آزادی اظہار اس کے لیے نہیں تھی؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ مغرب اپنی بے راہ معاشرت کے سبب تمام اعلیٰ انسانی صفات سے عاری ہو چکا ہے۔

ٹراٹسکی کو اسٹالن سے شدید نظریاتی اختلاف تھا۔ جب سٹالن برسر اقتدار آیا تو ٹراٹسکی روس سے نکل کر میکسیکو میں پناہ گزیں ہو گیا۔ میکسیکو اسٹالن کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا۔ اس لیے اسٹالن نے اپنے ایجنٹ بھیجے اور انہوں نے ٹراٹسکی کو میکسیکو میں اُس کے گھر میں قتل کر دیا۔ سولہ سترہ برس کی بات ہے، اسرائیل کے ایجنٹ ایک نازی جرنیل ایکمین کو لاطینی امریکہ سے پکڑ کر اسرائیل لے آئے۔ معلوم ہوا کہ یہ جرنیل ان کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ یہودیوں کا کہنا ہے کہ یہ نازی جرنیل ہزاروں یہودیوں کا قاتل تھا۔ لاطینی امریکہ کا وہ ملک جہاں یہ جنگ عظیم دوم کے بعد پناہ گزین تھا، احتجاج ہی کرتا رہ گیا۔ لیکن نہ اسرائیل نے پروا کی نہ امریکہ اور برطانیہ نے اسے غیر بین الاقوامی رویہ قرار دے کر اس کی مخالفت کی۔ اسرائیل نے دھڑلے سے اس کے خلاف اپنی عدالت میں مقدمہ چلایا اور اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔ کیا اسرائیل کی یہ غنڈہ گردی بین الاقوامی رویے کے مطابق تھی؟ اسرائیل تو ایسے اغوا بطور کاروبار کرتا ہے۔ تین چار برس کی بات ہے نائیجیریا کی حکومت کو اپنے ملک کا ایک سابق وزیر درکار تھا جو انقلاب کے بعد لندن میں آ کر مقیم ہو گیا تھا۔ خفیہ ایجنٹ اس وزیر کو بے ہوش کر کے

ایک بڑے صندوق میں بند کر کے لے جارہے تھے کہ کسٹم والوں کو شبہ ہو گیا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ اغوا کا یہ کام اسرائیلی ایجنٹوں نے کیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ مغرب کے دوست یہ بات کریں تو نہ آزادی اظہار مجروح ہوتی ہے نہ بین الاقوامی رویہ ٹوٹتا ہے اور نہ کوئی احتجاج ہوتا ہے لیکن اگر مشرق کے لوگ اپنے جذبات پر چھری چلنے پر تڑپتے ہیں تو مغرب سراپا احتجاج ہو جاتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا سی آئی اے کے قاتل دستے نہیں؟ کیا کے جی بی مخالفین کو قتل نہیں کرتی؟ اگر شخصی اور سیاسی اختلافات میں قتل روا ہے تو کیا وہ شخص واجب القتل نہیں جس نے پورے عالم اسلام کے دل کو مجروح کیا ہے؟

ڈاکٹر مولانا سید عبداللہ عباس ندوی

اہانت رسول ﷺ اور آزادی رائے

پیغام بر سے نفرت و بیزاری کا اعلان اصل پیغام کی تحقیر ہے۔ کسی بھی رسول پر سب وشتم کرنے والا دراصل اس کی رسالت سے اپنی برات وانکار کا اظہار کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے کوئی دریدہ دہن بد بخت اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ آپ کا نام محمد ﷺ تھا، آپ ﷺ عرب کے رہنے والے تھے، یا قریش کے قبیلہ کے تھے، یا آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ وہ دراصل اس دین سے بغاوت ظاہر کرتا ہے جس کو برپا کرنے کے لیے آپ ﷺ آئے۔ اس کو اس روشنی سے کدورت ہے جو آپ ﷺ کے ذریعہ پھیلی۔ وہ ان لوگوں سے اپنے بغض وعداوت کا اعلان کرتا ہے جنھوں نے آپ ﷺ کا ساتھ دیا اور آپ ﷺ کے مشن کے لیے قربانی دی۔

خواہ یہ حرکت ایک بالشتیے نے اس لیے کی ہو کہ وہ بھی قد آوروں کی نگاہ اپنی طرف متوجہ کرے، خواہ اس لیے کی ہو کہ ان ہزاروں کینہ پرور تاریکی میں بھٹکنے والے چمگاڈروں سے خراج تحسین وصول کرے جو روشنی کے دشمن ہیں۔ سبب جو بھی ہو............ مگر اس کا فعل ایک بدترین مجرم اور باغی کا فعل ہے اور جس کی سزا عقل، نقل، عرف اور رواج ہر لحاظ سے قتل ہے۔

رہا آزادی تحریر وتقریر، تو اس عالمی اصول کو غلط مفہوم میں پیش کرنا عقل و دانائی پر ظلم ہے۔ آزادی کی تعریف یہ ہے کہ دوسروں کی آزادی مجروح نہ ہو۔ کروڑوں انسانوں کے قلوب کو مجروح کر دینا آزادی نہیں ہے۔

سلمان رشدی کے وکیل وحید الدین خاں اس بات کو نہیں سمجھے اور وہ آزادی تقریر کا پیدائشی حق ایسے شخص کو دینا چاہتے ہیں جو دوسروں کی آزادی پر حملہ آور ہے۔ ان سے کہیے کہ آزادی تقریر سے فائدہ اٹھا کر وہ لال قلعہ کی چھت پر کھڑے ہو کر گاندھی جی، نہرو جی، اندرا جی کو مغلظات سنائیں، پھر پولیس ان کو بتا دے گی کہ آزادی تقریر اور آزادی تحریر کے

حدود کیا ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لندن کے ہائیڈ پارک میں اسپیکر کارنر میں آزادی تقریر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جو چاہے، جس کو بھی چاہے، گالیاں دے مگر وہاں بھی شرط ہے کہ حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور ملکہ وقت کے خلاف ایک حرف زبان سے نہ نکالے۔

احمد شجاع پاشا

آزادی اظہار کی آڑ میں مسلمانوں کی دل آزاری

مغرب نے اسلامی بنیاد پرستی کی مذمت کو وتیرہ بنالیا ہے۔ یہ بنیاد پرستی ہے کیا؟ اس کی وضاحت کھلے عام تو نہیں کی جاتی مگر دبی زبان میں یہ ضرور کہا جارہا ہے کہ اسلام کے بنیادی ارکان پر یقین رکھنے والا بنیاد پرست ہے۔ مغرب کی نظروں میں وہ مسلمان بنیاد پرست نہیں جو نماز نہیں پڑھتا اور روزے نہیں رکھتا اور اپنے مذہب کو اپنے گھر تک محدود رکھنے کا قائل ہے۔

یوں معلوم ہو رہا ہے کہ مغرب مسلمانوں کا مزاج سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ لوگ حضرت محمد ﷺ سے اس قدر محبت کیوں کرتے ہیں، قرآن کی غلط تشریح کو قابل مواخذہ کیوں سمجھتے ہیں، حضور سرور کائنات ﷺ کی شان میں گستاخی کے مرتکب رشدی کو ملعون کیوں کہتے ہیں اور ''لجا'' لکھنے والی تسلیمہ نسرین کے خلاف کیوں ہیں؟ تعجب اس پر نہیں کہ مسلمان اسلام کی تحقیر کرنے والوں کے خلاف کیوں ہیں، تعجب اس امر پر ہے کہ ان انسانوں کو جنہوں نے اسلام کی جان بوجھ کر تحقیر کی، مغرب میں اس طرح پذیرائی مل رہی ہے جیسے وہ دنیا کے نجات دہندہ ہوں۔ برطانیہ نے تسلیمہ نسرین کو ''آزادی افکار'' کا ایوارڈ دیا جس میں بارہ ہزار پونڈ کی رقم بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یورپی پارلیمنٹ کے اراکین یا مغربی ممالک کے قائدین ادب وفن کو تسلیمہ نسرین کی تحریروں میں کوئی خوبی نظر آئی یا اس کے ناول کو فنی یا ادبی لحاظ سے شاہکار تسلیم کرلیا گیا؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کے حامیوں اور معترفین کی عظیم اکثریت نے شاید ہی اس کی کوئی تحریر پڑھی ہو جنہوں نے پڑھی ہے، وہ انہیں عریانیت پر مبنی تحریریں قرار دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مغرب نے صدیوں سے اسلام کے خلاف جو ثقافتی جنگ شروع کر رکھی ہے، رشدی، مصر سے نوالسودی، متحدہ عرب امارات سے دیبا فاسں اور اب بنگلہ دیش سے تسلیمہ نسرین...... یہ سب لوگ اس جنگ میں مغرب کے وہ ہتھیار اور آلہ کار ہیں جن سے اسلام، اس کی تعلیمات، عقائد، اس کی معاشرتی، تمدنی اور

اخلاقی قدروں پر اندر سے ضرب اور نقب لگانے اور مسلم معاشروں میں بے راہ روی پر مبنی مغربی افکار و خیالات مسلط کرنے کا کام لیا جارہا ہے۔

اسلام کی ثقافتی میراث پر مغرب کا حملہ صلیبی جنگوں کے انداز میں سینکڑوں سال سے جاری ہے۔ صرف اس کا انداز اور اس کے اظہار کے طریقے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مسلم معاشروں میں ''آزادی نسوانیت'' کی تحریک برپا کرنے کے لیے مغربی حکومتیں دانشور، مشنری ادارے، یونیورسٹیاں اور دیگر علمی اور تحقیقی ادارے نہایت زور شور سے اس طرح مصروف عمل ہیں جس طرح وہ ماضی میں مستشرقین کے ذریعے تحقیق کے نام پر سرگرم رہے۔ مستشرقین نے علمی تحقیق کے نام پر جو کام انجام دیا، اس کا مقصد ایک طرف تو امپریلزم اور نوآبادیاتی نظام کا استحکام اور بقا تھا اور دوسری طرف اسلام کے سرمایہ علم و عمل کو مشتبہ بنانا تھا۔ یونیورسٹیوں اور علمی درسگاہوں میں، چاہے وہ مغرب میں ہوں یا مسلم ممالک میں، طالب علموں، ریسرچ اسکالروں اور لکھنے پڑھنے والوں کو اپنے رنگ میں ڈھالنے اور اسلام پر مختلف محاذوں سے حملہ کرنے کی پوری ترغیب دی گئی۔ اس طرح کی ہزاروں شخصی مثالیں اور کتابیں موجود ہیں جو مستشرقین اور ان کے زیر اثر کام کرنے والوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جس کا مقصد اسلام سے مسلمانوں کا رشتہ کمزور کرنا اور مسلم معاشروں میں تشکیک پھیلانا ہے۔ اب یہ کام ''نسوانیت سے آزادی'' کی تحریک برپا کر کے لیا جاتا ہے۔ مغرب نے اسلام کے بارے میں صرف اپنے اہداف تبدیل کیے ہیں، پالیسی اور اس میں کارفرما روح وہی ہے جو صلیبی جنگوں کی تہہ میں کارفرما تھی۔

امریکہ اور مغرب نے ملعون سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کو ان کی مذموم خدمات کے صلے میں اپنے ہاں بے حد پروٹوکول دیا۔ سلمان رشدی کی سرکاری طور پر حفاظت کی جارہی ہے جس پر ماہانہ ہزاروں پونڈ خرچ ہورہے ہیں۔ وہ امریکہ پہنچا تو امریکہ کے صدر کلنٹن نے جن سے ملاقات کے لیے دنیا کے سربراہان حکومت کی قطار لگی رہتی ہے، اسے بغیر کسی پروگرام کے، اپنے حضور میں حاضر ہونے کا موقع فراہم کیا اور ٹی وی پر اس کی یوں تشہیر کی گئی، جیسے کوئی بہت بڑا قائد، کوئی بہت بڑا عالم اور حکیم، صدر سے ملنے آیا ہو۔ تسلیمہ نسرین ابھی امریکہ نہیں پہنچی، وہ گئی تو ممکن ہے اس کو رشدی سے زیادہ پذیرائی ملے۔ رشدی کی کتاب کی ادبی حیثیت کچھ نہیں۔ اگر وہ ادبی لحاظ سے کسی قابل ہوتی تو اسے ادب کا نوبل پرائز دے دیا جاتا۔ اس

کی شیطنیت کو سیاسی رنگ دے کر اس بے ضمیر کو اس قدر اہمیت دے دی گئی ہے کہ اسے بھی اپنے لعنتی ہونے پر فخر ہونے لگا ہوگا۔ تسلیمہ کی "لجا" بھی ناول ہے۔ ممکن ہے اگلے سال کے نوبل پرائز کے لیے منتخب کر لیا جائے مگر تا حال تو کتاب کی بجائے لکھنے والی کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ سویڈن نے سیاسی پناہ دے رکھی ہے۔ ایک دنیا جانتی ہے کہ سویڈن کا معاشرہ غیر مزاحم ہے۔ تسیمہ کو "لجا" لکھنے پر سویڈن نے ایوارڈ دیا۔ یورپی پارلیمنٹ نے اسے مدعو کیا ہے۔ اسے عورتوں کے حقوق کے حق میں آواز بلند کرنے پر یورپی پارلیمنٹ نے بھی ایوارڈ دیا۔ بارہ ہزار پونڈ کی بنگلہ دیش میں تو بہت زیادہ اہمیت ہوگی لیکن سویڈن میں، جہاں وہ رہائش پذیر ہے، یہ رقم دو تین مہینے اس کا ساتھ دے سکے گی اور فرانس کے صدر متراں نے بھی تسلیمہ نسرین سے ملاقات کی۔ اسے اور رشدی کو یہ پذیرائی صرف مغرب میں ملی اور وہ بھی اس لیے کہ ان دونوں نے اسلام کی تحقیر اور تضحیک کی۔

کیا اس پذیرائی سے یہ سمجھا جائے کہ مغرب اسلام کی تحقیر کرنے والوں کو خوش آمدید کہتا ہے اور ان کی ہر قسم کی اعانت کے لیے تیار ہے؟ کیا اس پذیرائی پر اسلامی امہ کے لیے کوئی پیغام مضمر تو نہیں؟ کیا مغرب کا یہ اقدام اسلام کی تحقیر کے مترادف نہیں؟

آغا شاہی سابق وزیر خارجہ

آزادی اظہار اور شیطانی آیات

سلمان رشدی کے ناول پر اٹھنے والا طوفان، اس کی مذمت اور کلمہ کفر کہنے پر اسلامی قانون کے تحت اسے سزائے موت دینے کا اعلان کے گرد گھوم رہا ہے اور مغرب میں اس سنگین جرم اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو پہنچنے والی اذیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی، جس کا موجب شیطانی آیات کے وہ پیراگراف بنے ہیں، جن میں حضور ﷺ کی عزت و عظمت کو داغدار کرنے، آپ ﷺ کے محترم صحابہؓ کی توہین کرنے اور امہات المومنینؓ پر گھٹیا ترین طعن کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ مصنف سلمان رشدی، جس کا دعویٰ ہے کہ اسے اسلامی تاریخ اور روایات کا علم ہے، نے دیدہ و دانستہ طور پر اسلامی اعتقاد کی مرکزی صداقتوں پر آتش بازی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم مغرب میں حکومتی اداروں اور نیوز میڈیا کی ساری توجہات کا مرکز اس کی سزائے موت اور آزادی اظہار کا حق بنایا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حق اتنا غیر مشروط ہے کہ وہ ان تمام حقوق اور آزادیوں پر سبقت حاصل کر جائے جن سے تمام شہری نسل، جنس، زبان یا مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر متمتع ہو رہے ہیں اور جو کسی کم اساسی حیثیت کے حامل نہیں۔

28 فروری کو عوامی بحث میں حصہ لیتے ہوئے وزیراعظم تھیچر نے ہاؤس آف کامنز کو بتایا:

> "آزادی تقریر و اظہار صرف قوانین ملکی کے تحت ہے۔ یہ ہر اس چیز سے زیادہ اساسی ہے جس پر ہم یقین رکھتے ہیں اور کسی ملک کی طرف سے اس میں مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔"

برطانیہ، جسے جمہوریت کا گہوارہ اور قانون کی حکمرانی کی مثال پیش کرنے والے ملک کی حیثیت سے دنیا میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، وہ اقوام متحدہ کی جانب سے قریباً بیس سال پہلے منظور کیے جانے والے شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی میثاق

کا فریق ہے۔اس میں جن بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے،ان میں ہر ایک کے لیے آزادی اظہار کا حق بھی ہے لیکن یہ معاہدہ دوسروں کے حقوق اور شہریوں کے احترام، نیز سلامتی، امن عامہ،عوامی صحت واخلاق کے تحفظ کے لیے بعض ضروری پابندیاں بھی عائد کرتا ہے۔

اس بین الاقوامی معاہدہ کی ایک اور دفعہ آرٹیکل 26، قانون کے سامنے تمام انسانوں کی برابری اور بغیر کسی امتیاز کے، سب کو قانون کے ایک جیسے تحفظ کی گارنٹی دیتی ہے۔صرف یہی تحدیدی بین الاقوامی دستاویز ہی ایسی نہیں جو آزادی اظہار کے حق کے لیے بعض حدود اور تحفظات متعین کرتی ہے۔ برطانیہ نسلی اور امتیازی رویہ کے خاتمہ کے کنونشن میں بھی شامل ہے جو نسلی برتری یا نفرت کے خیالات کے پھیلانے پر پابندی عائد کرتا ہے۔ برطانیہ کے قومی قانون میں بھی آزادی تقریر و اظہار، زبانی وتحریری اہانت اور بے حرمتی کے قانون کے ماتحت ہے۔

اس قانونی منظر نامے کے برعکس برطانیہ ایک ایسا سماجی منظر پیش کرتا ہے جس میں اس کے بھورے اور کالے، پندرہ سے بیس لاکھ مسلمانوں کی مضبوط برادری مذہب کی تقدیسات کے معاملہ میں قانون کے تحت مساویہ سلوک سے متمتع نہیں ہو رہی۔ انگلیکن عیسائی، قانون بے حرمتی کے تحت اس وقت تحفظ طلب کر سکتے ہیں جب حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت کو شامل کیا گیا ہے لیکن جب پیغمبر اسلام ﷺ پر شدید ترین حملے کیے جائیں، جیسا کہ "شیطانی آیات" کے معاملہ میں ہوا ہے تو وہ اس قانون سے مدد کے طالب نہیں ہو سکتے بلکہ اس کی بجائے انہیں اس کے مصنف کی آزادی خیال واظہار کے بارے میں بتایا جاتا ہے اور تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو برطانیہ کی سیکولر سوسائٹی کے معیارات واقدار کے مطابق ڈھالیں۔

ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی الازہری

مغرب کے پجاری اور آزادی رائے

مغرب...... مغربی اقدار...... مغرب کی مذہب سے لاتعلقی...... اور...... سیکولر نظریات کی خوبیوں، عظمتوں اور رفعتوں کو خوش نما انداز، انتہائی خوبصورتی اور غیر محسوس طریقے سے ''چٹخارے'' لے لے کر بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عام سا انسان ان ''طلسماتی کہانیوں'' کو سن سن کر یہ محسوس کرتا ہے کہ یورپ کی ترقی کا راز ہی مذہب سے دوری میں پوشیدہ ہے اور اس طرح کے ''خیالات فاسدہ'' کو اپنے پرنٹ میڈیا کے ذریعے خوب خوب اجاگر کرتا ہے جس کے نتیجے میں عوام تو ایک طرف رہے، علم و آگہی سے وابستہ افراد اور حکمرانی کے ''بے وفا تخت'' اور ''فروکش''، شخصیات'' بھی اس ''فریبی سحر'' میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہماری فلاح بھی ''سیکولرازم'' میں پنہاں ہے۔ اس لیے حکمرانوں کا انداز حکمرانی بھی سیکولر روایات کا روپ دھار لیتا ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کم و بیش آج بھی یورپ اپنے مذہبی عقائد، روایات اور افکار میں اسی قدر رجعت پسند ہے، جس قدر آج سے دو ہزار سال پہلے روم کے کلیسا کی تعلیمات کی روشنی میں رجعت پسند تھا اور جس کا مشاہدہ ہم آئے دن یورپ سے آنے والے مہذب افراد کے ارشادات، بیانات، پیغامات اور حکمرانوں کو دیے گئے ''احکامات'' سے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مشنری اداروں کی آڑ میں اور کبھی غیر ملکی امداد سے چلنے والی ''این جی اوز'' کے حوالے سے ایسی کارروائیوں کو پروان چڑھاتے رہتے ہیں۔ کبھی ''رشدی'' کے ذریعے اور کبھی ''نسرین'' کے روپ میں اپنے مقاصد کو حاصل کرتے ہیں۔ کبھی وہ مذہب کو انسان کا ذاتی مسئلہ قرار دے کر اس کی اہمیت ختم کرنا چاہتے ہیں اور وہ مذہب کو انسان کا ذاتی مسئلہ قرار دینے میں حق بجانب بھی ہیں۔ کیونکہ عیسائیت، یہودیت اور دیگر تمام ادیان کی تعلیمات صرف عبادات اور اخلاقیات تک محدود ہیں اور زندگی کے دیگر شعبہ ہائے حیات کے بارے میں ان کی تعلیمات یا تو خاموش ہیں، یا اگر ہیں تو اسلام کے مقابلے میں انتہائی محدود، غیر متوازن،

ناپائیدار، غیر مستقل اور غیر ابدی ہیں۔ یہ صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور ان موضوعات پر علمی مواد سے معمور بہترین کتب اس پر شاہد ہیں۔ اسلام کے احکامات بھی اگر صرف عبادات اور اخلاقیات تک محدود ہوتے تو مغرب کو اس سے خوفزدہ ہونے کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ ہے۔ آخر یورپ میں دیگر ادیان والے بھی تو سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں ان کا وہ "ترش رویہ" نہیں ہوتا جو اسلام کے بارے میں ہوتا ہے۔ آخر اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہے؟ اگر کہا جائے کہ اس کی وجہ مسلمانوں کے مابین مسالک کا اختلاف اور ان کے پیروکاروں کی باہمی چپقلش ہے تو جب "صلیبی جنگیں" ہوتی تھیں، اس وقت تو کوئی فرقہ واریت اور مسلکی اختلاف کا وہ زور و شور نہ تھا جو آج نظر آتا ہے تو اس وقت یورپ اور روم کے کلیساؤں کے راہب اور شہنشاہ کس بنا پر اسلام سے برسرِ پیکار رہتے تھے؟ گویا اسلام دشمنی میں صرف طریق کار بدلا ہے، مذہبی عصبیت نہیں بدلی۔

مغرب اسلام سے خوفزدہ بھی صرف اس لیے ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات رکھتا ہے۔ اسلام کے نظام "معاشیات و اقتصادیات" کو اگر عملاً نافذ کر دیا جائے تو چند سالوں کے اندر اندر یورپ کی نام نہاد ترقی زمین بوس ہو جائے گی۔ اسلام کے نظام "حکومت و سیاست" کا جامہ زیب تن کر لیا جائے تو جمہوریت کے بڑے بڑے بت پاش پاش ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اسلام کے نظام "عدل و انصاف" کو اپنا لیا جائے تو یورپ کی نام نہاد عدل و انصاف کی کہانیاں اور مسلمان اقوام اور ملکوں کے ساتھ ان کا مظاہرہ اور سلوک ان کی دوغلی پالیسیوں کو ننگا کر دے گا۔ اسلام کے نظام عبادات کو روح جان بنا لیا جائے تو یورپ کا بے کل ہنگامہ خیز معاشرہ، سکون قلب کی دولت سے مالا مال ہو جائے گا۔ اسلام کے نظام "اخلاقیات" کو حرز جان بنا لیا جائے تو یورپ کا مکروہ شیطانی معاشرہ اخلاق حمیدہ کا منبع و مرکز بن جائے گا۔ اسلام کے نظام "معاشرت" کو جاری و ساری کر دیا جائے تو طبقاتی کشمکش اپنی موت آپ مر جائے گی۔ اسلام کی کتاب ہدایت "قرآن" کو تعلیم و تعلم اور تسخیر کائنات کا سرچشمہ بنا لیا جائے تو یورپ کی سائنسی ترقی روبہ زوال ہو کر قصہ ماضی کا ایک پارینہ جز بن جائے گی۔ غرضیکہ اسلام کی تعلیمات میں سے کسی ایک تعلیم کو بھی خلوص سے، عملاً نافذ کر دیا جائے تو یورپ کے کلیساؤں کے راہب بخوبی جانتے ہیں کہ پھر وہ اسلام کے فروغ اور اس کی نشر و اشاعت کا راستہ کسی بھی طرح نہیں روک سکیں گے۔ اس لیے ہر چھ ماہ کے بعد یورپ

کے مذہبی، سیاسی اور عمرانی رہنماؤں کے پیٹ میں اسلام دشمنی کے پس منظر میں ''توہین رسالت ﷺ'' کا مروڑ اٹھتا رہتا ہے۔

اہل حکمت جانتے ہیں کہ بعض اوقات مقاصد کو فوراً حاصل کرلیا جاتا ہے اور بعض اوقات سست روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وقفوں کے ساتھ ساتھ، آہستہ آہستہ اذہان وقلوب کو مقاصد کے حصول کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے، گاہے بگاہے کرنٹ کی خفیف شارٹوں کی صورت میں ذہن کے گوشوں میں ناپسندیدہ بات ڈال کر ارتعاش پیدا کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ذہن اس ارتعاشی کیفیت کو برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ارتعاش کا زیر و بم اور مدوجزر ذہن پر بارگراں ثابت نہ ہونے کی بنا پر ایک معمول کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد عامل جس طرح کے مقاصد اور مفادات حاصل کرنا چاہے، بلا تردد حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی صورتحال سے پاکستانی بھی دوچار ہیں۔ ''توہین رسالت ﷺ'' کی دفعات پر انتہائی تعصب، عصبیت اور تنگ نظری کی ''خوردبین'' لگا کر اس کے منفی پہلو تلاش کیے جاتے ہیں اور اگر منفی پہلو تلاش کرنے میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑے تو اپنی خفت مٹانے کے لیے، لے دے کر یہ ''نعرہ'' لگایا جاتا ہے کہ یہ ''آزادی رائے'' کے خلاف ہے۔ ''آزادی رائے'' کا اطلاق کہاں کہاں ہوتا ہے، اس کی قیود کیا ہیں؟ آزادی رائے کا اونٹ بھی کیا شتر بے مہار کی مانند ہے؟ آزادی رائے کی لگامیں کسی ''فیل بان'' کے ہاتھ میں تھمائی جا سکتی ہیں تو اس کی حرکات وسکنات کی شرائط کیا ہیں۔ کیا ''آزادی رائے'' بھی مغربی تہذیب و تمدن کی عریاں ''دوشیزہ'' کی مانند کسی ''قلوپطرہ'' کی تمثیلی آئینہ کی پرتو ہے جس پر ''آزادی رائے'' کے ''متوالے'' اور ''عشاق'' عالم وارفتگی اور بے خودی میں ٹوٹ پڑتے ہیں اور اس آزادی کی ''دوشیزہ'' کے ''آئینہ'' کی کرچیوں سے اپنے آپ کو لہولہان کر کے شہیدوں میں نام لکھاتے جاتے ہیں۔ کیا ''آزادی رائے'' بھی اخلاقی اور قانونی حد بندیوں کی محتاج ہے یا نہیں۔ خود مغرب والے کشمیر و فلسطین، عراق و ایران کے ''آزادی رائے'' کے زخم خوردہ ''مجروحین'' سے سفاکانہ سلوک کا مظاہرہ کن اصولوں کے تحت کر رہے ہیں، شاید ان کے ہاں ''اپنے'' اور ''غیروں'' کے لیے آزادی کی رائے کے الگ الگ پیمانے ہیں۔

ایک مسلمان تو اس امر کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ اس کے وہم وخیال میں یہ تصور آ

سکتا ہے نہ اس کے مذہب کی تعلیمات ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہیں۔ اس لیے یہ سوال مسلمان سے متعلق نہیں بلکہ کوئی اور کافر شخص یا کسی اور دین باطلہ کا ماننے والا شخص "آزادی رائے" کے حوالے سے نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان اقدس میں توہین کا ارتکاب کرتا ہے (نقل کفر کفر نباشد) تو برطانوی قانون "آزادی رائے" کے حق کو پامال کرتے ہوئے حرکت میں کیوں آتا ہے؟ کیا "آزادی رائے" کے ڈھنڈورچیوں اور نام نہاد متوالوں نے اپنی تنہائیوں میں اپنے جیتے جاگتے ضمیر سے پوچھا؟

"مغرب" پروپیگنڈہ کے بل بوتے پر "جھوٹ" کو "سچ" اور "سچ" کو "جھوٹ" ثابت کرنے کا "مشرق" کی بہ نسبت زیادہ تجربہ رکھتا ہے۔ دوسرے معنی میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ "کفر" اس "فن" کی گہرائیوں سے زیادہ آشنا ہے جس کا مظاہرہ وہ اکثر اوقات کرتا رہتا ہے اور اسی پروپیگنڈے کے ذریعے وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر جہاں کہیں اسلام کے فروغ کا معاملہ ہو یا اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل کرنے کا مسئلہ ہو تو وہ اس پروپیگنڈے کے فن کے رموز کو جاننے کی بنا پر پورے "لاؤلشکر" اور اپنے "شیطانی اسباب وآلات" کے ذریعے حملہ آور ہوجاتا ہے اور ظاہر بین افراد اس "لشکر" کی ظاہری شان وشوکت کے ساتھ جب لفظ "مغرب" کی پیوندکاری کو دیکھتے ہیں تو بلا چون وچرا مرعوب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات بڑے دلنشیں انداز میں بٹھا دی گئی ہے کہ مغرب کی کوئی بات بھی غلط، جھوٹ، باطل اور حقیقت سے ماورئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر ان کا کوئی "مذہبی راہب" ہمارے کسی قانون کو "غلط" کہتا ہے تو وہ قانون یقیناً آزادی رائے اور حقوق انسانی کو پامال کر رہا ہوگا؟ وگرنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ "مغرب" کا حقوق انسانی کا علمبردار، "دینی رہنما" اس کی مخالفت کرتا؟ اور جب "مغربی کلیسا کا پادری" اور "سیکولر معاشرے" کی ایک قابل احترام شخصیت "آرچ بشپ" ہمارے حکمرانوں کے سامنے بیانگ دہل کسی قانون کی مخالفت کر رہی ہو تو بلا ریب اس سے "آزادی رائے" جیسی "مقدس گائے" کی توہین ہو رہی ہوگی؟ ورنہ یورپ جیسے سیکولر معاشرے کا مذہبی "سیکولر" رہنما، مخالفت میں "آداب مہمانی" کے خلاف مظاہرہ نہ کرتا تو کیا "سیکولر معاشرے" کے "سیکولر" رہنما کے قول وفعل سے خود لفظ "سیکولر" کے معنی کی دھجیاں نہیں بکھر رہی ہیں؟ کیا اس طرز عمل سے لفظ "سیکولر" کی لغت اور اصطلاح کے اعتبار سے، ان تک جو تعریفیں کی گئی ہیں، وہ سب غلط قرار

نہیں ہو جاتیں۔ اس لیے ''سیکولر'' کی نئی تعریف وجود میں لائی جارہی ہے اور انگریزوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس لفظ کی تعریف اور معنی جب چاہیں، بدل دیں۔ کیونکہ وہ ''انگریزی'' کے ''مائی باپ'' جو ٹھہرے۔ ''بادشاہ'' کو حق حاصل ہے کہ وہ ''خفتی'' کو مذکر کہے یا مونث۔ ہم ''محکوموں'' کو کیا حق حاصل ہے کہ ''سیکولر'' کی وہ تعریف کریں جواب تک لغت کی کتابوں میں موجود ہے۔

''مغرب'' کا یہ نعرہ کہ وہ ایک ''سیکولر معاشرہ'' ہے اس کی حیثیت بعینہٖ وہی ہے جیسی ہندوؤں کے اس نعرے کی ہے کہ ''ہندوستانی معاشرہ'' ایک ''سیکولر معاشرہ'' ہے۔ ان نعروں کی حیثیت ''ڈھونگ'' اور ''دھوکہ'' کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مغربی معاشرہ مکمل طور پر سیکولر معاشرہ نہیں ہے بلکہ وہ انتہائی ''متعصب معاشرہ'' ہے۔ یہ تعجب انگیز امر نہیں کہ جب بھی پاکستان یا کسی بھی اسلامی ملک میں کوئی قانون اسلام کی تعلیمات کے مطابق بنتا ہے یا کوئی قدم، اسلام کی تعلیمات کے مطابق اٹھایا جاتا ہے تو اس قانون کے خلاف پہلی آواز ''مغرب'' سے بلند ہوتی ہے اور اس کے بعد اپنے ملک میں موجود مغرب کے ''گماشتے'' بھی اپنی بے سری آوازوں کو ''کوے کی آواز'' میں شامل با جا بنا کر ''گانے'' لگتے ہیں؟

کیا وجہ ہے کہ ''امتناع قادیانیت کا قانون'' پاکستان کی مقننہ بناتی ہے اور اس کا ''مروڑ'' مغرب کے پیٹ میں اٹھتا ہے؟ ''قوانین حدود'' کا اطلاق پاکستان میں ہوتا ہے اور اس کے خلاف ''صدائیں'' یورپ میں بلند ہوتی ہیں؟ ''قانون شہادت'' کا اجرا پاکستان میں عمل میں آتا ہے اور اس کے خلاف ''نعرے'' یورپ میں لگائے جاتے ہیں؟ ''عریانی اور فحاشی'' پر پابندیاں یہاں عائد ہوتی ہیں اور اس کے خلاف ''غم و غصہ'' کا اظہار یورپ میں ہوتا ہے؟ ''توہین رسالت ﷺ'' کا قانون پاکستان کی عدلیہ کی ہدایات کی روشنی میں بنایا جاتا ہے اور اس کے خلاف ''جلوس اور مظاہرے'' مغرب میں ہوتے ہیں؟ کیا یورپ اور مغرب کی یہ تمام کارروائیاں اس امر کی غمازی نہیں کر رہی ہیں کہ مذہبی اعتبار سے اصل ''متعصب معاشرہ'' مغرب اور یورپ ہی ہے کہ وہ اپنے مذہبی اعتقادات اور قوانین کو دوسرے ممالک میں نافذ کرانا چاہتا ہے۔

بین الاقوامی قوانین میں سے کون سا قانون مغرب کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے مذہبی اعتقادات اور قوانین میں دخل اندازی کریں۔ کیا ان ممالک میں بسنے

والے افراد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کی آزادی کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی مذہبی تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگی گزاریں؟ اور اپنے ملک میں اقلیتوں کو اپنے اعتقادات کے مطابق ندگی گزارنے دیں؟ کیا کسی شخص کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ برطانیہ یا امریکہ جائے؟ یقیناً نہیں لیکن اگر وہ اپنی مرضی سے یا کسی بھی طریقہ سے امریکہ یا برطانیہ پہنچ جاتا ہے یا پہنچا دیا جاتا ہے تو اب اس پر لازم ہے کہ وہ اس ملک کے قوانین کی پابندی کرے، جس مقام پر وہ موجود ہے، اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کہے کہ چونکہ میں پاکستانی ہوں اور میں پاکستان میں "رائٹ ہینڈ ڈرائیونگ" کرتا ہوں، اس لیے میں امریکہ میں بھی "رائٹ ہینڈ ڈرائیونگ" کروں گا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو قابل گرفت قرار پائے گا۔ اب اس پر لازم ہے کہ وہ وہاں کے قوانین کی پابندی کرے یا اس کے برعکس کوئی امریکی پاکستان میں ڈرائیونگ کرے تو اس پر لازم ہے کہ امریکی ہونے کے باوجود پاکستانی قوانین کی پابندی کرے۔ اگر وہ دعویٰ کرے کہ یہ میرا بنیادی حق ہے کہ میں اپنی مرضی سے چلوں، چاہے دائیں طرف چلوں یا بائیں طرف، تم کون ہوتے ہو میرے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے؟ کوئی بھی ذی شعور شخص اس کے دعویٰ کی تائید نہیں کرے گا کیونکہ اس کا یہ دعویٰ، بین الاقوامی قوانین کے خلاف ہے۔ بین الاقوامی قانون یہی کہتا ہے کہ جو شخص جس ملک میں ہو، اس پر لازم ہے کہ اس ملک کے قوانین کی پابندی کرے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ دین کے معاملات میں جبر نہیں۔ دین اسلام ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی فرد کو زبردستی اور اس کے مرضی و منشا کے خلاف اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے اور زبردستی اقرار رسالت کرایا جائے۔ یہ ہر فرد کا حق ہے کہ وہ اسلام قبول کرے یا نہ کرے۔ رسالت کا اقرار کرے یا نہ کرے لیکن دنیا کا کوئی قانون، کوئی آئین اور بنیادی حقوق کا کوئی چارٹر کسی شخص کو یہ حق بھی تو نہیں دیتا کہ وہ کسی بھی رسول کی توہین کرے اور مذہبی معاملات میں دوسروں کی دل آزاری کا سبب بنے۔ اگر وہ مسلمان ہو گیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو، یہاں اب وہ اپنی آزادی اور حق انسانی کے اصول کا اطلاق نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو اسلام میں داخل کر کے اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کا پابند کرلیا ہے اور نہ ہی کسی شخص کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ پاکستان میں داخل ہو کر "پاکستانی قوانین" کی خلاف ورزی کرے۔

قانون کی مخالفت کون کرتا ہے......؟ اور کیوں کرتا ہے؟ کیا قانون جرائم میں اضافہ کرنے کے لیے بنتے ہیں......؟ کیا قانون دوسرے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے......؟ اور کیا قانون مذہب کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے......؟ یقیناً تنازعات میں تصفیہ جوئی...... حقدار کو حق دلانے...... ظالموں اور جابروں سے نجات دلانے...... برائیوں کے انسداد...... اور جذبات کو مجروح کرنے سے روکنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔

قاتل کبھی نہیں چاہے گا کہ قاتل کے خلاف قانون بنے یا قتل کی مذمت کی جائے، چور کبھی نہیں چاہے گا کہ چوری کے خلاف قانون بنایا جائے یا چور کو سرعام رسوا کیا جائے۔ زانی اور شرابی کبھی نہیں چاہے گا کہ زنا اور شراب کے خلاف قانون بنایا جائے یا وہ شخص جس نے کسی بھی قسم کی برائی کا ارتکاب کرنا ہو، اس کی کوشش ہوگی کہ اس کی خواہشوں کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ بنے اور نہ کوئی آڑ بننے کی کوشش کرے۔ اس لیے وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنے خلاف قانون نہ بننے میں ہزار جتن کرے گا۔ کبھی اپنی عادات کا سہارا لے گا، کبھی اپنے فطری تقاضوں کی تکمیل کا جواز گھڑے گا، کبھی آزادروی کا بہانہ بنائے گا، کبھی اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے غیر مذاہب کی غیر مصدقہ روایات کا سہارا لے گا۔ کبھی حقوق انسانی کے خلاف سازش قرار دے گا اور کبھی انسان کی آزادی کے خلاف جرم قرار دے گا۔

لیکن جس شخص نے قتل نہیں کرنا، چوری نہیں کرنی، زنا اور شراب اس کے قریب بھی نہیں جاتا اور نہ کسی برائی کے ارتکاب کا خیال دل میں لاتا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کتابوں کے اندر کوئی اس قسم کا قانون بھی موجود ہے یا نہیں۔ جب اس نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب ہی نہیں کیا تو اسے کس بات کا ڈر یا خوف ہوگا۔ قانون کتابوں کے اندر ہوتا ہے تو ہوتا رہے، اسے کیا فرق پڑے گا۔ ڈر اور خوف تو اس کو ہوتا ہے جو پہلے سے اپنے آپ کو ان گندے کاموں میں مبتلا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔

اسی طرح جب کسی شخص نے "نعوذ باللہ" کسی بھی "نبی مکرم" یا "مقدس ہستی" کے خلاف کچھ لکھنا یا کہنا ہی نہیں ہے تو اسے کیا فرق پڑتا ہے کہ "توہین رسالت ﷺ" کے بارے میں دفعہ 295-C (مجموعہ تعزیرات پاکستان) ہے بھی یا نہیں۔ قانون کی کتابوں میں دفعہ 302 آج سے نہیں بلکہ 1860ء سے موجود ہے۔ کیا اس وقت سے تمام انسانوں کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاچکا ہے؟ یا تمام انسانوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور

اگر یہ کہا جائے کہ خدشہ ہے کہ C-295 کو غلط طریقوں سے استعمال کیا جائے گا، اس دفعہ کی موجودگی میں جس پر جب چاہیں گے، اطلاق کروا کر گرفتار کروا لیا جائے گا چونکہ مذہبی منافرت دن بدن پھیل رہی ہے اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ اس دفعہ C-295 ہی کو ختم کر دیا جائے تا کہ اس کا ناجائز اور غلط استعمال ہی نہ ہو۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کوشش بھی کی جانی چاہیے کہ دفعہ 302 کو بھی ختم کروایا جائے کیونکہ دفعہ 302 کو ایک مرتبہ نہیں ہزاروں مرتبہ غلط استعمال کروا کر ہزاروں افراد کو پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا ہے اور ہر پھانسی پر لٹکنے والا تقریباً یہی کہتا رہا ہے کہ مجھے 302 میں جان بوجھ کر ملوث کروا کر پھانسی دلائی جارہی ہے۔ جبکہ یہ قتل میں نے نہیں کیا۔ البتہ دیگر گناہوں میں مبتلا رہا ہوں لیکن اس قتل کا ارتکاب میں نے نہیں کیا تو کیا عدالتوں نے اپنے فیصلے صادر کیے جانے کے بعد ایسے تمام قاتلوں کی سزا معاف کر دی؟ کیا عدالتوں نے بغیر ثبوت کے قاتل کے دعویٰ کو قبول کر لیا؟ کیا بھٹو کو عدالت کے ذریعے پھانسی کی سزا مل جانے کے بعد شیدائیان بھٹو نے عدالت کے فیصلے کو دل سے قبول کیا ہوا ہے؟ وہاں تو بالفعل دفعہ 302 کا غلط استعمال ہوا لیکن یہاں تو ایک شخص کو بھی C-295 کے تحت سزا نہیں دی گئی۔ صرف مقدمات ہی درج ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس امر کی چغلی کھا رہا ہے کہ ان افراد کے مقاصد کچھ اور ہیں یا اس کے پیچھے کوئی سازش کارفرما ہے؟ اور کس ذہن کے افراد ہیں جو دفعہ C-295 کو ناپسند کرتے ہیں؟ اور غیر ملکی اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ اسے کیوں ختم کرانا چاہتے ہیں؟

اگرچہ قانون سے متعلق شخصیات کے لیے قانون کی دفعہ کا حوالہ ہی کافی ہوتا ہے لیکن اہل نظر ذرا دفعات 295، A-295، B-295، C-295 کو نظر انداز کر کے مشاہدہ کریں کہ اس میں کون سی چیز اور الفاظ خلاف اسلام ہے۔

باب 15: ان جرائم کے بیان میں جو مذہب سے متعلق ہیں (Offenes Relating to Religion)

عنوان: عبادت گاہ کو نقصان پہنچانا یا نجس کرنا کسی طبقہ کے مذہب کی توہین ہو، دفعہ 295، جو شخص کسی عبادت گاہ یا کسی شے کو جو لوگوں کے کسی فرقہ کے نزدیک متبرک سمجھی جاتی ہو، خراب کرے یا مضرت پہنچائے یا نجس کرے (Defile) لوگوں کے کسی فرقہ کے مذہب کی توہین کرنے کی نیت سے یا اس امر کے احتمال کے علم سے کہ لوگوں کا کوئی فرقہ اسے خراب

کرنے یا مضرت پہنچانے یا نجس کرنے کو اپنے مذہب کی ایک طرح توہین (Insult) سمجھے گا تو شخص مذکورہ کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی معیاد دو برس تک ہوسکتی ہے یا جرمانے کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

ضابطہ: قابل دست اندازی پولیس سمن، ابل ضمانت، نا قابل ضمانت راضی نامہ، میجسٹریٹ درجہ اوّل یا دوم،

گویا ''حقوق انسانیت'' اور ''آزادی رائے'' کے ''آقاؤں'' یعنی ''انگریزوں'' کے نزدیک یہ ''حقیر'' سے جرائم بھی ''نا قابل راضی نامہ'' ہیں۔

''انسان'' کی کسی شخصیت، فرد، قوم، ملک، وطن، ادارے اور شعبے سے الفت اور وابستگی کے اطوار مختلف زمانوں اور حالات میں مختلف انداز سے ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ تغیرات زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے انداز میں کمی بیشی اور افراط وتفریط کے مظاہرے بھی ہوئے۔ کبھی کبھی ایسی وابستگیاں شکست و ریخت کا شکار بھی ہوئیں اور تاریخ کی کہنگی کے ساتھ ساتھ ان میں کہنہ پن بھی پیدا ہوتا رہا لیکن دین و مذہب سے باوجود تغیرات زمانہ کے وابستگی اور تعلق کا پہلو مکمل طور پر کبھی بھی ختم نہ ہوسکا اور نہ ہوسکے گا۔ معاشرہ اپنے آپ کو کتنا ہی جدت پسند قرار دینے کا دعویٰ کیوں نہ کرے، لیکن پھر بھی کسی نہ کسی انداز میں اس سے وابستہ رہتا ہے۔ یہ اسی رابطے ہی کا تو نتیجہ ہے مغرب اپنے آپ کو کتنا ہی مذہب سے نفرت کرنے والا اور مذہب کو افیون کی گولی قرار دینے والا ہی کیوں نہ ہو، جب بھی مواقع اور حالات میسر آئیں گے، اپنے آپ میں مضمر اور پوشیدہ وابستگی کے پردے کو چاک کر کے عریاں ہونے میں سستی کا مظاہرہ نہیں کر پاتا۔ مذہب سے دوری کے دعویٰ کے باوجود جہاں کہیں اسلام اور مسلمانوں کے بطور مذہب اور قوم، ترقی کا پہلو سامنے آتا ہے اسلام دشمنی کا آغاز بھی ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ ''توہین رسالت ﷺ'' کے قانون کی مخالفت بھی اسی پس منظر کی آئینہ دار ہے۔

قانون کی نگاہ میں تمام وابستگیوں سے زیادہ مضبوط وابستگی ''دین و مذہب'' کی قرار پاتی ہے۔ چنانچہ اس وابستگی کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے ''انگریز'' آقاؤں نے اپنے دور ''بادشاہت'' 1927ء میں دفعہ 295۔الف (ایکٹ ترمیمی فوجداری قانون 1927ء) کا اضافہ اسی پس منظر میں کیا جس کی عبارت سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ''توہین

مذہب" کی کتنی اہمیت ہے۔

295۔الف (مجموعہ تعزیرات پاکستان) کی مکمل عبارت یہ ہے:

"عنوان: بالارادہ اور عداوتی افعال کے ذریعہ سے یا کسی جماعت کے مذہبی احساسات کو بذریعہ توہین مذہب یا مذہبی عقائد کے بھڑکانا"۔

دفعہ 295۔ الف: جو کوئی شخص ارادتاً اور عداوت کی نیت سے پاکستان کے شہریوں کی کسی جماعت کے مذہبی احساسات کو بھڑکائے (Outrage) بذریعہ الفاظ زبانی یا تحریری یا نظر آنے والی علامات، اس جماعت کے اعتقادات مذہبی کی توہین کرے یا توہین کرنے کا اقدام کرے، اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی۔ جس کی میعاد دو برس تک ہوسکتی ہے یا جرمانے کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

ضابطہ: ناقابل دست اندازی، وارنٹ، ناقابل ضمانت، ناقابل راضی نامہ مجسٹریٹ اوّل۔

یہ دفعہ 1927ء میں زیادہ کی گئی تاکہ اگر کسی مذہب کے بانی پر توہین آمیز حملہ کیا جائے تو ایسا کرنے والا سزا کا مستحق قرار پائے۔

"آزادی رائے" کے "متوالے" انگریزوں کے دور سے اس دفعہ کے اضافہ کرنے پر ابھی تک کیوں خاموش رہے؟ شاید اس لیے کہ چونکہ یہ "مغرب کے آقاؤں" نے بنایا تھا اور ان کا ہر بنایا ہوا قانون چاہے وہ آزادی رائے پر پابندیاں ہی کیوں نہ عائد کرتا ہو، قابل قبول ہے۔ لیکن آزاد شدہ مملکت کے قانون ساز ادارہ کا بنایا ہوا اسی طرح کا قانون "قابل مذمت قرار" پاتا ہے جس سے مغرب کے پجاریوں کی دورنگی اور منافقت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اور جب اس قانون کے باوجود "توہین رسالت ﷺ" و "توہین قرآن" کی مسلسل توہین آمیز کارروائیوں پر قابو نہ پایا جاسکا تو اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ایسا قانون بنایا جائے، جس کے ذریعے ایسی توہین آمیز کارروائیوں کا انسداد کیا جاسکے اور ایسا قانون قرآن و سنت کی تعلیمات کے عین مطابق بھی ہو۔ مغرب کے پجاریوں کی اس سوچ پر تعجب ہے کہ وہ قانون سازی پر تو اعتراض کر رہے ہیں اور اسے آزادی رائے کے خلاف قرار دے رہے ہیں لیکن "کلام اللہ" کی توہین کرنے والوں کی مذمت کرنے کے لیے ان کی زبانوں پر تالے پڑ جاتے ہیں اور ان کی توہین آمیز کارروائیوں کے خلاف ایک جملہ بھی کہنا اپنی "توہین" تصور

کرتے ہیں جبکہ وہ اس امر کو بخوبی جانتے ہیں کہ جرائم کا تسلسل اور توہین آمیز کارروائیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہی نئی قانون سازی کا ذریعہ بنا کرتا ہے اور نئے نئے قانونوں کو وجود میں لایا کرتا ہے۔ چنانچہ رہی پس منظر کے اندر 1982ء میں دفعہ 295 ب کا اضافہ مجموعہ تعزیرات پاکستان میں کرنا پڑا جس کی عبارت سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے کلام کی بہ نسبت خالق کائنات کا کلام زیادہ قابل تعظیم و تکریم ہے۔

''مغرب کے پجاریوں'' کی آزادی رائے'' کے حوالے سے اس سوچ پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک انسان کے جملے اور الفاظ ''خالق انسان'' ''اللہ تعالیٰ'' کے کلمات سے زیادہ محترم اور قابل تکریم و تعظیم ہیں۔ نیز دفعہ 295 ب، کے الفاظ سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں مقصود صرف اور صرف قرآن پاک کی حفاظت ہے۔

عنوان: قرآن پاک کے نسخے کی بے حرمتی وغیرہ کرنا۔

''جو کوئی قرآن پاک کے نسخے یا اس کے کسی اقتباس کی عمداً بے حرمتی کرے، اسے نقصان یا اس کی بے ادبی کرے یا اسے توہین آمیز طریقے سے یا کسی غیر قانونی مقصد کے لیے استعمال کرے، تو وہ عمر قید کی سزا کا مستوجب ہوگا۔''

قانون کی عبارت میں کسی قسم کی مذہبی منافرت نہیں پائی جارہی ہے۔ کسی فرقہ، طبقہ اور مذہب کے خلاف نہیں بلکہ اس شخص کے خلاف ہے جو اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خدانخواستہ اگر ایک مسلمان ہونے کا دعویدار بھی کسی طرح کی ہتک آمیز حرکت کرے گا تو وہ بھی موجب سزا ہوگا۔ یہ قانون کسی بھی مذہب اور دین کے ماننے والوں کے خلاف نہیں بلکہ صرف اور صرف ''قرآن عظیم'' کی عظمت کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر اس قانون کو بھی غلط معنی پہنائے جائیں تو ''آزادی رائے'' کے متوالوں کی عقلوں پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔

''مغربی افکار پر آنکھیں بند کر کے ''ایمان'' لانے والوں نے ''سیدھے سادھے'' افراد اور عوام کے ذہنوں میں اس تصور کو پختہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ مغرب کے ''مذہبی رہنما'' حقائق کے خلاف کبھی نہ کوئی بات کرتے ہیں اور نہ کہتے ہیں۔ ہمیشہ ان کے اقوال اور افعال ''حقائق'' کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اگر واقعتاً ایسا ہی ہوتا تو پھر ان کا دفعہ 295-C (ت پ) کی مخالفت کرنا حیران کن ہے کیونکہ اس دفعہ کی مخالفت کرنے میں وہ ''حقائق'' سے اعراض اور روگردانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 295-C کا ایک ایک لفظ اور عبارت کا

ایک ایک جملہ یہ واضح کر رہا ہے کہ اس کا استعمال کسی مذہبی فرقہ، گروہ، جماعت اور طبقہ کے خلاف اس لیے نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق عیسائی، یہودی اور قادیانیوں سے ہے اور اس لیے اس دفعہ کے مطابق کارروائی عمل میں لائی جائے بلکہ اس کے برعکس ہر اس شخص کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے جو ''توہین رسالت ﷺ'' کا ارتکاب کر رہا ہے، چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہلواتا ہو۔ ''توہین رسالت ﷺ'' کے ارتکاب کرنے والے میں یہ تفریق نہیں کی جاسکتی ہے کہ چونکہ وہ غیر مسلم ہے، اس لیے قانون عمل میں لایا جائے بلکہ اگر ''توہین رسالت ﷺ'' کا ارتکاب کرنے والا خدانخواستہ مسلمان بھی ہوگا تو اس کے خلاف بھی یہ قانون اسی طرح حرکت کرے گا جس طرح غیر مسلم کے خلاف حرکت کرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قانون کا اطلاق جتنی قوت سے کافر پر ہوتا ہے اتنی قوت سے ''توہین'' کرنے والے ''نام نہاد مسلمان'' کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ یہ قانون تو اندھا ہے جو صرف قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو دیکھتا ہے اس کے مذہب، گروہ، جماعت کو نہیں دیکھتا۔

دوسری طرف حکومت کے وزرا، اسلام کی تعلیمات کے بارے میں احساس کمتری کا اس حد تک شکار نظر آتے ہیں کہ اسلام پر کی جانے والی نکتہ چینی اور دریدہ دہنی کا جواب دینے کی بجائے وہ اسلام دشمن افراد کی صفائی پیش کرنے کے سلسلے میں، ان سے بھی زیادہ پیش پیش ہوتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ دنوں قومی اسمبلی میں ایک توجہ دلاؤ نوٹس کے جواب میں وفاقی وزیر مذہبی امور نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''آرچ بشپ آف کنٹربری'' کے حالیہ ریمارکس اسلام یا مسلمانوں کے خلاف نہیں تھے۔ اگر واقعی ''آرچ بشپ'' کے ریمارکس اسلام یا مسلمانوں کے خلاف نہیں تھے تو چند دن پہلے وزیر موصوف نے کس پس منظر میں موصوف پادری سے ملاقات میں 295-C کے خلاف ان کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی تھی؟ اگر وہ اسلام یا مسلمانوں کے حق میں تھے تو ''خدشات'' دور کرنے کا مقصد کیا تھا؟ یہ دو متضاد دعوے کس امر کی غمازی کر رہے ہیں؟

دفعہ 295-C کیا ہے، غالباً اس کو مکمل پڑھنے کی نہ تو مغرب کے پجاریوں نے اور نہ ہی آزادی رائے کے متوالوں نے اور نہ ہی غیر ملکی مشنری اداروں کے کارپردازوں نے شعوری طور پر کوشش کی ہے۔ اس قانون کی پوری عبارت میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس میں ''عیسائی'' یا ''یہودی'' یا ''غیر مسلم'' یا ''مسلم'' کے لفظ سے توہین کرنے والے کی تعین کی گئی

ہو۔ دفعہ 295-C (ت پ) کی مکمل عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

عنوان: حضرت محمد ﷺ کی شان میں توہین آمیز الفاظ وغیرہ استعمال کرنا۔

"جو شخص بذریعہ الفاظ زبانی، تحریری یا اعلانیہ، اشارتاً یا کنایتاً، بالواسطہ یا بلاواسطہ بہتان تراشی کرے یا رسول کریم حضرت محمد ﷺ کے پاک نام کی بے حرمتی کرے، اسے سزائے موت یا سزائے عمر قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

("دفعہ 295 سی میں "یا عمر قید" کا لفظ مکمل اسلامی سزا کے خلاف تھا، اس لیے وفاقی شرعی عدالت نے اکتوبر 1990ء میں اپنے فیصلے میں صدر پاکستان کی ہدایت کی کہ وہ 30 اپریل 1991ء تک اس قانون کی اصلاح کریں اور "یا عمر قید" کے الفاظ ختم کریں، اور یہ کہ اگر تاریخ مقررہ تک ایسا نہ کیا گیا تو پھر اس کے بعد یہ الفاظ خود بخود کالعدم متصور کیے جائیں گے اور صرف سزائے موت، ملک کا قانون بن جائے گا، چنانچہ مقررہ تاریخ تک یہ کام نہ ہو سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے مطابق یہ الفاظ خود بخود کالعدم ہو گئے۔")

آپ نے قانون کی مکمل عبارت ملاحظہ فرمائی ہوگی کہ اس میں کسی لفظ میں بھی کسی مذہبی یا فرقہ کی تعین نہیں کی گئی تو پھر قانون کے "پجاریوں" اور "پجارنیوں" "قانون دانوں" اور "قانون دانیوں" کا اس قدر واضح قانون کے خلاف آہ و بکا اور آہ و زاری کرنا، شور مچانا، ہنگامہ آرائی کرنا کس امر کی چغلی کھا رہا ہے؟

افسوس صد افسوس! ایسے مسلمان وکلا پر جن کے نزدیک ایک "گناہگار" انسان کی عظمت ایک "معصوم عن الخطا نبی مکرم ﷺ" سے کہیں زیادہ اور "فائق تر" ہے۔ جب ان دونوں میں وہ تقابل کرنے بیٹھتے ہیں تو انہیں "انسان" اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرستادہ "نبی مکرم ﷺ" سے زیادہ باعث عزت نظر آتا ہے۔ "انسان" کی توہین تو ان کے "مزاج شاہانہ" پر "بار گراں" قرار پاتی ہے اس لیے "ہتک عزت" کا دعویٰ کرنا قانونی تقاضا ٹھہرا لیکن خالق کائنات کے آخری فرستادہ "نبی مکرم ﷺ" کی توہین کرنا نہ تو "قابل نفرت" نہ "باعث ننگ و عار" نہ "خلافت انسانیت" نہ اخلاقی تعلیمات کے خلاف، نہ "عیسائیت اور یہودیت کی مذہبی تعلیمات" کے خلاف بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کے "اخلاق عالیہ" کا "شاہکار" نمونہ قرار پاتا ہے۔

مغرب کے پجاریوں اور آزادی رائے کے علمبرداروں کی نگاہ میں "موت کی سزا" توہین انسانیت کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ اس لیے صبح و شام 'موت کی سزا' کے خلاف

ہنگامہ آرائی کرتے رہتے ہیں اور اسے وحشیانہ، جابرانہ اور ظالمانہ سزا قرار دیتے ہیں۔ وہ ''مغربی افکار'' کے بوجھ تلے ''مغربی فلسفہ تعزیر'' کو ''حقوق انسانی'' کی قدروں کے حوالے سے دیکھنے میں اس قدر مستغرق رہتے ہیں کہ ''حقوق اللہ'' اور ''حقوق العباد'' میں امتیاز بھی نہیں کر پائے، اسی کشمکش میں نگاہوں سے یہ بات بھی اوجھل ہو جاتی ہے کہ خود یورپ اور مغرب میں توہین انسانیت تو دور کی بات ہے ''توہین شہنشاہیت'' بھی ''قابل تعزیر'' جرم قرار پائی جاتی ہے چنانچہ برطانوی رعایا میں سے جو شخص برطانوی حدوں کے اندر یا باہر رہتے ہوئے بادشاہ کے دشمنوں سے تعلق رکھے یا بادشاہ ملکہ یا ولی عہد کی موت کے درپے ہو یا اس کا تصور کرے یا بادشاہ کی رفیقہ حیات یا اس کی بڑی بیٹی یا ولی عہد کی بیوی کی بے حرمتی کرے، بادشاہ کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرے یا نشانہ تاکے یا ہتھیار اس کے سامنے لائے جس سے مقصود اس کو نقصان پہنچانا یا خوف زدہ کرنا ہو، اسٹیٹ کے مذہب کو تبدیل کرے یا اسٹیٹ کے قوانین کو منسوخ کرنے کے لیے قوت استعمال کرے، یہ سب افعال برطانوی قانون کی رو سے غدر کبیر (High Treason) ہے جس کی سزا ''موت'' ہے خود جمہوریت کے دوسرے بڑے علمبردار امریکہ میں بادشاہت کے نہ ہونے کی بنا پر برطانیہ میں جو مقام بادشاہ کو دیا گیا ہے، وہی مقام متحدہ امریکہ کی قومی حاکمیت اور وفاقی دستور کو دے کر اسٹیٹ سے غداری کی سزا ''سزائے موت'' کی شکل میں روا رکھی گئی ہے۔

چونکہ یہ سب کچھ مغرب میں ہو رہا ہے، اس لیے اس کے جرم کی ہر سزا کا حکم ''سر آنکھوں'' پر۔ اب یہ سزائیں بھی ''قابل احترام'' شکل اختیار کر جائیں گی اور اسی پس منظر میں ''توہین انسانیت'' کا فلسفہ بھی بدل جائے گا اور ان سزاؤں کے دلائے جانے کے جواز کی ترجیحات میں مغربی اقدار کے پجاری اپنی مزعومہ ''حقوق انسانی'' کی قدروں کو یک لخت پس پشت ڈالتے نظر آئیں گے۔

اسی طرح کے مغربی افکار کی رنگینیوں کو ایک مشہور و معروف قانون دان نے اپنی تالیف لطیف ''ناموس رسول ﷺ اور قانون توہین رسالت ﷺ'' میں خوب خوب روشنی ڈالی ہے۔ جس کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں جس سے یہ ثابت کیا ہے کہ ''توہین رسالت ﷺ'' کی سزا صرف مسلمانوں کے نزدیک قابل مستوجب نہیں ہے بلکہ خود عیسائیوں کے ہاں بھی قابل مستوجب ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

''موسوی قانون کے تحت قبل مسیح کے انبیا کی اہانت اور تورات کی بے حرمتی کی سزا ''سنگسار'' مقرر تھی۔ رومن ایمپائر کے شہنشاہ جس ٹینین (Justinian) کا دور حکومت طلوع اسلام سے چند سال قبل 265 تا 525 صدی عیسوی پر محیط ہے، رومن لاء کی تدوین کا سہرا بھی اسی کے سر ہے اور اس کو عدل وانصاف (Just and Justice) کا مظہر بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے جب دین مسیحی قبول کر لیا تو قانون موسوی کو منسوخ کر کے انبیائے بنی اسرائیل کی بجائے صرف یسوع مسیح کی توہین اور انجیل کی تعلیمات سے انحراف کی سزا ''سزائے موت'' مقرر کی۔ اس کے دور سے قانون ''توہین مسیح'' سارے یورپ کی سلطنتوں کا قانون بن گیا۔ روس اور اسکاٹ لینڈ میں اٹھارہویں صدی تک اس جرم کی سزا ''سزائے موت'' ہی دی جاتی رہی ہے۔

روس میں بالشویک انقلاب کے بعد جب کیمونسٹ حکومت برسر اقتدار آئی تو سب سے پہلے اس نے دین ومذہب کو سیاست اور ریاست سے کلیتاً خارج کیا، اس کے بعد یہاں سزائے موت کی سزا برقرار رہی لیکن ''اہانت مسیح'' کے جرم کی پاداش میں نہیں بلکہ مسیح علیہ السلام کی جگہ اشتراکی امپریلزم کے سربراہ نے لے لی۔ اسٹالن جو رشین ایمپائر کا سربراہ بن بیٹھا تھا، اس کی اہانت تو بڑی بات تھی، اس سے اختلاف رائے رکھنا بھی سنگین جرم بن گیا۔ ایسے سر پھرے لوگوں کے یا تو سر کچل دیے جاتے تھے جس کی مثال لینن کے ساتھ ٹرانسکی کی خونچکاں موت کی صورت میں موجود ہے جو اپنی جان بچانے کے لیے روس سے بھاگ کر امریکہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا یا پھر ایسے مجرموں کو سائبریا کے بیگار کیمپوں میں موت کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

برطانیہ میں ''توہین مسیح'' (Blasphamy) کامن لاء کے تحت قابل تعزیر جرم ہے جبکہ بلاس فیمی ایکٹ (Blasphamy Act) میں مجرم کے لیے جسمانی موت کی بجائے شہری موت (Civil Death) کی سزا مقرر ہے۔

انگریزی زبان کے مستند قانونی لغت بلیک لاء ڈکشنری (Black's Law Dictionary) کی رو سے بلاس فیمی ایسی تحریر یا تقریر ہے جو خدا، یسوع مسیح علیہ السلام یا انجیل یا دعائے عام کے خلاف ہو اور جس سے انسانی جذبات مجروح ہوں یا اس کے ذریعے قانون کے تحت قائم شدہ چرچ کے خلاف جذبات کو مشتعل کیا جائے اور اس سے

بدکرداری کو فروغ ملے۔"

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں بلاس فیمی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"مسیحی مذہب کی رو سے بلاس فیمی گناہ ہے اور علمائے اخلاقیات بھی اس کی تائید کرتے ہیں جبکہ اسلام میں نہ صرف خدا کی شان میں بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی بھی بلاس فیمی کی تعریف میں آتی ہے۔(انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا۔ جلد 2 صفحہ 74)"

اہل مغرب اوران کے حواری اس امر کو بخوبی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو، چاہے وہ عمل کے اعتبار سے کتنے کورے ہی کیوں نہ ہوں، انہیں اپنے مذہب حقہ اور آقائے ختم الرسل، باعث کون و مکان، فخر کائنات حضرت محمد ﷺ سے اس قدر محبت اور عقیدت ہے کہ وہ ان کی عصمت و آبرو کی خاطر اپنی حقیری سی جان نچھاور کرنا اپنے لیے باعث سعادت خیال کرتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو؟ کیونکہ خود خالق کائنات ارشاد فرما رہا ہے:

"نبی (ﷺ) مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔"(الاحزاب:6)

اور سرور کائنات علیہ التحیۃ والثناء نے اس آیت مبارکہ کی توضیح وتشریح حدیث مبارکہ میں اس طرح فرمائی:

"تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد، والدہ اور اولاد حتیٰ کہ تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔"

یہ عقیدہ محبت و الفت ہر زمانہ میں ایک زندہ و جاوید حقیقت بن کر مسلمانوں کے اذہان وقلوب میں موجزن رہا ہے اور تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں کہ عاشقان پاک طینت راہ میں زخم ہائے خونچکاں سے معمور پیکر صدق و وفا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خیبر شکن قوت کے سرچشمہ کے منبع اور ابن ملجم کو واصل جہنم کرنے والے حیدر کرار اور حارث بن ابی ہالہ، حضرت خبیب، حضرت زید، حضرت سعد بن ربیع، معاذ اور معوذ، حضرت سمیہ، حضرت خنساء، حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہم وعنہن اجمعین اور برصغیر پاک و ہند میں غازی عبدالرشید شہید، غازی علم الدین شہید، غازی عبدالقیوم شہید، غازی میاں محمد شہید، غازی مرید حسین شہید، غازی محمد اسحاق شہید، غازی عبداللہ شہید، غازی معراج دین شہید، غازی امیر احمد شہید، غازی عبداللہ پشاوری شہید، غازی محمد صدیق شہید اور نامعلوم مجاہدین اور غازیین کی ایک

طویل فہرست ہے جو ان اشعار کی عملی صورت کے پیکر تھے اور جنہوں نے اپنی حقیری جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ابدی زندگی حاصل کی۔

نماز اچھی حج اچھا روزہ اچھا زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلمان ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ بطحاؐ کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایمان ہو نہیں سکتا

اور حضور ﷺ کی ذات مقدسہ پر ایمان تو نام ہی اس چیز کا ہے، بقول شاعر

محمدؐ کی محبت دین حق کی شرط اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس خطہ ارضی کے اوپر جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت رہی، وہاں وہاں گستاخان رسول کو سزائے موت بطور حد دینے کا قانون عام (Common Law) کے طور پر نافذ رہا۔ چنانچہ عراق، ایران، ترکی، شام، حجاز، سوڈان، مراکش، اسپین، ایران، بخارا، سمرقند، افغانستان اور انگریزوں کی آمد سے قبل جب تک ہندوستان میں فقہ اسلامی نافذ العمل رہا، گستاخان رسول کو موت کی سزا جاری کرنے کے قوانین موجود رہے۔

اور یہ سزا صرف اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہی درست نہیں بلکہ خود بائبل میں نہ صرف رسولوں کی شان مبارک میں گستاخی کرنے کی سزا ''سزائے موت'' ہے بلکہ انبیائے کرام اور رسول کے نائبین کی گستاخی کرنے کی سزا بھی واجب القتل قرار پاتی ہے۔ چنانچہ بائبل مقدس کی کتاب استثنا کے باب 17 فقرہ 12 میں ترجموں کے بار بار بدلے جانے اور آیات کے کم وبیش کیے جانے کے باوجود آج بھی یہ واضح حکم موجود ہے۔ اب یہ اہل بصیرت پر موقف ہے اور خاص طور پر اہل کتاب پر کہ اگر وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ بائبل اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہی ہے تو اس میں ذکر کردہ ''موت کی سزا'' کی حقانیت کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے؟ اور کیا اس فقرے کا حکم ان کے آج کل کے طرز عمل کے بطلان پر ناقابل تردید ثبوت نہیں ہے؟ کیا چند دنوں کے بعد وہ نئے شائع ہونے والے اردو ایڈیشن میں اس آیت کے حکم کو حسب سابق پھر بدل تو نہیں دیں گے؟

ایک بات اور باعث تعجب ہے کہ ہر مرتبہ شائع ہونے والی کتاب مقدس "انجیل" میں یہ عبارت لکھنے کی ضرورت پیش کیوں آتی ہے؟ (The Holy Bible in Urdu Revised Version) کیا ہر نئے ایڈیشن میں اردو یا دیگر زبانیں اپنا اسلوب بدل لیتی ہیں کہ دوبارہ ترجمہ کو زبان کے جدید اسلوب میں ڈھالنا ضروری ہو جاتا ہے؟

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بائبل کا مستند ترجمہ 1611ء میں کیا جا چکا ہے۔

The English Translation of the Bible completed in 1611

پھر بار بار نظر ثانی کرنا، دوبارہ غور کرنا اور ترمیم کرنے کا اختیار "کتاب اللہ میں کس قانون کی حیثیت سے "انسان" کو حاصل ہو گیا ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سچے پیروکار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واضح حکم کا انکار کیونکر کر سکتے ہیں؟ اگر انہیں اس کتاب مقدس کی حقانیت پر اعتقاد کامل ہے؟

- ❑ "تو، تو اس مرد یا اس عورت کو جس نے یہ برا کام کیا ہو، باہر اپنے پھاٹکوں پر نکال لے جانا اور ان کو ایسا سنگسار کرنا کہ وہ مر جائیں"۔ (کتاب استثنا باب 17 آیت 5)
- ❑ "شریعت کی جو بات وہ تجھ کو سکھائیں اور جیسا فیصلہ تجھ کو بتائیں، اس کے مطابق کرنا اور جو کچھ فتویٰ وہ دیں، اس سے داہنے یا بائیں نہ مڑنا اور اگر کوئی شخص گستاخی سے پیش آئے کہ اس کاہن کی بات جو خداوند تیرے خدا کے حضور خدمت کے لیے کھڑا رہتا ہے یا اس قاضی کا کہنا نہ سنے تو وہ شخص مار ڈالا جائے۔" (باب 17 'یت 11-12)

(یہ ترجمہ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور کے شائع کردہ کتاب مقدس کی سیریز نمبر 93 کے مطابق ہے)

محترم جناب محمد اسماعیل قریشی صاحب اپنی کتاب "ناموس رسالت ﷺ اور قانون توہین رسالت ﷺ" میں لکھتے ہیں:۔

"مسیحی برادری کو تو قانون توہین رسالت ﷺ کا خوشی سے خیر مقدم کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس قانون کی رو سے جناب مسیح علیہ السلام اور دیگر انبیائے کرام، جنہیں عیسائی اور مسلمان سب ہی اپنا پیغمبر برحق مانتے ہیں، کی شان میں گستاخی اور اہانت قابل تعزیر جرم بن گیا ہے۔ وران کی اہانت اور توہین کی وہی سزا مقرر ہے جو خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی

جناب میں گستاخی سزا ہے۔ مسلمان ان تمام پیغمبران کا اسی طرح احترام کرتے ہیں جیسے کہ یہودی اور عیسائی اپنے پیغمبروں کا احترام کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کے بارے میں کسی قسم کی گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

مسیحی برادری اور اقلیتی فرقوں کے رہنماؤں اور ان کے پیروکاروں کی نیت پر ہمیں شبہ نہیں۔ جب وہ ہمارے پیغمبر کی توہین اور گستاخی نہیں کریں گے تو پھر انہیں ڈر اور خوف کس بات کا ہے؟ کیا قانون بلاوجہ ان کے خلاف حرکت میں آ جائے گا؟ یا پھر پاکستان کی عدلیہ بے گناہ لوگوں کو جو توہین رسالت ﷺ کے مجرم نہیں، پھانسی کی سزا سنائے گی؟ یا کیا وہ پاکستان میں پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف گستاخی اور توہین کا لائسنس طلب کر رہے ہیں؟ ان میں جب کوئی بات بھی قرین قیاس نہیں تو پھر اس منسوخی کے مطالبہ کا آخر کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟

محمد احمد ترازی

مغرب کا منافقانہ دوہرا معیار.......

اِس سے زیادہ سفلہ پن، ذہنی پسماندگی، کمینگی اور ڈھٹائی کیا ہوگی کہ ایک ایسا معاشرے کا فرد، جس کی نوجوان لڑکیاں شادی سے پہلے جنسی تعلقات کو برا نہ سمجھیں، جس کے بچے اپنے باپ کا نام نہ جانتے ہوں، جس کے والدین کو اولاد اور اولاد کو والدین کی خبر نہ ہو، جس کے بوڑھے بے کار و ناکارہ سمجھ کر اولڈ ہوم میں پھینک دیئے جائیں اور جس کے مادر پدر آزاد ماحول میں انسان انسان کو نہ پہچانے، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شان اقدس میں زبان طعن دراز کرے، دامن مصطفیٰ ﷺ پر کیچڑ اچھالنے کی ناپاک جسارت کرے، دنیا بھر کے کروڑوں مسلمانوں کی دل آزاری کا مرتکب ہو اور وہاں کے حکمران و انتظامیہ دوسرے مذاہب بالخصوص اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی بے ادبی کی کوششوں کو آزادیٔ اظہار کا نام دے کر چپ سادھ لے تو اِسے اسلام دشمنوں کو خباثت و کمینگی اور ذلالت کی تمام حدوں کو پار کرنے کا موقع فراہم کرنے کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، شاید بے شرمی، بے حیائی، بے حمیتی اور منافقت کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی، دوسری طرف عالم اسلام کے غلام حکمرانوں کا شرمناک اور بزدلانہ طرزِ عمل کہ اپنے آقا انکل سام کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے یہ بھی بھول جائیں کہ کسی کے مذہبی عقائد کو نشانہ بنا کر اُسے مشتعل کرنا بھی اتنا ہی قابل مذمت اور قابل گرفت فعل ہے جتنا کہ تشدد کا ارتکاب کرنا۔

یہ حقیقت ہے کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے مغرب کے اپنے معیارات، اپنے پیمانے اور اپنے خودساختہ معنی و مفہوم ہیں، نائین الیون کے بعد نوایجاد شدہ مغربی لغت کسی غیر مسلم کے غلط کام کو جرم تو قرار دیتی ہے مگر کسی مسلمان سے اگر وہی کام سرزد ہوجائے تو وہ دہشت گرد قرار پاتا ہے، اسی طرح مغربی دنیا میں ایک یہودی کا ڈاڑھی رکھنا اُس کے مذہب کا حصہ مانا جاتا ہے، مگر ایک مسلمان کی ڈاڑھی اُسے انتہا پسند اور دہشت گرد

گردانتی ہے، اگر ایک عیسائی راہبہ "نن" اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپے تو کہا جاتا ہے اُس نے اپنے آپ کو خداوند مسیح کیلئے وقف کر دیا ہے، لیکن ایک مسلمان عورت اگر اسکارف اوڑھے تو مغرب اُسے نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، مغرب کو چرچ کی گھنٹیوں کا بجنا درست لگتا ہے مگر مساجد سے اذانوں کا بلند ہونا سماعتوں پر بوجھ اور نیند کُش محسوس ہوتا ہے، الغرض مغرب اپنے ہر فعل ہر عمل کیلئے آزاد و خودمختار مگر مسلمان اپنے فعل وعمل کیلئے قابل نفرت ومعتوب قرار پاتے ہیں، یہ ترقی یافتہ، رواداری اور حقوق انسانی کے عالمی چیمپئین اور اپنے آپ کو انسانی آزادی اور آزادیٔ اظہار کے دعویدار کہلانے والے مغرب کا وہ منافقانہ دوہرا معیار ہے، جس کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

جیسے نائن الیون کے بعد امریکہ میں 26 سالہ طارق مہانا کو ایک مقدمے میں ساڑھے سترہ سال کی سزا سنائی گئی، اِس نوجوان امریکی مسلم پر الزام تھا کہ وہ انٹرنیٹ پر القاعدہ کے پیغام کو عام کرنے کے لیے کوشاں تھا، جبکہ آزادیٔ اظہار سے قطع نظر یہ الزم جھوٹا تھا، اِسی طرح پاکستانی نژاد 25 سالہ جاوید اقبال کو 9 ماہ کی سزا سنائی گئی، جاوید اقبال کا گناہ یہ تھا کہ اُس نے حزب اللہ کے ٹیلی وژن چینل المنار کی نشریات کو امریکہ میں دکھانے کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کی تھیں، انٹرنیٹ پر پوسٹ کیے جانے والے ایک کارٹون میں ہالینڈ کے دائیں بازو کے سیاست دان گیرٹ ولڈر کو ایک نازی گارڈ سے تشبیہ دی گئی تھی، اِس سلسلے میں دھمکیاں موصول ہوتے ہی کارٹون کو ویب سائٹ سے ہٹالیا گیا، اِس کے برعکس جب گیرٹ ولڈر نے خود قرآن کی توہین کی اور اُسے ہٹلر کی خودنوشت کی طرح کی کتاب قرار دیا تو اُس کی اِس توہین کو "آزادیٔ اظہار" قرار دے کر ویب سائٹ سے ہٹانے سے انکار کر دیا گیا، جرمنی میں معروف مورخ ارنسیٹ اینڈلی کو ہولوکاسٹ کے بارے میں "اظہار رائے" پر سات سال کی سزا ہوئی، فرانس کے ممتاز فیشن ڈیزائنر جان گیلیانو نے یہودیوں پر تبصرہ کیا تو فرانس کے صدر فرانسواں ہالینڈ نے اُس سے فرانس کا اعلیٰ ترین سول اعزاز واپس لے لیا۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مغرب توہین اسلام اور گستاخی رسول ﷺ کو تو آزادیٔ اظہار سے تعبیر کرتا ہے مگر کسی فرد کو اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ہولوکاسٹ کے خلاف کچھ کہہ سکے، کیا مغرب میں کسی کی زبان پکڑنے کا دستور واقعی پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اور آیا مغرب میں کسی قوم کے ہاں نازک مانے جانے والے الفاظ وتعبیرات پر قدغن ہے یا صرف

ہمارے ہی مقدسات پر بھونکنے کی آزادی ہے...... آیئے اِس واقعہ سے حقیقت حال جانتے ہیں، ویسے بھی یہ واقعہ زیادہ پرانا نہیں، نہ ہی یہ کسی تنگ نظر ایشیائی یا افریقی معاشرے کا ہے کہ جس کی آسانی سے مذمت ہو جائے بلکہ یہ واقعہ قلب یورپ کا ہے، جب چند سال پیشتر یہ واقعہ پیش آیا تو تمام ذرائع ابلاغ میں نشر ہوا اور بی بی سی کی انگریزی ویب سائٹ پر اِس کی رپورٹ موجود ہے، جس کا عنوان ہے۔

"ہولوکوسٹ کے انکار کے مرتکب اِرونگ کو سزائے قید"

اِس واقعہ کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ "یورپی یہودیوں (پر گزرنے والی) ہولوکاسٹ کے انکار کے مرتکب پائے جانے والے برطانوی تاریخ دان ڈیوڈ اِرونگ کو ویانا میں تین سال قید کی سزا سنا دی گئی، 67 سالہ اِرونگ کمرہ عدالت میں حاضر ہوا تو اُس کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں، وہ نیلے کوٹ پینٹ میں ملبوس، اپنی کتاب "ہٹلر کی جنگ" اٹھائے ہوئے تھا، جو کہ نازیوں پر لکھی گئی اور جس میں ہولوکاسٹ کی (مبینہ) شدت کو مشکوک ٹھہرایا گیا ہے۔ عدالت میں برطانوی تاریخ دان ڈیوڈ اِرونگ نے اپنے اوپر عائد الزام کی بابت اعتراف جرم کیا، اُس نے عدالت کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ "مجھ سے غلطی ہوئی جب میں نے یہ کہا کہ آسچوٹس میں (عقوبت کے) کوئی گیس چیمبرز نہیں تھے۔" اُس نے اعتراف کیا کہ 1989 میں واقعی اُس نے نازی جرمنوں کے ہاتھوں کئی ملین یہودیوں کے قتل ہونے کا انکار کیا تھا، اُس نے کہا کہ تب اُس کا یہی خیال تھا اور یہ میں نے تب اپنے اُس وقت تک کے علم کی بنیاد پر کہا تھا، مگر 1991ء میں جب مجھے اچ مین کے وثائق دیکھنے کو ملے تب سے میں نے یہ کہنا موقوف کر دیا تھا اور اب میں یہ بات نہیں کہتا ہوں" اِرونگ نے عدالت کے سامنے (اپنے حالیہ موقف کی بابت) بیان دیتے ہوئے کہا "یقیناً نازیوں نے کئی ملین یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔"

قارئین محترم! مغرب کے یہاں مانے جانے والے فکری جرائم یعنی Thought Crimes کے مرتکب افراد کی ایک طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہے جس سے آپ پر آزادیٔ اظہار کی حدود بخوبی واضح ہو جائیں گی، مگر اِن میں سے ڈیوڈ اِرونگ کی مثال خاص اِس لئے منتخب کی کہ اِرونگ عدالت میں کھڑا ہو کر صاف کہہ رہا ہے کہ "میں اپنے اُس پرانے قول سے رجوع کر چکا ہوں، اب میں ویسے ہی اُس بات کا قائل نہیں ہوں اور نہ اب میں وہ بات کبھی کہوں گا اور یہ کہ یہ میری معلومات کا نقص تھا اور مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے۔"

اِس کے باوجود ڈیوڈ اِرونگ کو تین سال قید کی سزا ملتی ہے،سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ محض ایک اعتقاد رکھنے پر قدغن نہیں، کہاں ہے آزادیٔ فکر؟ یہاں تو محض ڈیوڈ اِرونگ کا ایک انٹرویو اور ایک تقریر قابل مواخذہ جرم ٹھہرتی ہے اور سترہ سال (1989 تا 2006) گزرنے کے باوجود اُس کو عدالت کے کٹہرے میں لے آیا جاتا ہے، کیا یہ آزادیٔ اظہار ہے، پھر ایک شخص کو تائب ہو جانے کے بعد اور عدالت میں بار بار اِس توبہ کا تذکرہ ہونے کے باوجود ہتھکڑیاں ڈال کر لایا جاتا ہے اور سزا سنادی جاتی ہے، آخر ایک اعتقاد، ایک نظریہ اور ایک قول ہی تو تھا جس سے اُس نے رجوع کر لیا ہے،لیکن یوں لگتا ہے کہ مغرب میں ''ہولوکاسٹ کے گستاخ'' کی تو توبہ تک قبول نہیں ہے!!!

کیا یہ واقعتا مغرب کا نام نہاد آزادیٔ اظہار ہرگز کسی قید سے واقف نہیں۔؟ کیا واقعتا ہر آدمی وہاں آزاد ہے کہ وہ جو مرضی کہے اور جو مرضی لکھے، چاہے کسی قوم یا کسی طبقے کے جذبات ہی اُس کے اِس کہے سے مجروح کیوں نہ ہوتے ہوں۔؟ کیا واقعتا یہ ایک عجیب وغریب اور انہونی بات ہوگی کہ ڈیڑھ ارب مسلمان آج مغرب سے یہ تقاضا کریں کہ جس طرح سامی جذبات کے احترام میں یا اِسی طرح کے کچھ نازک مقامات پر اُن کے یہاں زبان سنبھال رکھنے کی پابندی ہے اور جس طرح یہودیوں کے ہولوکاسٹ کی حرمت کے بالمقابل اُن کے یہاں آزادیٔ اظہار کی حدود ختم ہو جاتی ہیں اور یہ کہ جس طرح زبان وقلم پر ایسی کسی پابندی کے عائد ہونے سے اُن کے تہذیبی خدوخال پر کوئی قیامت نہیں آ جاتی، اُسی طرح ہمارے مقدسات کے بالمقابل اور ہمارے نبی ﷺ کی حرمت وناموس کے آگے وہ اگر زبانوں کو لگام دے رکھنے کے پابند رہتے ہیں تو بھی اُن کے آزادیٔ اظہار پر کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔؟

قارئین محترم! خود مغرب ہی کی منطق کی رو سے ہمارے اِس مطالبے میں آخر کونسی انہونی بات ہے، ہمارے روشن خیال متعجب نہ ہوں، جس طرح معاشروں میں کچھ چیزوں کی حرمت قائم کر دیے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی نہ کسی چیز کی حرمت تو ہر معاشرے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، اگر ہولوکاسٹ اتنا ہی قابل احترام ہے تو اِس تناظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہولوکاسٹ کا یہ قانون آزادیٔ اظہار پر قدغن نہیں؟ کیا ہولوکاسٹ کیلئے علیحدہ سے قانون سازی کرنا اور مسلمانوں کے مذہبی شعار کیلئے قانون بنانے سے گریز کرنا متضاد رویے کی عکاسی نہیں کرتا اور کیا ہولوکاسٹ کے منکرین کیلئے قانون کی موجودگی اسلام اور پیغمبر

اسلام ﷺ کے حوالے سے بھی ایسے ہی کسی قانون کے نفاذ کا جواز فراہم نہیں کرتا؟ مغرب کے پاس اِن سوالوں کا کوئی جواب نہیں، نہ ہی وہ اِن سوالوں کے جواب تلاش کرنا اور دینا چاہتا ہے، دراصل مغرب کا یہ طرزِ عمل اُس کے اُس ذہنی خناس کو ظاہر کرتا ہے جس کے مظاہرے اکثر و بیشتر توہین آمیز خاکے، متنازعہ کتب ورسائل اور گستاخانہ فلموں کی شکل میں سامنے آتے رہتے ہیں اور مغرب کا خبث باطن اُسے بغض و کینہ اور نفرت پن پر ابھارتا رہتا ہے، یہ اَمر مغرب کے اُس نفسیاتی روگ اور دلی مرض کی جانب اشارہ کرتا ہے، جس کا راز اُس ذلت آمیز ہزیمت اور شرمناک شکست میں پوشیدہ ہے جو اُس نے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے کھائی تھی، اسلام اور عالم اسلام کے خلاف مغربی دنیا کا یہ بغض اب پوری طرح عریاں ہو چکا ہے، ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ اب کھل کر عملی شکل اختیار کر چکا ہے، یہ شیطنت کا وہ پہلو ہے جس کا اظہار صدیوں سے ہو رہا ہے اور جسے مغرب آزادیٔ اظہار کے لبادے میں چھپانا اور تحفظ چاہتا ہے۔

دراصل مغربی دنیا نے آزادیٔ اظہار کو ایک حفاظتی ڈھال بنالیا ہے، اہل مغرب اسلام اور رسول اکرم ﷺ کی توہین کرتے ہیں اور آزادی اظہار کے حفاظتی قلعے میں جا چھپتے ہیں، گذشتہ دنوں امریکہ میں اسلام اور رسول اکرم ﷺ کی توہین آمیز فلم بنائی گئی تو امریکی صدر خاموش رہا، لیکن جب مسلم دنیا کے ایک ملک میں ایک چرچ جلادیا گیا تو اُس نے فلم کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ فلم کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں انہیں چرچ کو نذر آتش کیے جانے کی بھی مذمت کرنا چاہیے، گویا امریکی صدر کے نزدیک اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ''شعوری توہین'' اور اُس کے ردِعمل میں ایک چرچ کا جلایا جانا اخلاقی اعتبار سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں، جبکہ اسلام مذہبی عبادتگاہوں کے تحفظ کو بڑی اہمیت دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ جنگ کے دوران بھی مسلمانوں کو اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی عبادت گاہ کو نقصان پہنچائیں، لیکن مسلمان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ دنیا کی واحد سپر پاور کہلانے والے ملک کا سربراہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تکریم سے زیادہ ایک چرچ کی حفاظت میں دلچسپی رکھتا ہے، یہی حال دیگر امریکی حکام کا بھی ہے، سابق امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے فلم کو ''افسوسناک'' تو قرار دیا لیکن ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ'' ہم اپنے شہریوں کو اُن کے خیالات کے اظہار سے نہیں روک سکتے، خواہ اُن کے خیالات کتنے ہی کڑوے کسیلے کیوں نہ ہوں۔''

اِس حوالے سے گوگل نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ (توہین آمیز) فلم کی ویڈیو ہمارے رہنما اصولوں کے دائرے میں ہے، چنانچہ ہم اِسے یوٹیوب سے نہیں ہٹا سکتے۔ 25 ستمبر 2012 کی دی نیوز کراچی کی اشاعت میں کالم نگار میر عدنان عزیز گوگل کے مؤقف کو یوں عریاں کرتے ہیں کہ ''آزادی اظہار کا پرچم بلند کرنے والی گوگل نے یوٹیوب سے ایک دو نہیں 1710 ایسی ویڈیوز کو ہٹایا ہے، جن سے اکثر میں یا تو ہولوکاسٹ کا انکار کیا گیا تھا یا ہولوکاسٹ کا انکار کرنے والوں کا دفاع کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا بڑے پیمانے پر قتل ہر اعتبار سے ''تاریخی اور تحقیقی'' موضوع ہے اور اِس میں فی نفسہ کوئی ''تقدیس'' نہیں ہے، چنانچہ اِس سلسلے میں ایک سے زیادہ آراء موجود ہو سکتی ہیں، لیکن گوگل نے ایک تاریخی تحقیقی اور عالمی موضوع کو ''مقدس'' بنا دیا ہے اور یوٹیوب سے ایک دو نہیں 1710 ویڈیوز ہٹا دیں۔'' مغرب کے اِس طرز فکر و عمل کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ مغرب میں آزادی اظہار نہ صرف یہ کہ مطلق ہے، بلکہ مغرب میں اِس سے زیادہ مقدس شے کوئی نہیں۔

یقیناً یہ فلم ایک سوچی سمجھی سازش اور اسلام کے خلاف مغرب کی اُس بین الاقوامی مہم کا حصہ ہے جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کا کرۂ ارض سے صفایا کرنا ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر مسلمانوں کے خلاف ہی ایسی مذموم حرکات کا ارتکاب کیوں کیا جاتا ہے؟ کیوں توہین آمیز خاکوں، شعائر اسلامی کی توہین اور اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی کے ذریعے بار بار مسلمانوں کی غیرت کو للکارا جاتا ہے؟ کیوں یورپی ممالک میں مسلمان کو دہشت گرد اور مسلم خواتین کے اسکارف پہننے پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔؟ اِس کا سیدھا سادہ جواب ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان دیگر الہامی کتب (توریت، زبور، انجیل) اور تمام انبیاء و مرسلین پر ایمان رکھنے کے ساتھ اسلام، شعائر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی عزت و حرمت حوالے بڑے حساس واقع ہوئے ہیں، حضور ﷺ کی عزت و ناموس کا تحفظ اور شعائر اسلامی کی حفاظت اسلام کی بنیاد و اساس ہے، جس کیلئے ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے اور زبان و نسل سے تعلق رکھتا ہو، اسلام اور صاحب اسلام ﷺ کی عزت و ناموس کا تحفظ اپنی جان سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا ہے، جناب رسالتمآب ﷺ سے والہانہ عشق و محبت کا تقاضہ مختلف رنگ و نسل اور زبان و علاقوں میں تقسیم اُمت مسلمہ کو ہمیشہ اہل کفر کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیتا ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو عالم کفر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے اور جس

کے خاتمے کیلئے وہ وقتاً فوقتاً اِس قسم کی شرانگیز مذموم کوششیں کرتا رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالم کفر مسلمانوں سے نہیں بلکہ اُن کے ایمان کی راکھ میں چھپی محبت رسول ﷺ کی اُس چنگاری سے ڈر وخوف اور خطرہ محسوس کرتا ہے، جو کسی بھی وقت شعلہ جوالہ بن کر اُس کے طاغوتی نظام کے درودیوار زمین بوس کرسکتی ہے، لیکن ہر بار وہ اسلام دشمنی میں یہ بات بھول جاتا ہے کہ مسلمان خواہ کتنا ہی بدعمل اور دین سے دور کیوں نہ ہو، ناموس رسالت ﷺ کے تحفظ کیلئے جان دینا یا لینا ایک اعزاز اور سعادت سمجھتا ہے، اُسے اپنی جان مال اور عزت وآبرو سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی عزت وحرمت عزیز ہے، جس کی حفاظت کیلئے وہ ہر لحہ کٹ مرنے کو تیار ہے، لہٰذا شعائر اسلامی کا مذاق اڑانے اور توہین رسالت ﷺ کی ناپاک جسارت کرکے صلیبی جنگ بھڑکانے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی سے زیادہ موت سے محبت کرنے والے مسلمانوں کی غیرت کو نہ للکاریں، اگر یہ اٹھ کھڑے ہوئے تو پھر تمہیں دنیا کے کسی کونے میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔

کمزور ہیں ہم لوگ مگر اتنا بتا دیں
میراث ہے دار پہ انکار نہ کرنا
آزادئ رائے کا احساس ہے لیکن
تم ذات محمد ﷺ پہ کبھی وار نہ کرنا

شاہنواز فاروقی

آزادیٔ اظہار اور مغرب کا دوہرا معیار

مغربی دنیا نے آزادیٔ اظہار کو ایک بنکر بنالیا ہے۔ اہل مغرب، اسلام اور رسول اکرم ﷺ کی توہین کرتے ہیں اور آزادیٔ اظہار کے بنکر میں جا چھپتے ہیں۔ امریکا میں اسلام اور رسول اکرم ﷺ کی توہین کے لیے فلم بنائی گئی اور بارک حسین اوباما خاموش رہے۔ مسلم دنیا کے ایک ملک میں ایک چرچ جلا دیا گیا تو انہوں نے فلم کی مذمت کی اور فرمایا کہ جو لوگ فلم کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں، انہیں چرچ کو نذر آتش کیے جانے کی بھی مذمت کرنا چاہیے۔ گویا صدر امریکا کے نزدیک اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ''شعوری توہین'' اور اس کے ردعمل میں ایک چرچ کا جلایا جانا اخلاقی اعتبار سے مساوی حقیقت ہیں۔ اسلام مذہبی عبادت گاہوں کے تحفظ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جنگ کے دوران میں بھی مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی عبادت گاہ کو نقصان پہنچائیں۔ لیکن مسلمان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ دنیا کی واحد سپر پاور کہلانے والے ملک کا سربراہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تحریم سے زیادہ ایک چرچ کی حفاظت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ امریکا کی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے فلم کو ''افسوسناک'' قرار دیا لیکن فرمایا کہ ہم اپنے شہریوں کو ان کے خیالات کے اظہار سے نہیں روک سکتے۔ خواہ ان کے خیالات کتنے ہی کڑوے کسیلے کیوں نہ ہوں۔ گوگل نے اس سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ (توہین آمیز) فلم کی ویڈیو ہمارے رہنما اصولوں کے دائرے میں ہے، چنانچہ ہم اسے یوٹیوب سے نہیں ہٹا سکتے۔

مغرب کے اس طرز فکر و عمل کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ مغرب میں آزادیٔ اظہار نہ صرف یہ کہ مطلق ہے بلکہ مغرب میں اس سے زیادہ مقدس شے کوئی نہیں۔ لیکن میر عدنان عزیز نے دی نیوز کراچی کی 25 ستمبر 2012ء کی اشاعت میں ایک دلچسپ کالم لکھا ہے۔ اس کالم میں میر عدنان عزیز نے بتایا ہے کہ آزادیٔ اظہار کا پرچم بلند کرنے والی گوگل نے یوٹیوب سے

ایک دو نہیں، 1710 ایسی ویڈیوز کو ہٹایا ہے جن سے اکثر میں یا تو Holucast کا انکار کیا گیا تھا یا Holucast کا انکار کرنے والوں کا دفاع کیا گیا تھا۔ ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا بڑے پیمانے پر قتل ہر اعتبار سے ''تاریخی'' اور ''تحقیقی'' موضوع ہے اور اس میں فی نفسہٖ کوئی ''تقدیس'' نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک سے زیادہ آرا موجود ہوسکتی ہیں لیکن گوگل نے ایک تاریخی تحقیقی اور عالمی موضوع کو ''مقدس'' بنادیا ہے اور یوٹیوب سے ایک دو نہیں، 1710 ویڈیوز ہٹا دیں۔ سوال یہ ہے کہ اس دوہرے معیار کا کیا جواز ہے؟ میر عدنان عزیز نے مغرب کے دوہرے معیار کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ نائن الیون کے بعد امریکہ میں 26 سالہ طارق جیانا کو ایک مقدمے میں ساڑھے سترہ سال کی سزا سنائی گئی، اس نوجوان امریکی مسلم پر الزام تھا کہ وہ انٹرنیٹ پر القاعدہ کے پیغام کو عام کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ آزادیٔ اظہار سے قطع نظر یہ الزام جھوٹا تھا۔ پاکستانی نژاد 26 سالہ جاوید اقبال کو 9 ماہ کی سزا سنائی گئی۔ جاوید اقبال کا ''گناہ'' یہ تھا کہ اس نے حزب اللہ کے ٹیلی وژن چینل المنار کی نشریات کو امریکہ میں دکھانے کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ انٹرنیٹ پر پوسٹ کیے جانے والے ایک کارٹون میں ہالینڈ کے دائیں بازو کے سیاست دان گیرٹ ولڈر کو ایک نازی گارڈ سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں دھمکیاں موصول ہوتے ہی کارٹون کو ویب سائٹ سے ہٹا لیا گیا۔ اس کے برعکس جب گیرٹ ولڈر نے خود قرآن کی توہین کی اور اسے ہٹلر کی خودنوشت کی طرح کی کتاب قرار دیا تو اس کی اس توہین کو ''آزادیٔ اظہار'' قرار دے کر ویب سائٹ سے ہٹانے سے انکار کردیا گیا۔ یورپ کے معروف مورخ ڈیوڈ ارونگ کو Holocaust کے بارے میں ''اظہار رائے'' پر 3 سال کی سزا ہوئی۔ فرانس کے ممتاز فیشن ڈیزائنر جان گیلیانو نے یہودیوں پر تبصرہ کیا تو فرانس کے صدر فرانسس ہالینڈ نے اس سے فرانس کا اعلیٰ ترین سول اعزاز واپس لے لیا۔

ان حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب میں آزادیٔ اظہار نہ مطلق اور نہ مقدس ہے۔ البتہ اسلام اور نبی اکرم ﷺ کا معاملہ آتے ہی مغرب میں آزادیٔ اظہار مطلق بھی ہو جاتی ہے اور مقدس بھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ صورتحال 21 ویں صدی میں رونما ہورہی ہے جب ایک خبر لمحے بھر بعد پوری دنیا کی سماعت تک پہنچ جاتی ہے اور کوئی راز، راز نہیں رہتا اور کسی بات پر پردہ ڈالنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن مغربی دنیا کو اس بات کی رتی برابر بھی پروا نہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

اس کی بنیادی وجہ مغرب کا جھوٹا احساس برتری ہے۔ مغرب کو اپنے رنگ، اپنی نسل اور اپنی تہذیب کی برتری کا زعم ہے۔ یہ زعم اتنا بڑھا ہوا ہے کہ مغربی دنیا کے رہنما جھوٹ بھی بولیں تو ان کے جھوٹ کو اسلامی دنیا کے سچ پر فوقیت دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے جھوٹ کو انسانیت کی خدمت باور کرایا جاتا ہے۔ امریکا کے صدر جارج بش نے عراق پر الزام لگایا کہ اس کے پاس بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں۔ مغربی دنیا نے اس دعوے کو کسی تحقیق کے بغیر درست مان لیا۔ حالانکہ چند ہی ماہ بعد ثابت ہوگیا کہ عراق کے پاس بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود جارج بش کا جھوٹ اس طرح چیلنج نہ ہوسکا جس طرح اسے چیلنج ہونا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں مغربی دنیا کے رہنماؤں کا جھوٹ یہاں تک پہنچا کہ برطانیہ کے سابق وزیراعظم ٹونی بلیئر نے عراق کے خلاف جارحیت کے حوالے کہا کہ عراق سے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار تو برآمد نہ ہوسکے لیکن تاریخ بالآخر ثابت کرے گی کہ ہم نے عراق پر حملہ کرکے ٹھیک کیا۔ ٹونی بلیئر کے اس بیان کو درست مان لیا جائے تو دنیا کے ہر ملک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حقائق کے بجائے تاریخ کی بنیاد پر جب چاہے، دوسرے ملک کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرسکتا ہے۔ تجزیہ کیا جائے تو مغرب کے اس طرز عمل کی وجہ مغرب کی مادی طاقت یا Physical Power ہے۔ مغرب نے اس طاقت کو ہی حق بنا لیا ہے اور اس میں طاقت کو وہ دلیل سمجھتا ہے۔ اس کے بغیر مغرب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے حوالے سے وہ سب کچھ نہیں کرسکتا تھا جو وہ کررہا ہے۔

سلمان نسیم ندوی

آزادی رائے کا دوہرا معیار

عصر حاضر میں یورپین میڈیا اور اہل قلم کا شیوہ یہ بن گیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر ہونے والی بڑی سے بڑی زیادتی کے خلاف معمولی احتجاج کو بھی آزادیٔ رائے، پر شب خون بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسی ''آزادیٔ رائے'' کو وسیلہ بنا کر ہر اس شخص کے عقائد، روایات، تاریخ اور تہذیب وثقافت پر ڈاکا ڈالا جاتا ہے جو اس سے سیاسی، فکری یا مذہبی اختلاف رکھتا ہو۔ اسلام کی توہین کرنے والوں کا سب سے بڑا ہتھیار ''آزادیٔ رائے'' ہے، یہ ہتھیار گستاخانِ اسلام کی نہ صرف حمایت کرتا ہے بلکہ اس کو پوری بے باکی سے پناہ دیتا ہے، اس کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کر کے دوسروں کو اسلام اور مسلمانوں کی دل آزادی کی کھلے عام دعوت دیتا ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ڈنمارک کا سانحہ اس کا ثبوت ہے، اسی آزادیٔ رائے کی شہ پر ڈنمارک سے ملتے جلتے حادثات میں تیزی آتی جارہی ہے۔

یورپ میں ''آزادیٔ رائے'' کی کیا حقیقت ہے اور اس کا کیا مفہوم ومصداق ہے، اس کا اندازہ حال ہی میں برطانیہ کے ایک پادری ڈاکٹر روون ولیمس کے بیان اور اس کی شدید مخالفت سے لگایا جاسکتا ہے۔

7 فروری 2008ء کو لندن کے لیمبتھ پلیس نامی مقام پر وہاں کے وکلا کے سامنے "Islamic English Law" کے عنوان سے 12 صفحات پر مبنی ایک تقریر میں ڈاکٹر ولیمس نے برطانیہ میں سول اور مذہبی قانون پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس بات پر بار بار زور دیا کہ برطانیہ میں چونکہ مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں، اس لیے وہاں کے عیسائی مذہب پر مبنی قانون میں دوسرے مذاہب، خاص کر اسلامی شریعت کو بھی جگہ دینی چاہیے، لہٰذا اپنی اس تقریر کے ذریعے انہوں نے حکومت برطانیہ اور وہاں کے قانون سازوں کو اس بات کا مشورہ دیا کہ انہیں برطانوی قانون میں اسلامی شریعت کو شامل کرنے کی کوشش

کرنی چاہیے، کیونکہ اسلام کا یہ قانون کسی نظام یا افراد کے ذریعے نہیں بنایا گیا ہے بلکہ یہ شریعت خود اللہ کے کلام یعنی قرآن کریم سے ماخوذ ہے، جس پر دنیا کے تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، اپنی بحث کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر ولیمس نے کہا:

> ''برطانوی معاشرہ میں مسلمانوں کو کیا مقام ملنا چاہیے؟ اس پر ہمیشہ گرما گرم بحث ہوتی رہی ہے، یہاں کے مسلم باشندے بھی اپنی شریعت کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں جس پر بعض "Opinion Pols" بھی کرائے جاتے رہے ہیں، اس طرح کے سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ برطانیہ کے عام باشندوں کا اسلامی شریعت کے بارے میں یہی خیال ہے کہ یہ قانون عورتوں پر پابندیاں عائد کرتا ہے اور غلطی کا ارتکاب کرنے پر سخت جسمانی سزا دینے کی حمایت کرتا ہے جو سراسر غلط ہے۔''

کنٹربری کے آرک بشپ، ڈاکٹر روون ولیمس برطانوی قانون میں اسلامی شریعت کو شامل کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''شریعت کا درست ہونا کسی انسانی فیصلے، ووٹ یا ترجیحات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لیے شریعت کو قبولیت کا درجہ دینا، قانون، انصاف کے ایک ایسے طریقہ کو قبولیت عطا کرنا ہے جو کہ خدا کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب پر مبنی ہے اور کسی واحد نظام کا حصہ نہیں ہے۔''

ڈاکٹر روون ولیمس انقلابی فکر کی حامل شخصیت ہیں۔ دنیائے مسیحیت کے مروجہ افکار و خیالات سے بغاوت کی بنیاد پر وہ کئی بار تنازعات کا شکار بھی ہو چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس راہ پر مضبوطی سے کار بند ہیں کہ حق کی آواز اٹھائی جانی چاہیے۔ ڈاکٹر روون ولیمس کا پچھلا بیان بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ بیان دراصل آیت قرآنی: ''شهد شاهد من اهلها'' (یوسف:26) کا مصداق ہے۔ اس بیان میں ان کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے ایک مسلمہ حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور اس طرح انہوں نے آزادیٔ رائے کے استعمال کو صحیح رُخ اور سمت دینے کی کوشش کی ہے۔

مشاہدین نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر روون کی اس رائے کی تردید نے یورپ میں ہسٹریائی انداز اختیار کرلیا۔ آزادیٔ رائے کے وہ محافظین جنھوں نے ڈنمارک کے مذموم واقعہ کی پشت پناہی کے لیے اپنی پوری قوت جھونک دی تھی، وہ برطانیہ جس کو جمہوریت کی ماں کہا جاتا ہے اور جو ''آزادیٔ رائے'' کے عنوان سے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، سب کے سب اپنا نعرہ بھول کر پادری کی مخالفت میں یک آواز ہوگئے، برطانیہ کے وزیراعظم کے ترجمان نے کہا:

''ہم برطانوی قانون کے علاوہ کسی اور قانون کو تسلیم نہیں کرسکتے، ہمارے ملک میں برطانوی قانون ہی نافذ العمل ہوگا، جس کی بنیاد برطانوی اقدار پر رکھی گئی ہے۔''

برطانیہ کی اپوزیشن جس میں کنزرویٹو اور لبرل دونوں طرح کی جماعتیں ہیں، نے بھی ڈاکٹر روون کے اس بیان پر تنقید کی ہے۔ کرنل آرمٹس ٹید نے مشورہ دیا ہے کہ: ''اینگلیکن چرچ کی قیادت کرنے کے بجائے انہیں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے''۔ ایک مخالف نے یہ مشورہ دیا کہ: ''اگر وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوجائیں تو بہت سے لوگوں کو راحت ملے گی، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک لائق اور ذہین اسکالر ہیں، لیکن جہاں تک عیسائی فرقہ کی قیادت کا سوال ہے تو وہ اس معاملہ میں بربادی کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں۔''

مغربی میڈیا نے ڈاکٹر موصوف کو دنیائے مسیحیت کا ''دشمن'' قرار دیا۔ ٹائمز نے ایک مضمون شائع کیا ہے، جس کا عنوان ہے: ''ولیمس خطرناک ہیں ان کا مقابلہ ضروری ہے'' انڈیپنڈنٹ نے ایک مضمون شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے: پادری نے سیاسی وفکری بارودی سرنگ پر پاؤں رکھ دیا ہے''، مذکورہ مضمون میں لکھا گیا ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کا مطلب ہے کہ نافذ کردہ قانون ایک مخصوص طبقہ کے لیے لازم العمل ہوگا اور دوسرے کے لیے نہیں، جبکہ ایک لبرل معاشرہ کے لیے ضروری ہے کہ وہاں ایسا قانون نافذ ہو جو سب پر یکساں طور پر عائد ہو، مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ''ڈاکٹر موصوف کا مضمون نہ صرف یہ کہ فکری گمراہی کا نتیجہ ہے بلکہ سیاسی لحاظ سے انتہائی گھٹیا بھی ہے۔'' ڈیلی ٹیلی گراف نے طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر صاحب کو چاہیے کہ وہ قانون کو تقسیم نہ کریں بلکہ یا تو پوری اسلامی شریعت کو

برطانیہ پر نافذ کردیں یا پھر اس کی بات کرنا چھوڑ دیں"۔ اس کے بعد مضمون نگار نے اسلامی شریعت کی مفروضہ ہولناکیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر روون کا مذکورہ بیان جو برطانوی ذرائع کے مطابق صرف ایک اظہار خیال تھا لیکن اگر صورت حال اس سے مختلف بھی ہوتی اور ولیمس نے یہ بیان وضعی قوانین کی شکست اور اسلامی شریعت کی ضرورت کے پس منظر ہی میں دیا ہوتب بھی کیا "آزادیء رائے" کے علمبردار معاشرہ میں وہ اس قدر شدید مذمت اور مخالفت کا مستحق تھا؟ چہ جائیکہ بقول بشپ جوناتھان گلیڈین کہ ولیمس کے بیان کو غلط پیرائے میں پیش کیا گیا ہے، آرچ بشپ نے کوئی فیصلہ نہیں دیا، بلکہ محض غور وخوض کے لیے ایک مسئلہ کو پیش کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل کلیسا کو یقین ہے کہ ولیمس کا بیان ایک تبصرہ سے زیادہ نہیں ہے اور باوجود یہ کہ چرچ آف انگلینڈ کی پارلیمنٹ نے ولیمس کی حمایت کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر ولیمس کی مخالفت، استعفٰی کے مطالبہ یہاں تک کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائے اور سکیورٹی کا انتظام کرنا پڑے، یہ ایک ایسے معاشرہ کے لیے جس کی وسیع النظری، دریادلی اور علم دوستی کے راگ الاپے جاتے ہیں، کس طرح زیبا ہوسکتا ہے؟

دراصل مغرب کا یہ متضاد رویہ "آزادیٔ رائے" کا وہ دوہرا معیار ہے جس کی آڑ میں وہ امت مسلمہ کی دل آزاری اور اسلامی شریعت کی تنقیص کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ڈاکٹر ولیمس کے اس بیان پر مسیحی دنیا میں جس طرح زلزلہ آیا ہے، وہ اس کی رواداری، آزادیٔ رائے کے صحیح مفہوم ومصداق کی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ اب صاف طور پر یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ "آزادیٔ رائے" کی اصطلاح ایک ایسا ہتھیار ہے جس کو مسلمانوں کو ذہنی، نفسیاتی طور پر شکست خوردہ بنانے کے لیے ایجاد کیا گیا ہے، ورنہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہر وہ اقدام جو امت مسلمہ کی دل آزاری کا سبب ہوتا ہے، اس کی وجہ جواز "آزادیٔ رائے" قرار پاتی ہے، اس کے برخلاف اگر دنیا کے کسی مذہب کے خلاف کوئی بات پیش کی جاتی ہے، یہی نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں کوئی کلمہ خیر کسی کے نوکِ زبان پر آجاتا ہے تو اس کو برداشت نہیں کیا جاتا۔

بات زیادہ پرانی نہیں ہے، 8 نومبر 2007ء میں فرانس کی ایک عدالت نے ایک شخص کو ایک سال قید کی سزا سنائی، ساتھ ہی اس پر 43 ہزار یورو جرمانہ بھی عائد کیا گیا، اس کا

جرم یہ تھا کہ اس نے ایک کتابچہ تحریر کیا تھا جس میں ہولوکاسٹ کی اصلیت پر سوالات اٹھائے گئے تھے، دیگر ممالک میں ابھی ایسے محققین کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسری طرف اسی فرانس نے 9 جنوری 2008ء کو گستاخ مصنفہ تسلیمہ نسرین کو ایوارڈ دینے کا ارادہ کر کے اس کی "روح آزادی" کو سلام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے اس کے علاوہ اور کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فرانسیسی محقق کی تحقیق اس لیے جرم ٹھہری کہ اس کا نشانہ مسلمان نہیں ہیں اور بدنام زمانہ مصنفہ کی حوصلہ افزائی کی سزاوار اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی گستاخیوں کا نشانہ اسلام اور مسلمان ہیں۔

ایک اور مثال لے لیجیے، ستمبر 2006ء میں پاپائے روم نے جرمنی میں اپنے ایک محاضرہ میں اسلام کو نشانہ بنایا، پادری نے خود اعتراف کیا کہ یہ اس کی اپنی ذاتی تحقیق نہیں بلکہ کسی اور کا قول ہے جس کو اس نے نقل کیا ہے، لیکن چونکہ اس میں مسلمانوں کی دل آزاری کا سامان موجود تھا، اس لیے مغرب نے پاپائے روم کے اس بیان کا خیر مقدم کیا، ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ مغربی میڈیا نے اس کی مذمت کو "آزادیٔ رائے" پر حملہ قرار دیا، دوسری طرف ڈاکٹر رودن ویمس کا بیان ہے، جس کے بارے میں خود ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اس کا یہ بیان کسی فوری تاثر کا نتیجہ نہیں بلکہ عمیق مطالعہ اور طویل تجربہ کا نتیجہ ہے، لیکن چونکہ اس رائے میں اسلام کی حقانیت اور قیادت کی صلاحیت کو اجاگر کیا گیا ہے، اس وجہ سے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کوئی بیان نہیں بلکہ مسلم دنیا کی طرف سے مسیحیت پر یلغار ہے، جس کی حفاظت کے لیے گرجا گھر کے پادری صاحبان، قائدین عظام اور میڈیا سب میدان میں کود پڑے۔

پاپائے روم نے جرمنی میں جو بیان دیا تھا اس نے مسلم، مسیحی دنیا میں متوقع قربت کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ پاپائے روم نے حالات کی نزاکت، مسلم دنیا کی غیر معمولی مخالفت کو دیکھتے ہوئے اپنے سابقہ بیان کی حدت کو کم کرنے کے لیے ترکی میں اپنے ایک خطاب کے دوران ایسا بیان دیا، جس سے محسوس ہوتا تھا کہ ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور وہ اس کا تدارک کرنا چاہتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق انہوں نے مسجد سلطان محمد میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا: "ہم انشاء اللہ متبادل تعاون کے ذریعے امن کو حاصل کرلیں گے۔" انہوں نے مزید کہا: "ہم ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیمؑ سے جڑتا ہے، یہ انسانی اور روحانی رشتہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم ایک ایسا مشترکہ راستہ تلاش کرلیں جو

موجودہ انسانی معاشرہ کی انسانی اقدار تک رہنمائی کرے۔" انہوں نے اس متبادل تعاون کا علامتی آغاز اس طرح کیا کہ یورپین یونین میں ترکی کی شمولیت کے دعویٰ کی تائید کی، اس سے پہلے اس کی مخالفت میں کلیسا سب سے آگے تھا، پاپائے روم کے ان اقدامات سے یہ امید قائم ہونے لگی تھی کہ مسلم، مسیحی دنیا لادینیت کے خلاف جنگ میں کسی قدر مشترک پر اکٹھا ہو جائے گی لیکن ڈاکٹر روون ولیمس کے حالیہ بیان کی جس شدت سے مخالفت کی گئی ہے اور جس طرح اس میں ہر طبقہ نے حصہ لیا ہے، وہ اس امید کی نفی کرتی ہے۔

پاپائے روم کا طرز عمل مسلسل اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ مسیحی دنیا باہمی قربت کے تئیں قطعی سنجیدہ نہیں بلکہ وہ اس سلسلہ میں مکروفریب سے کام لے رہی ہے، اس کی تازہ مثال مصری نژاد اطالوی صحافی مجدی علام کی پشت پناہی اور اس کو عیسائی بنانا ہے۔ مجدی علام عرصہ سے اسلام کے خلاف لکھتا رہا ہے۔ یہ شخص اسرائیل کا سب سے بڑا حامی ہے۔ اس کو عیسائی مذہب کے سب سے مقدس دن، یعنی ایسٹر کے موقع پر بپتسمہ دیا گیا اور پوری دنیا کے اخبارات اور ٹی وی چینلوں پر اس کی تشہیر کی گئی اور "آزادیٔ رائے" کے عنوان سے پوری دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا گیا، اس سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ پاپائے روم مسلمانوں سے دوستی کے تئیں قطعی سنجیدہ نہیں ہیں۔

قرونِ وسطیٰ میں مسلم مسیحی کشمکش میں سب سے زیادہ ہاتھ کلیسا ہی کا رہا ہے۔ صلیبی جنگ کی آگ بھی ایک پادری ہی نے بھڑکائی تھی، جس نے پوری مسیحی دنیا کو ایک خونخوار فوجی کیمپ میں تبدیل کر دیا تھا، پھر فکری اور علمی جنگ کی قیادت بھی کلیسا نے مستشرقین کی سرپرستی کر کے کی اور آج عیسائی مشنریاں برابر اسلام اور نصرانیت کے بیچ خلیج کو بڑھا رہی ہے۔

اگر مسیحی دنیا واقعی مسلم، مسیحی قربت کی متمنی ہے تو اس کو اپنی ان حرکات سے باز آ کر اور آزادی رائے کے اس غلط مفہوم کو بدل کر مسلمانوں کی دل آزاری سے گریز کرنا ہوگا، ورنہ یورپ ابھی تک جنگ وجدال کی آگ میں جتنا جل چکا ہے اور اس کا انسانی اور روحانی سرمایہ اتنا لٹ چکا ہے کہ اگر اب بھی اس نے نفرت وعداوت کی پالیسی کو ترک نہ کیا اور اپنی دوہری سیاست سے باز نہ آیا تو صرف برطانیہ سے ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطہ سے ایک ڈاکٹر روون کھڑا ہو جائے گا جو حق کی شہادت دے گا۔

۞۔۔۔۞۔۔۔۞

علی احمد

آزادی اظہار اور مغرب کا دوغلا پن

آزادی اظہار کے حوالے سے بھی مغرب نے مسلم دنیا کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔
اس ضمن میں سلمان رشدی اور اس کی رسوائے زمانہ تصنیف کے خلاف مسلم ممالک کا شدید رد عمل بالخصوص ''مسلم تنگ نظری'' کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رشدی کی ''شیطانی آیات'' نے مغربی معاشرے کی منافقانہ روش کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مغرب کے اس منافقانہ طرز عمل کی وضاحت کے لیے وہ تصانیف اور تحریری مواد ہمارے سامنے ہے جسے انہوں نے اپنی تہذیب و ثقافت سے متصادم ہونے کی بنا پر ہدف تنقید بنایا۔ ایک طرف مغربی دانشور رشدی کے آزادی اظہار کے حق کا شد و مد سے دفاع کر رہے ہیں تو دوسری جانب اسی برطانیہ نے 1960ء کی دہائی تک "Chatterleys Lover Lady" کو اخلاقی باختگی کے پہلو سے ناپسند قرار دیا تھا۔ آسکر وائلڈ کے ہم جنس پرستی کے جرم میں ماخوذ ہونے کے بعد ایک طویل عرصے تک اس کی تصنیف The Picture of Dorian Gray قابل مواخذہ تھی۔ ہم جنس پرست قلمکاروں کو آج بھی شدید تنقید کا سامنا ہے۔

رشدی کی تصنیف کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس نے مختلف ممالک میں امن و امان کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ بھارت نے اس کتاب پر پابندی فساد خلق اور ہنگامہ آرائی کے خوف سے ہی عائد کی۔ وہ کتاب برطانیہ جیسے دور افتادہ ملک میں چھپی تھی مگر اس نے بمبئی، اسلام آباد اور کراچی میں جس رد عمل کو جنم دیا، اس کے نتیجے میں پندرہ قیمتی انسانی جانیں ضائع ہوئیں جبکہ درجنوں افراد زخمی ہوئے۔ مگر رشدی کے ناشر جوناتھن کیپ نے اس کی اشاعت پر پابندی عائد کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف مغرب کے ممتاز ناشرین ان مسودوں کو چھاپنے سے انکاری رہے ہیں جن کے بارے میں انہیں شبہ تھا کہ ان کی طباعت سے ان کے اپنے یہاں امن عامہ کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ گذشتہ سال کیمبرج یونیورسٹی پریس نے اناستیسا کراکاسیدو

کی تجزیاتی رپورٹ "Fields of Wheat, Rivers of Blood" کی اشاعت سے معذرت کرلی، اس لیے کہ اس کے خیال میں یونان کے صوبے مقدونیہ کی نسلی صورت حال کے اس عمرانی جائزے کی اشاعت سے یونان میں کیمبرج یونیورسٹی پریس کے ملازمین کی جانوں کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ کاش جوناتھن کیپ نے بھی جنوبی ایشیا میں انسانی جانوں کو لاحق خطرات کا خیال کیا ہوتا۔

یہاں یہ بات بہرحال تسلیم کرنی ہوگی کہ مسلم دنیا میں سنسر شپ کا انداز نسبتاً بھونڈا اور اصلاح طلب ہے۔ یہاں یہ کام بالعموم حکومتی اداروں، ائمہ مساجد یا بلند آہنگ اسلامی تحریکات کے ذریعے عمل میں آتا ہے جبکہ مغرب میں سنسر شپ کا عمل وسیع البنیاد اور زیادہ سلجھا ہوا ہے۔ اس کے لیے وہاں جذباتی نعروں سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ وہ افراد اور ادارے جو معاشرے کی ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کی مالی طور پر سرپرستی کرتے ہیں، یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ مثلاً ٹی وی چینلز کو اشتہار دینے والی کمپنیاں، پبلک براڈ کاسٹنگ سسٹم کے معاونین، عوامی مفادات کی ذمہ دار تنظیمیں، اخبارات و جرائد کے مدیران، ناشرین اور ذرائع ابلاغ پر اثر انداز ہونے والی شخصیات اور ادارے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں آزادی اظہار کو کسی حکومتی قانون یا دستور سے نہیں بلکہ غیر سرکاری تنظیمات اور اداروں سے خطرہ لاحق رہتا ہے۔

مغرب کے منافقانہ طرز عمل کی چند مثالیں میں اپنی ذات کے حوالے سے دے سکتا ہوں۔ 1986ء میں میری ایک ٹی وی سیریل "The Africans" میں، میں نے کارل مارکس کو تمثیلی طور پر ''یہودیوں کا روحانی پیشوا'' لکھا تو WETA نے جو واشنگٹن میں پبلک براڈ کاسٹنگ سسٹم کا ایک ٹیلی ویژن چینل ہے اس ٹکڑے کو بغیر میری اجازت کے حذف کردیا کیونکہ ان کے خیال میں اس سے یہودیوں کی دل آزاری کا احتمال تھا۔ اسی چینل نے میرے سیریل میں لیبیا کے رہنما معمر قذافی کے حوالے سے جو تین منٹ کا ٹکڑا تھا، اس پر اس لیے اظہار ناپسندیدگی کیا کہ میں نے ان کی مرضی کے برعکس قذافی کی شخصیت کے منفی پہلو بہت زیادہ اجاگر نہیں کیے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ میں قذافی کو دہشت گردوں کے سرپرست کے طور پر پیش کروں۔ میرے انکار پر انہوں نے تجویز پیش کی کہ سیریل میں قذافی کی ایسی تصویریں پیش نہ کی جائیں جن سے ان کے معاشرتی انسانی پہلو کی عکاسی ہوتی ہو مثلاً کسی

ہسپتال کا افتتاح وغیرہ۔

اس طرح کولوروڈو کے ''ویسٹ ویو پریس'' نے میری کتاب "Cultural Forces in World Politics" (عالمی سیاسیات کے ثقافتی عوامل) کی طباعت کی ذمہ داری لینے کے بعد اچانک اعلان کیا کہ وہ اس کتاب کے تین ابواب حذف کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایک کا تعلق رشدی اور اس کی ''شیطانی آیات'' سے تھا، دوسرے میں فلسطینی تحریک انتفاضہ کا 1989ء کی چینی طلبہ کی تیانن من چوک کی بغاوت سے اور تیسرے میں جنوبی افریقہ کی نسل پرستانہ تحریک Apartheid کا صیہونی ریاست کی تحریک سے موازنہ کیا گیا تھا۔ امریکی ناشرین کے اس رویے سے مجبور ہو کر مجھے بالآخر 1990ء میں اپنی کتاب کو برطانوی ناشر کے حوالے کرنا پڑا۔ مغرب میں سنسرشپ کی اس عدم مرکزیت کا ایک عجیب پہلو بھی ہے کہ جو کتاب ایک ناشر کے لیے نا قابل قبول ہو، وہ کبھی کسی دوسرے کے لیے قابل قبول بھی ہو جاتی ہے، مگر یہ واقعات ان کی منافقانہ طرز فکر کی عکاسی بہرحال کرتے ہیں۔

اسرار احمد کسانہ

دوہرا معیار

مشہور زمانہ جریدے دی اکانومسٹ کو آخر یہ سرخی لگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ "Big vision colides with small minds"۔ وجہ یہ تھی کہ دبئی میں ایک کمپنی "دبئی پورٹس ورلڈ" نے 6.8 ارب ڈالر کی قیمت سے Peninsular and oriental steam navigation ایک نامی کمپنی کو خرید لیا جس سے نہ صرف امریکہ کی چھ بڑی بندرگاہیں بلکہ برطانیہ، بیلجیئم، فرانس، بھارت اور چین سمیت اٹھارہ ممالک کی بڑی بڑی بندرگاہیں اس کے کنٹرول میں چلی جاتیں۔ جیسے ہی اس ڈیل کی خبر سامنے آئی، امریکی سیاستدانوں نے ایک واویلا کھڑا کردیا کہ ہماری سرحدیں اور بندرگاہیں دہشت گردوں کے کنٹرول میں چلی جائیں گی اور اس کمپنی کے ذریعے دہشت گرد امریکہ کے اندر بآسانی داخل ہوسکیں گے جس سے قومی سلامتی خطرے میں پڑنا یقینی امر ہوگا۔ امریکہ کے شہریوں کو اس قدر ڈرا دیا گیا کہ عوام بھی انگشت بدنداں کی تصویر بن گئے۔ حکومتی شخصیات کے اس مہم میں حصہ لینے پر دبئی کی کمپنی اس ڈیل کو مؤخر کرنے پر رضامند ہوگئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی تجارت کے تمام قوانین کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وجود میں آنے والی کسی بھی ڈیل کو اس لیے خطرے میں ڈالنا کہ اس کمپنی کا تعلق ایک مسلمان ملک سے ہے، کہاں کی دانشمندی ہے اور کہاں کا منصفانہ قدم ہے؟ اگر نائین الیون کے فضائی حادثات سے تعلق رکھنے والے دو ہائی جیکروں کا تعلق متحدہ عرب امارات سے تھا تو اس کمپنی کا کیا قصور جو کسی فرد کی نہیں بلکہ دبئی کی حکومتی کمپنی ہے اور ایک عرصہ سے شپنگ کے بزنس سے وابستہ ہے اور جس نے تمام بین الاقوامی اصولوں کے مطابق اس ڈیل میں بہتر بولی دے کر کامیابی حاصل کی۔ تمام اصول ایک طرف مگر جب بات آتی ہے کسی نہ کسی مسلمان شخصیت یا ادارے کے کوئی ممتاز مقام حاصل کرنے کی تو نہ جانے مغرب اپنے تمام تر نام نہاد اصول اور اخلاقیات پس پشت کیوں ڈال

دیتا ہے؟ حقیقت یہی ہے اور جس کے حقیقت بننے میں خود مغرب کے اپنے ٹریک ریکارڈ کا زیادہ کمال ہے کہ اپنے لیے مغرب کے قوانین کچھ اور ہیں مگر بات آتی ہے مسلمانوں کی تو وہ قوانین بالکل پس پشت ڈال دیے جاتے ہیں اور نئی نئی توجیہات اور توضیحات نکال کر اپنے خبث باطن کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مغرب کا یہ دوہرا معیار آئے دن دیکھنے کو مل رہا ہے۔ دو مزید تازہ ترین مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی حماس کے معاملہ کو بھی لیجیے۔ امریکہ نے عراق پر حملہ کرنے کے بعد جب مہلک ہتھیاروں کی موجودگی میں ناکامی پر سبکی محسوس کی تو اپنے حملے کا مقصد مسلم دنیا بالخصوص مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کا قیام ٹھہرایا اور عراق کو اس سلسلے میں پہلا قدم قرار دیا جانے لگا۔ اب جبکہ حماس نے تمام تر بین الاقوامی اصولوں کے مطابق لوگوں کے حق انتخاب کی ایکسر سائز ہونے کے بعد انتخابات میں کامیابی حاصل کی تو امریکہ بہادر نے کہا کہ یہ دہشت گرد حکومت اس کے لیے قابل قبول نہ ہوگی۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب فلسطینی عوام کی اکثریت نے حماس کو اپنے اعتماد سے نوازا ہے تو کیا یہ جمہوریت کا بنیادی اصول نہیں ہے کہ حکمرانی کا حق اکثریت کے پاس ہوتا ہے۔ آخر کیوں حماس کی حکومت بننے سے پہلے ہی اس کے راستے میں روڑے اٹکائے جا رہے ہیں۔ اس کی امداد بند کرنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں بلکہ جو ممالک اس کی مدد کرنے کا اظہار کر رہے ہیں ان پر برہمی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ حماس کی حکومت کے پاؤں نہ لگنے دیے جائیں۔ گویا کہ اگر جمہوریت کا نتیجہ امریکہ کے حق میں نکلے تو وہ صحیح جمہوریت اور اگر نتائج پسند کے برآمد نہ ہوں تو وہ ناقابل قبول ہے، اسی کو دوہرا معیار کہتے ہیں جو اس وقت مغرب بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے لیے رکھتا ہے۔

دوسری مثال توہین رسالت ﷺ کی ہے۔ حالیہ کارٹون تنازعے نے مغرب کے دوہرے معیار کو ایک دوسرے زاویے سے ظاہر کیا ہے۔ آئے دن جب مختلف ممالک میں توہین آمیز خاکوں کو بار بار شائع کیا گیا تو کہا یہ گیا کہ یہ آزادی رائے کے حق کی پاسبانی کی خاطر کیا جا رہا ہے اور یہ کہ مغرب جیسی مہذب سوسائٹی میں یہ ایک بہت بڑا قیمتی حق ہے جس کی پاسداری جمہوریت کی بنیادی نشانی ہے۔ ہر اخبار نے اظہار یکجہتی کی خاطر ان خاکوں کو شائع کرنا مناسب سمجھا۔ مغرب کے دوہرے معیار کا بھانڈا ایک بار پھر اس وقت پھوٹا کہ جب ممتاز تاریخ دان ڈیوڈ ارونگ کو آسٹریا کی عدالت میں یہودیوں کے قتل عام کے متعلق

1989ء میں دیے گئے ان کے ریمارکس کی پاداش میں تین سال جیل کی سزا سنائی گئی۔ اور یہ وہ ریمارکس تھے جن سے بعد میں وہ تائب بھی ہو گئے تھے۔ یہ ریمارکس آخر تھے کیا؟ ڈیوڈ ارونگ کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے 1989ء میں کہا تھا کہ یہودیوں کے قتلِ عام (HOLOCAUST) میں مرنے والوں کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی کا دعویٰ کیا جاتا ہے بلکہ اس سے کہیں کم تھی اور جو یہودی ہلاک بھی ہوئے وہ بھوک اور بیماری سے ہلاک ہوئے نہ کہ ہٹلر کے ظلم کی وجہ سے -ANTI-SEMITISM کے قانون کا سہارا لیتے ہوئے ڈیوڈ ارونگ کو سزا سنا دی گئی کہ مبادا ساری دنیا کے یہودی آسٹریا کے خلاف ہو جائیں۔ اس معاملے میں آزادیٔ رائے کا حق اور اس کی حرمت کہاں گئی۔ ڈیوڈ ارونگ نے بھی تو صرف اپنی رائے کا اظہار ہی کیا تھا اور رائے رکھنے کا حق مغربی جمہوریت ہر کسی کو دیتی ہے۔ تو آخر ڈیوڈ ارونگ کو سزا کیوں دی گئی۔ وجہ دراصل یہ ہے کہ یہاں بات یہودیوں سے متعلق تھی جو اپنے متعلق کسی قسم کی کوئی غلط بات برداشت تو کیا سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ امریکہ میں اور دیگر ممالک میں انہوں نے اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر ایسے قوانین بنوا لیے ہیں کہ ان کے خلاف بات کرنا یا لکھنا قابل تعزیر فعل ہے۔ امریکہ میں ہٹلر کا نشان SWASTIKA کسی دیوار یا جگہ پر پینٹ کرنا بھی کسی کو جیل بھجوانے کے لیے کافی ہے۔ مگر دوسری طرف اسلام یا مسلمانوں کے خلاف مغرب میں موجود اس قدر نفرت ہے کہ وہ آئے دن بہانے سوچتے رہتے ہیں کہ اس کا اظہار کس طرح کریں۔ غیر ملکیوں سے نفرت یعنی XENOPHOBIA مغرب میں اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب اس کا اظہار بھی آسان اور قابل قبول عمل بن گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام سے خوف یا نفرت کے اظہار اور XENOPHOBIA کو بھی اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے قابل تعزیر جرم قرار دلوایا جائے اور مغرب کے اوپر ایسا دباؤ ڈالا جائے کہ جس کے بعد اسلام اور اس کے شعائر پر زبان درازی کرنے والا سب کی نظر میں ملعون ٹھہر سکے۔ اس امر میں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو خود منظم اور دور اندیش ہونا ہوگا، ورنہ وہ آئے دن مغرب کے دوہرے معیارات کا شکار بنتے رہیں گے۔

گل شیر بٹ

اہل یورپ وامریکہ کی فکری بددیانتی

آسٹریا کی انزبوک ریجنل کورٹ نے بی بی مریمؑ کے حوالے سے بننے والی فلم SATIRICAL TRAGEDY بین کردی جبکہ فلم کے پروڈیوسر نے یورپین کنونشن کے آرٹیکل 10 کے تحت دی گئی آزادی اظہار کے تحت یورپین کورٹ فارہیومن رائٹس سے رجوع کیا کہ فلم سے پابندی اٹھائی جائے۔ یورپین کورٹ نے فلم مذکورہ پر ''دوسروں کی مذہبی آزادی میں مداخلت'' اور برداشت کی روح کے منافی ہے، کی بنیاد پر ریجنل کورٹ کی پابندی کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اسی طرح برطانیہ میں بننے والی فلم VISIONS OF ECSTASY میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بائبل کے متعلق ہتک آمیز مواد شامل کیا گیا۔ یورپین کورٹ نے اس فلم کی ڈسٹری بیوشن پر پابندی کو جائز قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ فلم عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے منافی ہے۔ دونوں صورتوں میں آزادئ اظہار کے حق کو دوسروں کی مذہبی آزادی میں مداخلت کی بنیاد پر تسلیم نہ کرکے کروڑوں عیسائیوں کو دل آزاری سے بچا کر ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ دوسری طرف ڈنمارک میں توہین آمیز خاکے شائع کیے جاتے ہیں۔ فیس بک پر توہین آمیز خاکوں کا مقابلہ کروا کر کروڑوں مسلمانون کی دل آزاری کا سامان اور اہتمام کیا جاتا ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ اہل یورپ اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں مصروف ہیں اور ہم غلامانہ سوچ اور چند مفادات کی خاطر سچ کے اظہار کی قوت سے بھی محروم ہوگئے ہیں۔ ہم نے اسلام کے خلاف بات کرنے کو پڑھا لکھا ہونے کی دلیل بنا لیا ہے۔ کوئی سوال کرنے والا ہی نہیں رہا کہ ہولوکاسٹ اگر جرم ہے تو نبی کریم ﷺ کی توہین جرم کیوں نہیں؟ دراصل وہ بھول جاتے ہیں کہ برابری اور مساوات کی پرچارک اہل یورپ اور امریکہ نے آزادئ اظہار رائے اور اس کی تشریح کا حق صرف اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سنڈی لی گارشیا کی طرف سے حالیہ متنازعہ فلم دکھانے کے لیے یوٹیوب پر پابندی کی بابت گزاری گئی درخواست لاس اینجلس کی سپریئر کورٹ جج لوئس لیون کی طرف سے مسترد نہ ہوتی۔

۞.....۞.....۞

ڈاکٹر عبداللہ خان

توہین رسالت ﷺ کی سازش کب اور کہاں تیار ہوئی؟

یہ گزشتہ برس کی بات ہے جب 5 تا 8 مئی 2005ء تک بلڈر برگر گروپ کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ بلڈر برگر گروپ کے تعارف کے لیے اس کا لوگو ہی کافی ہے جو خطرے کے نشان کے نیچے ایک ہاتھ گلوب کو اپنی ہتھیلی پر گھماتا نظر آتا ہے۔ گلوب پر دنیا کا آدھا حصہ روشن اور آدھا تاریک ہے جو بذات خود انتہائی ذومعنی ہے۔

بات ہو رہی تھی گزشتہ برس ہونے والی بلڈر برگر گروپ کی کانفرنس کی جو جنوبی جرمن ریاست بیوریا میں ڈورنٹ سوفٹل سی ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ توہین رسالت ﷺ پر مبنی پہلا خاکہ اسی برس ستمبر کے مہینے میں شائع ہوا۔ بلڈر برگر گروپ کی یہ کانفرنس کتنی اہم تھی، اس کا اندازہ اس کے شرکاء کے نام پڑھ کر آپ کو خود ہی ہو جائے گا۔

اس میٹنگ میں مائیکل لیڈین بھی تھا، رچرڈ پرلے اور ولیم لتی بھی۔ یہ تینوں پاگل پن کی حد تک فاشسٹ ہیں اور یہ بات باقاعدہ تصدیق شدہ ہے۔ تینوں عدالتی کارروائی بھگت رہے ہیں۔ بلڈر برگر گروپ کی تمام کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں اس امید پر کہ شاید انہیں انتہائی متوقع سزا سے چھٹکارا مل جائے اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں، خاص کر عراق کے حوالے سے تو انتہائی بغض کا اظہار وہ سوائے یہودیوں کے دل جیتنے کے اور کسی چیز کے لیے نہیں کر رہے۔ جیل سے باہر رہنے کی امید میں یہ تینوں ایران کے خلاف بڑی جنگ کی حمایت میں بالکل جنونی ہو گئے ہیں۔ دیگر شرکاء میں ڈچ، بیلجیئم اور ہسپانوی اشرافیہ، ٹاپ بیورو کریٹس اور نیٹو کی اعلیٰ شخصیات بشمول نیٹو کے سیکرٹری جنرل ہاپ ہوپ ڈی شیفر بنفس نفیس موجود تھے جو برسلز سے بیوریا صرف اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ انٹرنیشنل یہودی بینکار نیمیا نزراک اور روتھس چائلڈ خاندان کے افراد بھی اس کانفرنس میں موجود تھے اور سابق امریکی وزیر خارجہ اور یہودیوں کے ممتاز رہنما ہنری کسنجر کے بغیر تو شاید یہ کانفرنس

منعقد ہی نہ ہوتی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، ڈنمارک کی مشہور شخصیت اینڈرز ایلڈرپ بھی موجود تھے جو گزشتہ 5 برسوں سے بلڈر برگر گروپ کی کانفرنسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔ اینڈرز ایلڈرپ بھی موجود تھے جو گذشتہ پانچ برسوں سے بلڈر برگر گروپ کی کانفرنسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔ اینڈرز ایلڈرپ کے بارے میں آپ کو بتاتے چلیں کہ یہ شخص Danish Oil and Natural Gas DONG کا چیئرمین ہے مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ شخص میریٹے ایلڈرپ نامی عورت کا شوہر ہے جو جیلنڈر پوسٹن/پولیٹیکنز نامی اس پبلی کیشنز فرم کی مینیجنگ ڈائریکٹر ہے جس نے سب سے پہلے توہین رسالت ﷺ پر مبنی کارٹون شائع کیا تھا۔

بلڈر برگر گروپ جنگ عظیم دوم کے بعد بنی اور اس کے بنانے والے برطانوی شہزادہ پرنس فلپ (جو قاتل شہزادے کے نام سے معروف ہے) اور نازی ایس ایس ہالینڈ کے پرنس برنارڈ تھے۔ یہ گروپ دنیا کے مالیاتی اداروں کی نمائندگی کرتا ہے جو امریکی و برطانوی رہنماؤں کی سرکردگی میں باہم ملتے ہیں اور بڑے اسٹریٹیجک معاملات پر مشترکہ لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ ایک ہی مثال سے آپ کو بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ بلڈر برگر گروپ والے کن اسٹریٹیجک معاملات پر مشترکہ لائحہ عمل طے کرنے پر جمع ہوتے ہیں۔

1973ء کو سویڈن میں اسٹاک ہوم کے قریب سالٹس جو باڈن کے مقام پر ہونے والی بلڈر برگر کی کانفرنس میں رائل ڈچ شیل کے 1973ء کے منصوبوں کے لیے مشترکہ طور پر حتمی فیصلے ہوئے۔ یہ منصوبے اکتوبر 1973 کی مشرق وسطی کی جنگ اور عربوں کی طرف سے تیل کی سپلائی منقطع ہونے کے بعد کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ جاپان اور یورپ کو لوٹ کر امریکی ڈالر کو استحکام اور اٹلانٹک بینکنگ سسٹم کو دوام بخشنا اس کانفرنس کا اولین مقصد تھا۔

5 مئی 2005ء کی بلڈر برگر گروپ کی کانفرنس کے حوالے سے ویبسٹر گریفین نے اپنے آرٹیکل میں لکھا ''اس بات کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں کہ (توہینِ رسالتؐ پر مبنی) کارٹونز کے ذریعے اشتعال پھیلانے کا منصوبہ اس کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا۔'' گریفین کا کہنا تھا کہ ''اس اشتعال کا مقصد واضح تھا، اب تک مسلمان امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کے لیے نفرت کے جذبات رکھتے تھے مگر خاکوں کی اشاعت کے بعد ڈنمارک، ناروے، فرانس اور

جرمنی مسلمانوں کی شدید نفرت کا ٹارگٹ بن چکے ہیں۔ یوں سیموئیل ہنگٹن کے تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کو ایک حقیقت ثابت کرنے کے لیے راہ ہموار ہوگئی ہے۔" گریفن کے مطابق "یورپ اب ایران کے خلاف جنگ کے لیے پہلے کی نسبت زیادہ حمایت فراہم کرنے کی پوزیشن میں آ گیا ہے۔ فلسطین میں جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والی قیادت حماس کے حوالے سے یورپ کا وہ رویہ بہت کچھ سمجھائے دے رہا ہے جو اس نے فلسطین کو دی جانے والی تمام امداد روک کر اپنایا ہے۔"

بحوالہ: The Muhammad (PBUH) Cartoons Recruiting Europe for Bush, War on Iran by Webster Griffin Tarpley.

ویبسٹر گریفن نے ایک اور اہم نقطے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے مطابق، شام، ایران اور لبنان میں ڈنمارک کے سفارت خانے جلائے جا چکے ہیں۔ یہ سب اچانک نہیں ہوا بلکہ سی آئی اے، ایم آئی 6 اور موساد کے کرایوں پر بھرتی کیے ہوئے مظاہرین نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ بیروت میں اقوام متحدہ کے اہلکاروں نے بھی سی این این کو یہ بتایا کہ "ہمیں یہ پرتشدد مظاہروں کا پہلے سے علم تھا۔" یہ تمام تر صورتحال یورپی عوام کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئی کہ مغرب اور مسلم دنیا کے ساتھ تہذیبوں کا تصادم اب ایک طے شدہ امر بن چکا ہے۔

جرمنی، فرانس، بیلجیئم اور دیگر یورپی ممالک نے 2003ء میں ایران پر حملے کا بش اور بلیئر کا منصوبہ مسترد کر دیا تھا۔ اسی وقت سے امریکی و برطانوی اٹلانٹک انٹیلی جنس یورپی حکمرانوں کو سبق سکھانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ جرمنی چانسلر شیروڈر کی جگہ مسز مرکل لائی گئیں جو وال اسٹریٹ اور سٹی آف لندن کی کٹھ پتلی ہیں۔ فرانس میں صدر شیراک سے یورپی یونین کا آئین تسلیم کرانے جیسی غلطی کرا کے ان کی صدارت کو انتہائی کمزور کر دیا گیا۔ صدر شیراک اس حالت پر پہنچ گئے کہ انہوں نے ایران کے خلاف ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے تک کی دھمکی دے دی۔ یہ وہی شیراک تھے جو 2003ء میں ایران پر بش و بلیئر حملے کے سب سے بڑے مخالف تھے اور صرف ایک اس کی مخالفت یہ حملہ رکوانے کی اکلوتی وجہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اب وہ دن ہوا ہوئے کہ جب صدر شیراک تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ (بحوالہ: ویبسٹر گریفین، ایضاً)

جیلنڈر پوسٹن نامی ڈنمارک کے اخبار میں توہین آمیز خاکوں کا چھپنا کوئی ایسی غلطی نہیں جو نادانستہ طور پر سرزد ہوئی۔ یہ ایک گہری سازش ہے مسلمانوں کو گھیرنے کی۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان وہ کونسا راستہ اختیار کریں جو اپنے اثر کے لحاظ سے موثر ترین اور ردعمل کے لحاظ سے اینٹ کے جواب میں پتھر ہو۔ اکثر یہی جواب سننے میں آئے گا کہ مسلمان سوائے چیخنے چلانے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مسلمانوں کے پاس ایک دو نہیں کئی ہتھیار ہیں جن کا بہترین استعمال ہی ڈنمارک کے اخبار سے شروع ہونے والی خباثت بھری سازش کا جواب ہے۔ ان میں سے ایک ہتھیار وہ ہے جس کا استعمال ملائیشیا کے سابق وزیراعظم مہاتیر محمد کا کہنا تھا "اب گلے شکوے کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ وہ وقت آچکا ہے کہ "ڈالر" کو دفن کر دیا جائے۔" مہاتیر کا یہ مشورہ ان کی دوراندیشی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اصلی رہنما آنے والے حالات کو پہلے سے ہی بھانپ لیتے ہیں۔ گریفن کے الفاظ میں ڈالر کا گرنا ہی انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF) اور وولفوٹز کے ورلڈ بینک کا گر جانا ہے جو دنیا بھر کی سازشوں کو پروان چڑھانے کے لیے عظیم ترین انجنوں کا کام کر رہے ہیں۔

ڈالر مسلم دنیا کے حکمران ہی دفنا سکتے ہیں مگر اس کے لیے قبر مسلم عوام کو ہی کھودنی ہوگی۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ اب مسلم عوام اپنی توانائیوں کو صحیح رخ پر استعمال کریں اور اپنے حکمرانوں کو ڈالر دفنانے پر مجبور کر دیں۔ یہی وہ بہترین جواب ہے جو ان گھناؤنی سازشوں کو لگام ڈال سکتا ہے۔

سید عاصم محمود

توہین مذہب کی تاریخ اور آزادیٔ اظہار

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی زندگیاں سنوارنے کے آفاقی احکام (مذاہب) نازل فرمائے، تو ان کی تضحیک کرنے کے لیے شیطان کے پیروکاروں کا سب سے بڑا ہتھیار ''توہین مذہب'' (Blasphemy) قرار پایا۔ اسی لیے ہزاروں برس قبل جب خیر وشر کی جنگ کا آغاز ہوا تو تبھی یہ عمل بھی ظہور میں آ گیا۔ گویا توہین مذہب بنی نوع انسان کے قدیم ترین نظریات میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں و پیغمبروں علیہم السلام کی تضحیک کرنے کا نام توہین مذہب ہے جبکہ فتنہ پرور غیر مسلم، رسول کریم ﷺ کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کریں تو یہ عمل ''توہین رسالت'' کہلاتا ہے۔''

جب انسانیت کو درست راہ دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی نازل فرمائے تو ہر دور میں کفار نے انہیں بے عزتی اور ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ چونکہ انہیں شتر بے مہار آزادی حاصل تھی۔ لہٰذا کفار کو لگام دینے کے لیے تمام مذہبی کتب، توریت، زبور، انجیل اور قرآن پاک میں توہین مذہب کی سزائیں مقرر ہوئیں۔

توریت میں حکم آیا کہ رب کائنات کی توہین کرنے والا قتل کا مستحق ہے۔ یہودیوں کی رو سے یہ اہم ترین جرائم میں سے ایک ہے۔ مرقس انجیل میں بھی توہین مذہب ''دائمی گناہ'' ہے جس کا ارتکاب کرنے پہ کسی کو معافی نہیں ملے گی۔

عیسائی علماء نے بھی توہین مذہب کو اہم گناہوں و جرائم میں شمار کیا۔ دور جدید کا سب سے بڑا عیسائی عالم، سینٹ تھامس ایکویناس (1225ء تا 1274ء) اپنی مشہور کتاب ''مدخل الٰہیات'' (Summa Theologica) میں لکھتا ہے: ''یہ حقیقت ہے کہ توہین خدا قتل سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے کیونکہ قتل تو ایک انسانی فعل ہے، جبکہ توہین خدا آفاقی عمل بن جاتا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک یہی سب سے بڑا گناہ ہے۔''

قرآن پاک میں بھی جگہ جگہ اللہ تعالیٰ اور حضور اکرم ﷺ کی بڑائی بیان ہوئی ہے۔ نیز سورہ مائدہ آیت 33 میں حکم ہے کہ جو اللہ اور رسول ﷺ سے جنگ کریں، وہ موت کے مستحق ہیں، یا ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں پوری عیسائی اور اسلامی دنیا میں اللہ تعالیٰ، پیغمبروںؑ، حتیٰ کہ بزرگان دین کی توہین کرنے والوں کے لیے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ پوپ اور عیسائی حکمران توہین مذہب کے مرتکب مرد و زن کو بشمول پھانسی مختلف سزائیں دیتے۔ صورت حال سولہویں اور سترہویں صدیوں میں بدلی جب یورپی فلسفیوں مثلاً دیکارت، ہیوم، جان لاک، روسو، والٹیئر وغیرہ نے ''آزادی رائے'' کا نعرہ بلند کیا۔

آزادی رائے کی یقیناً خوبیاں ہیں، لیکن مذہب دشمنوں نے دور جدید میں اسی کو اپنا سب سے بڑا ہتھیار بنا لیا۔ وہ تحریروں، تقریروں اور بعد ازاں فلموں کے ذریعے مذہب و مذہبی شخصیات پہ حملے کرنے لگے۔ امریکہ سمیت کئی ممالک میں انہیں آزادی رائے کی آڑ میں قانونی تحفظ بھی مل گیا۔ یوں شیطان کے نمائندوں نے خصوصاً مغرب میں پوری نسلوں کی برین واشنگ کر کے انہیں مذہب سے برگشتہ کر دیا۔

آج اسی لیے کئی یورپی ممالک مثلاً اسٹونیا، جمہوریہ چیک، سویڈن، ڈنمارک اور ناروے وغیرہ میں باقاعدہ اعداد و شمار کی رو سے آبادی میں دہریوں کی تعداد زیادہ ہے۔ امریکہ میں بھی لاکھوں دہریے بستے ہیں۔ مزید برآں مغرب میں ان مذہبی باشندوں کی بھی کمی نہیں جو اسلام سے سخت تعصب برتتے ہیں۔ گویا تمام مذاہب میں اسلام کو خصوصاً بیک وقت کئی دشمنوں کا سامنا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ پچھلی تین چار صدیوں میں مادر پدر آزادی کے قائل رہنما مغربی حکومتوں کو مذہب سے علیحدہ کرنے میں کامیاب رہے۔ اس طرح وہاں معاشرتی و سیاسی زندگی میں مذہب کا کردار بہت محدود ہو گیا۔ اس امر نے بہر حال عیسائیت کو نقصان پہنچایا لیکن اسلام تو ماں کی گود سے لے کر گور تک ہر مسلمان کے ساتھ ساتھ رہتا اور اس کی زندگی میں رچ بس جاتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام مسلمانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی نہ کریں، اپنی تمام ذمے داریاں بخوبی انجام دیں اور اپنے مذہب سے الفت رکھیں۔ لہٰذا تمام مسلمانوں کا یہ خاصہ ہے کہ شاید وہ اسلامی احکامات پورے طور پر بجا نہ لائیں،

لیکن اللہ تعالیٰ اور اپنے رسول ﷺ کی خاطر کٹ مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

اس طرز کا ایمانی جوش و جذبہ مغرب میں مفقود ہے۔ اسی لیے وہاں انتہا پسندانہ آزادی رائے کا کوئی حامی کسی بھی طرح اللہ تعالیٰ یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تضحیک کرے تو کسی قسم کا احتجاج نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ جو مذہب کی جتنی زیادہ توہین کرے، اتنا ہی بڑا دانشور بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی فتنے باز تحریر یا فلم کے ذریعے اسلام، اللہ تعالیٰ اور رحمت دو عالم ﷺ کی توہین کرے اور نتیجتاً اسلامی دنیا میں زبردست احتجاج جنم لے تو عام مغربی اسے حیرت سے دیکھتا اور سوچتا ہے کہ مسلمانوں کو کیا ہوا؟ تب مذہبی جوش و جذبے سے بے خبر مغربی کو مسلمان انتہا پسند، دہشت گرد، تاریک زمانے کے مکین وغیرہ ہی نظر آتے ہیں۔

مذہب دراصل دنیاوی لذتوں سے کھل کر کھیلنے والوں کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اسی لیے مغربیوں نے اسے بتدریج دیس نکالا دے دیا۔ گو بیسویں صدی کے وسط تک بھی یورپ اور امریکہ میں توہین مذہب یا جنسیات کو چھونے والی تحریر یا فلم قبولیت عام نہیں پاتی تھی۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جہاں کئی شعبوں میں انقلاب آیا تو مغرب میں مذہب کی بھی کایا پلٹ گئی۔ حد سے بڑی آزادی رائے نے اسے چاروں شانے چت کر ڈالا۔ امریکہ میں تو اب حالت یہ ہے کہ ایک امریکی سر عام حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا دیگر پیغمبروں علیہم السلام کو مغلظات بکے تو کوئی اسے روکنے ٹوکنے کی زحمت نہیں کرتا۔ لیکن مغرب اور مشرق خصوصاً عالم اسلام میں مذہبی طور پر زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی شیطانی نمائندے نے بذریعہ کتاب یا فلم اسلام کو بدنام کرنا چاہا تو دنیا بھر میں لاکھوں مسلمان احتجاج کر کے بتاتے ہیں کہ ان میں دینی حمیت زندہ ہے اور اسی نے سبھی مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔

دنیائے مغرب میں مستشرقین نے سب سے پہلے اپنی کتاب میں اسلام اور رسول کریم ﷺ کے خلاف بے ہودہ پروپیگنڈا کیا۔ لیکن ان کی نام نہاد تحقیق کو خود انہی کے علمی حلقوں نے مسترد کر دیا۔ بیسویں صدی کے اواخر میں پھر جعلی مسلمان اسلام مخالف رو میں شامل ہوئے۔ مثلاً ملعون سلمان رشدی نے اپنا بدنام زمانہ ناول ''شیطانی آیات'' لکھا۔ پھر 2004ء میں مادر پدر آزادی کی قائل اور تحریک آزادی نسواں کی رہنما، ایان حرسی علی نے ولندیزی ڈائریکٹر، تھیووان گوخ کے ساتھ دستاویزی فلم ''سبمشن'' (Submission) بنائی۔ سبمشن میں برقع کو نشانہ بنا کر اسے قید اور پابندی کا مترادف قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے،

عورت کو شمع محفل، بنانے والوں کو تو دوپٹہ بھی کھلتا ہے۔ اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے پر تھیووان گوخ ایک مراکشی باعمل مسلمان، محمد بویری کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

سمشن کے بعد ایک اور ولندیزی اسلام دشمن رہنما، گیرٹ فیلڈرز نے 2008ء میں مختصر فلم "فتنہ" تیار کرائی۔ اس میں جھوٹا دعویٰ کیا گیا کہ قرآنی تعلیمات مسلمانوں کو اکساتی ہیں کہ وہ غیر مسلموں سے نفرت کریں۔ سمشن کی طرح فتنہ کا مواد بھی مستشرقین، ملحدوں اور نام نہاد اسلامی دانشوروں کی کتب سے لیا گیا۔

"انوسنس آف مسلمز" نامی فلم اب اسلام دشمنوں کا تازہ وار ہے۔ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی شر کے بطن سے خیر کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی زبردست عمل اس بظاہر منفی فلم نے بھی کر دکھایا۔ وہ یہ کہ ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ پوری دنیا کے مسلمان بھائی چارہ کے ذریعے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ان کی تہذیب و ثقافت، رسوم و رواج اور روایات کچھ بھی ہوں، اسلام سبھی کے خون میں مشترکہ عنصر بن کر دوڑتا ہے۔ لہٰذا اسلام سے محبت کی جیتی جاگتی بین الاقوامی مثال نے مسلم دشمنوں سے لے کر سپر پاورز تک سبھی کی آنکھیں حیرت سے کھول دیں۔
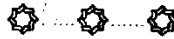
محمد فرقان

آزادیٔ اظہار رائے کے متعلق اسلام اور مغرب کا نقطہ نظر

اسلام ایک مکمل و معتدل ضابطہ حیات ہے جو اپنی نورانی تعلیمات سے اختلاف رکھنے والوں سے جبر اور زبردستی کا قائل نہیں بلکہ آزادیٔ فکر و عمل کی بھرپور تائید کرتا ہے اور اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے لیکن اس کے برعکس مغرب آزادیٔ اظہار رائے کے نام پر ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر رہا ہے۔ مغرب نے یہ گمراہ کن اور پرفریب اصطلاح اسلام کی آفاقی تعلیمات اور بانی اسلام ﷺ کی نعوذ باللہ تحقیر کے لیے وضع کی ہے۔ اس ابلیسی اصطلاح کی آڑ میں مسلمانوں کی دل آزاری، اہانت رسول اور تخریب کاری کے واقعات میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں کبھی مستشرقین کی طرف سے قرآن کریم کی صحت کو موضوعِ بحث بنایا جا رہا ہے اور اس کی حجیت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے جا رہے ہیں، کبھی نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اور نجی زندگی پر اعتراضات کی ناپاک جسارت کی جا رہی ہے اور کبھی سنت رسول ﷺ کو مضحکہ خیز اور مشکوک بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں تاکہ کسی طرح تنقید اور تنقیص کا دروازہ کھلے۔ علاوہ ازیں جہاد جیسے اسلامی فریضے کو مذکورہ اصطلاح کی آڑ میں وحشیانہ فعل باور کروانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

دراصل مغرب فکری، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تمدنی سطح پر اسلام سے شکست کھا چکا ہے جس کا واضح ثبوت مغرب میں اسلام کا روز بہ روز پھیلاؤ ہے۔ اپنی اسی ناکامی کو چھپانے کے لیے مغرب اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آیا ہے، اس لیے اب مغربی ذرائع ابلاغ، دانش ور، کالم نویس، اخبارات، ناول نگار اور فلم ساز اسلام کو اس کی اصل روح کے برعکس اپنے نقطہ نظر سے پیش کر رہے ہیں اور دوسری طرف مغرب سے مرعوب ایسے افراد جو اپنی تہذیب وثقافت سے نابلد اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں، مغرب کا آلہ کار بن رہے ہیں۔

آج مغربی تنظیمیں، این جی اوز اور انسانی حقوق کی نام نہاد تنظیمیں، توہین رسالت

کے مرتکب افراد کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ اس کے ردِ عمل میں مسلمانوں کا غم وغصہ، بے چینی اور اضطراب وقتی نہیں بلکہ فطری عمل ہے۔ اہانت رسول ﷺ سے امن داماں کے مسائل اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، کروڑوں لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے اور شہری آزادی کی بنیادیں متزلزل ہوتی ہیں، اسلام آزادیٔ اظہار رائے کے خلاف نہیں لیکن یہ آزادی جب اپنی حدود سے متجاوز ہو تو دوسروں کے لیے مسائل پیدا کرتی ہے اور آزادی انارکی بن جاتی ہے اس لیے آزادیٔ اظہار رائے کے نام پر کسی کی دل آزاری کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی کسی کی کردار کشی کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اس آزادی کو ہر نظام میں قانونی، اخلاقی اور ملکی سلامتی کی حدود میں پابند کیا جاتا ہے اس لیے بنیادی اقدار کا تحفظ ہر نظام کا حصہ ہے۔ آزادیٔ اظہار رائے کا مطلب مادر پدر آزادی نہیں لیا جاسکتا کہ دوسروں سے دست درازی کا سبب بن جائے اس لیے ہمیشہ بے قابو آزادی، افراتفری اور انتشار کا باعث بنتی ہے۔

مغرب مسلمانوں کی حساسیت سے آگاہ ہے اس لیے شر پسند مغربی عناصر مسلمانوں کو ذہنی طور پر تارچر کرنے کے لیے اہانت کی مذموم اور قبیح حرکات کرتے ہیں اور مسلمانوں کی غیرت اور حمیت کا امتحان لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے جواب میں مسلمانوں کے فطری ردِ عمل کو منظر عام پر لا کر بحیثیت مجموعی قوم مسلمانوں کا امیج پر تشدد قوم کے طور پر دکھاتے ہیں۔

نبی ﷺ کی ناموس کی حفاظت ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔ حامد کمال الدین ان مغربی ملحدین کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

> "نبی ﷺ پر ایمان لانا، تمہاری اپنی مرضی ہے، اور اس پر کوئی زبردستی نہیں مگر نبی اکرم ﷺ کی بابت تمہارا زبان سنبھال کر بات کرنا، اس دنیا میں ہمارے جینے کی شرط ہے اور اپنے جینے کی شرط پوری کرنا ہر مخلوق کا حق ہے۔ تنگ آمد بجنگ آمد" (یہ گرد نہیں بیٹھے گی، ص 27)

اہل مغرب کی جانب سے لامحدود اور غیر مقید آزادیٔ اظہار رائے کے نام پر آئے روز تقریر وتحریر کے ذریعے توہین آمیز واقعات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری وساری ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک پیغمبروں کی شان میں گستاخی کوئی معیوب عمل نہیں۔ چنانچہ نامور مستشرقین ولیم میور، ایڈورڈ گبن، آر۔ اے نکلسن، آندرے ڈینڈلو اور عصر حاضر کے گمراہ ترین انسان سلمان رشدی نے تعددِ ازدواج کے مسئلہ کو زیر بحث لا کر نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ برصغیر میں تاج برطانیہ کے زیر اقتدار اُٹھنے والی

تحریک شاتت میں منفی کردار ادا کرنے والے چند لوگ مثلاً سوامی دیانند سرسوتی، سوامی شردھا نند، راج پال، کالی چرن، نتھورام، پنڈت رام چندر اور کھیم چند، پنڈت لیکھ رام، پروفیسر چموپتی وغیرہ کی کبھی قانونی باز پرس نہ کی گئی بلکہ انھیں متعدد مواقع پر سرکاری تحفظ فراہم کیا گیا۔

مغرب میں سلمان رشدی کی مصنفہ "Stanic Verses" اور تسلیمہ نسرین کی مصنفہ ''لجا'' کو بے پناہ پذیرائی ملی ان کو اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا اور باقاعدہ تحفظ فراہم کیا گیا۔توہین آمیز کارٹون شائع کرنا اور ان میں مقابلے کی تشہیر کرنا، You Tube پر اہانت آمیز فلم ''انوسنس آف مسلمز'' دکھانا، پادری ٹیری جونز کا قرآن کریم کی بے حرمتی کرنا اور جلا دینا، یہ سب مغرب کے حاسد، منافق، خبطی اور نفسیاتی مریض ہونے کی دلیل ہے۔جن سے اُن کی ابلیسی فکر عیاں ہوتی ہے۔

ان نام نہاد آزادی کے مبلغوں کی نظر میں اسلام اب سب سے بڑا خطرہ ہے اور دن رات اس سے پریشان ہیں اور نت نئے انداز سے اس کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ اگر کچھ عرصہ قبل کے مغربی نقطہ نظر کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے 1950ء سے 1990ء تک کیمونزم کو دنیا کا سب سے بڑا خطرہ قرار دیا تھا۔ جب کیمونزم دم توڑ گیا تو امریکیوں نے دہشت گردی اور انتہاء پسندی کا لیبل مسلمانوں پر لگا دیا جنہوں نے ایسے لوگوں کے حصے بخرے کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ حالات کا رخ 90 کی دہائی کے بعد بدل گیا اور نائن الیون کے بعد جبراً مسلمانوں کو بدنام کیا گیا۔ اور ان کو دُنیا کے امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا گیا۔

مسلمانوں کو ایسے واقعات پر صبر وتحمل کا سبق دیا جاتا ہے اور اپنی آزادی اظہار رائے کا حق باور کروایا جاتا ہے لیکن جب ان کی اپنی باری آئے تو آزادیٔ اظہار رائے کی بجائے تنگ نظری، قدامت پسندی، مذہبی جنونیت اور انتہاء پسندی کا مظاہرہ کہا جاتا ہے۔ یعنی توہین آمیز واقعات کی ظاہری مذمت کے باوجود مغرب ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کے لیے تیار نہیں، یہ مغرب کی تصویر کا دوسرا رُخ ہے یعنی ایک ہی بات کے لیے دوہرا معیار مغرب کے شاطرانہ وطیرے کا آئینہ دار ہے۔ اب مغرب کی دوغلی پالیسی کی چند مثالیں بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

1- فرانس، بیلجیئم، پولینڈ، سوئٹزرلینڈ، جرمن، آسٹریا، رومانیہ، سلواکیہ اور چیک اتحاد پبلک میں ہولوکاسٹ پر تنقید کرنا جرم ہے۔ یعنی ان ممالک میں ہولوکاسٹ کو چیلنج

کرنا آزادیٔ اظہار کے منافی ہے۔

-2 امریکی سیاست کے معروف رازداں "پال فنڈلے" نے امریکی سیاست ومعیشت اور ذرائع بلاغ پر یہودی شکنجوں اور جارحانہ منصوبوں پر مشتمل کتاب They Dare to Apeakoul لکھی تو مصنف کی آزادی اظہار کو سلب کرتے ہوئے کتاب کو غائب کروادیا گیا۔

-3 ڈینش اخبار جب پیغمبر اسلام کے خاکے شائع کرے تو آزادیٔ اظہار لیکن جب اسی اخبار کو مئی 2004ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاکے چھاپنے کو کہا گیا تو یہ کہہ کرا نکار کردیا کہ اس سے عیسائیوں کی دل آزاری ہوگی جب کہ اسی اخبار ایریل شیرون کے بطور قاتل فلسطینی عوام کے خاکے چھاپنے سے بھی انکار کردیا۔

-4 آزادیٔ اظہار کے علم بردار چیچنیا، بوسنیا، کوسوو، کشمیری اور فلسطینی مسلمانوں کے آزادیٔ اظہار کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ ان پردن بدن ظالم کیوں ڈھائے جارہے ہیں، ان کے آزادی اظہار رائے کو بھی تسلیم کیا جانا چاہیے۔

-5 صدر اوبامہ اسلام مخالف فلم پر آزادیٔ اظہار کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں جب کہ دوسری جانب وکی لیکس کے بانی جولین اسانج کی ویب سائٹ کو امریکہ مخالف معلومات فراہم کرنے پر پابندی اور مقدمات کا سامنا ہے۔

-6 ایک عراقی صحافی نے اپنا فریڈم آف ایکسپریشن استعمال کرتے ہوئے جارج ڈبلیو بش پر جوتا پھینکا لیکن ان کو تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا، تشدد کے دوران ان کا ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔

-7 امریکہ میں Patsiol act کے تحت القاعدہ کی مدد نہیں بلکہ صرف ہمدردی کی بنا پر حراست میں لے لیا جاتا ہے۔

-8 امریکہ میں Maccaran اور Smeth ایکٹ کے تحت کسی شخص کو کیمونسٹ رجحانات رکھنے پر زیر تفتیش لایا جاسکتا ہے۔

-9 یورپی یونین کی جانب سے ایران پر جوہری تعاون کرنے یا پابندیاں لگوانے کا اعلان بھی ایران کی آزادیٔ اظہار کے خلاف ہے۔

-10 دہشت گردی کی جنگ میں امریکی حمایتی حکومت کے منسٹر غلام احمد بلور نے گستاخانہ

فلم بنانے والے کو قتل کرنے والے کو ایک لاکھ ڈالر کی انعامی رقم کا اعلان کیا تو یورپی ممالک میں ان کے داخلے کی پابندی کا اعلان مغرب نے کردیا، حالاں کہ انھوں نے مردان میں گرجے کے نذرِ آتش ہونے پر اظہارِ افسوس کیا تھا۔

-11 جب عیسائیت کے خلاف پاکستان میں کتب شائع ہوں تو ان پر جبراً پابندی لگادی جاتی ہے اور مصنفین کو برے انجام کی دھمکیاں ملتی ہیں۔ مثلاً ''عیسائیت کے تعاقب میں''، ''پادریوں کے کرتوت''، ''اُف یہ پادری'' وغیرہ، حالاں کہ یہ کتب حقائق پر مبنی ہیں۔

-12 آزادیٔ اظہار کو اپنا حق سمجھنے والے ممالک میں جب کوئی قابلِ اعتراض یا کسی شاہی خاندان سے منسلک قابلِ اعتراض شے منظرِ عام پر آئے تو مغرب کیوں تڑپ اُٹھتا ہے۔

-13 فرانس میں مسلمان عورتوں کو شخصی آزادی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حجاب پہننے پر پابندی آخر کیوں؟

-14 سلمان رُشدی کے جواب میں برطانیہ کے ڈاکٹر شبیر احمد نے کتاب لکھی مگر کوئی برطانوی پبلشر اسے شائع کرنے پر تیار نہیں ہوا بلکہ مصنف کو اس جرم پر برطانیہ چھوڑنا پڑا۔

مواحد حسین سید

آزادیٔ اظہار کا مذاق

مغرب میں ایک عام پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ مسلم دنیا میں توہین آمیز کارٹونز کے خلاف رویہ آزادیٔ رائے کے منافی ہے کیونکہ یہ لوگ آزادیٔ رائے کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ مغرب میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اگر مسلمان زیادہ روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہوتے اور آزادیٔ رائے کی حقیقت سے آگاہ ہوتے تو یہ تنازعہ کھڑا نہ ہوتا لیکن کیا مغرب واقعی ویسا ہی کرتا ہے جیسا یہ کہتے ہیں؟

امریکہ میں سفر کے دو دن میں نے ورجینیا میں ارلنگٹن نیشنل سمیٹری کا دورہ کیا اور جنرل جارج براؤن کی قبر پر رک گیا جو 1974 سے 1978ء تک چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف تھے یہ امریکہ کی اعلیٰ ترین فوجی پوزیشن ہے۔ جنرل براؤن 1974ء میں اپنے ایک بیان کی وجہ سے بہت مشہور ہوگئے تھے جب انہوں نے خبردار کیا تھا کہ امریکہ کی مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اسرائیلی لابی کی اندھی حمایت بین الاقوامی مسائل پیدا کرسکتی ہے۔ جنرل براؤن نے اپنی بات کا اعادہ امریکی کانگریس کے سامنے بھی کیا جب انہوں نے اسرائیل کو امریکہ کے اوپر ایک ''سٹریٹیجک بوجھ'' قرار دیا۔ جنرل کے ان بیانات نے اسرائیل کے حامی حلقوں میں بہت زیادہ ہلچل پیدا کر دی تھی اور انہوں نے اس وقت کے امریکی صدر فورڈ پر زور دیا تھا کہ وہ جنرل براؤن کو فارغ کر دیں مگر بعد میں ایسا نہ کیا گیا کیونکہ اسرائیل کو معلوم تھا کہ اگر اسے ہٹایا گیا تو اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ جنرل براؤن صحیح تھے۔

جنرل براؤن سے پہلے ایڈمرل تھامس مورر تھے جو 1970ء سے 1974ء تک چیئرمین جوائنٹس چیفس آف سٹاف رہے۔ جون 1967ء میں عرب اسرائیلی جنگ کے دوران ایک اسرائیلی جنگی جہاز نے امریکی بحری جہاز کو بم مار کر عملے کے 34 افراد سمیت 172 افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ ایڈمرل مورر اور ان کے سینئر بحریہ کے افسران کا شکریہ کہ حقیقت

کبھی منظرِ عام پر نہ آسکی۔ امریکی نیوی میں کچھ افسران نے امریکی انتظامیہ کو واقعہ چھپانے کا مورد الزام ٹھہرایا۔ 1984ء میں ایڈمرل مورر نے کہا......

"اگر امریکی عوام کو پتہ لگ جائے کہ اسرائیل کے حامی عناصر امریکی حکومت میں کس قدر اثر و رسوخ رکھتے ہیں تو شاید وہ ہتھیار اٹھالیں۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کے تعلقات کے حوالے سے بہت کم بحث ہوئی ہے۔ کئی دوسرے افراد کا بھی یہ خیال ہے کہ امریکی جمہوریت کو ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔ سابق کانگرس کے رکن پاؤل فنڈلے نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے

"They dare to speak out"

عمان میں یکم مارچ 2006ء کو اقوام متحدہ میں پی ایل او کے پہلے نمائندے زیدی تیرزی انتقال کر گئے۔ وہ 1975ء میں اقوام متحدہ میں فلسطین کے پہلے مستقل ممبر بنے تھے۔ 1986ء میں امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے زیدی تیرزی کو نیویارک سے 200 میل دور بوسٹن میں ہارورڈ لاء سکول جانے سے روک دیا تھا کہ وہ وہاں مسئلہ فلسطین پر بحث نہ کر سکیں۔ 1979ء میں تیرزی نے اقوام متحدہ میں امریکی سفیر اینڈریو ینگ کے ساتھ دوپہر کا کھانا تناول کیا۔ اس پر اسرائیل کی حامی لابی نے اتنا زیادہ شور مچایا کہ امریکی صدر جمی کارٹر اینڈریو ینگ کو فارغ کرنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ فلسطین کے حوالے سے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اینڈریو ینگ ایک معروف سیاہ فام ہیومن رائٹس لیڈر اور کانگرس کے رکن رہے تھے۔

حال ہی میں کولوراڈو کی ایک سکول ٹیچر جے بینش کو محض اس لیے معطل کر دیا گیا کیونکہ انہوں نے صدر بش کا ہٹلر کے ساتھ موازنہ کرنے کی کوشش کی اور ثابت کیا کہ امریکہ دنیا کی سب سے بدمعاش قوم ہے۔ کلاس کے دوران بینش نے سوال کیا کہ امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں جنگ کرنے کی اجازت کیوں دی گئی جبکہ فلسطینی ریاست کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اسرائیل کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ ٹیچر کو سزا دے کر معطل کر دیا گیا۔

5 مارچ کو ہالی وڈ میں آسکر ایوارڈ کی تقریب میں جس فلسطینی فلم "Pradise Now" کو بہترین غیر ملکی فلم کے لیے ہارٹ فیورٹ تصور کیا جا رہا تھا۔ اس فلم کی کہانی دو فلسطینی نوجوانوں سے بحث کرتی ہے جو اسرائیلی تسلط کے خلاف خودکش دھماکے

کا منصوبہ بناتے ہیں۔ اسرائیل میں بہت زیادہ شور مچایا گیا اور کہا گیا کہ اس فلم کو مقابلے سے دستبردار کیا جائے کیونکہ وہ مسئلہ فلسطین کے حوالے سے کسی بھی قسم کی ہمدردی والی فلم کو پروموٹ ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فلم کو کوئی ایوارڈ نہیں دیا گیا۔

اس کے مقابلے میں ایک اور ڈاکومنٹری کو پروموٹ کرنے کی کوشش کی گئی جو مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کا نام Obsession-Radical Islam`s War against the West ہے۔

فلم کا مختصر جائزہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

''آج ہمارا سامنا ایک نئے دشمن سے ہے جو دنیا کو تبدیل کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ آج جب ہم اپنے گھروں میں پرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں، ایک بہت بڑا شیطان ہمارے خلاف سرگرم عمل ہو چکا ہے۔ ایک نیا طوفان ہمارے لیے خطرہ بن رہا ہے اور وہ مغربی تہذیب کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ یہ دشمن انتہا پسند اسلام ہے۔'' جو لوگ اس فلم کے بارے میں مزید جاننا چاہیں وہ مندرجہ ویب سائٹ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

www.obsessionthemovie.com

امریکی آئین میں پہلی ترمیم آزادی رائے سے بحث کرتی ہے لیکن اس کے باوجود ایسی خلاف ورزیاں کی گئی ہیں حالانکہ آئین میں اس حوالے سے تمام ترضمانتیں اور تحفظات دیے گئے ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کس طرح آزادی رائے یک طرفہ ہے۔ عملی طور پر اسے عرب اور مسلمانوں کے حوالے سے مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے کو دبانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں یہ بند دروازوں اور بند ذہنوں کی کہانی ہے۔ مغرب ''تہذیبوں کے تصادم'' کے فلسفے کو ہوا دے رہا ہے اور مغرب کے عیسائیوں کو اسلام کے خلاف کھڑا ہوا دکھایا جا رہا ہے مگر بدقسمتی ہے مسلمان آپس میں بھی لڑائی میں مصروف ہیں جو مال و دولت کے لیے ہو رہی ہے۔

یہ مغرب میں موجود مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے، اگر وہ اس معلومات کے منفی بہاؤ اور عدم مساوات کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے تو ان کا مغرب میں تحفظ، عزت و احترام باقی نہیں رہے گا، پھر ایسی زندگی کا کیا فائدہ کہ آپ زندہ ہیں مگر زندہ نہیں۔

عبداللہ طارق سہیل

بشپ کے سچ پر طوفان

یورپ کی جان ایک بشپ نے عذاب میں ڈال دی ہے۔ برطانوی نژاد جرمن بشپ رچرڈ ولیم سن نے پچھلے دنوں کہہ دیا کہ ہولوکاسٹ (ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا مفروضہ قتل عام) کی کہانی جھوٹ ہے، ہٹلر نے کسی یہودی کو گیس چیمبر میں نہیں مارا۔ سویڈن کے ایک چینل کو انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ ہولوکاسٹ کی کہانیاں جھوٹ ہیں۔ بس اس پر طوفان آ گیا، یورپ بھر کے ماہرین قانون اس پر پل پڑے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے امریکہ نے یورپ کا جو معاشرتی بندوبست کیا تھا، اس میں یہودیوں کو انوکھے سے بڑھ کر انوکھے لاڈلے کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ یہ واحد کمیونٹی ہے جس کے خلاف نفرت کا اظہار سخت ترین سزا کا موجب ہے۔ یہودی کہتے ہیں، ہولوکاسٹ میں ہٹلر نے 50 لاکھ سے زیادہ یہودی گیس چیمبرز میں بھون ڈالے، کچھ یہ تعداد اس سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔ کوئی کہے کہ 50 لاکھ نہیں 49 لاکھ 50 ہزار یہودی مارے گئے تھے تو اسے بھی سزا ملتی ہے۔ قانون کا تقاضا یہ ہے کہ یہودی جتنی تعداد بتائیں اس میں ایک کی کمی بھی نہ کی جائے۔

اور تو اور یورپ نے بھی اس بشپ کی سرزنش کی اور کہا کہ اپنا بیان واپس لو۔ یہی نہیں، یہودی اس بیان پر پورے کیتھولک چرچ سے ناراض ہو گئے۔ انوکھے لاڈلوں کی یہ ناراضی دور کرنے کے لیے پوپ بینڈکٹ نے یہودی گروپوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ انہوں نے یہودیوں کی تالیف قلب کے لیے ان سے اظہار یک جہتی ظاہر کی ہے۔ ظاہر ہے، بشپ رچرڈ نے یہ بیان دے کر کہ ہٹلر کے زمانے میں زیادہ سے زیادہ تین لاکھ یہودی مرے ہوں گے اور وہ بھی گیس چیمبرز میں نہیں بلکہ دیگر واقعات میں ہلاک ہوئے ہوں گے، یہودیوں کے زخموں پر روحانی زخم لگایا ہے جو جسمانی زخم سے گہرا ہوتا ہے۔ جسمانی زخم کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، اسی لیے تو اسرائیل نے جب غزہ میں ڈیڑھ ہزار فلسطینی جسمانی اعتبار

سے مار دیے، تیس ہزار کے اعضا اڑا دیئے تو پوپ نے فلسطینیوں سے یک جہتی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

جرمنی کے کیتھولک بشپس کی کونسل نے مذکورہ گستاخ بشپ کو چرچ سے نکالنے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ کیتھولک ازم میں ہولوکاسٹ کو جھٹلانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیا خوب! بائبل کے کس باب میں لکھا ہے کہ ہولوکاسٹ پر پورا پورا ایمان لاؤ۔ توریت میں، زبور میں، یوحنا، لوقا، مرقس، متی کی انجیل میں، ڈینیل (دانیال) نبی کی کتاب میں، یوحنا کے مکاشفات میں یا ان درجنوں اناجیل (گوسپلو) میں سے کسی ایک میں جن کو پچھلی صدیوں میں الگ کیا جا چکا ہے؟

ہولوکاسٹ کا انکار حضرت یسوع مسیحؑ کی تعلیمات کے خلاف ہے یا حضرت پولوس (سینٹ پال) کے کسی قول کی نفی ہے؟ کیا ایسا پطرس نے کہا یا پھر سٹیفن نے جسے اسرائیلی پیشواؤں نے سنگساری کا حکم سنایا تھا۔ جرمن کونسل کو چاہیے کہ وہ دین مسیحی کا کوئی صریح حکم بیان کرے۔ انوکھا مقام ہے، جرمنی کے کیتھولک رہنما اسرائیل نوازی میں ایونجلسٹک امریکہ پر بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کبھی کسی کونسل نے جنگ عظیم کے اس قتل عام کا احوال بھی لکھا جو امریکہ کے ہاتھوں ہوا۔ امریکہ نے جرمنی کے شہروں پر ایسی بمباری کی کہ عمارتیں اینٹوں میں اور اینٹیں برادے میں تبدیل ہو گئیں۔ امریکیوں کا اپنا اعتراف یہ ہے کہ ان کی بمباری سے 33 لاکھ سے زیادہ جرمن شہری مارے گئے۔ 33 لاکھ سے کتنے زیادہ؟ حقیقت میں بمباری سے جرمنوں کی اس سے کہیں زیادہ آبادی ماری گئی۔ 32 لاکھ سے زیادہ جرمن فوجی ہلاک ہوئے جن میں سے بڑی تعداد تو بلاشبہ میدان جنگ میں مری لیکن بہت سے ہتھیار ڈالنے کے بعد مار دیے گئے۔ 72 لاکھ جرمن شہری امریکی بمباری سے زخمی ہوئے۔ جرمنی کی دو کروڑ عمارتوں میں سے 70 لاکھ امریکی طیاروں نے مکمل طور پر تباہ کر دیں۔ برلن کی تو شاید ایک بھی عمارت صحیح سلامت نہیں چھوڑی گئی۔ جنگ کے بعد دس لاکھ جرمن شہریوں کو امریکی افواج نے غلام بنا لیا اور ان سے سڑکوں ریلوں کی تعمیر و مرمت اور ملبے کی صفائی کا کام لیا۔

جرمن قوم کی نفسیاتی برین واشنگ اس حد تک کی گئی کہ وہ خود کو ہی مجرم سمجھنے لگی جس طرح امریکہ نے جرمن آبادیوں اور اس کے انفراسٹرکچر کو تباہ کیا، اس کی مثال نہیں ملے گی۔

بشپ کونسل ہٹلر کو درندہ سمجھتی ہے لیکن درندے کے اس قول پر اس کی نظر شاید نہیں پڑی:

"یہ (دوسری عالمی) جنگ صرف ان بین الاقوامی مدبروں کی خواہش اور انگیخت کی بنا پر ہوئی جو یا تو یہودی الاصل تھے یا یہودیوں کے مفاد کے لیے کام کر رہے تھے............ میں اپنی قوم کے لیڈروں سے کہتا ہوں کہ وہ بین الاقوامی یہودیت کی بے پناہ مخالفت جاری رکھیں جو روئے زمین کی تمام قوموں میں زہر پھیلانے کے ذمہ دار ہیں"۔ (ہٹلر کا وصیت نامہ)

دنیا بھر کے سامنے جنگ عظیم کی وہی تاریخ ہے جو امریکیوں، برطانویوں اور فرانسیسیوں نے لکھی اور جس پر یہودیوں نے مہر لگائی۔ جرمن قوم کا کوئی "ورشن" موجود نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی تاریخ کا یہ قرض کوئی نہ کوئی چکا دے گا جس کے بعد جنگ عظیم کے اسباب اور اس کے پیچھے کارفرما یہودی مفادات کے بارے میں غیر جانبدارانہ رائے قائم کی جا سکے گی۔

جرمن بشپز کونسل کے پاس وقت ہو تو متی کی یہ سطریں پڑھ لے کہ حضرت یسوعؑ نے یہودیوں کے بارے میں کیا فرمایا تھا:

"تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر سے مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے"۔ (متی 23:27، 29، 33)

مولانا محمد احمد حافظ

آزادیٔ اظہار......ایک جائزہ

یورپی ذرائع ابلاغ کی جانب سے توہین رسالت ﷺ کے ارتکاب کے بعد اب تک کسی بھی متعلقہ ملک اور توہین رسالتؐ کے مجرموں نے معافی نہیں مانگی ہے بلکہ یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی ہے کہ کارٹونوں کی اشاعت آزادیٔ اظہار اور انسانی حقوق کا معاملہ ہے جو عالمی سطح پر مسلم ہے، اس لیے حکومتی سطح پر اس سلسلے میں کسی قسم کا ایکشن نہیں لیا جا سکتا بلکہ ایک موقف یہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ مسلم ممالک میں اس مسئلے پر احتجاج آزادیٔ اظہار کی نفی ہے۔ کم از کم ڈنمارک اور ناروے کی حکومتوں کا یہی موقف ہے۔

ادھر احتجاج کرنے والی مسلم تنظیموں اور مسلم زعما کا کہنا ہے کہ ہم آزادیٔ اظہار کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی کو ہدف بنایا جائے۔ چنانچہ کارٹونوں کی اشاعت آزادیٔ اظہار کا ''غلط استعمال'' ہے۔ گویا ان کے خیال میں آزادیٔ اظہار کی بھی کچھ حدود ہیں حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ خود مغرب اس سلسلے میں یکسو نہیں، حال ہی میں ہولوکاسٹ کے حوالے سے برطانوی مورخ ڈیوڈ آئرونگ کو اس لیے جیل بھیج دیا گیا ہے کہ اس نے آزادیٔ اظہار کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کا انکار کیا ہے۔ ڈیوڈ آئرونگ نے جیل سے اپنے ایک انٹرویو میں اپنے معاملے میں ہونے والی کارروائی کو ناانصافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''آزادیٔ اظہار رائے کا مطلب ہی ایسی بات کہنے کا حق ہے جسے دوسرے لوگ ناپسند کرتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں اظہار رائے کی آزادی کا مطلب غلط بات کہنے کا حق ہے۔'' (ایکسپریس 24 فروری 2006ء)

ہمارے ہاں بعض مسلم دانشور ابھی اس بات کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آزادی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ آزادیٔ اظہار حقوق انسانی کے منشور کی ایک شق ہے۔ ''حقوق انسانی'' کا ایک منشور مغربی طاقتوں کا ترتیب دیا ہوا ہے، چنانچہ اس پس منظر

میں مغرب کے تصور انسان، اس کے تصور خیر و شر اور مقصدیت کو جانے بغیر حقوق انسانی کے اس منشور کا گہرا مطالعہ و تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔

حقوق انسانی جس کا منشور ایسے ماحول میں ترتیب دیا گیا جب ہیومنزم کی تحریک پورے مغرب میں سرایت کر چکی تھی اور مغرب عمومی طور پر مذہب کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر انسان پرستی کی طرف مائل ہو چکا تھا، یعنی انسان خود اپنی پرستش میں مگن اور زیادہ سے زیادہ لذت کے حصول میں منہمک ہو چکا تھا۔ حقوق انسانی کے منشور کی تمام شقیں انسان ہی کے گرد گھومتی ہیں جو اس کی الوہیت کے امکانات کو واضح کرتی ہیں۔ اس منشور کے سرسری مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آزادی، مساوات اور ترقی ...... یہ تینوں اس کی حقیقی روح ہیں۔ آج مغرب ہمارے احتجاج کو سمجھنے سے اس لیے قاصر ہے کہ اس کے ہاں آزادی کا تصور خالص مادی نوعیت کا ہے۔ مغرب میں اس تصور کا مطلب مذہبیت، روحانیت، عقیدۂ آخرت، حصولِ رضائے الٰہی کی خواہش کی پامالی کے سوا کچھ نہیں۔ مغرب اس بات میں راسخ ہو چکا ہے کہ کسی بھی معاشرے کے قیام اور وجود کے لیے آزادی بنیادی قدر ہے۔ آزادی کی آڑ میں مغرب کا پہلا ہدف مذہب اور مقدس شخصیات ہوتی ہیں، اس لیے کہ لبرل اور سیکولر معاشرے میں ایسے فرد کی گنجائش نہیں جو مذہبی پابندیوں میں جکڑا ہوا اور تعقل و وجدان کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر کرنے کی بجائے کسی شخصیت کو اپنا رہبر، مقتدیٰ اور پیشوا تسلیم کرتا ہو۔

مغربی معاشروں میں آزادی (Freedom) کے بارے میں مختلف طرح کے تصورات موجود ہیں، مجموعی طور پر غالب تصور یہی ہے کہ انسان اپنے خیر و شر کے معیارات کے تعین کا نہ صرف خود مجاز بلکہ حق دار ہے اور اس کی انسانیت کا جوہر ہی یہ ہے کہ وہ اپنی متعین کردہ اقدار کو آزادانہ اپنا سکے اور ان کے مطابق زندگی گزار سکے۔ چنانچہ مغرب میں اگر کوئی شخص نکاح کو فضول چیز سمجھتا ہے اور اسے اپنی ترقی میں رکاوٹ سمجھتا ہے تو اسے آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی عورت سے وقتی تعلق رکھ سکے، یا وہ شراب پینے کو بہتر خیال کرتا ہے تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اسے شراب مہیا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مغربی معاشرے میں ایک رائٹر اپنی نگارشات میں جو چاہے پیش کر سکتا ہے، وہ اپنے خیالات کے اظہار میں آزاد ہے، ایک آرٹسٹ اپنے فن کے اعتبار سے آزاد ہے۔ وہ کارٹونسٹ ہے تو اسے آزادی ہے کہ وہ جیسا چاہے کارٹون بنا سکے، ڈرامہ نگار ہے تو اپنی مرضی سے کردار اور مکالمے تجویز کر سکتا ہے۔ وہ

افسانہ نویس اور کہانی نگار ہے تو وہ اس بات میں آزاد ہے کہ اپنی کہانی اور افسانے کا پلاٹ اپنی مرضی کا منتخب کر سکے، قطع نظر اس بات کے کہ اس کے کرداروں، مکالموں اور کہانیوں سے الحاد، عریانیت اور بدعقیدگی کا پرچار ہوتا ہو یا کوئی بھی مقدس شخصیت ہدف تنقید بنتی ہو۔ حالیہ واقعات کے تناظر میں جب ایک فرانسیسی اخبار نے یہ کہا کہ "ہمیں حق حاصل ہے کہ ہم خدا کا کارٹون بھی بنائیں اور چھاپیں"، تو اس ایک جملے میں پورے مغرب کی سوچ اور فکر سمٹ کر آ گئی کہ اہل مغرب اپنی آزادی کے سلسلے میں کسی قسم کی حد بندیوں کے قائل نہیں۔ ڈینش حکومت کو امریکا و برطانیہ کی تھپکی اس بات کی غماز ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی قسم کی مفاہمت یا معذرت پر مبنی رویہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ حقوق انسانی کا تحفظ اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہر فرد اپنے دائرہ اختیار میں آزاد رہ سکے۔ تحفظ حقوق انسانی کی تنظیموں کی خاموشی بھی اسی تناظر میں ہے کہ وہ کارٹونوں کی اشاعت پر قدغن کو آزادئ اظہار میں رکاوٹ خیال کرتی ہیں۔

اس مرحلے پر لمحہ فکریہ ہمارے لیے ہے کہ ہم ذہنی سطح پر آج کہاں ہیں؟ کیا ایک ایسا منشور جو حضور رسالت مآب ﷺ کی توہین کے ارتکاب میں نہ صرف یہ کہ رکاوٹ نہ ہو بلکہ اس جسارت کو مزید ممکن بناتا ہو، ایک صاحب ایمان کے لیے قابل تسلیم ہو سکتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ ہمارے خیال میں حقوق انسانی کا منشور اصلاً غلبۂ کفر کا منشور ہے۔ اس منشور کا علمی بنیادوں پر تنقیدی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ الحمدللہ! ہماری فکری بنیادیں ابھی اتنی بانجھ نہیں ہوئی ہیں کہ انسانی حقوق کے منشور کا علمی بنیادوں پر پرکھا نہ جا سکے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آج ہم مغرب کی علمی برتری کی مرعوبیت سے نکل آئیں اور اسلامی ماخذات کی طرف رجوع کر لیں، اپنے دل میں رومی کے عشق اور دماغ میں غزالی کی فکر کو اجاگر کر لیں، اپنے علم ونظر کا منبع وحی الٰہی کو مان لیں، اسوہ وقدوۂ رسول ﷺ کو حرز جان بنا لیں تو ان شاء اللہ ہمیں وہ روشن راہیں ضرور دکھائی دینے لگیں گی جن پر چلتے ہوئے ہم اپنی علمی کم مائیگی، فکری پستی اور عملی کمزوری کو دور کر سکیں گے۔

مرزا محمد الیاس

ہولوکاسٹ کا انکار جرم ہے، آزادیِ اظہار نہیں

متعدد یورپی ممالک میں ہولوکاسٹ کا انکار قانوناً جرم اور قابل سزا ہے۔ بعض ممالک کے قوانین میں بڑی واضح نشاندہی کی گئی ہے کہ یہودیوں کے اس مبینہ قتل عام کا انکار کرنے کا اقدام ایک مجرمانہ فعل ہے۔ یورپی یونین نے نسل پرستی اور غیر ملکیوں سے نفرت کے بارے میں باقاعدہ ہدایات جاری کر رکھی ہیں جن میں رکن ممالک سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسے افراد کے خلاف فوجداری مقدمات درج کر کے انہیں سزائیں دیں جو ہولوکاسٹ کا انکار کرتے ہوں۔ اس جرم کی سزا ایک سے تین سال تک ہو سکتی ہے۔ کونسل آف یورپ نے 2003ء میں سائبر کرائم کا اضافی پروٹوکول جاری کیا تھا جس میں نسل پرستی اور نفرت کے جرائم پر مقدمات چلانے کا کہا گیا۔ یہ سزائیں ان لوگوں کو دی جاتی ہیں جو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر پر ہولوکاسٹ کا انکار کرتے ہیں۔ اس قانون کو کہا گیا ہے کہ یہ ہولوکاسٹ سے انکار، اس کی شدت کم بتانے، قتل عام کی حمایت کرنے یا اسے جائز قرار دینے یا انسانیت کے خلاف جرائم کرنے پر سزا دینے کا قانون ہے۔ جرمنی، آسٹریلیا، ہنگری اور رومانیہ ایسے ممالک ہیں جن میں ہولوکاسٹ سے انکار ایک مکمل جرم ہے اور قانوناً ایسا کرنا منع ہے۔ یہی وہ ممالک ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہولوکاسٹ کے ذمہ دار تھے اور انہی ممالک میں لاکھوں یہودی قتل کر دیے گئے تھے۔ ان ممالک میں نازی ازم اور اس کی علامات تک پابندی کی زد میں آتے ہیں۔

ان ممالک میں تقریر یا اظہار کی آزادی پر کچھ اور بھی پابندیاں ہیں۔ ان پابندیوں کو ہتک عزت کی قانونی پابندی کے عنوان سے لگایا جاتا ہے۔ یہ پابندیاں عمومی قانون سے ہٹ کر خصوصی قانون سے لگائی گئی ہیں۔ امریکہ، آئرلینڈ اور دولت مشترکہ کے کئی ممالک میں بھی ان کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ یورپ کے ممالک اور سکاٹ لینڈ میں بھی ہولوکاسٹ کا انکار جرم

ہے۔ایسے مقدمات میں عدالت کے جج خود ہی الزام عائد کرتے اور خود ہی سماعت کے بعد سزا سنا دیتے ہیں۔ ہولوکاسٹ سے انکار پر ان سزاؤں کے بارے میں کبھی کبھی آوازیں بلند ہوتی ہیں جن سے یہ کہنا یا باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ ایسے قوانین سے یہودیوں کے خلاف تشدد میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف یہودی لابی یہ پروپیگنڈہ کرتی بھی نظر آتی ہے کہ ان کے حقوق کی بہتر حفاظت یہ نہیں کہ ایسی پابندیاں لگائی جائیں بلکہ آزاد معاشروں میں جمہوری حقوق پر یقین رکھنے میں ہے۔ عملی طور پر ان کا کردار اس کی نفی کرتا ہے۔ جب وہ جمہوری حقوق کی بات کرتے ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسے معاشرے خود بخود سزائیں سنا دیتے ہیں۔

بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ ہولوکاسٹ سے انکار پر سزا نہیں دینی چاہیے کیونکہ یہ آزادیٔ اظہار کی خلاف ورزی ہے۔ ہنگری کی آئینی عدالت نے لیزلوسولیوم کی سربراہی میں ایک قانون مسترد کردیا تھا جو 1992ء میں ہنگری کی پارلیمنٹ نے ہولوکاسٹ سے انکار کرنے والوں کے خلاف پاس کیا۔ عدالت نے قرار دیا تھا کہ ہولوکاسٹ سے انکار کرنے والوں کو سزائیں دینا انسانی حقوق کی یورپی کنونشن کی خلاف ورزی ہے۔ یہ انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کے بھی منافی ہے۔ اسے کونسل آف یورپ نے بھی مسترد کیا ہے۔ اس قانون کے خلاف نہ صرف انسانی حقوق کا یورپی کمیشن ہے بلکہ انسانی حقوق کی یورپی عدالت اور اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی بھی اس کی مخالف ہے۔ یہاں ان ممالک کا مختصر تذکرہ کیا جارہا ہے جہاں ہولوکاسٹ سے انکار جرم ہے۔

- آسٹریا: آسٹریا میں نازی ازم کے خلاف 1947ء میں قانون سازی کی گئی تھی۔ اس قانون سازی کے تحت نازی ازم کے کسی بھی نوعیت کے احیا کو دبانے کا حکم دیا گیا۔ 1992ء میں اس قانون میں ترمیم کرکے اسے زیادہ مخصوص کردار دیا گیا اور ہولوکاسٹ سے انکار یا اس کی شدت کم بتانے پر اسے قابل سزا جرم بنا دیا گیا۔ اسے 1947ء کا نیشنل سوشلزم ممنوعہ قانون کہا جاتا ہے۔ جسے 1992ء میں ترمیم کرکے نافذ کیا گیا۔ اس کے تحت ہر وہ فرد قابل سزا ہے، اسے نظر بند اور قید کیا جاسکتا ہے، دس سال کی سزا دی جاسکتی ہے، سخت معاملات میں یہ سزا 20 سال تک بڑھائی جاسکتی ہے، جو ہولوکاسٹ کا انکار کرے۔ اس ترمیم کے تحت انکار کرنے، اس کی شدت کم کرنے، اسے کم کرکے بتانے یا اس قتل عام کا جواز پیش کرنے کو قومی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اسے انسانیت کے خلاف جرم قرار دیا گیا ہے

خواہ اسے ریڈیو، ٹی وی سے کیا جائے یا پرنٹ میڈیا کو استعمال کیا جائے۔

- بلجیم: بلجیم میں آرٹیکل 1 میں کہا گیا ہے کہ تعزیرات کے آرٹیکل 444 کے تحت ان تمام اقدامات پر آٹھ دن سے ایک سال تک سزا دی جائے گی جن کا تذکرہ آسٹریا کے قانون میں ہوا ہے۔ ایسے افراد کو 26 فرانک جرمانہ ہوسکتا ہے جس کی مقدار پانچ ہزار فرانک تک بڑھائی جاسکتی ہے۔ آرٹیکل 2 میں کہا گیا ہے کہ ایسی سزا کی اخبارات اور دوسرے میڈیا سے تشہیر کی جائے گی اور مجرم کے بارے میں سب کو آگاہ کیا جائے گا۔ آرٹیکل 5 میں یہ سزا پانچ سال قید کردی گئی ہے۔
- بوسنیا ہرزیگووینا: مئی 2007ء میں ایجانووچ نے پارلیمان میں ایک قانونی مسودہ پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہولوکاسٹ سے انکار کرنے والے کو سزا دی جائے اور اس اقدام کو جرم قرار دیا جائے۔ بوسنیائی سرب رکن پارلیمنٹ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اس معاملے کو بوسنیا کے ضابطہ فوجداری کے تحت ہی حل کیا جائے۔ مئی 2009ء میں پہلے مسودہ قانون میں ترمیم تجویز کی گئی اور ہولوکاسٹ سے انکار کو جرم قرار دیا گیا۔
- چیک ری پبلک: ہولوکاسٹ سے انکار کرنیوالے کو ایک سے پانچ سال قید ہوسکتی ہے۔ یہ سزا تین سے آٹھ سال تک بڑھ سکتی ہے اگر جرم کی نوعیت شدید ہو اور یہ جرم کرنے والے نے میڈیا کا استعمال کیا ہو۔ اگر کسی منظم گروہ کے رکن نے یہ جرم کیا ہو تو سزا مزید بڑھ جاتی ہے۔
- فرانس: فرانس میں Gayssot ایکٹ 13 جولائی 1990ء سے نافذ ہے، جس کے تحت انسانیت کے خلاف جرائم پر سزا دی جاتی ہے۔ ان جرائم کی وضاحت لندن چارٹر 1945ء میں کی گئی ہے۔ اس کے مطابق نازی رہنماؤں پر 1945ء میں نومبرگ میں مقدمہ چلا کر انہیں سزا دی گئی تھی۔ اسی طرح سے ایک قانون جسے 90-615 کا نمبر دیا گیا ہے اور یہ 1990ء سے نافذ ہے۔ یہ جولائی 1881ء کے ایک قانون کی تبدیل شدہ شکل ہے جس کا تعلق ابلاغ کی آزادی سے ہے۔ اس قانون میں کہا گیا ہے کہ اس کی متعدد دفعات کے تحت جرم کرنے والے کو اس کے جملہ حقوق سے ہی محروم کیا جاسکتا ہے اور پانچ سال تک قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ ایک ترمیم آرٹیکل 24 میں کی گئی ہے جس کے مطابق مختلف نوعیت کی خلاف

ورزیوں پر سزا ایک ماہ سے ایک سال قید کی صورت میں دی جاسکتی ہے۔ بعدازاں ایک اور دفعہ شامل کردی گئی جس سے آرٹیکل 48 میں اضافہ کردیا گیا اور سزا ایک سال سے پانچ سال کردی گئی۔

- جرمنی: جرمنی کے ضابطہ فوجداری میں لوگوں کو اکسانے اور مشتعل کرنے کا قانون YOLKSVERHETZUNG کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق آبادی کے کسی حصے کے خلاف نفرت پھیلانا جرم ہے۔ سواستیکا یا دوسری علامت کی حمایت کرنا بھی جرم ہے۔ ہولوکاسٹ سے انکار بھی جرم ہے اور ان جرائم کی سزا تین ماہ سے پانچ سال تک ہوسکتی ہے۔ قتل عام کی وضاحت کردی گئی ہے جس کے مطابق کسی گروہ کے ایک رکن کو قتل کرنا، اس کے ارکان کو ذہنی یا جسمانی نقصان پہنچانا، کسی گروہ میں پیدائش کے عمل کو روکنا وغیرہ سب جرم ہیں۔ ان جرائم کی شکایت درج کرانا لازمی ہے۔ تحریر وتقریر کے کسی بھی ذریعے کو استعمال میں لاکر ایسا کرنا بھی جرم ہے۔
- ہنگری: ہولوکاسٹ کو عام واقعہ قرار دینا جرم ہے۔ اس کا انکار اس سے بڑا جرم ہے۔ اس پر تین سال تک قید ہوسکتی ہے۔
- اسرائیل: ہولوکاسٹ سے انکار پر باقاعدہ قانون موجود ہے جسے ہولوکاسٹ سے انکار سے ممانعت کا قانون مجریہ 1986ء کہا جاتا ہے اور اس کا نمبر 5746 ہے۔ اس قانون میں نازی اور نازی سازشیوں کے باقاعدہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس قانون کے تحت کوئی فرد تحریر، تقریر، ابلاغ یا کسی بھی طرح سے نازی حکمرانوں کی تعریف بھی کرے گا تو وہ مجرم تصور کیا جائے گا۔ ایسے اقدام کو یہودی آبادی کے خلاف جرم سمجھا جائے گا۔ اس کے خلاف فرد جرم عائد کی جائے گی اور اٹارنی جنرل اس معاملے میں رضامندی دینے کا پابند ہوگا۔
- لکسمبرگ: یہاں آرٹیکل 3-457 اور ضابطہ فوجداری کے ایکٹ 19 مجریہ 1997ء کے تحت ہولوکاسٹ سے انکار جرم ہے۔ اس پر 8 دن سے 6 ماہ تک سزا دی جاسکتی ہے یا نقد جرمانہ کیا جاسکتا ہے۔
- ہالینڈ: ہالینڈ میں ہولوکاسٹ کا انکار واضح الفاظ میں جرم نہیں کہا گیا بلکہ اسے انسانیت کے خلاف جنگی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اسے نفرت پھیلانے کا جرم کہا گیا

ہے۔ ایسے جرم کے ارتکاب پر آئین کے آرٹیکل 137 سی، 137 ڈی کے تحت کارروائی کی جاتی ہے، اسے تیسرے درجے کا جرم کہا گیا ہے اور ایک سال تک سزا ہوسکتی ہے۔

- □ پولینڈ: یہاں ہولوکاسٹ سے انکار مکمل جرم ہے۔ آرٹیکل 55 اور آرٹیکل 1 کے تحت اس کے مرتکب افراد کو سزا دی جاتی ہے۔ یہ تین سال تک قید ہوسکتی ہے۔
- □ پرتگال: پرتگال میں ہولوکاسٹ سے انکار کرنا واضح طور پر جرم نہیں ہے۔ اس کے بجائے یہ کہا گیا ہے کہ قتل عام سے انکار کرنا جرم ہے اور یہ انکار یہودیوں کے قتل عام سے ہے۔
- □ رومانیہ: رومانیہ میں ہنگامی صدارتی حکم نمبر 31 مجریہ 2002ء نافذ ہے جس کے تحت ہولوکاسٹ سے انکار جرم ہے۔ اس کی سزا 6 ماہ سے پانچ سال تک ہے۔ بعض حالتوں میں یہ سزا پانچ سے پندرہ سال اور بعض حقوق سے مکمل محرومی بھی ہوسکتی ہے۔
- □ سپین: ان ممالک میں سے ہے جہاں آئین میں ہولوکاسٹ سے انکار غیر قانونی تھا۔ سپین کی آئینی عدالت نے بعد میں قرار دیا کہ ''انکاریا'' کے الفاظ غیر آئینی ہیں۔ اس حوالے سے فیصلہ 7 نومبر 2007ء کو دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں سپین میں ہولوکاسٹ سے انکار قابل سزا جرم کے طور پر برقرار ہے۔ سزا 15 سے 20 سال تک ہوسکتی ہے۔ یہ سزا مزید بڑھ سکتی ہے۔ اس جرم کی بڑی تفصیل سے وضاحت آئین کے باب دوم میں کردی گئی ہے۔
- □ سوئٹزرلینڈ: یہاں آرٹیکل 261 کے تحت نسلی امتیاز کے قانون کے تحت ہر طرح کی تحریر، تقریر، تصویر، تاثر، عمل کسی بھی طرح اور کسی بھی درجے میں جرم ہے جس سے کسی ایک گروہ یا گروہ کے افراد کے خلاف نسلی امتیاز کیا جائے۔ اس کے تحت تین سال تک سزا ہوسکتی ہے۔
- □ یورپین یونین: یورپی یونین کے ایگزیکٹو کمیشن نے 2001ء میں ایک قانون کی منظوری دی جس میں ہولوکاسٹ سے انکار کو بھی جرم قرار دے دیا گیا۔ اس قانون کو کلیتاً رائج ہونے سے روکا گیا۔ روکنے والے برطانیہ اور کچھ دوسرے ممالک تھے۔ پھر اس پر ایک مفاہمت کی گئی اور اس کے تحت ہولوکاسٹ سے انکار کو مکمل

جرم کا درجہ نہیں دیا گیا۔ تاہم انکار کرنے والوں کو مختلف عوامل سامنے رکھ کر ایک سے تین سال کی سزا دی جاسکتی ہے۔

ہولوکاسٹ سے انکار پر سزا پانے والوں کا تعارف

سزا کی تاریخ	سزا پانے والے کا نام	ملک	سزا
27 فروری، 1998ء	راجر گیروڈے	فرانس	قید کی سزا بعد میں معطل۔ جرمانہ 2 لاکھ 40 ہزار فرانک
31 جولائی 1998ء	گیرہارڈ فورسٹر	سوئٹزرلینڈ	15 ماہ قید۔ سزا سننے کے بعد ملک سے فرار
ایضاً	جاگن گراف	ایضاً	12 ماہ قید
27 مئی 2009ء	جین پلانٹین	فرانس	6 ماہ قید، جرمانہ، نقصانات کا ازالہ کرنے کا حکم
11 اپریل 2000ء	کیسٹن آرمنڈ ایماوؤرز	سوئٹزرلینڈ	ایک سال قید اور جرمانہ
20 فروری 2006ء	ڈیوڈ اروِنگ	آسٹریا	ایک سال قید
15 مارچ 2006ء	جرمر روڈلف	جرمنی	اڑھائی سال قید
3 اکتوبر 2006ء	رابرٹ فاؤریسن	فرانس	75 ہزار یورو جرمانہ 3 ماہ پروبیشن
15 فروری 2007ء	ارنسٹ زنڈال	جرمنی	5 سال قید
14 جنوری 2008ء	وولف گینگ فرو ہلک	آسٹریا	ساڑھے 6 سال قید
15 جنوری 2008ء	سلویہ سٹالز	جرمنی	ساڑھے تین سال قید
11 مارچ 2008ء	ہرسٹ ماہلر	ایضاً	5 سال قید
23 اکتوبر 2009ء	ڈیرک زیرمن	ایضاً	9 ماہ قید
27 اکتوبر 2009ء	رچرڈ ولیم سن	ایضاً	12 ہزار یورو جرمانہ

مرزا محمد الیاس

جرمنی کے مصنف کی سرگزشت
جس نے اظہار رائے کی آزادی کا حق استعمال کیا تھا

جرمنی کے مصنف ارنسٹ زنڈال ان افراد میں سے ایک ہیں جنہیں ہولوکاسٹ کا انکار کرنے کی سزا کاٹنا پڑی۔ انہوں نے تین ملکوں میں سات برس قید کاٹی۔ ان کو اختلاف رائے اور اظہار کی آزادی دونوں کی وجہ سے بھی یہ سزا برداشت کرنا پڑی۔ انہوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا کہ ہولوکاسٹ کا واقعہ بیان کرنے والوں نے صحیح طرح سے بیان کیا۔ زنڈال یورپ کے سیاسی قیدیوں میں سب سے نمایاں شخصیت رہے اور دنیا کے تین جدید ترین ترقی کے حامل ملکوں میں قید رکھے گئے۔ امریکہ، کینیڈا اور جرمنی میں انہوں نے اس جرم کی سزا کاٹی۔ اس طرح یورپ اور امریکہ دو براعظموں میں وہ بند رکھے گئے۔ مبادا ان کی آواز ہولوکاسٹ کی روحوں کو مزید بے چین نہ کردے۔ انہیں 2003ء میں امریکہ میں گرفتار کیا گیا اور کینیڈا بے دخل کردیا گیا۔ کینیڈا میں انہیں ''قومی سلامتی کے لیے خطرہ'' قرار دے کر نظر بند کردیا گیا۔ دو سال وہ قید میں رہے پھر انہیں جرمنی دھکیل دیا گیا۔ یہ مارچ 2005ء کا مہینہ تھا۔ وہاں انہیں پھر ہولوکاسٹ کے انکار کا مجرم قرار دیا گیا اور پانچ برس قید سنادی گئی۔ انہیں یکم مارچ 2010ء کو رہا کیا گیا۔ امریکی جریدے فارن پالیسی جرنل نے ان کا پہلا انٹرویو شائع کیا۔ ہم یہاں اس کا اُردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ ہولوکاسٹ کا انکار سنگین جرم سمجھا جاتا ہے جس کی تاریخی حیثیت ہی طے شدہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کرنے کو آزادیٔ اظہار اور اختلاف رائے کا حق کہا جاتا ہے۔ اس واضح تضاد کے باوجود کمال ڈھٹائی سے توہین رسالتؐ کے مرتکب افراد کو ہیرو بنا کر پیش کرنے میں وہی میڈیا اور اس کے ملکی و غیر ملکی وکیل پیش پیش ہیں۔ جو ہولوکاسٹ کا انکار کرنے والے کو تین ملکوں کے درمیان

فٹ بال بنا دیتے ہیں۔ آیئے! پڑھتے ہیں کہ زنڈال نے اپنے انٹرویو میں کیا کہا ہے؟

فارن پالیسی: سب سے پہلے میں آپ کو رہائی پر مبارکباد دوں گا۔ کیا آپ کے ساتھ اس دوران میں برا سلوک کیا گیا، آپ کو ذہنی و جسمانی اذیت سے گزرنا پڑا۔ ایسا کرنا بین الاقوامی کنونشنز کی خلاف ورزی ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

زنڈال: مجھے ان سات برسوں میں جن لوگوں نے گرفتار کیا، مجھ پر مقدمہ چلایا، مجھے سزا سنائی اور مجھے جیلوں میں رکھا، ان کا رویہ اور سلوک شروع سے ہی نہایت بھیانہ رہا۔ یہ بین الاقوامی کنونشنز کی خلاف ورزی تھی۔ مجھے امریکہ میں دن کی روشنی میں امریکی حکومت کے اہلکاروں نے گرفتار کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو بدنام زمانہ افراد پر باقاعدہ حملہ آور ہونے کی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے پاس مجھے گرفتار کرنے کا کوئی وارنٹ تک نہیں تھا۔ مجھے میرے حقوق سے بھی آگاہ نہیں کیا گیا۔ مجھے ہتھکڑی میں دھکیلا جاتا رہا، میرا پرس چھین لیا گیا۔ مجھے اپنے اٹارنی سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مجھے یہ موقع بھی نہ دیا گیا کہ میں امریکی امیگریشن جج کے سامنے اپنے بارے میں بات ہی کر سکوں۔ مجھے اپنی اہلیہ کو خدا حافظ کہنے سے بھی روک دیا گیا۔

مجھے دو براعظموں کی چھ جیلوں میں قید رکھا گیا۔ تین ملکوں میں مجھے اذیت دی گئی۔ ان میں امریکہ، کینیڈا اور جرمنی شامل ہیں۔ مجھے اس دوران میں لحہ بھر سکون سے رہنے نہ دیا گیا۔ مجھ سے میری دس فیصد زندگی اس قید نے چھین لی، لیکن میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ میرا جرم کیا تھا۔ کیا امریکہ کا میرا ویزہ ختم ہو گیا تھا؟ پوری قید کے دوران میں مجھے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سارے حقوق ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے اپنے پاؤں تلے روند ڈالے ہیں۔ میرے لیے کینیڈا کی جیلیں بری ثابت ہوئیں۔ مجھے تھارولڈ، اونٹاریو اور ٹورانٹو میں قید رکھا گیا۔ مجھے ان جیلوں میں دو سال ان سیلوں میں رکھا گیا جن میں قید تنہائی کے مجرموں کو رکھا جاتا ہے۔ یہ سردی کے ایام تھے جن میں سیل یخ بستہ رہتے تھے۔ مجھے جوتے یا جرابیں پہننے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ کمرے میں روشنی اس قدر تھی کہ بمشکل پڑھا جا سکتا تھا۔ یہ بلب چوبیس گھنٹے جلتا رہتا۔ مجھے بیس منٹ کے بعد شیشے کے ایک سوراخ سے چیک کیا جاتا۔ وہاں شرمندگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوئی بھی معروفیت نہ تھی۔ بستر کی

چادر تین ماہ بعد تبدیل کی جاتی، کوئی تکیہ نہ تھا، کوئی کرسی نہ تھی۔ جب مجھے اپنی اہلیہ کو خط لکھنا ہوتا یا اپنے اٹارنی سے رابطہ کرنا ہوتا تو میں اپنے ہی مقدمے کی فائلوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر لکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ ریڈیو اور ٹی وی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پنسل شارپ کرنے کے لیے کوئی چیز نہ ملتی۔ کوئی بال پن نہ دیا جاتا۔ مجھے پنسل کے سکے دے دیے جاتے جن کو درمیان سے دو کر دیا جاتا تھا۔ کھانا کھانے کے لیے کوئی چمچ، چھری کانٹا وغیرہ کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے پلاسٹک کا ایک ایسا چمچہ دیا جاتا جس کے ایک کونے پر کارک لگا رہتا۔ کھانے کے بعد یہ واپس لے لیا جاتا۔ میری حفاظت پر مومور گارڈز کو کیمرے کی آنکھ سے بچ کر کچھ مہربانی کرنے کا موقع مل جاتا، فقط یہی مہربانی مجھے مل پاتی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ میں ایک خوفناک مجرم ہوں۔ کینیڈا نے مجھے یہی سمجھا۔ میں نے اس ملک میں اپنی زندگی کے چالیس سال کسی بھی جرم میں ملوث ہوئے بغیر گزارے تھے۔ وہ سب ایک خواب لگتا تھا۔

امریکہ میں مجھے کچھ فرق تھا تاہم وہاں کی قید بھی کچھ کم بری نہ تھی۔ جرمنی میں قدرے بہتر ماحول مل سکا۔ اس لیے کہ وہاں بنیادی ضروریاتِ زندگی تک رسائی مل گئی تھی۔ میری ڈاک وہاں بھی روک لی جاتی تھی۔ جب میں رہا ہوا تو مجھے لکھے گئے خطوط میرے حوالے کیے گئے۔ یہ سترہ سو خطوط تھے۔ یہ بھی اس وقت مجھے ملے جب ایک عدالت حکم کے ذریعہ میں نے جیل حکام کو خطوط حوالے کرنے پر مجبور کیا۔ میرا جب مقدمہ چلا تو یہ ایک خالصتاً سیاسی مقدمہ تھا جس کو سٹالن کے انداز میں چلایا گیا۔ میرے جرم پر کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا گیا۔ میں نے کئی بار کہا کہ میرے خلاف جو بھی ثبوت ہے، وہ مجھے بھی دکھایا جائے کہ واقعی جو کچھ میرے ذمہ لگایا جا رہا ہے، وہ میں نے لکھا اور کہا بھی ہے یا نہیں۔ مجھے اپنے دفاع سے بھی محروم رکھا گیا۔ مجھے موقع نہیں دیا گیا کہ میں عدلیہ کے ریکارڈ پر فورینزک شہادت پیش کر سکوں۔ مجھے تاریخی کتب سے شہادت پیش کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ میں نے اس پر اصرار کیا تو میرے خلاف اس دفعہ کا بھی اضافہ کر دیا گیا جو مجرمانہ کردار رکھنے والوں پر عائد کی جاتی ہے۔ اس طرح میرے خلاف مقدمہ میں مزید دفعات شامل کی جاتی رہیں۔ میرے وکلا کے خلاف بھی اسی نوعیت کے مقدمات درج کر لیے گئے۔

فارن پالیسی: یورپی یونین کے دیگر ممالک کی طرح جرمنی بھی آزادی اظہار اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر کڑی تنقید کرتا رہتا ہے۔ تاہم آپ کے معاملہ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ

یہ سب کھوکھلے نعرے ہیں جو یورپ میں لگائے جاتے ہیں۔ آپ اس حوالے سے کیا کہیں گے؟ کیا یورپ واقعی آزادیوں اور آزادی اظہار کی جنت ہے؟

زنڈال: یورپ کے بہت سے ممالک نے آزادی اظہار کو محض سرکاری پالیسی کے بیان اور تاریخ پر اپنے متعین موقف کے لیے چن رکھا ہے۔ یورپی یونین کے ہر ملک میں آزادی اظہار کے بارے میں قوانین موجود ہیں۔ یہ قوانین کسی نہ کسی حوالے سے اظہار رائے کی آزادی پر پابندیاں لگاتے ہیں۔ نسل پرستی نازی ازم پر مبنی سرگرمیاں بھی انہیں قوانین کے تحت ممنوعہ ہیں، لیکن یہ فیصلہ ریاست اپنی مرضی سے کرتی ہے کہ کون نسل پرست ہے اور کون نہیں ہے۔ یہ منافقانہ قوانین ہیں، جرمنی میں تو ان قوانین کو بھی پامال کردیا جاتا ہے۔

مخالفین کو بہت کم مواقع ملتے ہیں کہ ان کی بات سنی جائے، ان کی تحریر پڑھی جائے یا قومی میڈیا میں، قومی دھارے میں ان کو آنے کا موقع ہی دیا جائے۔ سارے مغربی میڈیا کا یہی عالم ہے۔ صحافت پر کنٹرول کرنے کے ذرائع بے شمار ہیں، اکثر یہ ذرائع تکلیف دہ ہوتے ہیں، لیکن میڈیا ان کی پابندی کرتا ہے، ان کو تسلیم کرتا ہے۔ کہیں ملازمت چھن جانے کا خوف ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے، سرکولیشن میں کمی آمادہ کرتی ہے، حکومتی اشتہارات چھن جانے کا خوف طاری ہوجاتا ہے۔ کسی بھی مغربی ملک میں محدود آزادی کے سوا کسی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ امریکہ کو ہی لیجیے۔ ایک بہترین آئین موجود ہے، ترامیم موجود ہیں، بل آف رائٹس کام کررہا ہے، لیکن وہاں بھی حال یہی ہے۔

مجھے آپ اجازت دیں تو میں آپ کے قارئین کو سنسر شپ کی ایک پالیسی لائن سے آگاہ کروں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ لوگوں کو محبوس کردیا ہے۔ دراصل یہ سیاسی اغوا ہوتا ہے جس کا خوف مخالفانہ سیاسی بات کرنے سے لوگوں کو روکے رکھتا ہے۔ مغرب میں اس پر بے خوف و خطر عملدرآمد ہورہا ہے۔ کسی بھی مبینہ مشکوک دہشت گرد کے خلاف یہ اقدام کیا جاسکتا ہے۔ ایسے لوگ عام طور پر سیاسی کارکن ہوتے ہیں یا پھر ایسے لکھنے والے ہوتے ہیں جو سرکاری پالیسی سے ہٹ کر لکھتے ہیں۔ ان کے خلاف مختلف لابیاں متحرک ہو جاتی ہیں۔ ایسی ایک صہیونی لابی امریکہ میں ہے جسے سب امریکہ اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی کے نام سے جانتے ہیں۔ کینیڈین جیوش کانگریس اور دیگر گروہ بھی یہی کام کرتے ہیں۔

جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر وائٹ ڈین ایشین لاء اینڈ پالیسی سٹڈیز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی کام کرتے ہیں۔ اس کی مدد سے ہی پیٹریاٹ ایکٹ تیار کیا گیا تھا۔ ان کا ایک بیان ایک امریکی جریدے Wired میں آزادیٔ اظہار کے بارے میں شائع ہوا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا تھا کہ:

> ''نائن الیون کے بعد ایک اندازہ لگایا گیا ہے کہ اب تک پانچ ہزار افراد کو نظر بند رکھا گیا ہے۔ ان میں سے تین باقاعدہ امریکی شہریت کے حامل غیر ملکی اور دو خالص امریکی شہری شامل ہیں جن پر دہشت گردی کے جرم میں سزائیں دی جانے کی نوبت آئی ہے۔ آپ کس طرح سے ایک ایسے قانون کی حمایت کریں گے جو اتنی بڑی تعداد میں شہریوں اور لوگوں کو نظر بند کرتا ہے، لیکن سزا محض چند ایک کو ہو پاتی ہے؟''

وائٹ کا جواب تھا:

> ''ممکن ہے کہ شہریوں کی ایک تعداد پر دہشت گردی سے متعلقہ جرائم میں مقدمہ درج نہ ہوا، اس کی ضرورت بھی نہیں، جہاں ڈیپارٹمنٹ کو شک ہو کہ بعض لوگ دہشت گردی میں ملوث ہو سکتے ہیں، انہیں دوسرے قوانین کی پامالی کے جرم میں نظر بند کر کے مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ اس بات کا انتظار کرنا ضروری نہیں ہے کہ دہشت گردی کی سازش مکمل ہو جائے اور خطرہ مکمل ہو جائے۔ سازش کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ مکمل نہیں ہو سکے گی، بے گناہ، امریکیوں کی جانیں خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔''

میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا۔ پہلے مجھے بتایا گیا کہ میں نے امیگریشن کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ میں نے ویزہ کی مدت کے بعد بھی قیام کیا ہے۔ میں کوئی دہشت گرد نہیں تھا۔ میں ایک مخالف رائے دینے والا مصنف تھا۔ میرے سیاسی مخالفین اچھی طرح جانتے تھے کہ میں امریکہ میں ہوں اور قانونی طور پر رہ رہا ہوں۔ میں اپنے معاملے میں امیگریشن کے امور کے فیصلے کا منتظر تھا جو عدالت میں زیر سماعت تھے۔ میری شادی ایک امریکی خاتون سے ہوئی تھی اور میں اپنی شہریت کا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ میں اس سلسلے میں تمام

قانونی تقاضے پورے کر چکا تھا۔ میں ٹینیسی کے ایک دیہی علاقے میں قانونی طور پر رہائش پذیر تھا۔ مقامی ٹیلی فون بک میں میرے نام کا اندراج تھا۔ امریکی حکومت نے مجھے سوشل سکیورٹی نمبر بھی دے رکھا تھا۔ کام کرنے کا اجازت نامہ میرے پاس تھا۔ میں نے ایف بی آئی کا ایک ٹسٹ بھی پاس کیا تھا اور صحت کا سرٹیفکیٹ بھی مجھے جاری کیا گیا تھا۔ میرا امیگریشن میں صرف ایک انٹرویو باقی رہ گیا تھا جس میں یہ دیکھا جانا تھا کہ امریکی خاتون سے میری شادی درست ہے یا نہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ ایسے انٹرویو کے ہونے میں تین سال تک کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ اس انٹرویو کی کوئی رپورٹ مجھے نہیں دی جائے گی۔ ہم اس آخری مرحلے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ میرا اٹارنی اس انٹرویو کے لیے باقاعدہ درخواست دے چکا تھا۔ پھر مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے کہا گیا کہ میں نے انٹرویو کے سلسلے میں ایک سماعت جان بوجھ کر مس کر دی ہے۔ اس ایک جواز پر مجھے میری زندگی کے سات برسوں سے بے دردی سے محروم کر دیا گیا۔

ایک سرکاری پالیسی سے جس طرح سے مجھے دھوکے میں رکھا گیا، ایسا بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ یہی طریقہ جرمر روڈلف کے معاملے میں بھی اختیار کیا گیا۔ ان کی بھی ایک امریکی خاتون سے ہی شادی ہو چکی تھی۔ یہ معاملہ جرمنی کے ایک مصری، کینیڈا کے ہیرارار، سپین کے جرڈ ہانسک، بلجیم کے سیج فریڈ وربیک، ڈیوڈ ارونگ، اور اب انگلینڈ کے بشپ ولیم سن کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ ان سب کو بھی پیٹریاٹ ایکٹ کے ذریعہ پکڑا گیا، امیگریشن قوانین کی خلاف ورزی کے الزامات لگائے گئے اور ان کو ان کے ملکوں میں جبراً دھکیل کر قید کرا دیا گیا۔ یہ سب پالیسی بنیادوں پر کیا گیا۔

فارن پالیسی: آپ کی کتب کو بہت قدر کی نگاہ سے ہر جگہ دیکھا جاتا ہے۔ آپ نے حکومتوں کی خارجہ پالیسی پر لکھا ہے اور سیاسی بنیادوں پر ناانصافی کے واقعات کی بھی ترجمانی کی ہے۔ اغوا، قید و بند کے واقعات بھی آپ نے بیان کیے۔ یہ واقعات آپ نے محض سیاسی قیدیوں اور غیر ملکی مخالفین کے حوالے سے ہی بیان نہیں کیے بلکہ آپ نے اسرائیل کے ایٹمی سائنسدان وینونو کا مقدمہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ نازی ازم یا نسل پرستی کا حامی بھی نہ تھا۔ اس نے تو ہولوکاسٹ کا بھی انکار نہیں کیا تھا۔ پھر بھی موساد نے اسے بری طرح سے تنگ کیے رکھا اور پھر اغوا کر کے آٹھ سال کے لیے

جیل بھی ڈال دیا...... کیوں؟

زنڈال: بین الاقوامی قوانین کو توڑنے، کنونشنز کی خلاف ورزی کرنے کا ایک طریقہ ہے، جعلی شناخت استعمال کرنا عام سی بات ہے، خفیہ اور جاسوس ایجنسیاں آسانی سے کسی کے گھر میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ان مجرمانہ سرگرمیوں کے بارے میں آپ روزانہ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں۔ اس طریقے کو سامنے رکھیں تو آپ کو میرا معاملہ پوری طرح سے سمجھ میں آ جائے گا۔ یہ ایک پرانی اور طے شدہ پالیسی ہے۔ فرق صرف ایک ہے۔ ہم "ایک مین" جیسے یا پتھر پھینکنے والے فلسطینیوں کی تلاش میں نہیں، ہم ان کو اغوا یا شکار کرنے نہیں نکلے، ہم کسی "عرب دہشت گرد" کے بھی تعاقب میں نہیں ہیں۔ بلکہ ہم تو ان مصنفین کی تلاش میں ہیں، ان صحافیوں کو اغوا کر رہے ہیں جن کو مغربی ممالک میں "سیاسی مخالف" قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ ملک خود کو "جمہوری" کہتے ہیں۔

میری کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ میرے معاملے میں، مجھے کہا گیا کہ میں نے ہولوکاسٹ کا انکار کیا۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے ایسا کیا، لیکن یہ الزام بھی پرانا ہے۔ میں تو صحیح معنوں میں ہولوکاسٹ کا انکاری بھی نہیں تھا۔ مجھ پر تو ویزہ کی مدت کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا۔ میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ "بلیو بک" کے مطابق ہوا۔ تب یہ کہیں طے ہوا تھا کہ میرے بہترین مفاد میں یہ ہے کہ مجھے وہاں سے نکال دیا جائے۔ پھر وہ ہوا جو آپ کو معلوم ہے۔ نائن الیون کے بعد ابتدائی مہینوں میں میری اہلیہ کو انٹرنیٹ پر ایک دستاویز ملی۔ جس کا عنوان تھا:

An Independent Investigation of 9/11 and the War on Terror By Anonymous (dated: 11-11-02)

اس نے ناشتے پر مجھے یہ دستاویز دی۔ میں نے اسے پڑھا تو مجھے اس میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے پرنٹر سے اس کی کچھ کاپیاں کیں اور اپنے چند دوستوں کو پوسٹ کر دیں۔ اس کے فٹ نوٹ پر جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ میں نے نہیں لکھا۔ میں نے اس بارے میں تحقیق نہیں کی۔ صرف اس کی کاپیاں کیں۔ کسی نے یہ نتیجہ نکالا ہو گا کہ میں ایک ایسا شخص

ہوں جس نے معمول سے زیادہ دلچسپی سے نائن الیون کو ایک ممکنہ سیاسی غلطی کے طور پر دیکھا ہے اور ایسی غلطیاں انٹیلی جنس ایجنسیاں اپنے آپریشنز میں کرتی رہتی ہیں۔

جرمنی میں مجھ پر "ہولوکاسٹ کا انکار" کرنے کا جرم عائد کیا گیا۔ اس کے لیے میرے نیوز لیٹر کے ایک حصے کو جواز بنایا گیا۔ اس میں نائن الیون کا واقعہ بیان کیا گیا تھا۔ اسے عدالت میں میرے خلاف مجرمانہ اقدام کے طور پر لیا گیا۔ جب یہ سب کچھ ثابت نہ ہوسکا تو اس معاملے کو "ہولوکاسٹ کا انکار" کرنے کا جرم بنا دیا گیا۔ مجھے اپنے دفاع کا بھی موقع نہ دیا گیا۔

فارن پالیسی: ہولوکاسٹ کے پس منظر میں اصل کہانی کیا ہے؟ کیا یہ واقعہ ہوا ہی نہیں؟ ہولوکاسٹ سے بچ جانے والوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے جو تکلیف دہ واقعات سنائے ہیں، آپ ان کے بارے میں کیا کہیں گے؟

زنڈال: میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ اگر میں نے جواب دیا تو مجھے مزید پانچ سال جیل میں گزارنا پڑیں گے۔ میرا جواب ایمانداری پر مبنی ہوگا اور سچا ہوگا۔ اس ایمانداری اور سچائی کی سزا پانچ سال قید ہوگی۔ تاہم آج انٹرنیٹ کا دور ہے۔ وہاں رجوع کیا جاسکتا ہے؟ وہاں سے آپ کو اس کا جواب بھی مل جائے گا اور ایران کو بم سے اڑانے کے بارے میں معلومات بھی مل جائیں گی۔

فارن پالیسی: دنیا کے اکثر ممالک اور ان کے عوام اس حقیقت کے قائل ہو چکے ہیں کہ مغربی ممالک جمہوریت اور آزادی اظہار کے علمبردار ہیں۔ بعض اوقات لگتا ہے کہ حقیقت یہ نہیں۔ ان ممالک میں بھی لوگوں کو محض اس لیے سزا دی جاسکتی ہے جو ناپسندیدہ ہوں۔ آپ نے کتابچہ لکھا Did Six Million Realy Die? آپ کیا سوچتے ہیں؟

زنڈال: میں نے اوپر جو کچھ لکھا ہے، یہ اس کا ایک اور طرح سے ہی اظہار ہے۔ ہمارے پاس ایسے فیکس اور دوسری دستاویزات ہیں جن پر سفارت خانے کا نشان موجود ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کی بڑھا نکنے کی عادت، اس کا پروپیگنڈہ اس کی عدلیہ کی مداخلت کا حصہ رہا ہے۔ اس سارے عمل میں اغوا کے واقعات اور غائب کردینے کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان پر امریکی حکومتوں نے ہمیشہ

پردے ڈالے ہیں حالانکہ وہ انسانی حقوق کی علمبردار کے طور پر خود کو پیش کرتی رہتی ہیں۔ یہ ان کی منافقانہ صحافتی مہم بازی ہے، تبت میں چین کے خلاف بھی امریکہ یہی کچھ کر رہا ہے۔ روس میں بھی کچھ ہو رہا ہے، اب ماسکو میں پوتین بھی کچھ دہرا رہا ہے۔ ایران کے سبز انقلاب کے دَر پردہ بھی یہ کہانیاں موجود ہیں۔

فارن پالیسی: اکثر صیہونی ویب سائٹس پر آپ کے بارے میں مختلف باتیں کی جا رہی ہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

زنڈال: یہ میری کردار کشی کی مہم ہے۔ میں کبھی بھی وہ نہیں رہا جو مجھے پیش کیا جا رہا ہے۔

فارن پالیسی: اسرائیل میں آپ کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیل کے حکمران فلسطینی قوم کے خلاف جابرانہ اور امتیازی رویہ رکھتے ہیں۔ کیا آپ وہاں استحکام اور امن کی حمایت کریں گے۔ کیا یہ بات ایک بین الاقوامی اصول نہیں ہے کہ ہٹلر ایک قاتل تھا اور رسوائے زمانہ آمر تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

زنڈال: بعض قانونی بنیادوں پر میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ میرا ایماندارانہ اور سچا جواب مجھے جیل میں ڈال دے گا۔ مجھے تیزی سے ہولوکاسٹ سے انکار کرنے کا پھر سے مجرم قرار دے دیں گے۔ آپ کے سوال میں ہی مجھے ایک زہرآلود کردار میں سامنے لایا گیا ہے۔ نازی کہلانے سے بھی کہیں یہ زیادہ خطرناک ہے کہ آپ کو کوڑھی کہہ دیا جائے۔ مجھے کئی عشروں سے اسی نوعیت کی کردار کشی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ مجھے کئی بار جیل جانا پڑا۔ یہ سب کسی نظریے کی حمایت کرنے پر نہیں ہوا۔ یہ اس لیے ہوا کہ میں بہت سے امور پر مختلف رائے رکھتا ہوں جسے مفادات سمجھا جاتا ہے۔ ایڈولف ہٹلر کا کردار بھی ایسا ہی موضوع ہے۔

میں آپ کے سوال کا اس طرح سے جواب دے سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ سیاسی مقاصد کے لیے تشدد کے استعمال کی مخالفت کی ہے۔ کوئی بھی کرے۔ سیاسی طور پر میں ایک امن پسند ہوں۔ میں گاندھی کا پیروکار ہوں۔ میں تاریخ کو سنجیدگی سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ اس تاریخ میں سب کچھ شامل ہے۔

فارن پالیسی: مئی 1995ء میں ٹورنٹو میں آپ کی رہائش گاہ پر حملہ کیا گیا جس میں آپ کو چار لاکھ ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ کچھ دنوں بعد آپ کے ایک انتہا پسند مخالف کو آپ

کے گھر میں گھستے ہوئے گرفتار کرلیا گیا۔ مزید کچھ دنوں بعد آپ کو پارسل بم ارسال کیا گیا۔ اس کو ٹورنٹو پولیس نے ناکارہ بنا دیا۔ آپ نے ان واقعات پر شکایت درج کرانے کی کبھی کوشش کی۔ کیا ان کو قانون کے مطابق سزا دی گئی؟

زنڈال: آپ نے مجھ سے پہلے جو سوالات کیے ہیں، یہ انہی سوالات کا دوسرا رخ ہے۔ میں نے کبھی تشدد کی حمایت نہیں کی اور نہ ایسے واقعات میں کبھی شامل رہا، لیکن میرے خلاف ایسے واقعات تسلسل سے ہوتے آئے ہیں۔ 2003ء میں میرا اغوا بھی سیاسی بنیادوں پر ہوا تھا۔ میرے گھر میں آگ لگائی گئی، بم بھیجا گیا، کسی پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ پولیس نے بم بنانے اور بھیجنے والوں کو پکڑا، لیکن جو الزامات لگائے گئے، عدالت نے ان کے خلاف حکم امتناعی جاری کردیا۔ کینیڈا کی حکومت میں سیاسی عزم موجود ہی نہیں۔ جن یہودیوں نے میرے گھر کو آگ لگائی، ان پر مقدمہ چلانے کی اس حکومت میں جرأت ہی نہیں ہے۔

فارن پالیسی: کیا آپ یہودی اور صیہونی میں فرق کرتے ہیں؟

زنڈال: جی ہاں! یہ دونوں مختلف شناخت کے لوگ ہیں۔ بعض قدامت پرست یہودی آج بھی صیہونیت کے مخالف ہیں۔ نیچری کارتا ان میں سے ایک ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ صیہونیت اور کمیونسٹ کے گاڈ فادر ایک ہی تھے۔ ان دونوں کا ایک ہی اصول ہے۔

فارن پالیسی: قومی میڈیا نے آپ کے واقعہ کو اہمیت دی نہ آپ کی رہائی کا ہی نوٹس لیا۔ آپ اس بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کیا آپ اب بھی اپنے نظریات کا پرچار کرتے رہیں گے یا آپ اپنے رویے میں تبدیلی لے آئیں گے اور عملی کاموں سے توبہ کرلیں گے؟

زنڈال: میں جب ٹینیسی گیا تھا تو میں نے یہی سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی سرگرمیاں محدود کردوں گا۔ آرٹ اور موسیقی سے اپنے شغف کو وقت دوں گا، لیکن آپ سے میں کہتا ہوں کہ آپ کبھی کسی مقام پر کھدائی کریں گے تو وہاں آپ ان ہڈیوں کو ضرور شمار کیجیے گا جو وہاں سے ملیں۔ میری بیوی کہتی ہے کہ تمہیں محض اس لیے اونٹ نہیں کھانا چاہیے کہ یہ معلوم کرسکو کہ اس کا ذائقہ کیسا ہے۔ میں اب

ریٹائر ہونا چاہتا ہوں۔ میں اپنے تخلیقی کام اور ارادوں کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔ میں سیاسی میدان چھوڑ سکتا ہوں، لیکن میرے سیاسی مخالفین بھی مجھے ایمانداری سے یہ اجازت دے سکیں گے کہ میں سیاسی میدان سے نکل جاؤں۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ان کی فطرت میں ہی نہیں ہے۔

میرے خلاف بھرپور مہم جاری ہے، اس مہم کا مجھے ایک فائدہ ہے کہ اس سے میرے مخالف مجھے بڑے منظر میں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنے میں خود ہی آسانی رہے گی کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ میری رہائی پر میری اہلیہ نے مجھے وہ ہزاروں لاکھوں خطوط دکھائے جو میرے پڑھنے والوں نے مجھے لکھے تھے۔ ان میں سے صرف تین ایسے تھے جن کو میں منفی کہہ سکتا ہوں۔ یہ کوئی خراب ریکارڈ نہیں ہے اور وہ بھی ان حالات میں کہ مجھے شیطان ظاہر کرنے اور ثابت کرنے والوں نے لاکھوں کروڑوں ڈالر خرچ کر ڈالے ہیں۔ مجھے وہ سینگوں والا شیطان تو ثابت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں انہیں کیوں کامیاب کروں؟
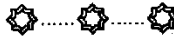
محمد عامر خاکوانی

لانگ آرم سٹیچو

ڈاکٹر شہزاد پچھلے بارہ برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ وہ لاہور کے مشہور کے ای میڈیکل کالج سے منسلک ہیں۔ ڈینش اخبار میں چھپنے والے توہین آمیز کارٹونز اور ڈچ ڈائریکٹر کی جانب سے بنائی جانے والی اسلام مخالف فلم پر وہ بڑے مشتعل ہیں۔ انہوں نے مختلف پاکستانی قلم کاروں کو ایک دھواں دھار ای میل ارسال کی۔ جس میں یہ سوال اٹھایا کہ یورپ میں ہولوکاسٹ کے خلاف بات کرنا جرم ہے تو اسلام کے خلاف مہم چلانے والوں کو کیوں نہیں روکا جاسکتا؟ یہ بڑا اہم اور بنیادی نوعیت کا سوال ہے، مگر اس کے جواب سے پہلے ایک نظر ہولوکاسٹ پر ڈالی جائے۔

ہولوکاسٹ (Holo Caust) یونانی لفظ ہولوکاسٹن (Holo Kaston) سے نکلا ہے، جس کا مطلب دیوتا کے حضور مکمل طور پر خاکستر شدہ قربانی کی بھینٹ چڑھانا، ہے۔ انیسویں صدی تک یہ اصطلاح کسی بہت بڑے سانحہ تباہی یا قتل عام کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ تاہم دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ اصطلاح یہودیوں کی نسل کشی کے لیے مختص ہوگئی۔ ماہرین کے مطابق نازیوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران چھ ملین (60 لاکھ) یہودیوں کو مختلف طریقوں سے موت کے گھاٹ اُتارا۔ یہ بربریت صرف یہودیوں تک محدود نہ تھی، بلکہ لاکھوں کی تعداد میں جپسی (خانہ بدوش)، پولش (پولینڈ کے رہنے والے) کمیونسٹ کارکن اور دانشور، ہم جنس پرست اور ذہنی و جسمانی معذور افراد کو بھی ہلاک کیا گیا۔ دراصل نازی جرمنوں نے یورپ پر اپنی یلغار اور یکے بعد دیگرے ملنے والی فتوحات کے بعد مختلف مقامات پر قیدیوں کو رکھنے کے لیے کیمپ بنائے۔ انہی کیمپوں میں بعدازاں یہ لاکھوں افراد ہلاک کردیے گئے۔

اس وقت اسرائیل اور دس کے قریب یورپی ممالک میں عوامی سطح پر ہولوکاسٹ کو نہ

ماننا یا اسے جائز قرار دینا جرم ہے اور اس پر قید تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔ ان یورپی ممالک میں جرمنی، آسٹریا، فرانس، رومانیہ، بلجیئم، سوئٹزرلینڈ، چیک ری پبلک، پولینڈ، لیتھوانیا اور سلاویکا شامل ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک برطانوی مورخ واشنگٹن ارونگ کو آسٹروی قانون کے تحت 3 سال سزا سنائی گئی۔ یہ آسٹریا کا خاصا معروف قانون ہے اور 2004ء کے دوران 724 افراد پر اس کے تحت مقدمہ چلایا گیا، مگر یہ اب تک ملنے والی پہلی سزائے قید ہے۔

ہولوکاسٹ کو جھٹلانے والے کے خلاف تادیبی کارروائی کا قانون ایک خاص پس منظر کا حامل ہے۔ یہودیوں نے دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر بڑی ہوشیاری کے ساتھ یہ ایشو اٹھایا۔ انہوں نے ہولوکاسٹ کو نہ ماننے والوں کا تعلق نازی ازم سے جوڑا اور منظم مہم چلائی کہ یہ بات کرنے والے اصلاً نازی ہی ہیں، اس لیے اگر ان کی حوصلہ شکنی نہ ہوئی تو یورپ میں نازی ازم پھر سے عروج پائے گا اور یوں سارے خطے کا سکون برباد ہوجائے گا۔ نازی ازم اور ہٹلر نے یورپ کو ایسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا (جنگ میں کروڑوں یورپین ہلاک ہوئے تھے) کہ وہاں کی رائے عامہ اس قانون بنانے کے لیے ہموار ہوگئی۔

ہولوکاسٹ کے حوالے سے یورپی ممالک میں موجود قانون مسلمانوں کے لیے بھی ایک نظیر کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس سے پہلے ہمیں اہلِ مغرب کے فریم آف ریفرنس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یورپ میں اظہار کی آزادی بذات خود ایک غیر رسمی قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے مخصوص تہذیبی پس منظر کے باعث وہاں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تنقیدی اور کسی حد تک توہین آمیز مواد کی اشاعت بھی ممکن ہوجاتی ہے۔ ویٹی کن اور پوپ کی شدید مخالفت بھی وہاں عیسائیت کے حوالے سے قابلِ اعتراض فلموں کی ریلیز نہیں رکواسکتی۔ دو سال پہلے مشہور امریکی فن کار میل گبسن کی فلم "پیشن آف کرائسٹ" ریلیز ہوئی، جس میں حضرت مسیحؑ کے خلاف یہودی سازشوں کو پہلی بار منظر عام پر لایا گیا۔ اسرائیل اور امریکہ کی یہودی لابی نے اس پر بڑا شور مچایا اور اس فلم کو یہود مخالف قرار دے کر ریلیز رکوانے کی کوشش کی، مگر اس طاقتور لابی کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پیشن آف کرائسٹ امریکہ بھر میں ریلیز ہوئی اور اس نے اچھا خاصا بزنس کیا۔ اسی طرح کچھ عرصہ پہلے "ڈاونچی کوڈ" نامی فلم پر پوپ اور دنیا بھر کے عیسائی پادریوں نے اعتراضات کیے، مگر ان کی مہم بھی ناکام رہی۔

مسلمان حکومتوں اور انٹیلی جنٹسیا کو یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم آزادی

اظہار یا مخالف نقطہ نظر کے مخالف نہیں، مگر اقوام متحدہ کے عالمی چارٹرز کے مطابق کسی بھی شخص کو نفرت انگیز تقریر کرنے، لکھنے یا پھیلانے کا کوئی حق نہیں۔ ڈینش کارٹونسٹ نے اسلام کے حوالے سے اپنی کسی علمی رائے کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اس نے سراسر ایک ارب مسلمانوں کے دل دکھانے والی گھٹیا حرکت تھی۔ اسلام یا اسلامی تعلیمات کے کسی جزو کے حوالے سے ماضی میں بہت سے عیسائی سکالرز اور ماہرین علمی اعتراضات کرتے رہے، مگر ایسے لٹریچر پر کسی مسلمان نے احتجاج نہیں کیا، بلکہ مسلمان علما ان کے رد میں کتاب تحریر کر دیتے تھے۔ پچھلے چند برسوں میں بعض جرمن مستشرقین کی تصانیف سامنے آئی ہیں جن میں اسلامی تعلیمات کے حوالے سے کئی اہم نکات اٹھائے گئے۔ معروف مسلم سکالر پروفیسر ہمدانی اپنی کتاب میں ان الزامات کا خاصا تفصیلی جواب دے چکے ہیں۔ اس نوعیت کے علمی مباحثے ہمیشہ سے جاری رہے ہیں اور مسلم معاشرے نے انہیں بڑی فراخدلی سے برداشت کیا۔ یہ نکتہ مغربی رائے عامہ پر واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

مصنوعات کا بائیکاٹ بھی پرامن احتجاج ہی کی ایک شکل ہے، مگر اسے بھی مغرب میں منفی حربہ گردانا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک ویب سائٹ نظر سے گزری، جس میں احتجاج کے 198 پُرامن طریقے بتائے گئے۔ ان میں خاموش مظاہروں سے لے کر مختلف رنگوں کی احتجاجی پٹی باندھنا شامل تھا۔ دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص گوگل سے اس کی تفصیل حاصل کر سکتا ہے۔ چند سال پہلے امریکہ کی مورمون (عیسائیوں کا ایک فرقہ جسے بڑے فرقے عیسائیت سے خارج سمجھتے ہیں) کمیونٹی پر کسی پروٹسٹنٹ سکالر نے شدید تنقیدی کتاب لکھ ماری۔ مورمون کمیونٹی نے جواباً دلچسپ احتجاجی حکمت عملی اختیار کی۔ مختلف شہروں میں روزانہ چند سو مورمون افراد ایک بینر تھامے فٹ پاتھ پر واک کرتے جس پر لکھا تھا۔ ''ہمارے جذبات مجروح ہوئے، ہم دکھی ہیں۔'' چند ہی ہفتوں میں یہ مہم رنگ لائی اور اس مصنف نے اخلاقی دباؤ کی تاب نہ لاتے ہوئے خود ہی اپنی کتاب واپس لینے کا اعلان کر دیا۔

او آئی سی کو بھی چاہیے کہ وہ اقوام متحدہ اور یورپی یونین کا چینل استعمال کرتے ہوئے توہین رسالت ﷺ کو عالمی سطح پر قابلِ تعزیر جرم بنوانے کی کوشش کرے۔ تاہم اس سے پہلے پاکستان اور دیگر مسلم ممالک توہینِ رسالت کو لانگ آرم اسٹیچو (Long arm statue) کا درجہ دیں۔ اس قانونی اصطلاح کے مطابق اگر کسی جرم کو لانگ آرم اسٹیچو بنا دیا

جائے تو اس کا مرتکب خواہ دنیا بھر میں جہاں بھی ہو، وہ اس ملک کا مجرم سمجھا جائے گا اور اس کی حوالگی کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ امریکہ نے دہشت گردی اور اسرائیل نے صامیت دشمنی (Anti Semitism) کو لانگ آرم اسٹیچو بنایا ہوا ہے، اسی لیے وہ دنیا کے کسی بھی ملک سے اپنے مجرم کو حوالے کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ توہینِ رسالت ﷺ کو لانگ آرم اسٹیچو بنانے کے لیے ہماری نئی پارلیمنٹ کو صرف ایک بل پاس کرنے کی ضرورت ہے۔ انٹرنیشنل لاء کے ماہرین کے مطابق اگر مسلمان ممالک جو پچاس سے زیادہ ہیں، اگر وہ سب توہین رسالت ﷺ کو لانگ آرم اسٹیچو بنا دیں تو یہ خود بخود انٹرنیشنل لاء کے زمرے میں آ جائے گا۔ امید کرنی چاہیے کہ پاکستانی وکلا برادری جس نے عدلیہ کی بحالی کے لیے نہایت منظم مہم چلائی، اب اس اہم ایشو پر توجہ مرکوز کریں گے۔

ایم طفیل

اظہار رائے کی یکطرفہ آزادی

ناروے اور ڈنمارک میں ایک مرتبہ پھر حرمت رسول ﷺ کے خلاف توہین آمیز خاکوں کی اشاعت دراصل مغربی حلقوں بالخصوص میڈیا کی طرف سے پوری امت مسلمہ کے خلاف ایک گھناؤنی سازش کا ثبوت ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عالم اسلام میں اس مذموم حرکت کے خلاف ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والی صورتحال کو اسلام کو دہشت گردوں کا مذہب اور مسلمانوں کو دہشت گرد اور انتہا پسند قرار دے کر امت مسلمہ کے خلاف عزائم کی تکمیل کا راستہ ہموار کیا جائے۔ اس طرح عالمی سطح پر اسلام دشمن قوتوں کو یکجا ہونے کا موقع مل سکے گا اور عالم اسلام کے خلاف ایک زبردست محاذ کھولنا بھی ممکن ہو سکے گا۔ جہاں تک حرمت رسول ﷺ کے خلاف ناروے اور ڈنمارک کے اخبارات میں توہین آمیز خاکوں کی دوبارہ اشاعت کا تعلق ہے تو اسے بلا سبب اور بے مقصد قرار نہیں دیا جا سکتا اور آزادیٔ اظہار خیال کے نام پر اس کا جواز پیش کرنا بھی امت مسلمہ کے زخموں پر نمک پاشی کی ایک انتہائی مذموم اور قبیح حرکت ہے۔ اگر یہ آزادیٔ اظہار خیال اور آزادیٔ صحافت کا مظاہرہ ہے تو پھر صرف مسلمانوں کے خلاف ہی اس قبیح حرکت کا اعادہ کیوں؟ آج تک کسی دوسرے مذہب کے خلاف مغربی ذرائع ابلاغ اور میڈیا نے ایسی مذموم حرکت کا ارتکاب کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ دنیا میں غیر آسمانی مذاہب اور ان کے ماننے والوں کی بھی کمی نہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج تک کسی مسلمان ملک، میڈیا، ذرائع ابلاغ یا حکومت کی طرف سے کسی مذہب اور غیر مسلم مذہبی رہنما کے خلاف کوئی توہین آمیز حرکت یا مظاہرہ دیکھنے سننے میں نہیں آیا بلکہ مغربی حلقوں اور بعض دانشوروں کی طرف سے اسلام کے خلاف زہر افشانی کا مثبت اور مدلل جواب دیتے ہوئے بھی کسی مسلمان عالم دین یا دانشور نے ان کے مذہب یا مذہبی رہنما کو ہدف تنقید نہیں بنایا

جو اسلام کی وسعت نظر اور دوسرے مذاہب کے لیے احترام کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے قرآن حکیم کے اس ارشاد مبارک کی بھی ترجمانی کے زمرے میں آتا ہے کہ "دین میں کوئی جبر نہیں"۔ اور یہ ارشاد مبارک ہی تلوار کے زور سے اسلام کی اشاعت وفروغ کے موقف کی نفی کرتا ہے لیکن اسلام دشمن عناصر بالخصوص مذہبی حلقوں اور دانشوروں کی طرف سے ہی نہیں بلکہ برصغیر کے بعض غیر مسلموں کی طرف سے بھی ماضی میں مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کے کئی واقعات منظر عام پر آ چکے ہیں۔ لاہور میں غازی علم دین کی شہادت کے حوالے سے ایک ہندو کی مذموم حرکت اور حرمت رسول ﷺ کے خلاف زہر افشانی کی ایک شرمناک داستان ہماری تاریخ کا حصہ بن چکی ہے اور اس کا بدلہ چکانے والے علم دین شہید کی قربانی کو قوم قیامت تک فراموش نہیں کر سکتی۔ مغربی حلقوں کا اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف یہ رویہ اور طرز عمل صرف میڈیا اور بعض دانشوروں تک ہی محدود نہیں بلکہ حکومتیں بھی اس حرکت کے مرتکب افراد کی نہ صرف پوری حوصلہ افزائی کرتی ہیں بلکہ خود بھی اس جرم میں ان کا ملوث ہونا کوئی راز کی بات نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے رشدی ملعون کو اعزاز سے نوازا اور ایوارڈز تقسیم کرنے کی سرکاری دعوت میں اسے مدعو کیا گیا۔ اگر برطانوی حکمران اس ملعون کے خلاف صرف برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو ہی پیش نظر رکھتے تو اسے اپنی سرزمین پر قیام کی نہ صرف اجازت نہ دیتے بلکہ اسے اعزاز سے نواز کر پوری امت مسلمہ کے جذبات کو مجروح نہ کرتے۔ ادھر بھارت نے بھی بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین کو اپنے یہاں قیام کی اجازت دے کر اسلام دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ بہرحال ڈنمارک اور ناروے میں توہین آمیز خاکوں کی از سر نو اشاعت پر پاکستان کے عوام بالخصوص مذہبی حلقوں میں جو رد عمل سامنے آیا، وہ پوری امت مسلمہ کے لیے ایک مثال اور رہنما اصول کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ امر افسوسناک ہی نہیں، باعث تشویش بھی ہے کہ پاکستان کی طرح کسی دوسرے مسلمان ملک میں اتنا شدید رد عمل تو کیا معمولی رد عمل بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ حکومت پاکستان نے عوامی رد عمل اور دباؤ کو دیکھتے ہوئے ہی پارلیمنٹ میں ان خاکوں کی اشاعت کے خلاف ایک قرارداد پیش کی لیکن مذہبی و سیاسی حلقوں کی طرف سے ان خاکوں کی اشاعت پر دونوں متعلقہ ملکوں کے خلاف جن اقدامات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے ان کی پذیرائی کے حوالے سے حکومت کا کوئی

موقف سامنے نہیں آیا اور نہ ہی اس کی پذیرائی کا کوئی امکان دکھائی دیتا ہے۔ حرمت رسول ﷺ کا تحفظ ہر مسلمان کے ایمان کا جزو لاینفک ہے اور اس کے بغیر کسی مسلمان کا ایمان ہی مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ جذبہ ہی مسلمانوں میں شوق شہادت کو تقویت دیتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کوئی قوت کوئی دولت اور تحریص مسلمانوں کے اس جذبے کو ماند نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ اس مذموم حرکت اور دل آزاری پر مہر بلب رہ سکتے ہیں۔ وہ مغربی حلقے اور ممالک جو اس حرکت کے مرتکب ہو رہے ہیں، وہ دراصل پیشہ صحافت اور آزادی اظہار خیال کی آڑ میں بدترین دہشت گردی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان کی ان حرکات سے عالمی امن کو شدید خطرات لاحق ہیں اور ان کی یہ سازش صرف اسلام اور مسلمانوں ہی کے خلاف نہیں بلکہ پوری انسانیت کے خلاف ایک ایسا مذموم اقدام ہے جو عالمی امن وسلامتی کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے کیونکہ اس کے خلاف ہونے والا ردعمل پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس حرکت پر مسلمان حکمرانوں کی خاموشی نے دو مغربی ملکوں کے اخبارات کو دوبارہ ان توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کا حوصلہ بخشا۔ آج تک اقوام متحدہ اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم نے بھی اس کے خلاف کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ مغربی میڈیا پر صیہونی قوتوں کا مکمل کنٹرول ہے اور ان کی اسلام اور مسلم دشمنی کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ یہ قوتیں عمداً مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی حرکات کی مرتکب ہو رہی ہیں اور وہ اسلام کو غلط رنگ میں پیش کر کے عالمی برادری کو اسلام دشمن قوتوں میں بدلنا چاہتی ہیں۔ اس حوالے سے پاکستان کے دینی حلقوں اور ممتاز علمائے کرام کا یہ مطالبہ حکومت کی خصوصی توجہ چاہتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی توہین کے مرتکب افراد کو سزائے موت دینے کا قانون وضع کیا جائے اور توہین آمیز خاکوں کے خلاف اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا اجلاس بلاتاخیر طلب کیا جائے کیونکہ پاکستان اور اسلام کے خلاف دہشت گردی کی الزام تراشی کرنے والے مغربی ملک خود بدترین دہشت گردی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان خاکوں کی اشاعت بلاشبہ پوری امت مسلمہ کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے اور سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں کی تعمیر پر پابندی اور ناروے اور ڈنمارک کے اخبارات میں توہین آمیز خاکوں کی ازسرِ نو اشاعت پر امت مسلمہ کی خاموشی مسلمان حکمرانوں کی بے حسی پر دلالت کرتی ہے جس سے ان کے حوصلے مزید بلند ہوں گے۔ اس

حوالے سے کراچی میں تمام مکاتب فکر کے علما کے کنونشن میں پاس ہونے والی قراردادیں اور کنونشن سے علما کا خطاب پاکستان کے 17 کروڑ عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، اسے نظر انداز کرنا بڑی حماقت ہوگی اس لیے کہ دنیا کی مقدس ترین ہستی کی ذات پر حملہ بدترین دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے۔ دراصل ان خاکوں کی اشاعت کے خلاف امت مسلمہ اور مسلمان حکمرانوں کی خاموشی کے بعد ہی سوئٹزر لینڈ میں مساجد کے میناروں کی تعمیر اور بعض یورپی ممالک میں مساجد کی تعمیر پر پابندی کے اقدامات سامنے آنے لگے ہیں کیونکہ ان ملکوں نے ڈنمارک اور ناروے کے اخبارات کی حرکت پر امت مسلمہ کی اجتماعی خاموشی کو اس کی کمزوری سمجھ لیا ہے اور ابھی ان کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف مزید اقدامات بھی غیر متوقع نہیں۔ اگر بین الاقوامی قانون کے تحت ایک عام آدمی کی توہین بھی قابل گرفت اور قابل مواخذہ ہے تو پھر خاتم النبیین ﷺ کی توہین کو نظر انداز کرنے کا کیا جواز ہے؟ اس کے مرتکب افراد کو موت سے زیادہ سنگین سزا بھی مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اسے اظہار خیال اور مذہبی آزادی کا نام دینا انسانیت کی بدترین دشمنی قرار پاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اظہار رائے کی آزادی کی آڑ لے کر یورپی ممالک اور مغربی میڈیا نے خدانخواستہ کبھی کسی دوسرے پیغمبر یا کم از کم مذہبی رہنماؤں کی توہین اور تضحیک کے لیے ایسا شرمناک رویہ اختیار کیا۔ یورپ اور مغربی دنیا میں ہمیشہ آئین وقانون کی بات کی جاتی ہے اور کسی کو اس سے مستثنٰی قرار نہیں دیا جاتا۔ اظہار خیال کی آزادی کو بھی قانون وآئین کے تابع رکھنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی آڑ میں کسی کے جذبات کو مجروح کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی نہ انسانی حقوق کو پامال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قانون کا اطلاق دنیا کے ایک ارب 14 کروڑ مسلمانوں کے جذبات پر کیوں نہیں کیا گیا اور کسی دوسرے مذہب اور بانیٔ مذہب کو کیوں نشانہ نہیں بنایا جاتا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہ شرمناک رویہ مغرب اور اسلام دشمن طاقتوں کے اس امتیازی طرز عمل کا ثبوت ہے جو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اختیار کر رکھا ہے اور اس کی آڑ میں عالم اسلام کے جذبات کو مشتعل کر کے تہذیبوں کے تصادم کا الزام مسلمانوں کے خلاف عائد کرنے اور انہیں نشانہ بنانے کی سازشوں کو آگے بڑھایا جارہا ہے۔ مغربی دانشور کچھ عرصہ سے

تہذیبوں کے درمیان جس تصادم کے اشارے دے رہے ہیں اور بظاہر اس سے اجتناب کرنے اور اس تصادم کو ہوا دینے والوں کی حوصلہ شکنی پر زور دیا جا رہا ہے، یورپی اخبارات کا حالیہ رویہ اور حکمرانوں کا طرز عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود ہی اس تصادم کا عمل تیز کرنے میں مصروف ہیں ورنہ اظہار رائے کی آزادی کو قانون کے تابع کرنے کا یہ دہرا معیار اور مسلمانوں کے خلاف امتیازی رویہ کیا ان کی انصاف پسندی اور امن و دوستی کا ثبوت ہے؟ ہرگز ایسا نہیں۔ کیا اظہار رائے کی آزادی کا سہارا لے کر دوسروں کے جذبات سے کھیلنا، ان کے مذہبی عقائد کا مذاق اڑانا اور ختم المرسلین حضور نبی کریمؐ کی توہین و تضحیک کو شعار بنانا اور پھر اس کا دفاع کرنا، مسلمانوں کے جذبات اور مذہبی اعتقادات کو مجروح کرنے کی بدترین حرکت نہیں۔ کیا اظہار رائے کی آزادی کو کسی آئین و قانون کے تابع نہیں رکھا جاتا اور اسے بے لگام آزادی کا نام دے کر اسلام اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے اور زخموں پر نمک پاشی کے لیے استعمال کیا جانا ہی اس کا مقصد و محور ہے۔ کیا مغربی اخبارات اور حکمرانوں کا یہ طرز عمل تہذیبوں کے درمیان تصادم کو فروغ دینے کی سازشوں میں مصروف عناصر کی حوصلہ افزائی کے زمرے میں نہیں آتا۔ اس کے جواب میں اگر انسانی جان و مال کے زیاں تک نوبت پہنچتی ہے، فرقہ واریت کی آگ بھڑکتی ہے، امن و سلامتی کا عمل متاثر ہوتا ہے اور افتراق و انتشار کو ہوا ملتی ہے تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟ کیا اظہار رائے کی یہ آزادی فتنہ انگیزی، شرپسندی اور دہشت گردی کی ایک خوفناک شکل نہیں؟ ایک طرف مغربی قوتیں پاکستان سمیت پورے عالم اسلام پر دہشت گردوں کے خلاف منظم ہونے پر زور دے رہی ہیں اور ان کا تعاون بھی مغربی دنیا کو حاصل ہے دوسرے طرف وہ ایک ایسی مذموم حرکت کی حمایت و سرپرستی میں مصروف ہیں جس کے خلاف ردعمل ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے، اسے دہشت گردی قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن مغرب اسے اسلام کے خلاف ایک سازش کے تحت دہشت گردی سے منسوب کرے گا۔ کیا مغربی اخبارات کی اس قسم کی حرکات اسلام اور مسلمانوں کو مغرب کے قریب لانے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں؟ یا ان کے درمیان اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کرنے کا ذریعہ بنیں گی؟ اس لیے کہ ان خاکوں کے ذریعے پورے عالم اسلام کے جذبات کی توہین کی گئی ہے۔

اس قبیح حرکت پر عالمِ اسلام کے جذبات اور ردِ عمل اپنی جگہ بجا اور درست لیکن اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمِ کفر اور بالخصوص صلیبی قوتوں نے عالمِ اسلام کے خلاف جو محاذ قائم کر رکھا ہے اور تہذیبوں کے تصادم کی جس سازش کی تیاری کے بعد اس پر پیش رفت کا اہتمام کیا جا چکا ہے، امت مسلمہ اسے سمجھے، اس کا صحیح معنوں میں ادراک کرنے اور اس کا جواب دینے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔ آثار و قرائن نے عالمِ کفر کے عزائم کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔ اس حوالے سے کسی قسم کی خوش فہمی کا جواز باقی نہیں رہا۔ یکطرفہ طور پر اعتدال پسندی، میانہ روی اور روشن خیالی کے نام پر ایسے توہین آمیز رویے کو برداشت کرنا اسلام اور ایمان کے تقاضوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

پروفیسر شمیم اختر

توہین رسالت ﷺ اور آزادئ اظہار خیال

25 ستمبر کو ابرہہ ثانی نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخانہ فلم کی سرسری مذمت اور اس سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے عالمی برادری کو ایک ٹکا سا جواب دے دیا کہ امریکہ کا آئین، آزادئ اظہار خیال پر پابندی کی اجازت نہیں دیتا اور پورا زور خطابت اشتعال انگیز فلم کے خلاف پرتشدد احتجاج کی شدید مذمت اور لیبیا میں امریکی سفیر Christopher Stevens اور تین سفارتی اہلکاروں کے قاتلوں سے انتقام لینے پر صرف کر دیا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس نے امریکہ کے خلاف عالمی سطح پر برپا مظاہروں کو روکنے کے لیے مختلف ممالک میں فوج کشی کے احکامات دے دیے تھے۔ لیکن بعد ازاں مظاہروں کی شدت میں روزافزوں اضافے سے خائف ہو کر اپنا احمقانہ حکم واپس لے لیا۔ تاہم امریکہ کی کٹی ہوئی ناک رکھنے کے لیے لیبیا اور سوڈان میں سفارت خانوں کی حفاظت کے لیے بحریہ کی کچھ نفری بھیج دی۔ اوباما نے بوکھلاہٹ میں توہین رسالت ﷺ کے خلاف امنڈتے ہوئے عوامی ریلے کو القاعدہ سے منسوب کر کے گویا یہ اعتراف کر لیا کہ اسے مسلم امہ کی حمایت حاصل ہے۔ اس طرح اس نے خود اپنے اس دعوے کو جھوٹا قرار دے دیا کہ امریکہ نے القاعدہ کی کمر توڑ دی ہے اور وہ تتر بتر ہو گئی ہے۔ ابھی ابرہہ ثانی کی کالی زبان سے یہ بات نکلی تھی کہ کویت اور سوڈان میں سیکڑوں مظاہرین امریکہ پر لعنت بھیجتے ہوئے اسے مخاطب کر کے ایک آواز ہو کر للکار رہے تھے "اوباما اوباما، ہم سب اسامہ"۔ جرمنی نے ملعون پادری ٹیری جونس کے داخلے پر پابندی عائد کر دی جب کہ فلپائن اور لبنان میں گستاخانہ فلم کی نمائش پر پابندی عائد کر دی گئی۔ لیکن امریکہ اور یورپی برادری نے پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف گستاخانہ فلم، ان کے کارٹونوں اور خاکوں کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کا اعلان کیا ہے جب کہ امریکہ کی بوڑھی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن چھمک چھلو بنی نیویارک میں افغانستان، پاکستان اور

دیگر ممالک کے رہنماؤں سے یہ کہہ رہی تھی کہ گستاخانہ فلم کے خلاف پرتشدد احتجاج کا کوئی جواز نہیں ہے اور مسلمانوں کو صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے۔ فلم کے بارے میں اوباما اور اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون کے خیالات میں بڑا فرق ہے کیونکہ اول الذکر اسے شاتمانِ رسول کا آئینی حق قرار دیتے ہوئے اس کی نمائش اور اشاعت پر کوئی پابندی عائد نہیں کرے گا۔ البتہ مسلمانوں کو اس کا حکم ہے کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان بند کرلیں اور زبان کو بتیسی کے اندر ہی رکھیں۔ جبکہ آخر الذکر واشگاف الفاظ میں اس قسم کی فلم یا دیگر توہین آمیز اشاعت کو انتہائی شرمناک قرار دیتا ہے اور انہیں اظہارِ خیال کے قانون کے تحت تحفظ دینے سے انکار کرتا ہے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ اور یورپ اسلام کے خلاف ایسی ہتک آمیز فلموں، کتابوں، مضامین اور خاکوں کی سرپرستی کرتے ہیں جیسے ملعون سلمان رشدی کو ''شیطانی آیات'' کی تصنیف پر ہونے والے احتجاج کی پروا نہ کرتے ہوئے برطانیہ کی ملکہ نے اسے ''سر'' کا خطاب دیا جبکہ امریکی صدر نے اسے شرف ملاقات بخشا۔ لیکن جب ان کے پوتے ولیم کی اہلیہ کی نیم برہنہ تصویر فرانسیسی جریدے Closer میں شائع ہوئی تو بکنگھم محل میں زلزلہ آگیا اور برطانیہ کی حکومت نے فرانس پر دباؤ ڈال کر عدالت کو مجبور کردیا کہ وہ جریدے کے اس شمارے کو ضبط کرلے۔ یہ ہے برطانیہ کی آزادیٔ اظہارِ خیال!

اور جب کبھی کوئی تاریخ کا طالب علم یا محقق نازی جرمنی میں تیس اور چالیس کی دہائیوں میں یہودیوں کی تطہیر (Holocaust) پر ذرہ برابر بھی شک وشبہ کا اظہار کرتا ہے تو جرمنی، فرانس، ہالینڈ، بیلجیئم، آسٹریا اور برطانیہ وغیرہ کا قانون حرکت میں آجاتا ہے اور اسے قید و بند کی سزا تو دی ہی جاتی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ تشدد اس پر وہاں کے باشندے کرتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں Partiot Act نامی ایک کالا قانون ہے جس کی رو سے کسی کو القاعدہ سے روابط تو کجا اس سے ہمدردی کے شبہ پر حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح امریکہ میں Smith Act اور Mac Carran Act کے تحت کسی شہری کو کمیونسٹ رجحانات رکھنے پر نہ صرف حراست میں لے لیا جاتا ہے بلکہ پوچھ گچھ کے دوران اس پر جسمانی اور ذہنی تشدد کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی مقامی آبادی کو اس کے خلاف اکسا کر اسے معاشرے سے الگ تھلگ کردیا جاتا ہے۔ کیا آج امریکہ میں کوئی شہری القاعدہ کے نظریات کی اشاعت کرسکتا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ کیا امریکہ اور یورپ میں القاعدہ کے نظریات

کے اظہار کی آزادی ہے۔ امریکی انتظامیہ اسے ایک فرد کا ذاتی فعل کہہ کر عہدہ برآ نہیں ہوسکتی کیونکہ اسلام دشمنی امریکہ کی سرکاری پالیسی ہے جبھی تو اس کے Joint Forces Staff College میں زیر تربیت افسران کو جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس میں انہیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اسلام، امریکہ کا دشمن ہے۔ چنانچہ امریکہ کو چاہیے کہ وہ مکے مدینے پر ہیروشیما اور ناگاساکی کی طرح ایٹم بم مار کر نیست و نابود کردے۔ (ڈان 11 مئی 2012ء) اسی طرح بگرام میں امریکی فوجی کمان کے حکم پر قرآن کے پانچ سو نسخے نذر آتش کردیے گئے۔ (ڈان 29-28 اگست 2009ء) علاوہ ازیں گوانتاناموبے، ابوغریب اور بگرام کے عقوبت خانوں میں مشتبہ افراد سے پوچھ گچھ کے دوران امریکی فوجی پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات ادا کرتے ہیں جب کہ قرآن پاک کے نسخوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے انہیں قیدیوں کے سامنے طہارت خانوں میں بہا دیتے ہیں۔ بالالفاظ دیگر امریکہ اس لیے توہین رسالت کے سدباب کے لیے موثر اقدام نہیں کرتا کیونکہ اسلام دشمنی اس کی پالیسی ہے۔

اب اگر کوئی مسلمان مغرب کی مروجہ آزادئ اظہار خیال کا استعمال کرتا ہے تو دیکھنا ہے کہ وہ اسے تسلیم کرتا ہے یا نہیں اور ایسا موقع جلد ہی آ گیا جب پاکستان کے وفاقی وزیر برائے ریلوے اور حکمران اتحاد کے روشن خیال مشرب کے حامل رہنما غلام احمد بلور نے امریکہ کے چند جرائم پیشہ یہودی اور قبطی فلمسازوں کی "مسلمانوں کی معصومیت" میں پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات پاک پر مبتذل، رکیک، نازیبا اور انتہائی ناشائستہ تحریف کردہ مکالمات پر اپنے ردعمل کا یوں اظہار کیا: اگر کوئی شخص اس فلمساز کو قتل کردے تو میں اسے ایک لاکھ ڈالر بطور انعام دوں گا اور مجھے اس کی مطلق پروا نہیں کہ کوئی بین الاقوامی عدالت مجھے تختہ دار پر لٹکا دے۔ (ڈان 23 ستمبر 2012ء) تاہم انہوں نے مردان میں گرجا گھر کے نذر آتش کیے جانے اور جان و مال کے ضیاع کی بھی شدید مذمت کی۔ (ڈان 23 ستمبر 2012ء) یہ جناب بلور کا (جو خود کو سیکولر رجحان کا حامل کہتے ہیں) اظہار خیال ہے جسے مغرب کو مسلم امہ کا اٹل ضابطہ سمجھتے ہوئے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہیے تھا لیکن اس پر سارا صلیبی صہیونی ٹولہ دہائی دینے لگا۔ یورپین یونین جو سلمان رشدی سے لے کر پیغمبر اسلام ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کرنے والے اخبارات کی اشاعت کی حمایت کرتی ہے، جناب بلور کے اظہار خیال کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور ان کو یورپ میں داخلے پر پابندی کی دھمکی دی اور فلم ساز کے

سر کی قیمت مقرر کرنے کی مذمت کی۔ (ڈان، جنگ 25 ستمبر 2012ء) کم از کم یورپی برادری کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ اس کا آقا امریکہ، تیونس، لیبیا، عراق، سعودی عرب، مالی، صومالیہ، افغانستان، پاکستان، انڈونیشیا کے کتنے علماء اور مسلم دانشوروں کے سر کاٹنے والوں کے لیے لاکھوں ڈالر کے انعامات کا اعلان کر چکا ہے۔ کیا امریکہ کا یہ اقدام ان مشتبہ غیر ملکیوں کے ماورائے عدالت قتل کا لالچ دینے کے مترادف نہیں ہے؟ خیر اگر یورپ کو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی ہے جس نے انہیں اندھا کر دیا ہے لیکن کراچی کے انگریزی روزنامے ڈان نے بھی کبھی جارج بش اور اوباما پر یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ بلا ضابطے کی کارروائی پوری کیے کرائے کے قاتلوں سے ناپسندیدہ مسلمانوں کو قتل کرانا چاہتے ہیں، لہٰذا انہیں معزول کر کے پولیس سے ان کے جرائم کی تفتیش کرائی جائے۔ لیکن مذکورہ اخبار نے جناب بلور کا بیان شائع ہونے کے دوسرے ہی دن 24 ستمبر کو ''قابل مذمت باتیں'' کے عنوان سے اپنے اداریہ میں رائے زنی کی کہ کسی بھی مستحکم اور پختہ نظام میں جناب بلور کو معطل کر کے پولیس کے ذریعے تفتیش کر کے ان پر فرد جرم عائد کر دی جاتی۔ اخبار نے وزیر موصوف کے اس بیان پر خاص طور پر برہمی کا اظہار کیا ہے کہ وہ ملعون فلمساز کے قتل میں القاعدہ اور طالبان کے تعاون کے خواہاں ہیں۔ جناب مدیر کے مطابق اگر پاکستان میں کسی تقریر کو جرم قرار دیا جائے تو وہ القاعدہ اور طالبان کو تقویت پہنچانے سے متعلق ہوگی۔ (ڈان 24 ستمبر 2012ء) یہاں ہمیں ایک عجیب تضاد نظر آ رہا ہے۔ امریکہ پاکستان اور بین الاقوامی برادری طالبان جنگجوؤں سے مصالحت کرنے کے بڑے بڑے جتن کر رہی ہے جب کہ ڈان کے ایڈیٹر طالبان کو بقول ان کے مضبوط کرنے کی کسی بھی کوشش کو جرم قرار دینے کے حق میں ہیں۔ کیا انہیں نہیں معلوم کہ امریکہ تو طالبان کو افغانستان میں اقتدار میں شامل کرنا چاہتا ہے جبکہ وہ ملک سے امریکی افواج کے مکمل انخلا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آخر امریکہ نے القاعدہ کا ہوا کیوں کھڑا کر رکھا ہے، جب بقول اوباما وہ اس کی کمر توڑ چکا ہے؟ حقیقت پسندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب دشمن کو شکست نہیں دی جا سکتی تو اس سے صلح کر لی جاتی ہے۔ اگر امریکہ سمجھتا ہے کہ القاعدہ ایک حقیقت ہے تو افغانستان اور مشرقِ وسطیٰ میں امن و استحکام کی خاطر اسے القاعدہ سے بھی مذاکرات کرنے چاہئیں۔ آخر اس نے ویتنام میں کمیونسٹ چھاپہ ماروں سے بات چیت کر کے صلح کی تھی یا نہیں؟ امریکہ شمالی کوریا پر چڑھائی کرنے کے باوجود جب

اسے فتح نہیں کرسکا تو اسے مجبوراً اس سے 1953ء میں جنگ بندی کا معاہدہ کرنا پڑا۔ کیا امریکہ نے عوامی جمہوریہ چین کو 32 سال بعد طوعاً وکرہاً تسلیم نہیں کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

ایسے اداریے تدبر سے عاری ہوا کرتے ہیں اور اگر ان پر حکومت نے عمل کیا تو وہ ہمیشہ امریکہ کی جنگ میں پھنسی رہے گی۔ اس سے چند مفاد پرست عناصر کو فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن ریاست اور عوام خسارے میں رہیں گے۔ میرے خیال میں اگر مغرب ہمارے شہریوں کے سر کی قیمت لگا سکتا ہے تو ہم بھی شاتمانِ رسولؐ کے سروں کی قیمت لگائیں گے۔ اس لیے ہم غلام احمد بلور کی آزادی اظہار رائے کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔

اشتیاق بیگ

امریکی یہودی لابی کا آزادی اظہار کے منہ پر طمانچہ

ماضی میں جب بھی میں امریکی صدور کی پریس کانفرنس دیکھتا تھا تو اکثر ایک بوڑھی عورت کی شخصیت مجھے اپنی جانب متوجہ کرتی تھی جو اگلی صفوں میں بیٹھی ہوتی تھی اور اس کے جھریوں بھرے چہرے پر بھرپور اعتماد دکھائی دیتا تھا۔ پریس کانفرنس میں امریکی صدر سب سے پہلے اس خاتون کو سوال کرنے کا موقع دیتے اور اس کے پوچھے گئے چبھتے ہوئے سوالات کا برا نہیں مانتے تھے اور بڑی خندہ پیشانی سے اس کے پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیتے۔ اس بوڑھی عورت کا چہرہ میرے لیے اتنا شناسا ہو گیا کہ ٹیلیویژن پر دکھائی جانے والی امریکی صدر کی پریس کانفرنس میں اس عورت کو تلاش کرتا تھا۔ میرے دل میں اکثر اس بوڑھی خاتون کے متعلق تجسس پیدا ہوتا اور اس کے متعلق تفصیلات جاننے کی خواہش پیدا ہوتی لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر میں اس کے متعلق تفصیلات حاصل نہ کر سکا۔ گزشتہ دنوں یہ بوڑھی خاتون دنیا بھر کے میڈیا کی توجہ کا مرکز بنی جب اس کے اسرائیل کے خلاف ایک تیز و تند بیان دینے پر اسے امریکہ میں یہودی لابی کی سخت تنقید اور مخالفت کا نشانہ بننا پڑا اور اپنے خلاف شدید پروپیگنڈہ کے باعث اسے ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ 89 سالہ خاتون کا نام ''تھامس ہیلن'' تھا جو پیشے کے اعتبار سے جرنلسٹ تھی جس نے صحافت کا آغاز 1943ء میں کیا۔

تھامس ہیلن نے وائٹ ہاؤس کی نامہ نگار کی حیثیت سے 57 سال وائٹ ہاؤس میں خدمات سرانجام دیں۔ ان کا شمار امریکہ کی نہایت تجربہ کار، محنتی اور نمایاں جرنلسٹس میں ہوتا تھا اور ان کا درجہ صحافیوں کے ڈین کی طرح تھا۔ ان کی نگاہوں نے امریکی وائٹ ہاؤس کے کئی نشیب و فراز دیکھے۔ وہ کئی ''کہی ان کہی داستانوں'' کی چشم دید گواہ تھیں۔ انہوں نے صدر جان ایف کینیڈی کے دور سے وائٹ ہاؤس میں ایک طویل عرصے تک یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل کے اہم رکن کی حیثیت سے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ہیلن نے امریکہ کے مختلف

صدور کے ساتھ دنیا بھر کا سفر کیا جن میں صدر نکسن، فورڈ، جمی کارٹر، رونالڈ ریگن، جارج بش اور کلنٹن نمایاں ہیں۔ 1972ء میں صدر نکسن کے چین کے خفیہ دورے کے موقع پر وہ واحد جرنلسٹ تھیں جو صدر کے ہمراہ تھیں۔ اس لحاظ سے وہ اہم رازوں کی امین بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر کے دوران کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کے شاندار کیرییئر، وسیع تجربے اور علم کی وجہ سے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حالیہ دنوں میں انہوں نے صدر اوباما سے بڑے دوٹوک الفاظ میں افغانستان میں جاری جنگ کے دوران مارے جانے والے امریکی فوجیوں کے بارے میں سخت سوالات کیے تھے۔

تھامس ہیلن کا 57 سالہ طویل اور شاندار کیریئر اس وقت اچانک ختم ہوگیا جب 27 مئی 2010ء کو ''یہودی وراثت'' کے یوم پر ایک یہودی صحافی نے ان سے اسرائیل کے بارے ان کی رائے جاننا چاہی۔ تھامس ہیلن نے اسرائیل پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''یاد رکھیں ان لوگوں (اسرائیلی یہودیوں) نے فلسطین پر قبضہ کیا ہے، یہ ان کی اپنی سرزمین نہیں ہے، اسرائیلیوں کو فلسطین سے نکل جانا چاہیے، انہیں پولینڈ، جرمنی، امریکہ یا کہیں اور جانا چاہیے۔'' ہیلن کے یہ الفاظ امریکی یہودی لابی اور اسرائیل پر ایٹم بم بن کر گرے۔ آزادی اظہار رائے کے چیمپئین ہیلن کے خلاف غلیظ اور گھٹیا الفاظ استعمال کرنے لگے۔ ان کے خلاف انٹرنیٹ پر درجنوں ویب سائٹس اور بلاگ پر شدید تنقیدی اور طعن وتشنیع پر مبنی کلمات شائع کیے گئے۔ ہیلن کو ''بوڑھی بدصورت عورت'' اور ''پاگل خبطی'' جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ ایک یہودی نے لکھا کہ ''اس بوڑھی کو جوش آگیا ہے، بہت پہلے ریٹائر ہو جانا چاہیے تھا۔'' یہودیوں کے شدید دباؤ کے نتیجے میں ہیلن نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے کیریئر کو نہیں بچا سکی۔

تھامس ہیلن کے ساتھ پیش آنے والا یہ واقعہ لوگوں کے ذہنوں سے ابھی محو نہیں ہوا تھا کہ گزشتہ دنوں اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ امریکہ میں پیش آیا۔ اوکتافیا نصر چند روز قبل تک امریکہ کے سب سے بڑے ٹیلیویژن نیٹ ورک سی این این سے 20 سال سے وابستہ تھیں، بیروت میں پیدا ہونے والی اوکتافیا کا چہرہ ناظرین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ وہ اس قدر باصلاحیت تھیں کہ خود سی این این کی مینجمنٹ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتی تھی۔ ان کی ملازمت چینل سے اس وجہ سے ختم کردی گئی کہ انہوں نے سوشل ویب سائٹ ٹویٹر پر اپنے ذاتی بلاگ میں 4 جولائی 2010ء کو انتقال کر جانے والے حزب اللہ کے قائد محمد حسین

فضل اللہ کی وفات پر ان کی تعزیت میں چند کلمات میں یہ تحریر کیا کہ ''انہیں انتقال کی خبر سن کر صدمہ پہنچا ہے، وہ حزب اللہ کے عظیم رہنماؤں میں سے ایک تھے اور میں ان کا بہت احترام کرتی تھی۔'' اوکتافیا نصر کا بیان ان کی جانب سے کسی سیاسی خیال کا اظہار نہیں بلکہ محض تعزیت کا اظہار تھا۔ ان کے لکھے گئے صرف اس جملے سے سی این این میں موجود یہودی لابی سیخ پا ہوگئی اور اوکتافیا نصر کو اس قدر شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور سی این این نے ان سے کوئی وضاحت طلب کیے بغیر ان کو عہدے سے برطرف کردیا اور کہا کہ وہ سی این این کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔''

تھامس ہیلن کی جبری ریٹائرمنٹ اور اوکتافیا نصر کی برطرفی امریکی معاشرے کے تضاد اور دوغلی پالیسی کو ظاہر کرتی ہے۔ مغرب میں آزادیٔ اظہار رائے کا مطلب ان کے خیالات، نظریات، تہذیب و ثقافت سے متفق ہونا ہے۔ وہ چاہے آزادیٔ اظہار رائے کے نام پر انبیائے کرام علیہم السلام کی توہین کریں، انہیں کچھ نہ کہا جائے لیکن اگر ان کے نظریات کے خلاف کسی نے اظہار کردیا تو پھر اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ مسلمان جب حضور اکرم ﷺ کی شان اقدس کے خلاف شائع ہونے والے توہین میز خاکوں یا فیس بک پر کارٹون مقابلوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو امریکہ اور مغربی ممالک اسے ''آزادیٔ اظہار رائے'' پر حملہ قرار دیتے ہیں لیکن جب دوسری جانب اسی معاشرے میں کبھی اسرائیل یا یہودیوں پر ذرا سی بھی تنقید ہوتی ہے تو یہ لوگ بھڑک اٹھتے ہیں اور یہ تنقید انہیں برداشت نہیں ہوتی۔

حال ہی میں پیش آنے والے یہ دو واقعات ثابت کرتے ہیں امریکہ کس قدر روشن خیال، وسیع النظر اور وسیع القلب ہے اور اس میں تحمل اور برداشت کا مادہ کس قدر ہے۔ تھامس ہیلن اور اوکتافیا نصر اگر خود اپنے کیریئر سے ریٹائر ہوجاتیں تو شاید دنیا بھر میں انہیں اس قدر مقبولیت اور پذیرائی نہ ملتی۔ آج یہ خواتین تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہیں اور انہوں نے اپنا نام تاریخ میں درج کرالیا ہے۔ آنے والی امریکی نسلوں سے دنیا بھر کے لوگ یہ سوال ضرور کریں گے کہ جب امریکہ میں رائے کے اظہار کی مکمل آزادی تھی تو پھر ان دو نامور خواتین صحافیوں کو ان کے حق سے محروم کیوں کیا گیا؟

سید عاصم محمود

امریکہ میں آزادی اظہار کا نیا نمونہ

اقوام متحدہ میں امریکی صدر کے خطاب سے مسلمانوں کے سلگتے جذبات کچھ ماند پڑے، لیکن یہ مطالبہ وقت کی آواز بن چکا کہ امریکہ میں آزادی رائے کو قانون و اخلاق کے دائرہ کار میں لایا جائے۔ امریکی انتہا پسندوں نے دراصل اس اصول کو اپنا بنیادی ہتھیار بنا لیا ہے۔ اس حقیقت کا ایک مظاہرہ جنرل اسمبلی کے دوران ہی سامنے آیا۔

امریکی انتہا پسندوں کی ایک رہنما پامیلا گیلر مسلمانوں کی دشمن ہے۔ یہ خصوصاً میڈیا کے ذریعے اسلام پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ پچھلے ماہ اس کی تنظیم، امریکن فریڈم ڈیفنس انیشیٹیو نے ایک شرانگیز اشتہار تخلیق کیا اور اسے سان فرانسسکو کی بسوں پر لگا دیا۔ اشتہار میں درج انگریزی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''مہذب آدمی اور وحشی کے درمیان کسی بھی جنگ میں، مہذب آدمی کا ساتھ دیجیے۔ اسرائیل کی مدد کریں۔ جہاد کو شکست دیں۔''

سان فرانسسکو کے بعد پامیلا یہ بے ہودہ اشتہار نیویارک کی بسوں اور ریلوے سٹیشنوں پر بھی لگانا چاہتی تھی، تاہم مقامی ٹرانسپورٹ اتھارٹی نے اسے اجازت نہ دی۔ اتھارٹی نے اشتہار کو نامناسب قرار دیا۔ پامیلا نے فیصلے کے خلاف عدالت رجوع کیا۔ وفاقی جج نے قرار دیا کہ اتھارٹی کا فیصلہ امریکی آئین کی پہلی شق (یعنی آزادی رائے) سے متصادم ہے۔ یوں پامیلا کو شرانگیز اشتہار لگانے کی اجازت مل گئی۔ وہ پھر 25 ستمبر کو نیویارک میں لگایا گیا، عین اس دن جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ یہ اشتہار بڑا بامعنی اور تین حصے رکھتا ہے۔ اس کا پہلا پیغام یہ ہے کہ ''مہذب آدمی'' Civilized کی حمایت کرو۔ امریکی اصطلاح میں مہذب آدمی سے مراد سفید فام اکثریت ہے۔ یہ دراصل تاریخی اصطلاح ہے۔ جب پوری استعماری قوتیں ایشیائی اور امریکی ممالک پر حملہ آور ہوئیں، تو انہوں نے خود کو

''مہذب'' کا خطاب دیا۔ جبکہ مفتوحہ علاقوں یا نوآبادیوں کے باشندے ''وحشی'' (Savage) کہلائے۔

امریکہ میں اب تک ریڈ انڈین، افریقی اور لاطینی امریکی ہی وحشی کہلاتے تھے۔ امریکی مسلمانوں کو مبارک باد کہ اب وہ بھی اسی فہرست میں شامل ہو چکے۔ مبارک باد اس لیے کہ یہ اشتہار ان امریکی انتہا پسندوں کی ذہنی پراگندگی کا آئینہ دار ہے جنھوں نے نہایت وحشیانہ طریقے سے امریکہ کے اصل وارثوں، سرخ ہندیوں کا قتل عام کیا اور ان کے پورے پورے قبائل صفحہ ہستی سے مٹا ڈالے۔

دوسرا پیغام یہ کہ اسرائیل کی حمایت کی جائے۔ یہ بھی باشعور امریکیوں کے لیے ایک لطیفہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ اسرائیلی ہی ہیں جنھوں نے سازش اور دھونس دھاندلی سے فلسطینیوں کے گھر بار پہ قبضہ کیا اور پھر بیدردی سے انھیں بے دخل کر دیا۔ اب انھوں نے ''چور آیا، چور آیا'' کا شور مچا رکھا ہے حالانکہ سب سے بڑے غاصب خود ہیں۔

تیسرے پیغام میں جہاد کو بدنام کرنے کی سعی ہوئی کہ اسے جنگ سے جوڑ دیا گیا۔ حالانکہ مسلمانوں پر صرف دفاعی جنگ فرض ہے اور جہاد تو بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اشتہار کا جملہ، فلسفہ جہاد سے ناآشنائی کا مظہر ہے۔

یہ اشتہار دراصل نظریہ تہذیبوں کا تصادم، پر مبنی ہے۔ وہ نظریہ جسے دنیا بھر کے ماہرین رد کر چکے لیکن امریکی انتہا پسند اسے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ امید ہے کہ باشعور امریکی مسلمانوں کے علمی دلائل اس زہریلے پروپیگنڈہ اشتہار کا تریاق بن جائیں گے۔

سجاد میر

احتجاج کا طریقہ

آج کل ناموس رسالت ﷺ کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

وہ کہتے ہیں مسلمان دشمنوں کے جال میں خود آ پھنسے ہیں۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ عالم اسلام کو مشتعل کیا جائے۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں اور اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ادھر فرانس کے ایک جریدے نے دل آزار کارٹون چھاپ دیئے۔ وہ پہلے بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔ انہیں مسلمانوں کو چڑا کر مزہ آتا ہے۔ صرف مزہ ہی نہیں آتا، وہ سمجھتے ہیں، اس طرح وہ اہل مغرب بالخصوص امریکیوں کے دلوں میں یہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ مسلمان ہیں ہی ایسے وحشی لوگ، فوراً اشتعال میں آ جاتے ہیں۔

ایسے میں ہمارے ہی اندر سے مہربان اٹھتے ہیں اور سمجھانے لگتے ہیں: دیکھو، ایسا نہ کرو، دنیا میں اپنی بدنامی کا سامان نہ کرو، پھر اپنا ہی نقصان کرنے کا فائدہ؟ کوئی ایسی راہ ڈھونڈو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ہمیں تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

سچ پوچھیے تو تحمل اور برداشت کی بھی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ ہر بات تو برداشت نہیں ہوتی۔ پھر کیا کیا جائے، مشتعل ہوا جائے۔ یہ تو ایک عالم بے بسی کا اشتعال ہے۔ وہ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی مایوسی اور فرسٹریشن ہے، وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب وہ اپنا غصہ اس طرح بات بات پر بگڑ کر نکالتے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کی ذلتوں کا ذمہ دار مغرب اور امریکہ ہے۔ اس لیے سارا غصہ ان کے خلاف نکلتا ہے، اور کوئی بات نہیں ہے!

کیا یہ سچ ہے، ٹھیک ہے۔ ہمیں مایوسی بھی ہے، غصہ بھی ہے، فرسٹریشن بھی ہے اور ڈپریشن بھی، مگر ہم کوئی وال سٹریٹ پر قبضے کی تحریک نہیں چلا رہے۔ ہمارا یہ غصہ مایوسی یا آپ اسے جو نام بھی دے لیں، اس لیے ہے کہ آخر ہم اپنی بات انہیں سمجھا کیوں نہیں پا رہے۔ یہ

جو ہم سے غصے کو قابو رکھنے کی بات کر رہے ہیں، ان سے ذرا رہنمائی حاصل کر کے یہ تو بتایئے کہ ہم کون سا راستہ اختیار کریں کہ ہماری بات بھی پہنچ جائے اور ہمارا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مغرب میں علم و دانش کی راہیں تراشنے والے ہمارے ایسے دیدہ ور موجود ہیں جو اپنے تجزیوں سے مسلمانوں کو رواداری اور بردباری کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ مجھے ان کے اسلام پر بھی ذرہ برابر بھی شک نہیں ہے۔ وہاں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے والی تنظیموں کے کرتا دھرتا بھی ہیں جو اس رواداری کے رویے کی عالمی سطح پر ترغیب بھی دیتے ہیں اور اسلام کی ایسی تعبیر پیش کرتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے، بھئی، مسلمان بھائیو! چپ رہو اور سر جھکا کر اپنا کام کرتے رہو۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کی اسلام کی تعبیر پر اعتراض ہے نہ ان کے مسلمان ہونے پر، مگر حالات کا جبر آدمی کی سوچ پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ ادھر ہندوستان میں بھی ایسے مسلمان اہل فکر و دانش رہتے ہیں جو بابری مسجد کا واقعہ ہو یا کوئی اور واقعہ مسلمانوں ہی کو ذمہ دار ٹھہرا کر خود حضور نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ سے ایسی مثالیں لاتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے کہ بس سر جھکا کر زندگی کے دن پورے کرو۔

میرا معاملہ یہ ہے کہ میں ایک آزاد ریاست کا شہری ہوں۔ میں نے آزاد مسلم ریاست بھی نہیں کہا۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں آزادانہ سوچ بھی سکتا ہوں اور آزادانہ رائے قائم بھی کر سکتا ہوں۔ میرے ہاں اسلامی ماحول ہے تو جمہوریت بھی ہے۔ میں جب آزادانہ سوچتا ہوں تو مجھ پر وہ جبر نہیں ہوتا جو ان مسلمان مفکرین یا معلمین کے ذہنوں پر ہے جو اس کرب میں زندگی گزارتے ہیں کہ وہ اپنے ملک میں اقلیت میں ہیں اور انہیں ہر صورت اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ ایسا نہ ہوا تو ہزار دعوؤں کے باوجود وہاں ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ ایسے میں بتایئے میں کیا کروں۔ کیسے مغرب کو سمجھاؤں کہ ناموس رسالت ﷺ کا ہمارے ہاں مفہوم کیا ہے۔ کیسے سمجھاؤں کہ نبی ﷺ کی عزت ہمارے ہاں کوئی ہیرو ورشپ نہیں ہے۔ کیسے ان کے بند ذہنوں پر واضح کروں کہ ان گستاخیوں پر مسلمان کے جذبات کس طرح مجروح ہوتے ہیں۔

مجھے طریقہ بتا دیجیے۔ ویسے ہی کر لوں گا۔ احتجاج بھی کرنا ہوگا تو آپ کے بتائے ہوئے طریقے سے کروں گا۔ یہ تو بتایئے، اس سے میری بات انہیں سمجھ آ جائے گی۔ یہ وہ غصہ ہے جس میں مبتلا ہوں۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ توڑ پھوڑ کی جائے۔ مگر میرے اندر ”ترکھان کا بیٹا“

سوال کرتا ہے کہ بابو جی نبی ﷺ کی عزت پر وار ہو رہا ہے۔ اسے بچانے کا تم کیا طریقہ رکھتے ہو۔
یہ نبی ﷺ کی عزت کا سوال، میرے بنیادی تہذیبی ڈھانچے کا سوال ہے۔

چلئے، یہ تو آپ کو سمجھ آ ہی نہیں سکتا۔ بعض تہذیبیں، دوسری تہذیبوں کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کی اہل ہی نہیں ہوتیں۔ مغرب ہماری ان تہذیبی نزاکتوں کو کیا خاک سمجھے گا۔ افسوس تو مگر اس بات کا ہے کہ یہ نہیں وہ ناموس رسالت ﷺ کو سمجھنے سے قاصر ہیں، بلکہ یہ کہ وہ تو آزادیٔ اظہار کے معنی بھی نہیں سمجھ پا رہے۔ میں بار بار لکھ کر پوچھ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ تمہارے لیے آزادیٔ اظہار ہے تو میرے بنیادی انسانی حقوق کا کیا بنے گا؟ کیا آزادیٔ اظہار سے آپ میرے حقوق مجھ سے چھین سکتے ہو۔ تم نے خود اس بات کی ضمانت دے رکھی ہے کہ دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے گا اور انہیں مجروح نہیں کیا جائے گا۔ کیا تم مذہب کی اس آزادی کو مجھ سے چھیننا چاہتے ہو اور وہ بھی جانتے بوجھتے۔

مغرب میں کچھ لوگ ہیں جو ایسے سوال اٹھا رہے ہیں۔ وہ امریکی سپریم کورٹ کے ایک مشہور مقدمے کا ذکر کرتے ہیں جس میں جج نے فیصلہ دیا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی تھیٹر میں کھڑا ہو کر جھوٹ موٹ آگ آگ پکارنے لگے تو کیا اسے ایسا کرنے کی اجازت اس بنا پر دی جا سکتی ہے کہ یہ اس کے آزادیٔ اظہار کا معاملہ ہے۔ پھر عدالت نے فیصلہ دیا جو آزادیٔ اظہار تشدد پر ابھارے یا جس کا نتیجہ تشدد نکلے یا جس کا مقصد تشدد کے لیے مشتعل کرنا ہے، اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اس معاملے میں تو تینوں باتیں موجود ہیں۔ فلم بنانے والے ٹولے نے اعتراف کیا ہے کہ وہ جانتے تھے ایسا ہوگا۔ پھر یہ فلم تشدد پر ابھارتی بھی ہے اور ثابت بھی ہو گیا ہے کہ اس سے تشدد پھیلا ہے۔ پھر آزادیٔ اظہار کے نام پر اس کا کوئی جواز بنتا ہے؟

یہ کوئی ایک آدھ معاملہ نہیں ہے۔ یہ بات ختم ہوگی تو دوسری شروع ہو جائے گی۔ یہودیوں کے خلاف کوئی بات کرنا تو انہوں نے جگہ جگہ قانونی جرم بنا رکھا ہے۔ ہالوکاسٹ کے حوالے سے انہوں نے تحقیق کا بھی گلا گھونٹ رکھا ہے۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ عالمی سطح پر ایسی قانون سازی پر زور دیا جائے جو قرآن و رسالت کے حوالے سے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح نہ کرے۔ اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایسا کوئی اقدام مسلمانوں کو مشتعل کرتا ہے اور یہ مذہبی آزادی کے سیکولر اصول کی خلاف ورزی ہے۔ میرے بنیادی انسانی حقوق بار بار

پامال کیے جارہے ہیں۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ اہل مغرب اپنے معاشرے کی اس کجی کو دور کریں اور اپنی اس بیماری پر قابو پانے کا کوئی طریقہ ڈھونڈیں۔

اب رہی یہ بات کہ ہمارا احتجاج بھی اسی سمت ہونا چاہیے تو ہماری دوسری اور اصل مایوسی اور غصہ ہے ہی یہ کہ مسلم دنیا میں ہمارے حکمرانوں کو اسکی پرواہ ہی نہیں ہے۔ انہیں صرف راج سنگھاسن سے غرض ہے۔ وہ دین کے نام پر بھی سیاست کررہے ہیں۔ میرا تو او آئی سی کا نام لینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ کیا یہ مسلم ممالک عالمی سطح پر بالخصوص اقوام متحدہ میں کوئی تحریک برپا نہیں کرسکتے۔ مٹھی بھر یہودی تو من پسند قوانین بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ہم ڈیڑھ ارب مسلمان اتنے ہی بے بس ہوگئے ہیں۔

ہمیں ہمارے حکمرانوں نے مارا ہے،

اورانہیں امریکہ کی دوستی نے!

مزید کیا عرض کروں مجھے درمیان کا راستہ نظر نہیں آتا۔ احتجاج کا طریقہ بھی سمجھ نہیں آتا۔ مہربانی کرکے رہنمائی فرمائیے۔

ظفر بنگش

کیا آزادیٔ اظہار بے لگام ہے؟

مغرب کا دعویٰ ہے کہ آزادانہ تقریر و تحریر کا حق مطلق اور مسلم ہے مگر یہودیوں کے خلاف بولنے پر پابندیاں عائد ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے حوالے سے عملی طور پر صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا ''بولنا'' تو درکنار، انہیں محض امریکہ کو نقصان پہنچانے کے متعلق ''سوچنے'' کے اندیشے میں منظم طریقے سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ دوہرا معیار کیوں ہے؟

ہر بار جب اسلام، اس کی مقدس کتاب یا اللہ کے برگزیدہ رسول حضرت محمد ﷺ کی توہین کی جاتی ہے یا ان کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے تو مغربی حکام اور میڈیا مبصرین فوراً مسلمانوں کو بتانے لگتے ہیں کہ ان کے ہاں آزادیٔ اظہار ہے اور بہتر ہے کہ وہ اسے گوارا کریں۔ لیکن کیا آزادیٔ اظہار مطلق اور بے لگام ہے اور اس کے ساتھ کوئی ذمہ داری وابستہ نہیں؟ کسی شخص کو ایک پُرہجوم تھیٹر یا ایک شاپنگ مال میں چیخنے چلانے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی؟ اگر معاملہ یہود کی مخالفت (anti-semitism) کا ہو تو کیا آزادیٔ اظہار کی دلیل پیش کی جاسکتی ہے؟ اگر نہیں، تو پھر یہ دوہرا معیار کیوں؟

تازہ ترین غم و غصہ کی لہر ایک گھٹیا درجے کی توہین آمیز فلم کے ساتھ اُبھری جسے امریکہ میں مقیم نکولا بیسلے نکولا نامی سزا یافتہ مجرم نے تیار کیا جو مصر سے تعلق رکھنے والا بہت متشدد اسلام دشمن قبطی عیسائی ہے۔ اسے 2010ء میں بینک فراڈ کے الزامات میں مجرم ٹھہرایا گیا، اس پر تقریباً 8 لاکھ ڈالر کا جرمانہ ہوا اور 21 ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ مجرم ان دنوں پیرول پر جیل سے باہر تھا۔ اس کی رہائی کی شرائط میں یہ بات شامل تھی کہ وہ کمپیوٹر یا انٹرنیٹ استعمال نہیں کرے گا۔ تاہم نکولا تنہا یہ ابلیسی کھیل نہیں کھیل رہا۔ امریکی عیسائی بنیاد پرست اور صیہونی اس کے گھناؤنے دھندے میں شریک ہیں۔ ان کا یہ توہین آمیز فلم بنانے کا مقصد مسلمانوں کو

اشتعال دلانا اور اسلام دشمن ایجنڈے کو آگے بڑھانا تھا۔

شروع میں تو اس فلم پر زیادہ ردعمل نہ ہوا حتیٰ کہ جب اسے یوٹیوب پر اپ لوڈ کر دیا گیا تو بھی کوئی خاص احتجاج نہ ہوا مگر اس کے پروڈیوسر اس مسئلے کے دب جانے کے روادار نہ تھے۔ چنانچہ فلم عربی میں منتقل کی گئی اور اس میں غلیظ زبان شامل کی گئی جو اصلاً اداکاروں اور اداکاراؤں نے استعمال نہیں کی تھی، پھر یہ فلم مصر کے بہت سے ٹی وی چینلوں کو ارسال کر دی گئی۔ ایک چینل پر اس کے براڈ کاسٹ ہوتے ہی فوراً ردعمل ہوا۔ قاہرہ میں امریکی سفارت خانے کے باہر احتجاج کے بعد لیبیا کے دوسرے بڑے شہر بن غازی میں احتجاجی مظاہرہ ہوا۔ امریکی سفیر کرس سٹیونز اتفاق سے بن غازی امریکی قونصل خانے کے دورے پر آیا ہوا تھا، وہ تین دیگر امریکیوں کے ہمراہ مظاہرین کے حملے میں مارا گیا۔ حملے کا ذمہ دار کون تھا، یہ ابھی غیر واضح ہے۔ لیبیا میں کیا ہوا، امریکی حکومت کی طرف سے اس کے متعلق متضاد (ڈھکے چھپے) موقف سامنے آئے ہیں۔ کیا یہ ایک پیشگی سوچا سمجھا حملہ تھا یا محض ایک ناگہانی اتفاق، یہ ہم یقین سے کبھی نہیں جان سکیں گے۔

پھر احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ تیزی سے دنیا بھر میں پھیل گیا اور مختلف ملکوں میں بیسیوں مظاہرین مارے گئے۔ دونوں قسم کے واقعات اور اموات قابل مذمت ہیں جن میں بے گناہ افراد کی جانیں گئیں مگر ان پر امریکی ردعمل مختلف تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی کیونکر خود کو دوسروں سے برتر سمجھتے ہیں۔ یہ امریکہ کے خلاف مسلمانوں کی فہرست شکایت کا حصہ ہے جو عادتاً اہتمام کے ساتھ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر حملے کر کے انہیں قتل کرتا ہے۔ پچھلے عشرے میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے عراق، افغانستان، پاکستان، صومالیہ اور یمن میں کم از کم بیس لاکھ مسلمان قتل کیے ہیں۔ ایران کے خلاف بھی جنگ کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ کیا یہ سب مقتولین اور آنے والی جنگوں میں نشانہ بننے والے ''آزادیٔ اظہار'' کے کوئی حقوق نہیں رکھتے؟ یا کیا انہیں زندہ رہنے کا بنیادی حق بھی حاصل نہیں؟

امریکی حکام مثلاً امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے کہا ہے کہ اس فلم کا امریکی حکومت سے کوئی تعلق نہیں، فنی طور پر درست ہے۔ یہ فلم سرکاری سطح پر تیار نہیں کی گئی لیکن امریکی حکومت پروپیگنڈہ مقاصد کے لیے بھی فلمیں بنانے کا کام خود نہیں کرتی۔ یہ ذمہ داری

حکومت سے باہر ہالی وڈ یا ان گنت میڈیا والوں کو سونپی جاتی ہے۔ مگر امریکی حکومت اور اس کے اتحادی ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے جس میں اسلاموفوبیا (اسلام کا مصنوعی خوف) پھیلانے والے قابل احترام ٹھہرتے ہیں۔ ہزاروں مسلمانوں کو محض اس شک کی بنا پر حراست میں لیا گیا کہ وہ امریکی مفادات کے خلاف خیالات کے ''حامل'' ہوسکتے ہیں۔ مسلمانوں کا کسی حقیقی یا تصوراتی چیز کے بارے میں سوچنا بھی جرم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کے خلاف غلیظ پروپیگنڈہ یا حضور نبی کریم ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی ہو تو آزادیٔ اظہار کے نظریے کی جگالی ہونے لگتی ہے۔

لیکن ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ اس کا آغاز 1980ء کی دہائی میں سلمان رشدی کی توہین آمیز کتاب ''شیطانی ہفوات'' (Satanic Verses) سے ہوا تھا۔ 2003ء میں امریکی فوجیوں نے گوانتاناموبے میں قرآن مجید کی توہین کی اور اس کے اوراق پھاڑ کر فلش میں بہا دیے۔ اسی سال بدنام زمانہ ابوغریب جیل میں عراقی مسلمان عورتوں اور مردوں کو نہ صرف ٹارچر کیا گیا بلکہ آبروریزی بھی کی گئی۔ 2005-2006ء میں ہمیں ڈنمارک میں بننے والے خاکوں کا دکھ برداشت کرنا پڑا۔ یہاں بھی آزادیٔ اظہار کے نظریے کا راگ الاپا گیا۔ جرمن چانسلر انجیلا مرکیل نے تو 2010ء میں ڈینش اخبار کے ایڈیٹر کو ایوارڈ دیا جو خاکے شائع کرنے میں ملوث تھا۔

غلیظ فلم کے بعد فرانسیسی ہفتہ وار جریدے چارلی ہیبڈو نے رسول اکرم ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کردیے۔ فطری طور پر فرانس میں مسلمان اس نئی توہین پر غم وغصہ میں ڈوب گئے۔ فرانسیسی وزیراعظم ژاں مارک آیرالٹ نے 19 ستمبر کو جریدے کے ''آزادیٔ اظہار'' کے حق کی علانیہ حمایت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو 22 ستمبر کی ریلی منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جس میں وہ امریکی ساختہ توہین آمیز فلم پر احتجاج کرنا چاہتے تھے جس نے مسلم دنیا میں بے پناہ غم وغصہ کی لہر دوڑا دی ہے۔ آیرالٹ نے RTL ریڈیو سٹیشن کو بتایا ''آخر ہم ان تنازعات کو اپنی سرزمین میں کیوں آنے دیں جو فرانس سے تعلق نہیں رکھتے اور اس کا کوئی جواز نہیں۔'' کیا وہ یہی دلیل پیش کرتے اگر بعض یہودی شہری یہود مخالف ریمارکس یا کسی اور ملک میں تیار شدہ فلم کی مذمت کے لیے ریلی نکالنا چاہتے؟

فرانسیسی، امریکی اور دیگر مغربی یہ کیوں سوچتے ہیں کہ وہ اسلام کی برگزیدہ ترین ہستیوں کی توہین کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کو اسے برداشت کرنا چاہیے کیونکہ مغرب میں "آزادیٔ اظہار" نامی مقدس گائے ڈکرا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مغرب میں آزادیٔ اظہار کے تصور کا مطلب اسلام اور اسلام کی مقدس ہستیوں کے خلاف غلیظ زبان میں ہرزہ سرائی اور توہین کے سوا کچھ نہیں۔ شرم ان کو مگر نہیں آتی۔

اوریا مقبول جان

کامل مرا ایماں ہو نہیں سکتا

ان لوگوں کو شاید پختہ یقین ہے کہ انہیں روزِ حشر سید الانبیاء ﷺ کی شفاعت کی ضرورت نہیں، یا پھر وہ خیال کیے بیٹھے ہیں کہ ایسا کوئی دن آئے گا ہی نہیں۔ کتنے اطمینان سے یہ لوگ طیش میں آنے والے ہجوم اور غم و غصے میں بپھرے ہوئے افراد کو ہوش کی تلقین کرتے ہیں۔ کیا یہ اُس وقت بھی ایسا ہی کرتے، اگر اس قدر فحش اور بیہودہ فلم ان کے کسی سیاسی رہنما کے بارے میں بنتی؟ ان کے باپ، ماں اور بہن کے بارے میں ایسی فلم بنتی تو کیا وہ تب بھی خاموش رہتے؟ کیا میرے آقا ﷺ کا اس ملک کے قائدین پر کوئی حق نہیں؟ وہ رسول رحمت ﷺ کہ جن کے بارے میں میرا اللہ فرماتا ہے: ''میرا احسان ہے مومنین پر کہ میں نے ان کے درمیان اپنا رسول ﷺ بھیجا''۔ اللہ نے کسی نعمت پر احسان نہیں جتایا سوائے سرکارِ دو عالم ﷺ کی بعثت کی نعمت کے۔ اگر اس ملک کا صدر، وزیر اعظم، تمام وزرائے اعلیٰ اور وزراء ایسے ہی دیوانہ وار سڑکوں پر احتجاج کرتے ہوئے نکل آتے تو کیا غصے میں بپھرے ہوئے ہجوم میں ناراضگی اور غصہ باقی رہتا؟ لیکن شاید یہ توفیق میرا اللہ ان کو دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تو انہیں اتنی بھی توفیق عطا نہیں کی کہ سپریم کورٹ کے حکم سے پہلے خود ہی یوٹیوب پر پابندی عائد کر دیتے، اسے بلاک کر دیتے۔ یہ اعزاز بھی اللہ نے افتخار محمد چودھری کو دیا۔ جن قوموں پر عذاب نازل کرنے کے فیصلے ثبت ہو جایا کرتے ہیں، ان سے اللہ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کی بھی توفیق چھین لیتا ہے۔ دنیا کی ذلت تو ان کا مقدر ہوتی ہے، ان کی آخرت کے اجر میں بھی محرومی لکھ دی جاتی ہے۔ میں اس بدنصیب ملک کی وزارت خارجہ کا امریکی حکومت کو لکھا گیا خط پڑھ رہا تھا تو ان کی بدنصیبی پر رونا آ رہا تھا۔ کہتے ہیں: اگر آپ نے اس طرح کی نازیبا حرکات کو نہ روکا تو دہشت گردی کی جنگ متاثر ہوگی۔ انہیں میرے اللہ نے یہ توفیق تک نہ دی کہ لکھ دیتے: اس سے ہمارا ایمان، سرکارِ دو عالم ﷺ سے ہماری محبت مجروح ہوگی۔ لیکن وہ

ایسا کیوں کرتے۔ جن لوگوں نے دنیا اور آخرت کا اجر امریکہ سے وابستہ کرلیا ہو، انہیں یہ توفیق نہیں ملا کرتی۔

یہ اس قوم کے روشن خیال لوگ ہیں جو نجی محفلوں میں بیٹھ کر مسلمانوں کے غم و غصے کو پاگل پن قرار دیتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو جاہل، دقیانوسی اور کسی بہت بڑے شدت پسند کا آلہ کار بتاتے ہیں۔ لیکن سرعام یا میڈیا کے سامنے آکر ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ لیکن آفرین ہے کہ امریکہ میں پاکستان کے سابق سفیر حسین حقانی نے منافقت کا لبادہ چاک کرتے ہوئے وال سٹریٹ جرنل میں احتجاجی رویے کے خلاف مضمون لکھ دیا۔ اس مضمون میں انہوں نے لکھا کہ ایسی ویڈیوز سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ہیلری کلنٹن کے اس ویڈیو کی مذمت کرنے پر بھی وہ برس پڑے اور کہا کہ ہیلری دہشت گردوں کے ہاتھ میں یرغمال بن گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ مسلمان اس ویڈیو کے خلاف اکٹھے ہو کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ موصوف کہتے ہیں کہ اصل مسئلہ اہانت رسول نہیں بلکہ سڑکوں پر مسلمانوں کا پرتشدد مظاہرہ ہے۔ ایسے موقع پر سرکار دو عالم ﷺ کی حدیث یاد آتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب دنیا دو خیموں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک خیمہ جس میں مکمل ایمان اور دوسرا خیمہ جس میں مکمل کفر ہوگا''۔ چلو حسین حقانی نے نفاق سے نجات حاصل کرلی۔

لیکن کتنے ایسے ہیں جو اس بات پر لوگوں کو عقل و ہوش کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تو ایک فرد کا معاملہ ہے، پورے امریکہ یا یورپ کا اس سے کیا تعلق۔ یہ تو انسانی حقوق ہیں، اظہار رائے ہے، وہاں ایسا کوئی قانون نہیں ہے۔ میں یہاں دنیا کے ہر ''نام نہاد مہذب'' ملک کے قوانین کی ایک فہرست پیش کرسکتا ہوں جہاں یہودیوں کے خلاف گفتگو کرنے، لکھنے یا فلم بنانے پر پابندی ہے اور سخت سزائیں موجود ہیں۔ آسٹریا میں 1947ء میں (Denazification) کے تحت قانون بنا اور پھر اس کے تحت 1992ء میں اس پر سزائیں مقرر ہوئیں۔ جو بیس سال قید تک ہیں۔ بیلجیم میں 1995ء میں ایسا قانون نافذ ہوا۔ ناروے کے قانون کے تحت ان کی تعزیرات نمبر 444 میں یہودیوں کے بارے میں گفتگو قابل دست اندازی پولیس جرم ہے جس کی سزا پانچ سال ہے۔ چیک ری پبلک میں 2001ء میں بنائے گئے قانون کے تحت سزا آٹھ سال ہے اور جو کسی ایسے شخص سے ہمدردی کا اظہار کرے گا جو یہودیوں کے خلاف ہے تو اسے تین سال قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ فرانس میں

ایسے قوانین 1981ء میں بنائے گئے جو ان کی تعزیرات کے آرٹیکل 42 میں شامل ہیں۔ جرمنی میں یہ قوانین 1981ء میں بنائے گئے اور اسے 1992ء میں مزید سخت کیا گیا۔ ہنگری میں یہودیوں کے خلاف جذبات بھڑکانے کا قانون فروری 2010ء میں بنا اور اسے انسانیت کے خلاف جرم قرار دیا گیا۔ یہاں بھی کم از کم سزا پانچ سال ہے اور زیادہ سے زیادہ بیس سال۔ لتھونیا، لکسمبرگ میں بھی ایسے ہی قوانین ہیں۔ ہالینڈ کے آئین کے آرٹیکل 173 ڈی میں اسے شدید جرم قرار دیا گیا ہے۔ پولینڈ کے آئین کے آرٹیکل 55 کے تحت اس کی سزا تین سال ہے۔ پرتگال کے آئین کے آرٹیکل 240 میں بھی ایسا ہی قانون ہے۔ رومانیہ میں ایسا قانون 13 مارچ 2002ء میں بنایا گیا اور یہاں سزا پندرہ سال ہے۔ سپین کے قانون تعزیرات کی شق نمبر 6071 میں اس کو قتل کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے قانون کی شق نمبر 261(B1) کے تحت اس کی سزا تین سال ہے۔ یورپی یونین نے اپنے تمام ممالک کو 2007ء کے فریم ورک کے تحت پابند کیا ہے کہ ایسے تمام ممبر ممالک اس طرح کے جرم میں کم از کم تین سال سزا مقرر کریں۔ یہ تمام ملک صرف قوانین کی حد تک محدود نہیں بلکہ عملاً اس کے تحت مختلف لوگوں کو برابر سزائیں بھی سناتے رہے ہیں اور آج بھی ان قوانین کے تحت مقدمے چل رہے ہیں۔ فرانس میں جین میری لی پین کو 1997ء میں اور روجر گراڈے کو 1998ء میں سزائیں ہوئیں۔ سوئٹزرلینڈ میں جورگن گراف کو 21 جولائی 1998ء اور گیرٹ ہارڈ کو اگست 1998ء میں سزا سنائی گئی۔ آسٹریلیا میں فریڈرک توبن کو سات ماہ سزا ہوئی اور پھر اپریل 1999ء میں اسی جرم پر اس پر جرمنی میں 2011 میں دوبارہ مقدمہ چلایا گیا۔ فرانس میں جین پلنٹین کو 27 مئی 1999ء میں سزا ہوئی۔ سوئٹزرلینڈ میں گیسٹر آرمنڈ کو 11 اپریل 2000ء کو، آسٹریا میں ڈیویڈ آرونگ کو 20 فروری 2006ء کو، جرمنی میں گیرمر روڈلف کو 15 مارچ 2006ء کو، فرانس میں روبرٹ فروسین کو 3 اکتوبر 2006ء کو، جرمنی میں ارنسٹ زینڈل کو 15 فروری 2007ء کو، آسٹریا میں ولف گینگ فروچ کو 14 جنوری 2008ء کو سزائیں سنائیں گئیں۔ یہ ایک طویل فہرست ہے جس میں سے میں نے صرف ایک فیصد نام تحریر کیے ہیں۔ ان سب لوگوں کو صرف ایک جرم میں قید کاٹنا پڑی۔ یہ لوگ اس بات سے انکار کرتے تھے کہ ہٹلر نے یہودیوں کا قتل عام کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ایک یہودی پروپیگنڈا ہے۔ انہوں نے کسی کی تضحیک نہیں کی تھی۔ کسی قابل احترام شخصیت کا مذاق نہیں اڑایا

تھا۔اس قانون کا نام ہی Denial of Holocaust ہے۔ یہ تمام قوانین گزشتہ پندرہ برسوں کے دوران ان ملکوں میں بنائے گئے۔ یہ وہ دور ہے جسے انسانی حقوق اور آزادی اظہار کا دور کہا جاتا ہے۔

یہودی سرمائے سے چلنے والے ہڈسن انسٹی ٹیوٹ کے فیلو حسین حقانی کو یہ قوانین نظر نہیں آتے نہ ہی ان لوگوں کو نظر آتے ہیں جو ایسے موقع پر غصے میں بپھرے اور جذبات سے مغلوب شخص کو پاگل قرار دیتے ہیں۔ یہ پاگل پن ہمیں مبارک کہ یہی پاگل پن اس امت کی بقا اور اساس ہے۔ پوری دنیا کو علم ہے کہ یہ امت وہ ہے جس میں ہزار اختلاف ہوں، فرقہ بندی اور گروہوں میں تقسیم ہو، ایک دوسرے کو قتل کرتے پھریں، گناہوں میں لتھڑے ہوئے ہوں، لیکن ایک نکتے پر اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور وہ ہے حرمت رسول ﷺ۔ ایسے میں ان سے نہ ہوش کی توقع کی جا سکتی ہے اور نہ عقل کی۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی دنیا تو برباد ہے ہی، ان کے لیے آخرت میں سید الانبیاء ﷺ کی شفاعت کا سہارا باقی ہے، اگر یہ بھی ان سے چھن گیا تو وہ برباد ہو گئے۔ امام مالکؒ نے ہارون الرشید کے حرمت رسول ﷺ کے بارے میں سوال پر جواب دیا تھا: اس امت کے باقی رہنے کا کیا جواز ہے جس کے نبی ﷺ کی توہین کر دی جائے۔ ظفر علی خان نے ان اشعار پر بات ختم کر دی:

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا، زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ بطحا ﷺ کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل مرا ایماں ہو نہیں سکتا

رابرٹ فسک

آزادیٔ اظہار کا غلط استعمال اور اس کے "ثمرات"

سوا انٹرنیٹ کے ایک اور شاطر کھلاڑی نے پورے مشرق وسطیٰ میں آگ لگادی۔ کبھی کارٹون، کبھی مقدس کتاب کو نذر آتش کرنے کی بات اور اب یہ ویڈیو۔ اس طرح کی حرکتیں کرنے والے مغربی عیسائی اپنا کام دکھا کر خود کہیں زیر زمین چلے جاتے ہیں (جو سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے) اور معصوم لوگ زد میں آجاتے ہیں۔ مسلمان اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں اور فسادی سوچ کا پرچار کرنے والوں کو اپنے یہ نسل پرستانہ دعوے "ثبات" کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اسلام ایک تشدد پسند مذہب ہے۔

بلاشبہ اس طرح کا اشتعال پھیلانے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں سیاست اور مذہب آپس میں گڈمڈ نہیں۔ یہ دونوں ایک ہیں۔ کرسٹوفر سٹیونز، بن غازی میں اس کے سفارت کار ساتھی، ترکی اور افریقہ کے پادری، افغانستان میں امریکی عملہ، ان سب نے ان "عیسائی پادریوں"، "کارٹونسٹوں"، "فلمسازوں" اور "مصنفین" (واوین کا استعمال اس لیے ضروری ہے کہ حقیقت اور فریب کے درمیان پائی جانے والی باریک سی لکیر کو واضح کیا جاسکے) کے کرتوتوں کی قیمت ادا کی جو جان بوجھ کر ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کو اشتعال دلاتے ہیں۔

ڈنمارک کے ایک کارٹونسٹ نے پیغمبر اسلام ﷺ کا توہین آمیز خاکہ بنایا تو بیروت میں ڈنمارک کے سفارتخانے کو آگ لگا دی گئی۔ ٹیکساس کے ایک پادری نے جب قرآن پاک کی بے حرمتی کا "فیصلہ" سنایا تو افغانستان میں خنجر نکل آئے۔ فی الحال ہم بگرام میں امریکیوں کے ہاتھوں قرآن پاک کے صفحات کو "حادثاتی" طور پر بنائی گئی ایک واہیات فلم، سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک سفارتکار کی موت کا باعث بن گئی ہے۔

یادش بخیر اس طرح کی حرکتیں کوئی نئی بات نہیں۔ پندرھویں صدی میں سپین کے

عیسائی کارٹونسٹوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی توہین آمیز تصویریں بنائی تھیں۔ اور ہم تو ایسے ظاہر کرتے ہیں جیسے ہمارے ہاتھ بالکل صاف ہوں اور وہ واقعہ بھول جاتے ہیں جب پیرس کے ایک سینما گھر نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک توہین آمیز فلم کی نمائش کی تو اس سینما گھر کو جلادیا گیا جس میں ایک شخص مارا گیا اور مارنے والا کون تھا، عیسائی!

لیکن نئی ٹیکنالوجی کے تو رنگ ہی نرالے ہیں۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی دو چار مخبوط الحواس لوگ چند سیکنڈ کے اندر پوری مسلم دنیا کو میدان جنگ میں بدل سکتے ہیں۔ مجھے تو شبہ ہے کہ کرسٹوفر سٹیونز، (جوان چند امریکیوں میں سے تھا جو عربوں کو واقعی سمجھتے ہیں) نے اس 'فلم' کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں ہوگا جو بن غازی میں امریکی قونصلیٹ پر یلغار اور اس کی اپنی موت کا باعث بن گئی۔ ہمارے نزدیک یہ ایک الگ بات ہے کہ آپ بغیر سوچے سمجھے اعلان کر دیں کہ امریکہ القاعدہ کے خلاف ''صلیبی جنگ'' لڑے گا لیکن یہ بات اور کہ بیٹھے بٹھائے جان بوجھ کر اربوں افراد کی ایک قوم کی توہین کر دی جائے۔ اس طرح کا نسلی تعصب بہت سے لوگوں کے دلوں میں جنون برپا کر دیتا ہے۔

اور اب القاعدہ (جو ان عرب انقلابیوں کے ہاتھوں شکست کھا چکی ہے جنہوں نے پورے مشرق وسطیٰ پر اسامہ بن لادن کی خلافت کے مقابلے میں اپنے وقار کو ترجیح دی) اپنی طرز کے اسلام کو پھیلانے کے لیے عوام میں پائے جانے والے غم و غصے کا فائدہ اٹھائے گی؟ لیبیا کی نااہل حکومت خود امریکیوں کو سٹیونز کی موت کا الزام دیتی ہے چونکہ امریکیوں کو چاہیے تھا کہ وہ قونصلیٹ خالی کرا لیتے اور اس کا کہنا ہے کہ حملے کے پیچھے قذافی ٹولے کا ہاتھ ہے۔ یہ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر بن غازی کے مسلح ملیشیا، جو خود کو 'اسلامک لاء سپورٹرز' کا نام دیتے ہیں، ''ٹیلی فون گن مینوں' سے زیادہ کچھ ہیں تو پھر القاعدہ کے ملوث ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ مذاق نہیں تو کیا ہے کہ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان مثال کے طور پر قرآن پاک کی دوبارہ تشریح پر سنجیدہ بحث ہونی چاہیے لیکن مغربی اشتعال انگیز (افسوس کی بات تو یہی ہے کہ یہ مغربی ہی ہیں) اس ساری بحث کے سارے راستے بند کر دیتے ہیں۔ ایک طرف یہ سب چلتا ہے اور ساتھ ساتھ ہم ''آزاد پریس'' کے حق میں سینہ کوبی کرتے رہتے ہیں۔ نیوزی لینڈ کے ایک ایڈیٹر نے ایک بار بڑے فخر کے ساتھ مجھے بتایا

کہ کس طرح اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کے توہین آمیز خاکے اپنے اخبار میں دوبارہ شائع کیے۔ لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کہ اگلی بار جب اسرائیل لبنان پر حملہ کرے تو کیا تم کسی رابی کا کارٹون شائع کرو گے جس نے اپنے سر پر بم باندھ رکھا ہو تو فوراً بول اٹھا یہ تو صیہونیت مخالف بات نہیں ہو جائے گی!!!

یہ ہے سوچ۔ کچھ چیزیں حد سے باہر ہوتی ہیں اور وہیں ٹھیک ہوتی ہیں۔ کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ گزشتہ روز بہت سے ریڈیو پریزنٹر مجھ سے پوچھتے رہے کہ یہ مصر اور بن غازی میں بے چینی "گیارہ ستمبر کے ساتھ ہی" رونما ہونا محض اتفاق ہے۔ کسی کو یہ پوچھنے کا خیال نہیں آیا کہ یہ ویڈیو جاری کرنے والے اشتعال انگیزوں نے اپنی واردات کی تاریخ کا انتخاب گیارہ ستمبر کے ساتھ ملا کر کیوں کیا؟

پروفیسر شمیم اختر

توہین رسالت ﷺ، آزادیٔ اظہار رائے کا حق...... امریکہ کا موقف

11 ستمبر اگر امریکہ کا یوم سوگ ہے تو مسلمانان عالم (مسلم حکمران نہ سہی) کے خلاف یہ صلیبی جنگ کا اعلان ہے، جس کا انتہائی اوچھا حربہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تضحیک، توہین اور کردار کشی ہے لیکن یہی دن عالم اسلام کے لیے تحفظ ناموس رسالت ﷺ کا دن بھی ہے، لہٰذا برادران اسلام کو اس ناچیز کا یہ مشورہ ہے کہ مسلم امہ 11 ستمبر کو نبی آخرالزماں ﷺ کی ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسول کا عالمی دن منائے تاکہ عالم کفر پر یہ عیاں ہوجائے کہ یہ وہ راسخ عقیدہ ہے جس کی تضحیک و ہتک مسلم عوام (حکمران نہ سہی) کے لیے ناقابل برداشت ہے اور اگر مسلم امہ کی کھینچی ہوئی اس سرخ لکیر کو عبور کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلم عوام بھی صبر وتحمل کی حدود قیود و بند توڑ کر صلیبی صیہونی دہشت گردی کا منہ توڑ جواب دیں گے۔ جس کی ایک جھلک تو پاپائے روم نے لبنان کے شہر طرابلس اور اوباما اور اس کے ناتجربہ کار انتخابی حریف مٹ رومنی نے امریکہ سے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ ویسے نصاریٰ اور یہود کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ محض اس منظرنامے کا ٹریلر تھا جو ان کی زیر سرپرستی جارحیت کے نتیجے میں رونما ہوا۔ امریکہ نے عین اپنے روایتی دوہرے معیار کے مطابق پاکستان میں 20، 21 ستمبر کو اسلام آباد، لاہور، کراچی، ملتان، کوئٹہ، بنوں غرضیکہ ملک کے بڑے شہروں سے لے کر قریہ قریہ تک بپھرے ہوئے عوام کے تیور دیکھ لیے ہوں گے اور 20 ستمبر کو وکلا کا احتجاج بھی دیکھا ہوگا جس کے شرکا نے اسلام آباد میں سفارتخانوں کے ممنوعہ علاقے میں پولیس اور رینجروں کی کھڑی کی گئی رکاوٹوں سمیت ان کے آہنی حصار کو توڑ کر امریکہ اور مغربی ممالک کو متنبہ کردیا ہے کہ وہ آگ سے نہ کھیلیں اور ہمارے دین، ہمارے پیغمبر ﷺ کی ذات پر حملے

بند کر دیں، ورنہ نتائج کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔

امریکہ یہ تو جانتا ہے کہ وکلا برادری لاقانونیت، ناانصافی اور تشدد کو برداشت نہیں کر سکتی اور جب وہ میدان عمل میں نکل آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس شر اور فتنے کا سدباب کرنے کا عزم کر چکی ہے، لیکن بدقسمتی سے امریکہ اور اس کے مقبوضہ مقامی ذرائع ابلاغ یہ تاثر دیتے رہے ہیں کہ اسلام مخالف امریکی فلم کے خلاف صرف مذہبی جماعتیں احتجاج کر رہی ہیں اور اقتدار کی بھوکی جماعتیں اس عوامی احتجاج تحریک میں عدم شرکت سے اس تاثر کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے صلیبی صہیونی آقاؤں کو یہ پیغام بھیج رہی ہیں کہ یہ انتہا پسندوں اور جنونی عناصر کی حرکت ہے، جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ساتھ ہی بھولے بھالے عوام کو یہ باور کرانے کے لیے کہ وہ اس احتجاج میں بھرپور طور پر شریک ہیں، کاغذی شیروں کی طرح گستاخانہ فلم کے خلاف مذمتی بیانات بھی دے رہے ہیں۔ کوئی ان مرغانِ بادنما سے پوچھے کہ اگر تمہیں اپنے پیغمبر ﷺ کی تضحیک پر اتنا ہی غم و غصہ تھا جس کا تم اپنے بیانات میں اظہار کر رہے تھے تو احتجاجی مظاہروں میں من حیث الجماعۃ کیوں شرکت نہیں کی؟

امریکی پالیسی ساز بھی کتنے کوتاہ اندیش اور بے بصیرت ہیں کہ وہ مسلم عوام کی نفسیات اور جبلت کو بدلنے کے لیے پروپیگنڈا اور رشوت کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً امریکہ نے پاکستان میں توہین رسالت پر مبنی فلم کے خلاف عوامی ردعمل کی کاٹ کے لیے مقامی میڈیا میں یہ تشہیر کرنے کے لیے کہ امریکہ مذکورہ فلم کی مذمت کرتا ہے اور اس سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے، ستر ہزار ڈالر مختص کر دیے ہیں۔ (وائس آف امریکہ، 21 ستمبر 2012ء)

یہ کھلی رشوت ہے، جس کے ذریعے امریکہ جھوٹا پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ یوں بھی یہ کوئی راز نہیں رہا کہ امریکی سفارتخانے اور قونصل خانے کے پبلک افیئرز اور کلچرل افیئرز شعبوں کا کیا کام ہے؟ اور وہ کس کس طرح صحافیوں، دانشوروں اور زندگی کے مختلف شعبوں کے افراد پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی جھلکیاں بعض اخبارات کی خبروں پر لگی سرخیوں، اداریوں، ادارتی صفحات کے مضامین اور امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں آباد پاکستانی نژاد دانشوروں اور جامعات میں ملازم اساتذہ کی پاکستانیوں کو انتہا پسندی سے اجتناب اور انسداد دہشت گردی کی جنگ کے فضائل نصائح اور انتباہ پر مبنی مدیران کو لکھے گئے مراسلات

میں صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔

میری سمجھ نہیں آتا کہ جو لوگ ڈالر اور یورو کے لالچ میں اپنا وطن ترک کر کے دیار غیر کو اپنا وطن بنا چکے ہیں اور یہود و نصاریٰ کے اداروں اور ان کی کمپنیوں میں ملازمت اور محنت مزدوری کرتے ہیں، ہم انہیں کیسے پاکستانی کہہ سکتے ہیں، ان کا اس ملک پر کیا حق ہے جو عقل کل بن کر ہمیں انتہا پسندی اور دہشت گردی پر لیکچر دیتے ہیں۔ ہم اپنا بھلا برا خوب سمجھتے ہیں اور عوام تو اپنے دوست اور دشمن کو خوب پہچانتے ہیں۔ امریکہ بھی دیکھ لے کہ وہ کتنے پاکستانی طلبہ کو اپنی جامعات میں اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دے چکا ہے اور انہیں دوران تعلیم اپنا ہمنوا بنانے کے لیے کیسے کیسے جتن کر چکا ہے لیکن وطن واپسی پر ان کی بیشتر تعداد کا اسلام پر ایمان اور رسالت پر اعتقاد متذبذب ہونا تو کجا اور پختہ ہو گیا۔ پھر بھلا ستر ہزار ڈالر کے لالچ میں مسلم عوام اپنے ایمان کا سودا کیسے کر سکتے ہیں؟ کوئی مسلمان امریکہ کی بات کیسے باور کر سکتا ہے کہ وہ (امریکہ) اسلام مخالف فلم کو اشتعال انگیز اور مذموم تو سمجھتا ہے لیکن اس کی تشہیر، نمائش اور اشاعت کو نہیں روک سکتا، کیونکہ اس کے بقول یہ امریکی شہریوں کا آئینی حق ہے۔ اس ضمن میں ہمیں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون کا موقف معقول لگا۔ انہوں نے نیویارک میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اس گستاخانہ فلم کو غیر مہذب اور شرمناک قرار دیا اور کہا کہ تضحیک کے لیے آزادیٔ اظہار کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔

اس بارے میں جناب بان کی مون، اوباما اور ہیلری کلنٹن کی آرا مختلف اور متضاد ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے نزدیک اس اشتعال انگیز فلم کو آزادیٔ اظہار خیال کے قانون کے تحت تحفظ فراہم نہیں کیا جا سکتا جبکہ صدر اوباما اور ہیلری کلنٹن ایسی نفرت انگیز فلم کی نمائش کو قانونا جائز سمجھتے ہیں، جبکہ ری پبلکن پارٹی کا صدارتی امیدوار تضحیک وتوہین رسالت پر مبنی فلم کو نہ صرف جائز سمجھتا ہے، بلکہ الٹا اس کے خلاف احتجاج کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ رائے عامہ کے جائزے کے مطابق اوباما اور رومنی کے حامیوں کی تعداد میں تفاوت ہوتا رہتا ہے اور گو فی الوقت اوباما کو اپنے حریف پر برائے نام سبقت حاصل ہے لیکن اسے کوئی واضح برتری حاصل نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ امریکہ کی تقریباً نصف آبادی کا توہین رسالت پر وہی موقف ہے، جو مٹ رومنی کا ہے۔

اگر امریکہ کی پالیسی پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو اس کی اسلام دشمنی اس کے عمل سے

ثابت ہوتی ہے۔ امریکہ کے Joint Forces Staff College میں امریکی فوجی افسروں کو جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، اس میں انہیں یہ سبق دیا جاتا ہے کہ اسلام امریکہ کا دشمن ہے، لہٰذا امریکہ کو مکہ اور مدینہ کو ہیروشیما اور ناگاساکی کی طرح ایٹم بم حملہ کر کے تباہ کر دینا چاہیے۔ (ڈان 11 مئی 2012ء) فروری 2012ء میں امریکی فوجی اعلیٰ کمان کے حکم سے افغانستان میں امریکی اڈے بگرام پر امریکی فوجیوں نے قرآن کریم کے پانچ سو نسخے نذر آتش کر دیے، جبکہ ان کے ساتھی افغان فوجی انہیں ایسا کرنے سے منع کر رہے تھے۔ (ڈان 28 فروری 2012ء) ابوغریب اور بگرام کے عقوبت خانوں میں امریکی فوجی مسلمان قیدیوں پر جسمانی، جنسی اور ذہنی تشدد کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائی جبکہ قرآن کریم کے نسخوں کو پاؤں تلے روند کر انہیں پرزہ پرزہ کرنے کے بعد طہارت خانے (Toilets) میں (نعوذ باللہ) بہا دیتے ہیں۔

شاتم رسول، سلمان رشدی کو ملکہ برطانیہ نے سر کا خطاب دیا جبکہ امریکی صدر نے اس سے ملاقات کی۔ اس سال بھارت نے مسلمانوں کے شدید احتجاج کی پروا نہ کرتے ہوئے اس ملعون کو جے پور کی عالمی ادبی اور ثقافتی کانفرنس میں مدعو کیا۔ گستاخانہ قلم کے خلاف عالم اسلام میں احتجاج کے دوران بی بی سی کی اردو نشریات نے اس موضوع پر سلمان رشدی کا زہریلا تبصرہ نشر کیا تھا۔ کیا یہ مسلم امہ کے زخموں پر نمک پاشی نہیں ہے؟ اسی طرح توہین آمیز خاکوں اور کارٹونوں کی ڈنمارک کے اخبار میں اشاعت اور بعد ازاں اشاعت مکرر کا مقصد مسلم امہ کی غیرت آزمانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کیا یہ آرٹ اور ادب کا شاہکار تھے، جو ان کی بار بار اشاعت کی جاتی ہے؟ اس کے سد باب کا صرف ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ممالک کی تنظیم کا ہر رکن ملک توہین رسالت کو قانوناً گردن زدنی قرار دے دے خواہ وہ دنیا کے کسی خطے میں سرزد ہو۔

سجاد وسیم راجہ

آزادی اظہارِ رائے کے نام پر!

''اس حوالے سے شدید تشویش پائی جاتی ہے کہ اسلام کو اکثر و بیشتر غلط انداز سے حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں اور دہشت گردی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ مسلم اقلیتی برادری کے لیے جو قوانین بنائے اور انتظامی اقدامات کیے جاتے ہیں، ان کی مدد سے انہیں نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان کے ساتھ برتنے والے امتیازی سلوک کو قانونی شکل دی جاتی ہے۔''

یہ اقتباس اقوام متحدہ کی ہیومن رائٹس کونسل کی جانب سے منظور کی جانے والی اس قرارداد کا ہے جس کا عنوان ہے: ''مذاہب کی توہین کے خلاف جنگ'' اور یہ 2010ء میں منظور کی گئی۔ اس قرارداد میں پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کی بھی مذمت کی گئی کہ انہی کی مدد سے مذہب کے حوالے سے متشددانہ، متعصبانہ اور امتیازی رویے کو پھیلایا جاتا ہے جس سے مخاصمت پھیلتی ہے۔ اس قرارداد میں مزید یہ بھی ہے کہ مذہبی منافرت پھیلانا قابل مذمت فعل ہے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی حقوق انسانی کے قوانین کی شق 19 اور 20 کا بھی حوالہ دیا گیا اور کہا گیا کہ ہر ایک کو آزادی اظہار رائے حاصل ہے، لیکن یہ کام ذمہ داری اور خصوصی احتیاط سے کرنا اور دوسروں کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اسی طرح قومی سلامتی، امن عامہ اور اخلاقیات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے احتجاج اور مظاہرے میں وہی مطالبات دُہرائے جا رہے ہیں جو اس قرارداد میں بیان کیے گئے ہیں۔

اسلام کو کیا حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں اور دہشت گردی سے منسوب نہیں کیا جا رہا؟ کیا مسلم اقلیت کی نگرانی کے لیے بنائے گئے قوانین ان کے خلاف استعمال نہیں کیے جا رہے؟ کیا ان کے ساتھ برتا جانے والا امتیازی سلوک قوانین کی آڑ میں نہیں کیا جا رہا؟ کیا پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا اسلام کے خلاف متشددانہ اور متعصبانہ رویے کو پھیلا کر مذہبی

مخاصمت کو ہوا دینے کے مرتکب نہیں بن رہے؟ کیا مذہبی منافرت کو ہوا دینے کے لیے مسالک کے اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا جاتا؟ توہین اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور توہین قرآن کی مہم کا آزادی اظہار کے نام پر دفاع نہیں کیا جا رہا؟ کیا آزادی اظہار میں اس ذمہ داری اور خصوصی احتیاط کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے جو اس قرارداد میں مطلوب ہے؟ کیا اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ، قرآن اور مسلمانوں کی عزت کا خیال رکھا گیا؟ کیا قومی سلامتی، امن عامہ اور اخلاقیات کا خیال رکھا گیا جس کا یہ قرارداد تقاضا کر رہی ہے؟

ان تمام سوالات کا جائزہ لیں تو معمولی سا شعور رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ اسی وجہ سے اس وقت دنیا کی ایک تہائی آبادی کے حامل مسلمان پوری دنیا میں سراپا احتجاج ہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں مسلمانوں کے حوالے سے ردی کے کاغذ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ صہیونیوں اور صلیبیوں کے حق میں منظور کی جانے والی ہر قرارداد کا ایک ایک لفظ قابل عمل ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اس میں مسلمانوں اور مسلم ریاستوں کا حوالہ ہو۔ اقوام متحدہ کی قرارداد قانون کا درجہ حاصل کر لیتی ہے جس کی خلاف ورزی قانونی جرم بنا کر دنیا کو باور کرایا جاتا ہے کہ ہم انصاف اور قانون کی بالادستی کے لیے سرگرم ہیں۔ قانون کی بالادستی کا عمل صرف مسلمانوں کے خلاف ہی بروئے کار آتا ہے۔ اس کے برعکس اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل ان کے لیے ضروری ہے نہ وہ خود کو اس کا پابند سمجھتے ہیں۔

2010ء کی اس قرارداد کے بعد مارچ 2011ء میں ایک اور قرارداد بھی منظور کی گئی جس کا عنوان ہے: ''عدم برداشت، مذہب کے متعلق دقیانوسیت، مذہب یا عقائد کی بنیاد پر تشدد کے لیے اکسانے اور توہین کے خلاف جنگ'' اس قرارداد میں بھی مذاہب کو بدنام کرنے، انتہا پسند تنظیموں اور رویوں، میڈیا کے رول اور ایسے پروگراموں اور اقدامات کے متعلق شدید تحفظات کا اظہار کیا گیا جو مذاہب یا عقائد کے خلاف ہوں۔ اس قرارداد کے عنوان کو بھی دیکھ لیا جائے اور اس کے مندرجات کا جو خلاصہ سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے، اس کو دیکھ لیں تو جو ''تحفظات'' ظاہر کیے گئے ہیں، کیا وہ درست نہیں؟ لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کی بات آتی ہے تو اسلام کو شاید مذہب تسلیم ہی نہیں کیا جاتا، اسی لیے اس کے خلاف اس رویے کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے عقائد کا لحاظ کرنے کے بجائے ان کا مذاق اُڑانا اپنا حق گردانا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت پوری دنیا

میں ''آزادیٔ اظہار'' کے نام پر ''آزادیٔ آزار'' کا جو بازار گرم ہے، اس کو فرو کرنے کے لیے وہ اپنی ان دونوں قراردادوں کو روبہ عمل کیوں نہیں لا رہا؟ بیمار اور غلیظ ذہنیت کے حامل لوگوں کے ''اہانت'' پر مبنی افعال سے یہ قراردادیں لاتعلق کیوں نظر آتی ہیں؟ مغربی دنیا اور ان کے سرخیل امریکہ سے بھی یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اقوام متحدہ کی ان قراردادوں سے کیوں صرف نظر کیا جارہا ہے؟ کسی مسلمان کی زبان سے مذمتی الفاظ نکل جائیں تو انہیں بڑھا چڑھا کر الزامات کی شکل دے دی جاتی ہے اور مغرب اس کے خلاف اقدامات کرنے کے لیے مسلم حکومتوں پر دباؤ ڈالنا اور ان کی حوالگی پر مطالبے کرتا ہے، مگر جب ان کے ہاں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی توہین کا سلسلہ ہوتا ہے، تو وہ نہ صرف ان کے خلاف اقدامات سے گریز کرتا ہے، بلکہ ان کے دفاع اور پشتیبانی کی جاتی ہے۔

اس وقت دنیا میں جو انتشار، بدامنی پائی جاتی ہے، اس کا بڑا سبب یہی دہرا معیار ہے۔ ''میٹھا میٹھا ہڑپ اور کڑوا کڑوا تھو''! کا غیر منصفانہ عمل جب تک جاری موجود نہ بھی ہوتا تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 24 اکتوبر 2005ء کو ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں جنرل اسمبلی نے ریاستوں کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہر ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ باہمی عزت و احترام کو فروغ دے اور بلاتفریق مذاہب ثقافتوں کا احترام کرے، کیونکہ مذاہب کی توہین نہ صرف انسانی وقار کی توہین ہے بلکہ اس کے نتیجے میں سماجی تانا بانا بکھر سکتا ہے اور حقوق انسانی کی خلاف ورزیاں ہوسکتی ہیں۔ کیا مغربی ریاستیں اس قرارداد کے تحت باہمی عزت و احترام کو فروغ دے رہی ہیں؟ کیا مسلم ثقافت کا احترام کیا جارہا ہے؟ کیا مذہب اسلام کی توہین کرکے انسانی وقار کی توہین کی مرتکب نہیں ہو رہی؟ کیا ان کے منافقانہ طرز عمل سے مسلم دنیا کا سماجی تانا بانا بکھرا ہوا دکھائی نہیں دے رہا؟ کیا انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا سلسلہ دراز سے دراز نہیں ہوتا چلا جارہا؟ کیا اقوام متحدہ کا چارٹر صرف مسلمانوں کے لیے ہے؟ کیا دنیا میں مسلم اقلیتوں کے کوئی حقوق نہیں؟ صرف عیسائی، یہودی، مجوسی، ہندو، قادیانی اور بدھ ہی ایسی اقلیتیں ہیں جن کے ساتھ دنیا میں امتیاز برتا جارہا ہے؟ معمولی سے واقعے پر پورا مغرب ہاہاکار مچادیتا ہے مگر مسلمانوں کے خلاف کیے جانے والے اقدامات پر غیر تو غیر اپنے بھی دریدہ ذہنی کے ایسے مظاہرے کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ!

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے صدر نے کہا کہ

دنیا رسالت کی توہین کی قبیح حرکت کو قابل تعزیر جرم قرار دے، مگر اسی اقوام متحدہ میں امریکی صدر اوباما نے کہا: ''یہ قابل مذمت ضرور ہے مگر وہ اظہار رائے کی آزادی کے قانون کے باعث اسے بند نہیں کر سکتے۔ البتہ امریکہ کے قومی سلامتی کے مشیر کے بقول امریکی گستاخانہ فلم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن اسلامی ممالک کو چاہیے وہ احتجاج ختم کرائیں اور امریکی سفارت خانوں کا تحفظ یقینی بنائیں۔'' اسے کہتے ہیں اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ امریکہ اور مغربی ممالک اقوام متحدہ کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جب اقوام متحدہ اپنے چارٹر اعلامیوں اور قراردادوں پر عمل نہیں کرا سکتا تو پھر اس کے قیام کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ مسلم ممالک کو اجتماعی طور پر اس کی رکنیت سے الگ ہو جانا چاہیے تاکہ اس نام نہاد ادارے پر امریکہ اور مغرب اپنے غیر قانونی اقدام کو جواز مہیا نہ کر سکیں۔ اس اقدام سے ہی اقوام متحدہ کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ توہین رسالتؐ کے خلاف قانون سازی کرے۔

انصار عباسی

I Simply give it a damn

ایک انگریزی اخبار کے مطابق امریکی حکومت جائزہ لے رہی ہے کہ پاکستان کے کچھ سیاسی و مذہبی رہنماؤں، صحافیوں اور کئی علمائے کرام پر امریکن ویزے کی پابندی لگائی جائے کیونکہ ان حضرات کا سلمان تاثیر کے قتل پر ردعمل امریکا کی خواہش کے مطابق نہ تھا۔ گزشتہ ہفتے چھپنے والی اس خبر کو پڑھ کر ایک صحافی دوست نے مجھے ایک موبائل پیغام کے ذریعے مشورہ دیا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو ہمیں یہ واضح کرنا چاہیے کہ ہم نے سلمان تاثیر کے قتل کی حمایت نہیں کی اور نہ ہی اس اقدام کو سراہا۔ میں نے فوری طور پر اپنے صحافی دوست کو جواب لکھا جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ (As for as I am concerned I simply give it a damn.)

اس خبر کی ساکھ کے حوالے سے سوال اٹھائے جا رہے ہیں اور یہ بھی اشارے مل رہے ہیں کہ یہ خبر شاید اس اخبار یا حکومت کی خواہش ہے مگر میں ذاتی طور پر ایک لمحہ کے لیے یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں امریکیوں کو وضاحت پیش کروں گا کہ میں نے سلمان تاثیر کے قتل پر کیا کہا اور جو کہا اس کا کیا مقصد ہے۔ مجھے امریکی ویزے سے کوئی سروکار نہیں اور آج بھی میں اپنے ایک ایک لفظ پر قائم ہوں جو میں نے سلمان تاثیر کے قتل کے بعد کہا اور لکھا۔ میں اس عمل کو اپنے لیے بے عزتی اور بے غیرتی کے مترادف سمجھتا ہوں کہ میں کسی دوسرے ملک اور خاص طور پر امریکی ویزا کے حصول کے لیے اپنی رائے پر وضاحتیں دیتا پھروں اور خاص طور پر ایک ایسے مسئلہ پر جو محض ایک قتل کا واقعہ نہیں بلکہ ایک دینی اور مذہبی معاملہ بن کر ابھر چکا ہے اور جس کو امریکا سمیت مغرب اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تاکہ پاکستان میں ناموس رسالت ﷺ کے قانون میں مغربی طاقتوں کی مرضی و منشا کے مطابق ترامیم کی جا سکیں۔ میں امریکی و مغربی ممالک کے ویزوں، ڈالروں اور ان کی طرف سے دیے جانے والے ایوارڈز کے بدلے اپنے ایمان کا سودا نہیں کر سکتا۔ میری اپنے اللہ سے ہمیشہ یہ دعا رہی ہے کہ وہ مجھے اسلام کی زندگی اور ایمان کی موت نصیب کرے اور یقیناً اسلام کی زندگی

وہ نہیں جو ہمیں امریکہ سکھانا چاہتا ہے۔ ہر مسلمان ہر نماز کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم پر چلنے کی دعا کرتا ہے نہ کہ ان کے رستے پر جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا (یہودی) اور جو سیدھے رستے سے بھٹک گئے (نصاریٰ)۔ ہم مسلمانوں میں بہت سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ مغرب و امریکا جو کر رہے ہیں، وہ ہماری بہتری اور مسلمانوں سے محبت کے لیے ہے مگر میں اپنے رب کی اس بات کو کیسے جھٹلا سکتا ہوں کہ یہود و نصاریٰ اور کافر مسلمانوں کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے اور یہ کہ ان اسلام دشمنوں کی زبان میں جو بغض اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو ماننے والوں کے خلاف ہے وہ اس سے کہیں کم ہے جو ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے۔ ہم مسلمانوں کو تو اس وقت ان حالات کا سامنا ہے جس کا اشارہ میرے پیارے نبی ﷺ نے چودہ سو سال قبل دے دیا تھا۔ حدیث میں آتا ہے آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ میری امت پر ایک وقت آنے والا ہے جب غیر مسلم باقی غیر مسلم اقوام کو اس طرح بلائیں گے جس طرح لوگ ایک دوسرے کو دستر خوان پر کھانے کے لیے بلاتے ہیں اور مسلمانوں کو چن چن کر کھائیں گے۔ صحابہؓ حیران ہو کر عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم تعداد میں اتنے تھوڑے ہو جائیں گے، فرمایا نہیں تم سمندر کی جھاگ کی طرح ہو گے لیکن تمہارے اندر "وھن" کی بیماری آ جائے گی۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ "وھن" کیا ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا، دنیا سے محبت اور موت کا ڈر۔

آج مسلمانوں کو چن چن کر مارا جا رہا ہے اور مارنے والوں کی سربراہی امریکا کر رہا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ عراق اور افغانستان میں امریکا نے 20 لاکھ سے زیادہ معصوم مسلمان بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور دوسرے معصوموں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے اور اب اس قتل و غارت کا شکار پاکستان کے قبائلی علاقہ میں رہنے والے ہمارے مسلمان بھائی اور بچے ہیں۔ کیا کوئی مسلمان طاغوتی قوتوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے دین کو بیچنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ کیا ایک مسلمان صحافی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ امریکا ریاستی دہشتگردی کر رہا ہے اور اپنے مذموم مقاصد کے لیے مسلمانوں کو مار رہا ہے۔ میں اپنے اللہ کا حشر کے روز کیسے سامنا کر سکتا ہوں اگر میں امریکا کی خوشنودی کے لیے عراق و افغانستان میں جہاد کرنے والوں کو دہشتگرد کہنا شروع کر دوں۔ میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی شفاعت کا کیسے حق دار ہو سکتا ہوں اگر میں رسول پاک ﷺ کی حرمت کے سوال پر قرآن و حدیث کے ان واضح اصولوں سے نظریں چرا لوں جن کے مطابق حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی سزا موت (قتل) ہے۔ میں اپنی دنیا

بنانے کے لیے اور امریکی ویزا اور گرین کارڈ کے حصول کی خاطر سلمان تاثیر کے قتل کو اسلام دشمن قوتوں کی خواہش پر قانون ناموس رسالت ﷺ کو تبدیل کرنے کے لیے کیسے استعمال کر سکتا ہوں۔ سلمان تاثیر کے قتل کا مسئلہ اس وقت عدالت کے سامنے ہے مگر کون نہیں جانتا کہ پوپ اور یورپی یونین اور امریکا سب اس قتل کو تبدیلیاں لانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اس مسئلہ سے قطع نظر اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کبھی امریکا جانے کی خواہش ہوئی اور نہ ہی زندگی میں کسی ایمبیسی میں قطار میں کھڑے ہو کر ویزا لینے کی ضرورت محسوس ہوئی، اگر کسی نے عزت کے ساتھ بلایا تو اگر مناسب سمجھا تو چلے گئے ورنہ انکار کر دیا۔ 2008ء میں ایک امریکی ادارے نے مجھے ایک ماہ کے لیے امریکا کے دورہ کی دعوت بھیجی۔ ویزہ اور ٹکٹ بھی دے دیا مگر میں نے امریکا کے دورہ سے انکار کر دیا کیونکہ ان دنوں امریکی ڈرون حملوں کے علاوہ امریکی کمانڈوز نے پاکستان کے قبائلی علاقہ میں پہلا گراؤنڈ آپریشن کیا اور معصوم بچوں اور خواتین کو شہید کر دیا۔ میں نے احتجاجاً امریکا جانے سے انکار کر دیا اور لکھ کر اپنے امریکی میزبانوں کو یہ بھیجا کہ آپ کا اصل چہرہ بے حس قاتلوں والا ہے۔ اس سے قبل 2003ء میں مجھے امریکا جانے کا موقع ملا۔ جس روز میں امریکا پہنچا مجھے ایئر پورٹ پر تقریباً دو ڈھائی گھنٹے روکا گیا اور مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی۔ دوسرے روز جب میں امریکا آمد پر اپنی کہانی لکھ کر اپنے اخبار ”دی نیوز“ کو بھجوانے لگا تو مجھے امریکا کے محکمہ خارجہ کی ایک میزبان خاتون نے کہا کہ میں ایسا کچھ نہیں لکھ سکتا کیونکہ اس سے ان کے پورے پروگرام پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس پر میں نے محکمہ خارجہ کی میزبان خاتون کو کہا کہ امریکی آئین کی آزادی رائے سے متعلق پہلی ترمیم (First Amendment) پر فخر کرنے والا امریکا ایک پاکستانی صحافی کو اپنی روداد لکھنے سے کیسے روک سکتا ہے؟ میں نے اس خاتون کو صاف صاف انداز میں کہہ دیا کہ میں ہر حالت میں اپنے اخبار کے لیے لکھوں گا، چاہے مجھے اس پروگرام سے ڈراپ کر دیا جائے اور واپس پاکستان جانا پڑے۔ اس پر اس خاتون کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور میں پورے دورے کے دوران امریکا کے Double Standards اور مسلمانوں سے امتیازی سلوک پر لکھتا رہا۔ ہم صحافیوں کے پاس بندوق ہے اور نہ ایٹم بم۔ ہم تو صرف اپنے مشاہدے، معلومات اور تجزیات کی بنیاد پر لکھتے ہیں اور بولتے ہیں۔ کوئی اگر یہ کہے کہ ہم وہ سچ بولیں جو امریکا بہادر کی مرضی ومنشا کے مطابق ہو تو اللہ ایسا دن کم از کم میری زندگی میں نہ لائے۔

۞......۞......۞

ڈاکٹر مجاہد منصوری

آزادیٔ صحافت کی آڑ میں غیر ذمہ داری کی انتہا

The Role of Media in مخاصمت کے خاتمے میں میڈیا کا کردار"
Conflict Resolution" آج کے جدید دور میں ذرائع ابلاغ پر ہونے والی تحقیق کا ایک نیا ایوینیو ہے۔ انسانی تہذیب کے ارتقائی عمل میں میڈیا کے اس مثبت کردار کو عالمی سیاستدان، سفارتکار، دانشور، اور خود ماہرین ابلاغیات بے پناہ اہمیت دے رہے ہیں۔ ہوا یوں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد 45 سال سرد جنگ، میڈیا کو بطور نرم ہتھیار (Soft Weapon) استعمال کر کے لڑی گئی جو تباہ کن ہتھیاروں سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ میڈیا کے اس استعمال نے عالمی امن کی فضا میں بھی بڑی طاقتوں کے غلبے اور دھاک بٹھانے کی صورت نکال لی۔ سرد جنگ میں ہونے والے درجنوں واقعات (Cases) پر ہونے والی تحقیق ثابت کرتی ہے کہ میڈیا مخاصمت اور تصادم کو پھیلانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ سرد جنگ کے اختتامی عشرے پر میڈیا کے ذمہ دارانہ کردار کو بڑھانے پر عالمی ماہرین ابلاغیات نے (Conflict Resolution) میں میڈیا کے کردار کا جائزہ لینا شروع کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ "جس طرح میڈیا کے ذریعے تصادم کی فضا کو برقرار رکھ کر سرد جنگ جاری رکھی اور بڑھائی جا سکتی ہے، اسی طرح میڈیا اقوام ممالک کے درمیان تصادم اور مخاصمت کو ختم کرانے میں بہت مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔" اب تک دنیا میں کئی ایسے کیس سٹڈیز ہیں جن سے میڈیا کا یہ مثبت کردار واضح ہوتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال خود ہمارے خطے میں قائم ہو رہی ہے۔ نصف صدی تصادم اور شدید مخاصمت کی تاریخ رکھنے والے پاکستان اور بھارت میں جو پیس پراسیس جاری ہے اور جس میں عوام کے مختلف طبقات شامل ہو رہے ہیں، مفاہمت کی اس فضا کو تیار کرنے میں دونوں ملکوں خصوصاً پاکستانی میڈیا نے بہت اہم اور ذمہ دارانہ کردار ادا کیا ہے۔ میڈیا کے مثبت کردار سے متعلق اس نئی اپروچ کو سیکنڈے نیوین ممالک نے بہت فروغ

دیا۔سویڈن اور ناروے کی یونیورسٹیوں Conflict Resolution میں میڈیا کے کردار پر بھاری رقوم سے تحقیقی پراجیکٹ شروع کیے گئے۔نتیجتاً ماہرین ابلاغیات میں ایک مکتبہ فکر ایسا پیدا ہوگیا جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ میڈیا صرف سرد جنگ کا ہتھیار ہی نہیں بلکہ یہ دو متصادم ممالک میں پرامن فضا قائم کرا کے تنازعات ختم کرانے کا مؤثر انسٹرومنٹ بھی ہے۔ چنانچہ عالمی استحکام کے حامی ماہرین ابلاغیات اور دنیا میں تنازعات کو ختم کرنے پر حقیقی یقین رکھنے والے سفارتی حلقوں نے میڈیا کے اس کردار پر بہت زور دینا شروع کردیا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان گذشتہ چند سالوں میں بار بار پیدا ہونے والی شدید مخاصمت کو ختم کرنے کے لیے جب بھی سفارتی حلقوں اور سیاسی دانشوروں میں مذاکرات ہوئے، مخاصمت میں کمی اور مطلوبہ فضا پیدا کرنے میں میڈیا کے تعاون کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔افسوسناک اور تشویش ناک امر یہ ہے کہ ایک طرف دنیا میں امن عالم کے قیام کے لیے میڈیا سے کام لینے اور میڈیا کے اس نئے کردار کو فروغ دینے کی کوششیں ہو رہی تھیں تو دوسری جانب مغربی میڈیا سرد جنگ میں میڈیا کے روایتی کردار (مخاصمت پیدا کرنے اور اسے بڑھانے) کو برقرار رکھنے کے لیے سرگرم ہوگیا تھا۔ چنانچہ سرد جنگ کے خاتمے سے قبل ہی ''مسلم فنڈامینٹلزم'' مغرب میں ایک نئے ہوّے کے طور پر بلڈ کردیا گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک 9/11 کا واقعہ ہوا تھا نہ کینیا اور تنزانیہ کے امریکی سفارتخانوں میں دھماکہ، نہ ہی 7/7 ہوا تھا اور نہ ہی بالی میں دھماکے نہ ہی فلسطین میں خودکش حملوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا بلکہ حماس نے پرامن سیاسی جدوجہد کے لیے انتفاضہ کی تحریک شروع کی تھی جس کی تقلید مقبوضہ کشمیر میں بھی ہوئی لیکن ہر جگہ پاپولر اپ رائزنگ کو مسلح جدوجہد میں تبدیل کرنے پر مجبور کردیا گیا۔

اس پس منظر کے ساتھ سوویت یونین کا خاتمہ ہوا تھا۔ نیٹو کے سیکرٹری جنرل سالوا (یورپی یونین کے موجودہ وزیر خارجہ) نے ایک ٹی وی انٹرویو میں نیٹو کے قیام کو جاری رکھنے کا جواز یہی بتایا کہ ''اب نیٹو مسلم فنڈامینٹلزم کے خطرے سے نمٹنے کے لیے قائم رہے گا''۔ اگلے سال 1992ء میں امریکی پروفیسر ہنٹنگ ٹن کا شہرہ آفاق تحقیقی مقالہ ''تہذیبوں کا تصادم'' (Clash of Civilizations) بین الاقوامی امور کے مشہور تحقیقی جریدے فارن افیئرز میں شائع ہوا تو مغربی میڈیا نے اس کی خوب تشہیر کی اور اسے ایک عالمی ڈیبیٹ کا موضوع بنا ڈالا۔ زبردستی شروع کی گئی اس نئی سرد جنگ کے آغاز میں مغربی میڈیا کا کردار

انتہائی متنازع رہا خصوصاً مسلم دنیا میں تو یہ اپنا اعتبار کھو بیٹھا۔ مغربی میڈیا خصوصاً امریکہ کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے کی انتہائی شکل عراق پر امریکی، برطانوی حملے سے قبل اس پروپیگنڈے کی شکل میں سامنے آئی جس میں امریکی میڈیا (بحیثیت مجموعی) نے عراق میں تباہ کن ہتھیاروں کے ذخائر کا غوغا کرنے میں امریکی انتظامیہ کی بھرپور معاونت کی۔ عراق پر اس حملے کے خلاف عالمی رائے عامہ کے شدید دباؤ کے باوجود مجموعی طور پر امریکی میڈیا اپنی حکومت کے من مانے اور سامراجی نوعیت کے اقدامات کا ایسا ''وفاشعار'' نکلا کہ اس پر پروفیشنلزم کا جنازہ نکل گیا۔ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی پر دسترس کے علاوہ بھی پروفیشنلزم اس کی عالمی ابلاغی طاقت کے پوٹینشل کا غالب حصہ تھا۔ آج مغربی میڈیا مشرق پر اپنا اعتماد کھو بیٹھا ہے۔ جب تک مشرق کا اپنا میڈیا زور نہیں پکڑتا، اس کا غلبہ تو رہے گا لیکن اس کی تیزی سے اعتبار کھونے کے دوررس نتائج کو روکا نہیں جاسکے گا۔

اس پس منظر میں ڈنمارک کے اخبار گستاخی رسول ﷺ کے زمرے میں آنے والے کارٹونوں کی اشاعت اور مسلمانوں میں اس کے شدید ردعمل کے باوجود کئی یورپی ممالک کے اخبارات میں ان کی اشاعت مکرر نے یہ واضح شبہات پیدا کر دیے ہیں کہ دنیا کو تصادم سے دوچار رکھنے اور تہذیبی تصادم کے نظریے کو فروغ دینے والی ابلاغی قوتیں منظم ہو کر سرگرم ہو گئی ہیں۔ ان کا بڑا (اور موجودہ حالات میں شاید واحد) ہدف اسلامی دنیا ہے۔ اس امر کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ شر کی یہ عالمی قوتیں، مسلم حکومتوں، میڈیا، دانشوروں اور امہ کی بھاری اکثریت کی اس یقین دہانی پر یقین نہیں کر رہی کہ اسلام سلامتی و امن کا عالمی پیغام ہے یا کہ وہ ہر حال میں مسلمانوں سے الجھ کر کوئی بڑا تصادم بپا کرنے پر تلی ہوئی ہیں؟ ڈینش اخبار نے جس طرح نبی کریم ﷺ کے کارٹون شائع کرنے کی گستاخی کے بعد آزادئ اظہار کی آڑ میں اپنے گھناؤنے اقدام کے باجواز ہونے کی پوزیشن لی ہے اور جس طرح آزادئ صحافت کے نام پر یکے بعد دیگرے کئی یورپی اخبارات نے انہیں ری پروڈیوس کیا ہے اس سے تو واضح ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان اور متعلقہ یورپی ممالک کے درمیان تصادم پیدا کرنے کی کوئی بہت منظم سازش ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈینش اخبار اور اس سے اظہار یکجہتی کرنے والے کئی یورپی اخبارات نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو مشتعل کر کے آخر کون سا مقصد حاصل کیا ہے؟ یہ اتنے سادہ نہیں کہ ''آزادی کے اس مفہوم کو نہ سمجھتے ہوں کہ جہاں ان کی آزادی سے کوئی دوسرا متاثر ہونے لگے، وہاں ان کی آزادی کی حد ختم ہو جاتی ہے۔'' جو حقائق سامنے آئے ہیں اور بعض

مغربی اخبارات مسلم دنیا کے شدید ردعمل کے باوجود انتہا درجے کو جو غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کر رہے ہیں۔ اس سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اخبارات، ان کا دفاع کرنے والی حکومتیں اور تنظیمیں غیر اعلانیہ طور پر مسلمانوں میں اشتعال پیدا کرنے پر متفق ہیں۔ اگر ان کے اس غیر مہذب اقدام کا دفاع اظہار رائے کی آزادی کے نعرے سے ہی کیا گیا تو پھر دنیائے اسلام میں ملا اور مدرسے کو بھی اشتعال پیدا کرنے سے نہیں روکا جاسکے گا۔ مغربی الزامات کے مطابق وہ جو ''خودکش مجاہد'' تیار کرتے ہیں، اس کے پس پردہ وہ ملا اور مدرسے کی ابلاغی صلاحیت ہی ہے۔ اگر ان کے جواز کے مطابق مغربی پریس کو مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی آزادی ہونی چاہیے تو مغرب کو اپنا یہ مطالبہ ختم کر دینا چاہیے کہ مسلم ممالک کی حکومتیں اپنے ملکوں میں حصول آزادی اور بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے اپنے شہریوں کو مشتعل کرنے والے ابلاغی مراکز ختم کردیں۔ یہ صورتحال یقیناً دنیا کو ''تہذیبوں کے تصادم'' کے نظریے کو ایک طویل اور ہولناک شکل میں ڈھال دے گی۔ جس کی ذمہ داری مغرب کے اس اشتعال انگیز میڈیا پر عائد ہوگی جو آزادی اور ذمہ داری کے (ہر حال میں مطلوب) توازن کو بگاڑنے پر تل گیا ہے۔ سو مسلم ممالک کی حکومتوں، سیاستدانوں، میڈیا اور دانشوروں کو اب یہ عالمی ڈیبیٹ شروع کرنی چاہیے کہ کیا ''میڈیا کو اتنی آزادی دینی چاہیے کہ مخالف تہذیبوں سے ٹکرائے یا سوسائٹی میں ان سے ٹکرانے کا ماحول پیدا کرے''۔ اگر آزادئ صحافت کی آڑ میں اشتعال پیدا کرنے اور اس کے دفاع کا سلسلہ جاری رہا تو ایک ایسی ''انڈر ورلڈ'' وجود میں آجائے گی جو سب سے زیادہ مغرب کے لیے پریشان کن ہوگی۔ یہ پیدا کیا گیا تہذیبی تصادم جب بھی اپنے ہولناک نتائج کے ساتھ ختم ہوگا تو یہ ثابت کرنا مشکل نہ ہوگا کہ 21 ویں صدی کے اس سیاہ باب کے لکھے جانے کی ایک ہی وجہ ہوگی کہ مغرب کی ابلاغی قوتوں کے ایک موثر لیکن انتہائی غیر ذمہ دار حصے نے مغرب اور مسلمانوں میں آزادی کے مفہوم کو متنازعہ بنا دیا اور اپنی تشریح کے مطابق مادر پدر آزادی کا استعمال کیا۔ بہتر یہ ہے کہ مغرب کے محقق اتنی گھناؤنی سازش کے ماسٹر مائنڈ کو خود ہی تلاش کرکے اسے کیفر کردار تک پہنچائیں اور سوچیں کہ Conflict Resolution میں میڈیا کے مثبت کردار کے پروموٹر سیکنڈے نیوین ممالک آج ایک ارب 25 کروڑ مسلمانوں میں شرانگیز ممالک کیوں سمجھے جارہے ہیں۔

آصف محمود ایڈووکیٹ

Holocaust اور مغرب کی آزادیٔ صحافت

مغرب کی ''آزادیٔ اظہار'' کا اصرار ہے کہ اس کے تقدس کی خاطر مسلمان ناموس رسالت ﷺ سے دستبردار ہو جائیں۔ سوال یہ ہے کہ آزادی صحافت کی حقیقت کیا ہے؟ آپ Holocaust کا مطالعہ کیجیے، آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔

Holocaust ایک داستان ہے جسے مقدس آدرش بنا کر سارے یورپ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ اس داستان کا کہنا ہے کہ نازیوں نے قریباً 60 لاکھ یہودیوں کا قتل عام کیا اور انہیں گیس چیمبرز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ یہودیوں کی مظلومیت کی یہ داستان یورپ میں اتنا تقدس رکھتی ہے کہ وہاں قانوناً اس داستان کو زیر بحث لانا یا اس سے اختلاف کرنا منع ہے۔ آسٹریا میں اس کی سزا سات سال ہے۔ فرانس میں Gayssot Law (1990) کے آرٹیکل 24 بی کے مطابق اس جرم کی سزا ایک سال قید یا تین لاکھ فرانک جرمانہ ہے۔ یہی حال دیگر یورپی ممالک کا ہے۔ کہیں ایک سال تو کہیں تین سال، تاہم سارے یورپ میں یہ طے ہے کہ کوئی فرد، کوئی اخبار اور کوئی صحافی اس داستان سے اختلاف نہیں کرے گا اور کوئی دوسرا مؤقف شائع نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس وقت کسی یورپی صحافی کی جرأت نہیں کہ وہ Holocaust کی صحت سے انکار کر سکے یا اس پر کسی بحث کا آغاز کر سکے۔ اس بارے میں یہودیوں نے جو اعلامیہ جاری کیا، یورپ اس پر عمل پیرا ہے۔ اس اعلامیے کے مطابق ہمیں خود سے قطعاً یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے کہ اتنے وسیع پیمانے پر قتل عام فنی طور پر کیسے ممکن ہوا؟ گیس چیمبرز کے وجود کے بارے میں نہ تو کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

گیس چیمبرز میں یہودیوں کے قتل کے بارے میں دو اعتراف جرم سامنے آئے ہیں۔ ایک Hess کا اور دوسرا Sauckel کا۔ Hess نے اپنی سوانح حیات

"آٹو بائیوگرافی آف ہیس" میں لکھا ہے کہ ان سے تشدد کے ذریعے ایسے صفحات پر دستخط کرا لیے گئے جن کے بارے میں انہیں کچھ علم نہ تھا کہ ان پر کیا لکھا ہے۔ اس تشدد کی گواہی Rupert Butler بھی دیتے ہیں۔ جنہوں نے 11 مارچ 1946ء کو Hess کو ایک فارم سے گرفتار کیا۔ Sauckel کا اعتراف جرم بھی تشدد کا شاخسانہ تھا اور فرانس کی قومی اسمبلی کے سابق ڈپٹی سپیکر اور سینیٹر راجہ گارادڈی نے اپنی کتاب The Founding Myths of Israile Foreign Policy کے صفحہ 69 پر Sauckel کا بیان نقل کیا ہے جو اس ٹریبونل کے سامنے دیا کہ ان سے تشدد کے ذریعے ان دیکھی تحریر پر دستخط کرا لیے گئے۔

جس ٹریبونل نے Holocaust پر مہر تصدیق ثبت کی، اس کے سارے جج اتحادی تھے۔ 60 فیصد یہودی تھے اور مترجم کے فرائض دینے والوں کی اکثریت بھی یہودی تھی۔ Nuremberg ٹرائل دنیا کا بدنام زمانہ ٹرائل تھا جس کے بارے میں 26 جولائی 1946ء کو خود امریکی اٹارنی جنرل رابرٹ، ایچ، جیکسن نے کہا تھا کہ یہ اتحادیوں کی جنگ کا تسلسل ہے۔"

آرٹیکل 19 اور آرٹیکل 21 کے تحت اس ٹریبونل نے شہادتیں وصول کر کے یہودیوں کے قتل عام پر مہر تصدیق ثبت کری۔ آرٹیکل 19 کا کہنا تھا کہ ٹریبونل روایتی طریقہ شہادت سے آزاد ہوگا اور جو شہادت اس کا جی چاہے، وہ قبول کرے گا۔ آرٹیکل 21 کا کہنا تھا کہ Public Notoriety ایک مضبوط شہادت تصور کی جائے گی اور اس کے لیے مزید واقعاتی شواہد نہیں مانگے جائیں گے۔ یعنی ہر وہ چیز جو لوگ عمومی طور پر درست سمجھتے ہوں، وہ درست قرار پائے گی۔

چنانچہ اس طرح کی مضحکہ خیز عدالتی کارروائی کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا کہ نازیوں نے گیس چیمبروں میں یہودیوں کا قتل عام کیا۔ چنانچہ کئی مضبوط شواہد کو ٹھکراتے ہوئے طے کر لیا گیا کہ گیس چیمبر تھے اور قتل عام ہوا تھا۔ حالانکہ Wolter Laquer اپنی کتاب Terrible Secret (صفحہ 190) میں لکھتے ہیں کہ ہٹلر نے یہودیوں کے قتل عام کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ یہی اعتراف تل ابیب ڈاکیمنٹیشن سنٹر کے ڈاکٹر Kubvof نے بھی کیا ہے جو Lucky Dawid Owic کی کتاب The War Against Jewes

کے صفحہ 121 پر موجود ہے۔ نازیوں کے خلاف قائم ہونے والے ٹربیونل کے امریکی جج Stephen S. Pinter کا 14 جون 1959ء کو کیتھولک ہفت روزہ Sunday Visitor میں ایک خط شائع ہوا جس میں وہ اعتراف کرتے ہیں:

''میں نے 17 ماہ امریکی ملٹری جج کے طور پر کام کیا ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ وہاں کوئی گیس چیمبر نہ تھا اور میں اس موضوع پر کسی بھی آدمی سے زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔''

معروف برطانوی تاریخ دان David Irving کے مطابق دنیا بھر کے نمایاں قانون دان Nuremberg ٹرائل کی کارروائی پر شرمندہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے امریکی کورٹ کے جسٹس رابرٹ ایچ جیکسن کی ذاتی ڈائری پڑھی تو معلوم ہوا وہ بھی اس پر شرمسار تھے۔ Wennerstrum معروف امریکی جج تھے، وہ Nuremberg والے ٹربیونل کے رکن تھے مگر دلبرداشتہ ہو کر واپس امریکہ چلے گئے اور شکا گو ٹربیونل میں انہوں نے کھل کر لکھا کہ وہاں کیا ظلم ہو رہا ہے۔ Horton Fisk Stone امریکی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ ان کے بارے میں Piller of the Law کے نام سے تھامس مسین نے ایک کتاب لکھی۔ اس کے صفحہ 716 پر لکھا ہے کہ Stone نے بھی اس ٹربیونل کی کارروائی سے احتجاجاً علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت پر مغرب کی سول سوسائٹی نے جہاں اظہار ناپسندیدگی کیا ہے، وہیں اس بات پر اصرار کیا ہے کہ آزادیٔ رائے کا احترام ہونا چاہیے۔ گویا ایک بات کو غلط سمجھنے کے باوجود سول سوسائٹی، آزادی رائے پر کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں اور اسے یہ تصور اتنا عزیز ہے کہ وہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے کے باوجود اس پر نظر ثانی کرنے کو تیار نہیں۔ سوال یہ ہے کہ مغرب کی یہ سول سوسائٹی اس وقت کہاں ہوتی ہے جب کوئی فرد آزادی رائے کا استعمال کرتے ہوئے Holocaust پر کچھ لکھتا ہے اور اسے نشان عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ یہ سول سوسائٹی اس کا تحفظ کیوں نہیں کرتی؟ چند مثالیں حاضر ہیں۔

Henry Reques نے پی ایچ ڈی کا تھیسز Holocaust پر لکھا اور قرار دیا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ انہوں نے اس تھیسز کا کامیابی سے دفاع کیا اور انٹرویو میں ''پاس'' قرار دیے گئے لیکن آزادی صحافت کے علمبردار معاشرے میں کوئی ہاتھ حرکت میں آیا

اور انہیں ڈگری دینے سے محروم کردیا گیا۔ یہ مہذب دنیا کا واحد واقعہ ہے کہ تھیسز لکھ لینے اور اس کا کامیاب دفاع کرلینے کے باوجود کسی کو ڈگری سے محروم کردیا جائے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یورپ کی سول سوسائٹی ایک طوفان کھڑا کردیتی مگر افسوس آزادی کے علمبردار Henry کے لیے گھروں سے باہر نہ نکل سکے۔

Perri Guillame ایک معروف پبلشر تھے۔ ان کے ادارے نے ایک کتاب شائع کی، نام تھا Annales Dhirsorie Revisionniste۔ اس میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا تھا کہ 60 لاکھ یہودیوں کے قتل عام اور گیس چیمبرز کی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ آزادی رائے کے علمبردار معاشرے میں ان کے ادارے پر حملے ہونا شروع ہوگئے۔ انفراسٹرکچر تباہ کردیا گیا۔ یہاں تک کہ حکومت بھی ''آزادی رائے'' کا علم تھام کر میدان میں آ گئی اور ان کے ادارے پر بھاری جرمانے عائد کردیے گئے۔ Perri نے دلبرداشتہ ہوکر یہ شعبہ ہی چھوڑ دیا۔ سول سوسائٹی کے کسی فرد نے حکومت سے یہ نہ کہا کہ Perri کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔ کوئی اس کے لیے سامنے نہ آیا، آزادی رائے کے علمبردار جانے کہاں مدہوش پڑے رہے۔

ڈاکٹر Staglish نے Myth of Auschwitz کے نام سے ایک کتاب لکھ کر ثابت کیا کہ گیس چیمبرز کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان پر تین قاتلانہ حملے ہوئے اور اس کے بعد حکومت حرکت میں آئی اور ان سے ڈاکٹر کا اعزاز واپس لے لیا گیا۔ سول سوسائٹی میں سے کسی نے حکومت سے یہ نہ کہا کہ Staglish کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔

Zendal نے ایک کتاب لکھی، نام تھا Did Six Million Really Die، چنانچہ ٹورنٹو میں ان پر مقدمہ چلا اور اس جرم کی پاداش میں انہیں سزا دی گئی۔ سول سوسائٹی کے کسی سرکردہ ہیومن رائٹس والے یا والی نے Zendal کے حق اظہار رائے کا دفاع نہ کیا۔

Roger Garaudy فرانس کی قومی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر رہے، بعدازاں فرانس کے سینیٹر منتخب ہوئے۔ آپ کا شمار نمایاں سیاستدانوں میں ہوتا تھا۔ آپ کی تحریریں 20 سے زائد ممالک کے اخبارات میں بیک وقت شائع ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ آپ کی تحقیق Holocaust کی جانب متوجہ ہوئی جب آپ نے Holocaust اور گیس چیمبر کی

حقیقت پر انگلی اٹھائی تو یورپ میں آپ کے مضامین کے شائع ہونے پر پابندی عائد ہوگئی۔ ٹی وی چینلوں نے آپ کا موقف نشر کرنے سے انکار کر دیا اور عدالتوں میں آپ پر مقدمات قائم ہو گئے۔ ان کا ادارہ تباہ ہو گیا۔ لیکن سول سوسائٹی میں سے کوئی آگے نہ بڑھا، کسی نے یہ نہ کہا کہ راجر نے اپنا اظہار رائے کا حق استعمال کیا ہے، اسے پریشان نہ کیا جائے۔

یورپ ایسی داستانوں سے بھرا پڑا ہے جہاں Holocaust کے معبد پر اظہار رائے کا بلیدان ڈال دیا گیا لیکن کسی کہانی میں ہم نے یہ نہیں پڑھا کہ کبھی سول سوسائٹی نے کسی ایسے فرد کی اظہار رائے کی آزادی کے لیے بھی آواز اٹھائی ہو جس نے Holocaust پر تحقیق کرنا چاہی ہو۔

یہودیوں کے مارے جانے سے انکار نہیں لیکن 60 لاکھ کی تعداد اور گیس چیمبر بہرحال ایک ایسی داستان ہے جس کا سر ہے نہ پیر۔ اس کہانی کو جس طرح سٹیج پر فلمایا گیا، معروف ججز اس سے اختلاف کرتے ہیں جو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس کی شہادتیں جھوٹی اور خود ساختہ ہیں۔ معروف مؤرخین اس کو ڈراما قرار دیتے ہیں۔ لیکن پورے یورپ کے سینکڑوں اخبارات اور ہزاروں صحافیوں میں سے کسی ایک کی جرأت نہیں کہ وہ اس موضوع پر آزادی رائے سے کام لے سکے۔

کیا ہمیں یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے کہ جو سول سوسائٹی ایک کارٹون کو غلط سمجھنے کے باوجود کارٹونسٹ کی اظہار رائے کی آزادی کے لیے اٹھ کھڑی ہو جاتی ہے۔ Holocaust کے معاملے میں بکری کیوں بن جاتی ہے؟؟؟

ڈاکٹر احسن اختر ناز

توہین آمیز خاکے اور بین الاقوامی صحافتی اخلاقیات

دنیا بھر میں محسن انسانیت ﷺ کی شان اقدس کے خلاف شائع ہونے والے ناپاک خاکوں کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں۔ عشق نبی ﷺ سے سرشار ہر مسلمان مغرب کی اس ہرزہ سرائی اور سازش پر شعلۂ جوالہ بنا ہوا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کی زبان میں وہ کہہ رہا ہے:

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ بطحاؐ کی حرمت پر
خدا شاہد ہے، کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

یہی کٹ مرنے کا جذبہ مسلمانوں سے ان ملکوں کے سفارتخانوں پر حملے کروا رہا ہے اور یہی جذبہ ان ملکوں کی مصنوعات کا اقتصادی بائیکاٹ کرنے پر اکسا رہا ہے۔ اپنے ملک کا نقصان کرنے کی بجائے ان کو نقصان پہنچانے کی ضرورت ہے۔ وہی امریکہ اور مغرب، جو اپنی جمہوری آزادیوں اور نائن الیون کے بعد بالخصوص دوسرے مذاہب کا احترام اور ان سے مکالمے پر زور دے رہے ہیں، وہی اب اپنا اصل چہرہ دنیا کے سامنے لا کر اپنی ہی تعلیمات اور دعووں کی سر عام نفی کر رہے ہیں۔ ایک اخباری اندازے کے مطابق مختلف ممالک کے تقریباً 75 اخبارات میں یہ مذموم مواد شائع ہو چکا ہے اور 200 سے زائد ٹی وی چینلز اسے نیوز فیچر کی صورت میں پیش کر چکے ہیں۔

اس وقت انسانی حقوق کے ان علمبرداروں کو یہ یاد کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ سیاسی حقوق کے بین الاقوامی کنونشن کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ وہ نسلی تعصب کی تمام صورتوں کو ختم کرنے کی بات نہیں کر رہے۔ مذموم کارٹون شائع کر کے مغربی ممالک نے بین الاقوامی قانون کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ آزادی صحافت کے نام پر پوری دنیا کے مسلمانوں کے دل زخمی کیے ہیں۔ اس مسئلے کو عالم اسلام کے ماہرین قانون کو انسانی حقوق کی یورپی عدالت میں اٹھانا چاہیے۔

یہ گستاخانہ خاکے شائع کرنے والے اخبارات کو مسلمانوں کے دینی جذبات مجروح کرنے کی بجائے اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے دوسرے ہتھکنڈے آزمانے چاہئیں نہ کہ پورے عالم اسلام میں نفرتوں کا ایک کہرام برپا کردیا جائے۔ ایسے تخریبی ذہنوں کو دوسروں کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے وہ مشہور واقعہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جہاں سے دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے، وہاں سے ان کی آزادی کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔

مادر پدر آزاد صحافت کا چلن دنیا کے کسی بھی ملک میں برداشت نہیں کیا جاتا۔ صحافت کے ان دریدہ دہنوں کو ان کی اپنی تاریخ یاد کروانے کی ضرورت ہے کہ 1971ء میں میونخ (جرمنی) میں یورپین کمیونٹی کی صحافتی ٹریڈ یونینوں کے چھٹے اجلاس میں صحافیوں کے فرائض اور حقوق کا ڈیکلریشن منظور کیا گیا تھا۔ اس ڈیکلریشن کا مرکزی نکتہ ہی یہ تھا کہ صحافیوں کو آزادی صحافت کا حق استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ہر قدم پر ذمہ داری کا ثبوت بھی دینا ہوگا۔ اس ڈیکلریشن کا بیسواں نکتہ یہی تھا کہ صحافی کسی فرد یا ادارے کے متعلق غیر اخلاقی، توہین آمیز، ناشائستہ مواد شائع کرنے سے مکمل اجتناب کرے گا۔ اس ڈیکلریشن پر دستخط کرنے والے ممالک میں بیلجیم، سائپرس، چیکوسلواکیہ، ڈنمارک، فن لینڈ، فرانس، وفاقی جمہوریہ جرمنی، یونان، ہنگری، آئرلینڈ، اٹلی، نیدر لینڈ، ناروے، پولینڈ، رومانیہ، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ترکی، یوکے، کینیڈا، کیری بین، چلی، کولمبیا، کیوبا، امریکہ، وینزویلا اور آسٹریلیا وغیرہ شامل تھے۔

آزادئ صحافت کے نام پر عالم اسلام کے دلوں کو شدید ٹھیس پہنچانے والے یہ کیوں بھول گئے کہ وہ عالمی ادارے جن پر ہمیشہ ان کا قبضہ رہا ہے، انہی کے قائم کردہ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو UNESCO کے تحت صحافیوں کی بین الاقوامی تنظیم نے نومبر 1974ء میں ''صحافت کا عالمی ضابطہ اخلاق'' منظور کیا تھا۔ اس کا پہلا نکتہ ہی یہ تھا کہ کوئی صحافی حقائق کو مسخ نہیں کرے گا۔ تیسرا نکتہ یہ تھا کہ کسی فرد، افراد یا کسی مذہبی گروہ کی توہین کرنے کے لیے صحافت کے ذریعے کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کا پانچواں نکتہ یہ تھا کہ ہر صحافی عوامی مفاد کے لیے کام کرے گا۔ بنیادی انسانی حقوق کا ہر وقت خیال رکھے گا۔ لوگوں کے درمیان افہام وتفہیم کو فروغ دے گا۔ عالمی سطح پر دہشت گردی کے پھیلاؤ کے لیے کوئی کوشش نہیں کرے گا۔ سماجی، نسلی، مذہبی تعصبات اور نفرت کی حوصلہ افزائی ہرگز نہیں کرے گا۔

اقوام متحدہ کے ان ممبر ممالک کے صحافیوں نے یہ شر پسندانہ خاکے شائع کر کے اس عالمی صحافتی ضابطۂ اخلاق کی شدید خلاف ورزی کی ہے۔ اس خلاف ورزی کا اقوام متحدہ کے ادارے کو ہی سختی سے نوٹس لینا چاہیے۔

1983ء میں پیرس میں یونیسکو کے تحت چوتھے بین الاقوامی مشاورتی اجلاس کے بعد پیشہ ورانہ صحافت کے جو دس اصول وضع کیے گئے تھے، ان میں تیسرا اصول یہ ہے کہ صحافی ہر حال میں اپنی سماجی ذمہ داری پوری کرے گا۔ چھٹا اصول یہ تھا کہ ہر صحافی کو انسانی وقار کا خیال رکھتے ہوئے تمام انسانوں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے۔ ان کی شہرت کو زبانی یا تحریری صورت میں نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ آٹھواں اصول یہ تھا کہ ایک سچے صحافی کو انسانیت کی آفاقی اقدار کے لیے Stane رہنا چاہیے اور اسے امن، جمہوریت، انسانی حقوق و سماجی ترقی اور قومی آزادی سے بھی مقدم جاننا چاہیے، جبکہ اسے ہر تہذیب کے امتیازی تقدس کا خیال رکھنا چاہیے۔ صحافی کو بین الاقوامی تعلقات کی بہتری اور ہم آہنگی کے لیے امن اور انصاف قائم کرنے کے لیے مکالمے اور گفت وشنید کی حمایت کرنی چاہیے۔ ہر صحافی کو ان امور سے متعلقہ بین الاقوامی معاہدوں، اعلانات اور قراردادوں کے [illegible] باخبر رہنا چاہیے تاکہ ان کی پابندی کی جاسکے۔

اس بین الاقوامی صحافتی ضابطہ اخلاق کا نواں نکتہ یہ تھا کہ ہر صحافی دنیا بھر میں جنگ کے خاتمے اور انسانیت کے درمیان تصادم پیدا کرنے والی تمام برائیوں کو ختم کرنے کے لیے کوششیں کرتا رہے گا اور اسے تمام اقوام کے تقدس اور حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اسے نسل، جنس، زبان، قومیت اور مذہب وغیرہ کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں کرنا چاہیے۔

مذکورہ عالمی صحافتی ضابطۂ اخلاق کی روشنی میں جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اور یورپی اقوام نے اپنے ہی طے کردہ اخلاقی ضابطوں کی دھجیاں کس طرح اڑائی ہیں۔ ان اقوام نے اسلام سے تہذیبی تصادم میں ہر بات بھلا دی ہے اور تعصب ونفرت کی آگ میں سب کچھ جلا کر بھسم کر دیا ہے۔

ضابطۂ اخلاق کے بارے میں یہ عمومی تاثر پایا جاتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی پر حکومتوں کے پاس سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ انگریزی معاصر ''ڈان'' میں معروف بھارتی صحافی ایم جے اکبر کا مضمون "The answer is bycott" 17 فروری

2006ء کو شائع ہوا ہے۔ اس میں انٹرنیٹ پر موجود ڈنمارک کے پینل کوڈ کے سیکشن 266-B کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق اگر کوئی فرد عوامی سطح پر ارادتاً کوئی بیان دیتا ہے یا ایسی کوئی اطلاع دیتا ہے کہ جس میں کسی گروہ یا افراد کو دھمکی دی گئی ہو، ان کی بے عزتی یا توہین کی گئی ہو، یہ اقدام کسی گروہ یا افراد کی نسل، رنگ، قوم، علاقے، عقیدے، یا جنسی حوالے سے ہو، اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کو جرمانہ کیا جائے گا اور اسے دو برس کے لیے قید کیا جائے گا۔ اس سیکشن 140 میں یہ اضافہ ہے کہ اگر کوئی فرد کسی بھی فرد کے عقیدے یا کسی بھی مذہبی کمیونٹی، جو اس ملک میں قانونی طور پر مسلمہ ہے، کی توہین یا بے عزتی کرتا ہے، اس کو جرمانہ اور چار ماہ سے زائد عرصہ قید کی سزا دی جائے گی۔

اس قانون کی موجودگی میں ڈنمارک کے وزیر اعظم اپنی بے یاری و مددگاری کا رونا کیسے روسکتے ہیں۔ انہیں روئے زمین پر رہنے والے 150 کروڑ سے زائد مسلمانوں کے عقیدے اور جذبات کا لازماً احترام کرنا اور کروانا چاہیے۔ آخر تین سال قبل ڈنمارک کا وہی اخبار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں توہین آمیز مواد شائع کرنے سے کیوں رک گیا تھا؟ ان ملکوں میں ہولوکاسٹ کے بارے میں بات کرنے والے کو جیل میں ڈالنے کا قانون کیوں رائج ہے؟

اخبار Jyllands Posten کا متعصب ایڈیٹر فلیمنگ روز اگر اپنی اس ہرزہ سرائی اور ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی پر معافی مانگنے کو تیار نہیں ہے تو اسے صحافت کی بجائے کوئی اور پیشہ اختیار کر لینا چاہیے۔ اس کے بقول اگر یہ تہذیبوں کی بجائے ثقافتوں کی جنگ ہے تو اس کی اس مذموم حرکت سے پورے عالم اسلام نہیں بلکہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کو اس کی اس گستاخانہ اور کروڑوں انسانوں کی دلآزاری کرنے والی ثقافت سے بہت زیادہ نفرت ہو چکی ہے۔ فلیمنگ روز ایسی گھٹیا حرکات کر کے خود کو اپنے پہلے سے تباہ شدہ اور ہر اخلاق سے عاری اور بدبودار ثقافت کو بہت جلد دنیا بھر میں شدید نفرت کی علامت بنا دے گا۔

ابوطاہر

مغرب تعصب کی چھتری تلے

اسلام کے بارے میں جو خبط (Complex) پیدا ہو چکا ہے، وہ خود مغرب اور استعماریوں کے لیے سب سے سنگین خطرہ ہے۔ یہ خبط مغرب ہی نے پیدا کیا، یعنی اپنے لیے عصر حاضر کا بہت بڑا خطرہ خود ہی کھڑا کرلیا۔ اب پوری دنیا کے سنجیدہ فکر، معقول اور متوازن دانشور اور اہل الرائے مغربی طاقتوں بالخصوص ان کے دانشور طبقوں پر زور دے رہے ہیں کہ اپنی پروڈکشن کے مضرات سے بچنے کی تدابیر بھی خود ہی کریں۔ پوری دنیا آگاہ ہو چکی ہے کہ اسلام کے بارے میں تعصب بلا جواز اور بے بنیاد ہی نہیں، بہت حد تک مضحکہ خیز بھی ہے۔ روزنامہ خلیج ٹائمز کی ایک حالیہ اشاعت میں معروف قلم کار محترمہ نورین اکبری لکھتی ہیں: مغرب میں مسلمانوں کے خلاف جہالت اور دقیانوسی تصورات کی چھتری تلے تعصب کے سائے پھیلتے جارہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں میڈیا کتنا کردار ادا کرتا ہے؟ اس کا اندازہ ہمیں ناروے میں ہونے والے ایک افسوسناک واقعہ سے ملتا ہے۔ ناروے میں جنونی قاتل کی طرف سے قتل و غارت گری کے چند لمحے بعد کئی نیوز چینلو نے بغیر کسی تصدیق اور قابل اعتماد ذریعے کے حوالے سے یہ خبر جاری کردی: یہ حملہ "انتہا پسند مسلمانوں" کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اس واقعہ پر نیویارک ٹائمز نے دہشت گردی پر مہارت رکھنے والے تجزیہ کار میک کانٹس کا تبصرہ شائع کیا جس میں اس نے حملے کا ذمہ دار ایک ایسے دہشت گرد گروپ کو ٹھہرایا جو بین الاقوامی "جہادیوں" کا مددگار ہے۔ (مغرب میں زرد صحافت کو فروغ دینے میں پیش پیش) فاکس نیوز نے دعویٰ کیا ہے کہ اس حملے کی ذمہ دار منسلک ایک تنظیم ہے۔"

"اس واقعے کی سب سے مضحکہ خیز کوریج برطانوی اخبار "دی سن" کی تھی۔ یہ اخبار لکھتا ہے "ہم نہیں جانتے کہ یہ القاعدہ کا کام ہے جس نے ناروے کو دھمکی دی ہے یا پھر لیبیا کے رہنما کرنل معمر قذافی کی طرف سے تنبیہ ہے۔" ایسے ناقابل تصدیق معلومات اور متعدد

ذرائع ابلاغ کے غیر محتاط جائزے پریشان کن حقیقت کے آئینہ دار ہیں اور مسلمانوں کے خلاف منفی تاثر کی مہم جاری ہے۔ اصل پریشان کن بات یہ ہے کہ مغرب اس معاشرے کے بارے میں منفی تاثر پھیلا رہا ہے جس کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتا۔ امریکی ٹی وی چینل کیبل نیوز نیٹ ورک (سی این این) کے متعلق امریکہ اپنے مسلمان اتحادیوں کے بارے میں تقسیم ہو چکا ہے۔ سی این این کا دعویٰ ہے کہ 53 فیصد امریکی ذاتی طور پر مسلمانوں کے بارے میں جانتے ہی نہیں اور 55 فیصد کے پاس اسلام کے بارے میں کوئی بنیادی معلومات نہیں ہیں۔ حالیہ گیلپ سروے کے مطابق 43 فیصد امریکی مسلمانوں کے متعلق کم تعصب رکھتے ہیں۔ اس تعداد سے دوگنا وہ لوگ ہیں جو عیسائی، یہودیوں اور بدھ مت کے پیروکاروں کے بارے میں تعصب محسوس کرتے ہیں۔ 2011ء میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق مغرب میں بسنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کو متشدد اور جنونی سمجھتی ہے۔ اس تحقیق کے مطابق اسپین میں 80 فیصد، جرمنی میں 68 فیصد، روس میں 64 فیصد اور فرانس میں 52 فیصد لوگ مسلمانوں کو متشدد اور جنونی سمجھتے ہیں۔ تعداد کا یہ تناسب ایک ایسے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے جو حالات سے بے خبری اور فرسودہ تصورات سے وجود میں آیا ہے اور اسلام فوبیا غیر واضح اور غلط تصورات پر پروان چڑھایا جا رہا ہے اور یہ جہالت کی پیداوار ہے۔"

"مغرب کیوں اس مذہب (اسلام) اور اس کے پیروکاروں کے بارے میں شکوک کا شکار ہے جس کے بارے میں زیادہ جانتا ہی نہیں۔ میڈیا مختلف اقوام اور گروہوں کے بارے میں تاثر پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جب کہ اس کا قائم کردہ ہر تاثر حقیقت نہیں ہوتا۔ جب مغربی ذرائع ابلاغ جہاد اور شدت پسندی وغیرہ پر رائے زنی کرتے ہیں یا پھر اسلام کے متعلق تنقیدی فلمیں، جیسے پامیلا گیلر اور گیرٹ والڈرز (خلاف اسلام موویز) دکھائے گا تو پھر تسلیم کیجیے کہ فتنہ تو میڈیا ہی سے اٹھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں بہت سے لوگ اسلام کے صحیح تصور سے آشنا نہیں۔"

"مسئلہ یہ نہیں کہ بے پناہ من گھڑت کہانیاں ذرائع ابلاغ میں رپورٹ ہو رہی ہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ ان رپورٹوں کو غیر متوازن اور ہیجان خیز رخ دیا جا رہا ہے اور مسلمان مخالف ماحول پیدا کر کے لوگوں کو بنیاد پرست اسلام سے خوفزدہ کرتا ہے اور اب ان لوگوں کو یقین ہو گیا ہے کہ ان کے درمیان رہنے والے مسلمان "دھوکے باز" جہادیوں کی نمائندگی کرتے

ہیں۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ بعض مسلمانوں کے منفی رویے ہیں جو پرتشدد حملوں اور مجرمانہ وارداتوں میں ملوث ہیں، خواتین کو تشدد کا نشانہ بنانا اور معاشرے میں اسلام کی تذلیل کے متعلق مختلف فتوے مسلمانوں کے لیے پریشان کن ہیں۔ اس طرح کے ''اسلامی'' ایکٹ کی جب کوئی غیر مسلم اسلام کے طور پر تعریف پیش کرتا ہے تو میڈیا اس کو نمایاں کرتا ہے اور عام طور پر قابل احترام مسلمانوں کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔''

''پبلک مذہب ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کے مطابق فاکس نیوز اسلام کے متعلق منفی رویوں کو زیادہ کوریج دے رہا تھا۔ امریکی جن کا زیادہ اعتماد فوکس نیوز پر ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان اسلامی قوانین نافذ کریں گے اور ان کے خیال میں مسلمانوں کے بارے میں انتہا پسندی کے متعلق تحقیقات درست ہیں۔ مسلمانوں کا جہادی، اسلامی انتہا پسند یا اعتدال پسندی کے حوالے سے غلط تصور پیش کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف تعصّبانہ نظریات کو تقویت ملتی ہے۔ ''اسٹریٹیجک ڈائیلاگ اسٹڈی'' کے سروے کے مطابق مغرب میں مسلمانوں کے درمیان ایک احساس ہے کہ مرکزی میڈیا ان کے کنٹرول سے باہر ہے اور ان کا حقیقی تصور پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اس کا واضح مطلب ہے کہ ''وہ'' یہ نظریات پیدا کر رہے ہیں اور یہ کہ ''وہ'' بڑی تعداد میں یہ نظریات پھیلا رہے ہیں۔''

''میڈیا کو مسلمانوں کے تبصرے میں سیاق وسباق کے ساتھ پیش کرنا چاہئیں اور متوازن اور معقول صحافیوں کو متوازن رپورٹ پیش کرنا چاہیے تاکہ مسلمانوں کے متعلق مغرب میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، وہ ختم ہوں تاکہ رواداری قائم ہو اور بنیاد پرستی کو ختم کرنے میں مدد ملے اس سے عوام یہ سمجھ جائیں گے کہ مسلمان بھی دہشت گردی کی کارروائیوں کی مذمت کرتے ہیں، تاہم اگر میڈیا کا موجودہ رجحان جاری رہتا ہے تو مسلمانوں کے خلاف جذبات مزید ابھریں گے۔''

روزنامہ الشرق الاوسط کی 26 ستمبر 2012ء کی اشاعت میں ''مامون فاندے'' نے ''مغرب کو اسلام کے خبط سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت'' کے عنوان سے لکھا ہے:

مغرب کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اس خبط سے نجات حاصل کر لے جسے آج کل ''اسلام کمپلیکس'' کا نام دیا گیا ہے جب کوئی شخص اہل مغرب سے اسلام کے متعلق بات کرتا ہے تو ان میں ابتدائی دور (دور جہالت) کی جبلت ابھر آتی ہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ میں ''آزادی

اظہار'' کے مقابلے میں ''آزادی برہمی'' کا دفاع کروں تو میں قارئین سے اجازت چاہوں گا کہ وہ مجھے ایک ''ناراض مسلمان'' کی حیثیت میں اظہار خیال کی اجازت دیں۔ ایک مسلمان کو ناراض ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ مغرب اظہار آزادی رائے کا دفاع کرتا ہے تو ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ ''ناراضی کی آزادی'' کا دفاع کریں۔ میں پورے شعور اور شرح صدر سے عرض کر رہا ہوں کہ آج میں ایک ناراض مسلمان ہوں اور مجھے ہر حوالے سے یہ حق حاصل ہے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی مقدس ہستیوں کا مذاق اڑانے والی مغربی اشرافیہ کے خلاف ناراضی کا اظہار کروں۔''

''مغرب کسی بھی مذہب یا عقیدے کے پیروکاروں حتیٰ کہ اقلیتوں کا بھی دفاع کرتا ہے تاہم ان میں سے بہت سے ابھی تک اس دین کا تقدس پامال کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ اس مذہب کے پیروکاروں کی صریح دلآزاری کرتے ہیں جن کی تعداد پوری دنیا میں ایک بلین سے زیادہ ہے۔ میں نے مغربی فلاسفر، ان کے ایک دوسرے سے مختلف طریق فکر و عمل اور تہذیب انسانی پر ان کے اثرات کا مطالعہ کیا ہے، مغرب کے سیاستدان ہوں یا یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے والے پروفیسرز، صحافی ہوں یا ادیب سب کے سب مغربی اشرافیہ کے سامنے اسلام کو قدیم انسانی جبلت کے حامل دانشوروں کی حیثیت میں پیش کر رہے ہیں۔ میں اپنے علم اور اپنے دعوؤں کے بارے میں اپنے ذہن میں کسی قسم کا ذرا سا بھی شبہ نہیں رکھتا۔ مجھ نے ٹیلی ویژن، اخبارات اور تعلیمی اداروں کی راہداریوں میں ہونے والی بحث و تمحیص کا بغور جائزہ لیا ہے۔ حال ہی میں مجھے عربی زبان کے امریکی چینل ''الجزیرہ'' میں بطور مہمان مقرر مدعو کیا گیا۔ میرے ساتھ دوسری مہمان مقرر امریکہ کی جمہوریت، انسانی حقوق اور مزدوروں کے امور کی اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ تھی۔ ہماری بحث کا موضوع تھا ''مغرب میں مشرقی مذاہب کے تقدس کے خلاف آزادی اظہار''، اس مباحثے میں مجھے اسسٹنٹ سیکریٹری کی جاہلانہ رائے کا جواب دینے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا۔ اس پروگرام میں، میں بمشکل یہ کہہ پایا: امریکہ میں آزادی اظہار کی اجازت ہے لیکن حقیقت میں مسلمانوں کو اپنی ناراضی کے اظہار کی آزادی نہیں ہے''۔ ہم اس بحث میں عرب ممالک کے لیے عربی زبان میں گفتگو کر رہے تھے نہ کہ امریکی یا مغربی سامعین کے لیے۔ میں جب تک امریکہ میں رہا کسی امریکی چینل نے مجھے بطور میزبان مدعو نہیں کیا جب کہ سب جانتے ہیں کہ میں بہت

سے مغربی چینلو پر اپنا مؤقف بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں متعدد مغربی اخبارات میں لکھتا ہوں اور میں نے اہم مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس پس منظر کے حوالے سے ایک بار پھر یہ سوال اٹھاتا ہوں کہ مغربی دانشور تمام معاملات پر معقول تجزیے دیتے ہیں، اسلام کے بارے میں ان کا طرز عمل یکسر برعکس ہے"۔

"اگر میں امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے اس بیان کو غور سے دیکھوں جس میں ان کا کہنا تھا: بہار عرب آمروں کے ہجوم میں تبدیل ہوگئی ہے تو میں یہ کہوں گا کہ آمروں کا ہجوم نہیں۔ جب مسلمان اپنے مذہب اور پیغمبر اکرم ﷺ کی توہین پر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں تو یہ آمروں کا ہجوم نہیں ہوتا۔ جب لوگ سفارت خانوں کے باہر مظاہرے کرتے ہیں یا سفارت خانوں پر پتھراؤ کرتے ہیں تو یہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی طرف سے اظہار ناراضی ہوتا ہے اور اظہار کرنے والوں میں کوئی ایک بھی آمر نہیں ہوتا۔ آمروں کا ہجوم کہنا تو سراسر لغویات ہے۔ ممکن ہے ہیلری کلنٹن کو ماضی میں اس طرح کی ناراضی کا تجربہ نہ ہوا ہو تو اب اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلمان مغرب میں کس قسم کا اظہار آزادی رائے چاہتے ہیں۔ یورپ جو زیادہ تر کہانیاں بیان کر رہا ہے، وہ مسلمانوں کے خیالات صرف بحران کے وقت اخبارات اور ٹیلی ویژن پر نظر آتے ہیں جس کے بعد مسلمانوں کو پردہ غیب میں بھیج دیا جاتا ہے اور ہر قسم کے بحث مباحثوں میں غیر مسلم ہی نظر آتے ہیں"۔

"مغرب میں صرف اسلام ایک ایسا دین جس پر کھلی تنقید کی جاتی ہے اور اس کے خلاف بیان بازی کے طومار کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ ہیلری کلنٹن اور اس کے اسسٹنٹ گستاخانہ فلم کے معاملے میں "ہجوم" کے مظاہروں پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو بطور ہجوم ناشائستہ انداز میں مخاطب کرتی ہیں۔ میں "پدرم مسلمان بود" کا قائل نہیں، لہٰذا ماضی کی شان و شوکت کا تذکرہ نہیں کروں گا مگر نبی اکرم ﷺ ایسی ہستی نہیں ہے جو "گزر چکی" ہے۔ آپ ﷺ آج بھی ہم میں اپنی تعلیمات و فرمودات کے ساتھ موجود ہیں۔ آنحضرت ﷺ آج بھی مسلمانوں ہی نہیں پوری انسانیت کی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فرما رہے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ ہماری زندگی اور ہماری روح کا جزو لاینفک ہیں۔ میرا ہی نہیں، ہر مسلمان کا اور ان کی توہین فی الحقیقت اس راہ ہدایت کی توہین ہے جس پر چل کر ہم دنیوی اور اخروی فلاح کی سعادت سے بہرہ ور ہوسکتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نسلی عصبیت "دوسروں"

کے طرز زندگی کا مذاق اڑانے سے شروع ہوئی ہے۔"

"نائن الیون کے حوالے سے ہم اکثر یہ سنتے ہیں کہ مغرب اپنے معاشرے میں کامیاب مسلمانوں کو اپنی برداشت اور مقبولیت کے ثبوت کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ اصلاً وہ ہمارا ذکر ایسی جنس کے طور پر کرتے ہیں جو خریدی جاسکتی ہے۔ ہم صرف اظہار آزادی رائے اور جمہوریت کی نمائش کا حصہ ہیں۔ ہمیں مہینے میں ایک بار اخبارات کے صفحات پر ظاہر ہونے کی اجازت ہے۔ ٹیلی ویژن پر ہفتے میں ایک دن کسی آواز کے بغیر ہمیں دکھایا جاتا ہے کیونکہ ہم صرف شعر کا ایک حصہ ہیں۔"

"مغرب اسلام کے خبط سے اس وقت نجات حاصل کر لے گا جب وہ مسلمانوں کو بطور انسان قبول کر لے گا۔ ہم ایک ہجوم نہیں ہیں ہم مکمل اور منفرد و ممتاز تہذیب رکھتے ہیں۔ ہمارا مذہب قدر و قیمت کا حامل مذہب ہے۔ گرانقدر بلکہ انمول دین ہے جو پوری انسانیت کو راہ نجات کی ہدایت کرتا ہے۔ ہمارا مذہب کئی حوالوں سے ریاضی کے علم پر مبنی ہے۔ دو اور دو چار کی طرح بات کرتا ہے۔ کئی مستشرقین اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ چونکہ تھوڑی بہت عربی زبان جانتے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے اس زبان کے حقیقی معانی جاننے والے ہی اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ میں ہمیشہ اہل مغرب سے کہتا ہوں کہ تم اس سرزمین پر ہمارے شراکت دار ہو، بس اسلام کے بارے میں اپنے مفروضوں اور خبطوں سے نجات حاصل کرلو۔ اسی میں سب کا بھلا ہے۔"

مولانا سعید احمد جلالپوری

امریکی کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی کی شرانگیز رپورٹ

مشہور کہاوت ہے کہ: "الکفر ملة واحدة"......... کفر ایک ہی ملت ہے..... یعنی کفر اور کافر خواہ کہیں کا ہو، وہ ایک ہی ہے..... بلاشبہ کافر چاہے امریکہ کا ہو یا یورپ کا، ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا، عرب کا ہو یا عجم کا، یہودی ہو یا نصرانی، قادیانی ہو یا مجوسی، ان سب کا مفاد مشترک ہے، وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں یک جان ہیں اور ان کی فکر و سوچ میں بلا کا اتحاد و اتفاق ہے، اگر ان میں سے کسی کے پاؤں میں کہیں کوئی کانٹا بھی چبھ جائے تو ان کی پوری برادری چیخ اٹھتی ہے۔

اس کے برعکس اگر مسلمانوں کے حقوق پامال کیے جائیں، ان پر بمباری کی جائے، ان کی آبادیوں کی آبادیاں صفحۂ ہستی سے مٹادی جائیں، سرراہ ان کی عفت مآب ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت و عصمت تار تار کی جائے، ان کے مردوں کو جانوروں کی طرح پنجروں میں بند کردیا جائے، ان کو بے لباس کردیا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو زبردستی پیشاب پلانے کی کوشش کی جائے، ان کے سامنے ان کی مقدس شخصیات کو ننگی گالیاں دی جائیں، ان کی مقدس کتاب کو پاؤں میں روندا جائے، اسے بیت الخلا میں پھینکا جائے، ان کے سامنے مقدس اوراق سے استنجا کیا جائے، ان کے منہ اور ڈاڑھیوں پر ماہواری کا غلیظ خون ملا جائے، ان پر انسانیت سوز تشدد کیا جائے، ان کو مار مار کر ادھ موا کردیا جائے یا موت سے ہمکنار کردیا جائے، حتیٰ کہ ان پر قیامت ہی کیوں نہ توڑی جائے، ان کے نزدیک یہ قابل ذکر یا باعث تشویش نہیں، اس لیے کہ مسلمان دہشت گرد، مجرم اور ہر سزا کے مستحق ہیں، اس پر نہ "یونائیٹڈ اسٹیٹس کمیشن آن انٹرنیشنل ریلیجس فریڈم" کو تشویش ہوتی ہے اور نہ بین الاقوامی

انسانی حقوق کی تنظیمیں حرکت میں آتی ہیں، لیکن اگر کوئی مسلمان یا اسلامی ملک اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف بھونکنے والی زبان کو لگام دینے کی کوشش کرے یا اس دریدہ ذہنی کے خلاف اپنی ایمانی غیرت سے مجبور ہو کر آواز اٹھائے، تو امریکہ سمیت تمام اسلام دشمن ممالک اور قوتیں بیک زبان اس کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہیں۔

تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ ملعون رشدی جیسا دریدہ دہن، جس نے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ایسی مقدس شخصیات کی توہین و تنقیص پر مبنی ''شیطانی آیات'' نامی کتاب لکھی تھی اور 1989ء سے روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے اور برطانیہ جیسے نام نہاد سیکولر ملک نے اسے اپنی گود میں پناہ دے رکھی ہے، محض مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے، انہیں مشتعل کرنے، انہیں ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے اور ان کے دین و مذہب پر حملہ کرنے کی غرض سے ملکہ برطانیہ نے ''سر'' کا خطاب دے کر گویا دنیا بھر میں ہونے والی مذہبی شدت پسندی اور اشتعال انگیزی کو اپنی سرپرستی کا یقین دلایا ہے۔

اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا کہ اس خطاب اور اعزاز کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں کہ جو لوگ اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کی توہین و تنقیص کے مرتکب ہوں یا ان کے جذبات سے کھیلیں، وہ نہ صرف ہمارے نمائندے اور ترجمان ہیں بلکہ ہماری تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں اور ایسے تمام دریدہ دہنوں کو ہم اعزاز و اختصاص کا مستحق گردانتے ہیں، اور ان کی پشت پر ہمارے تعاون کا ہاتھ ہے۔

کیا امریکہ، برطانیہ اور مغرب کو معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے بھی کچھ جذبات ہیں اور کوئی حقوق رکھتے ہیں؟ وہ بھی اپنے اندر ملی، دینی اور مذہبی غیرت رکھتے ہیں؟ اور اس قسم کی دریدہ دہنیوں اور ہرزہ سرائیوں سے مشتعل ہو سکتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو وہ دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے بجائے صرف قادیانیوں، مرزائیوں اور عیسائیوں کے مذہبی حقوق کے بارے میں ہی اس قدر حساس کیوں ہیں؟ کہ امریکہ کی وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس کے نام ایک خط میں ایسے تمام مسلمان ممالک کو ہی خصوصی تشویش والے ممالک کی فہرست میں شامل کرتے ہیں، جو ان کے نام نہاد مذہبی لوگوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف متحرک ہیں، اس کے برعکس ان دریدہ دہنوں کی ہرزہ سرائی سے پیچ و تاب کھانے

والے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی پامالی کی ان کو ذرا بھر کوئی پروا نہیں ہے، آخر کیوں؟ اس سلسلہ میں ''امریکی کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی'' کی 2 مئی 2007ء کی ویب سائٹ کی ایک رپورٹ ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ کیجیے کہ امریکہ اور مغرب، عیسائیوں اور قادیانیوں کے بارے میں کس قدر حساس اور مسلمانوں کے بارے میں کس قدر بے حس ہیں؟ چنانچہ ''امریکی کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی'' کی شرانگیز ویب سائٹ کی رپورٹ پڑھیے اور داد انصاف دیجیے:

''حکومت امریکہ کے ادارہ ''یونائیٹڈ اسٹیٹس کمیشن آن انٹرنیشنل ریلیجس فریڈم'' (امریکی کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی) نے 2 مئی 2007ء کو اپنی ویب سائٹ پر ایک رپورٹ جاری کی، جس کے مطابق اس ادارہ نے بین الاقوامی مذہبی آزادی ایکٹ مجریہ 1998ء کی روشنی میں امریکی وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس کے نام ایک خط میں 2007ء کے لیے مذہبی حوالہ سے ''خصوصی تشویش والے ممالک'' میں شمار کیے جانے کے قابل ممالک کے لیے ان کو اپنی سفارشات پیش کیں۔ بین الاقوامی مذہبی آزادی ایکٹ مجریہ 1998ء کے مطابق یہ ضروری ہے کہ امریکہ ان ممالک کو ''خصوصی اہمیت کے ممالک'' قرار دے، جن کی حکومتیں عقیدہ یا مذہب کی آزادی کے بین الاقوامی حق کی باضابطہ پامالی میں یا تو خود ملوث ہیں یا اس پر خاموش ہیں۔''

اس حوالہ سے جن گیارہ ممالک کا نام امریکی کمیشن کی 2007ء کی سفارشات میں شامل ہے، ان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ ویب سائٹ پر جاری کردہ امریکی وزیر خارجہ کے نام کمیشن کے خط کے مطابق پاکستان کا نام ''خصوصی تشویش والے ممالک'' کی امریکی فہرست میں اب تک شامل نہیں، لیکن کمیشن مسلسل مشاہدہ کر رہا ہے کہ پاکستان مذہبی آزادی کے بین الاقوامی حق کی باضابطہ پامالی میں یا تو خود ملوث ہے یا اس پر خاموش ہے، اور یہ کہ کمیشن امسال بھی تجویز دیتا ہے کہ پاکستان کو ''خصوصی تشویش والے ممالک'' میں شامل کیا جائے۔

اس خط میں کمیشن نے امریکی وزیر خارجہ کو لکھا:

''فرقہ وارانہ اور مذہبی وجوہات پر مشتمل فسادات پاکستان میں رونما ہو رہے ہیں، بالخصوص قادیانی، عیسائی اور ہندو۔ اور اس مسئلہ پر حکومت کا ردعمل گو کہ بہتر ہوا ہے، لیکن اب تک کافی نہ ہو سکا اور نہ ہی مکمل طور پر

کارگر۔ مزید براں ملک کے کئی قوانین...... بشمول احمدی کمیونٹی کو محدود کرنے کے حوالہ سے قانون سازی اور توہین رسالت کے قوانین......
عام طور پر ان کا نتیجہ یا تو مذہب یا عقیدہ کی بنیاد قید کی صورت میں نکلتا ہے، یا پھر ملزم کے خلاف فساد کی شکل میں۔ صرف گزشتہ ماہ پنجاب کے ایک شہر میں چھ عیسائیوں کے خلاف انتہائی استفہامیہ حالات میں توہین کی دفعہ عائد کی گئی۔ اس علاقہ کے دیگر (عیسائی) رپورٹ کے مطابق حملہ کے خطرہ کے پیش نظر روپوش ہو گئے۔ یہ مذہبی آزادی کی تشویش جاری ہے، اس لیے کہ پاکستان میں جمہوریت کی عدم موجودگی بڑی پریشانی ہے...... ایک ایسی رکاوٹ جس کا مداوا موجودہ حکومت نے بہت کم کیا ہے۔"

بین الاقوامی مذہبی آزادی کے حوالہ سے مصر کے خلاف کمیشن کا کہنا تھا:

"اسلام کو ترک کر کے عیسائیت قبول کرنے والے افراد کو بھی مملکت کی سیکیوریٹی سروسز کی توجہ کا سامنا ہے، اور شناختی دستاویز پر مذہبی وابستگی تبدیل کرنے کی کوشش پر ان افراد کو گرفتار کر لیا گیا...... حکومت (مصر) کو چاہیے کہ وہ ان افراد کو سزا دے جو حالیہ سالوں میں مذہبی فسادات کو بڑھانے میں ملوث ہیں اور میڈیا اور تعلیمی نظام میں یہودیت کے خلاف عدم برداشت کا مقابلہ کرے۔"

بنگلہ دیش کے خلاف اپنے ریمارکس دیتے ہوئے کمیشن نے امریکی وزیر خارجہ کو لکھا:

"کمیشن نے 2005ء میں بنگلہ دیش کو اپنی واچ لسٹ پر رکھا بوجہ بڑھتی ہوئی اسلامی شدت پسندی اور مذہبی اقلیتوں بشمول ہندو، عیسائی اور قادیانیوں کے خلاف امتیاز۔ مذہبی اقلیتی کمیونٹیوں نے تشویش کا اظہار کیا ہے ووٹر لسٹوں سے اخراج پر، خوفزدہ کرنا اگلے عام انتخابات سے یا نشانہ بنانا اقلیت کے خلاف فساد کا جیسا کہ گزشتہ عام انتخابات کے بعد ہوا۔"

انڈونیشیا کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے امریکی وزیر خارجہ کونڈولیزا کے نام اپنے خط میں کمیشن نے لکھا:

”قادیانیوں کو نشانہ بنانے والے فسادات میں حالیہ سالوں میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے، اور شدت پسند گروپس (افراد کو) بھرتی کرنے، تربیت دینے اور مرکزی اور شمالی سولاویسی میں عملاً کام کرنے کے حوالہ سے جانے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال کم از کم نو پروٹسٹنٹ چرچ، چار قادیانی عبادت گاہیں اور ایک ہندو مندر بند کردیے گئے یا انہیں نقصان پہنچا۔ مغربی جاوا، شمالی ساٹرا، جنوبی سولاویسی اور مغربی نوساٹینگارا میں شدت پسند گروپوں کے اثرات کے نتیجہ میں جو مجمعوں کو اُکساتے ہیں یا، مقامی حکام کو خوفزدہ کرتے ہیں۔“

کمیشن نے خط میں یہ بھی لکھا ہے:۔

”خصوصی تشویش کے حامل وہ تمام ممالک جن کا تذکرہ اس خط میں کیا گیا ہے، ان کے حالات کا خلاصہ کمیشن کی سالانہ رپورٹ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، جو لف ہے، جسے اس خط کے ساتھ جاری کیا جائے گا۔“

”کمیشن نے ان ممالک کے حوالہ سے خاص پالیسی تجاویز دی ہیں اور کہا ہم آپ (امریکی وزیر خارجہ) کی حوصلہ افزائی کریں گے کہ آپ ان تجاویز پر خصوصی توجہ دیں، جو کہ ہماری رپورٹ میں بھی درج ہیں۔ ہم وزارت خارجہ پر بھی زور دیں گے کہ وہ بین الاقوامی مذہبی آزادی ایکٹ پر عملدرآمد کرانے کے لیے ضروری ایکشن لے۔“

”کمیشن اس بات کا اظہار جاری رکھے گا کہ مذہبی آزادی کا مسئلہ امریکی خارجہ پالیسی کے متعدد مسائل سے ٹکراتا ہے۔ عقیدہ یا مذہب کی آزادی کی شدید پامالی کے ہمارے سیاسی اور قومی سلامتی کے مفادات پر اثرات ہیں اور ساتھ ساتھ دنیا بھر میں سیاسی استحکام پر بھی۔“

”جب ہماری حکومت مذہبی آزادی کو شدت سے اُجاگر کرتی ہے، تو ہم دنیا کے لیے خطرہ بننے والی شدت پسندی کے خاتمہ کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس مرکزی انسانی حق کی پیش رفت میں ہم امن کی ترویج اور تمام اقوام بشمول ہماری اپنی قوم کی سلامتی کے لیے کام کرتے ہیں۔“

کیا دنیا بھر کے مسلمان "عزت مآب" امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے یہ پوچھنے کی "گستاخی" کر سکتے ہیں کہ دنیا بھر کے عیسائیوں، قادیانیوں، ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کے غم میں گھلنے والے ان سورماؤں کو دنیا بھر میں مظلومیت کی چکی میں پستی، چیختی، چلاتی اور بلبلاتی بے بس مسلم اقلیت کا آسمان سے باتیں کرتا نوحہ، سنائی نہیں دیتا؟ کیا انہیں عراق و افغانستان میں زبردستی مسلط ہونے والی عیسائیت اور عیسائیت کے مظالم دکھائی نہیں دیتے؟ کیا گوانتاناموبے میں مسلمانوں کے خلاف روا رکھے جانے والے انسانیت سوز مظالم پر "امریکی مذہبی آزادی کا کمیشن" کچھ نہیں کہتا؟ کیا ان کو اس پر تشویش نہیں ہوتی؟ کیا امریکہ اور اس کے اتحادی کسی قانون کے پابند نہیں؟ کیا امریکہ کے "کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی" کے دائرہ میں مسلمان اور اسلام کے دشمن نہیں آتے؟ کیا دنیا میں عیسائیت، قادیانیت اور ہندومت کے علاوہ دوسرا کوئی مذہب نہیں؟ کیا دنیا میں مسلمانوں کو ہراساں نہیں کیا جاتا؟ کیا ان کے خلاف تشدد سے کام نہیں لیا جاتا؟ کیا ان کے خلاف نسلی امتیاز نہیں برتا جاتا؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو کیا امریکہ بہادر نے اپنے مذہبی آزادی کے کمیشن میں ظلم کے شکار ایسے کسی مسلمان کے حق میں بھی آواز اٹھائی ہے؟ یا ان کے مذہبی جذبات کی پامالی کے خلاف بھی کوئی قانون بنایا ہے؟ کیا امریکہ نے اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے مجرم مرزا غلام احمد قادیانی، سلمان رشدی یا تسلیمہ نسرین ایسے دریدہ دہنوں کے خلاف بھی اپنی کسی تشویش کا اظہار کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا کہا جائے کہ خود امریکہ بہادر اسلام اور مسلمانوں کا حریف اور قادیانیوں کا سرپرست نہیں؟ کیا وہ خود اس مذہبی تشدد کا موجد نہیں؟ کیا امریکہ کے خلاف بھی کوئی کمیشن بنایا جا سکتا ہے؟ کیا امریکہ کے خلاف بھی کوئی اظہار رائے کر سکتا ہے؟

حافظ شفیق الرحمٰن

گندی رائے کے اظہار کی آزادی جوتے کی نوک پر

عوام جانتے ہیں کہ امریکی خواہش ہے کہ دفعہ 295 سی میں ترمیم کر کے اسے نئی شکل دے دی جائے۔ دفعہ 295 سی کے خلاف عشق رسول ﷺ سے بے بہرہ دانشوروں، فارن فنڈڈ این جی اوز کی عہدیداران، انتہا پسند قادیانی اور عیسائی حلقوں نے بلا جواز پروپیگنڈہ مہم اور میڈیا وار شروع کر رکھی ہے۔ یہ واحد قانون ہے جس کے اطلاق کو تقریباً اڑھائی عشرے گزر چکے ہیں لیکن آج تک اڑھائی ملزموں کو بھی سزا نہیں ملی۔ ویسے بھی اس الزام میں ماخوذ ملزمان کی تعداد پورے ملک میں معدودے چند ہے جبکہ دیگر دفعات میں ملوث، ماخوذ یا مطلوب ملزمان کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ کیا کسی قانون کو محض اس لیے غیر موثر بنا دینا یا ختم کر دینا کہ اس کے نفاذ کی وجہ سے چند انسانوں کو پابند سلاسل کرنا پڑے گا، قرین عقل و دانشمندی ہے؟ اگر آپ آج قانون توہین رسالت کو غیر موثر بنانے کی کوشش کریں گے تو یاد رہے کہ پہلے قدم پر ایسا اقدام عدالت عظمیٰ کی توہین کے مترادف ہوگا۔ قانون توہین رسالت یا دفعہ 295 سی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ فکری و ذہنی طور پر بھٹکے فتنہ پردازوں اور مفسدوں کو کائنات کی اکرم، اعظم، اشرف، احسن، اکمل اور محبوب ترین ہستی کے خلاف ہرزہ سرائی سے باز رکھا جائے۔ اگر اس ملک میں ریاست، آئین، فوج اور عدالت کی توہین جرم ہے تو یہ ریاست، یہ آئینی ادارے، یہ افواج اور یہ عدالتیں جس ہستی کے در کے ٹکڑوں پر پل رہی ہیں، اس کی توہین کو سنگین جرم تصور کرنے سے انکار کرنے والے بھی توہین رسالت کے اقراری مجرم ہیں۔

کل کلاں اگر اس ملک کے تمام "قاتلان عظام" کے ورثا اٹھ کھڑے ہوں اور یہ مطالبہ کریں کہ دفعہ 302 کو ختم کر دیا جائے کہ یہ ایک "کالا قانون" ہے اور اس کی وجہ سے لاکھوں انسان جیلوں کی دیواروں کے پیچھے گل سڑ رہے ہیں، تو کیا ہمارے موجودہ حکمران اس قانون کو بھی بیک جنبش قلم منسوخ کر دیں گے؟ اگر پرسوں اس ملک کے منشیات فروشی کے

دھندے میں ماخوذ ہزاروں ملزموں کے لواحقین اٹھ کھڑے ہوں اور پلے کارڈ اٹھا کر سڑکوں پر نکل آئیں اور مطالبہ کریں کہ منشیات کی بیخ کنی کے لیے بنائے گئے تمام قوانین کو نرم کر دیا جائے تو کیا ہماری موجودہ نرم دل حکومت ان کے مطالبے کے سامنے سرنڈر کر کے انسداد منشیات ایکٹ ختم کر دے گی؟ اور ڈرگ مافیا کو کھل کر کھیلنے کی اجازت دے دے گی؟

صاحبو! اگر توہین رسالت ﷺ جرم نہیں ہے تو پھر کوئی جرم اس قابل نہیں کہ اس کے کسی مرتکب پر قانون کا نفاذ کرنے والے ادارے ہاتھ ڈال سکیں۔ کانٹے کو کانٹا، زہر کو زہر، رات کو رات، ظلم کو ظلم، سیاہ کو سیاہ، برائی کو برائی، گناہ کو گناہ، غنڈے کو غنڈہ، قاتل کو قاتل، بدمعاش کو بدمعاش، آمر کو آمر، جابر کو جابر، غاصب کو غاصب، جارح کو جارح، غدار کو غدار قرار دینا اگر ازروئے تہذیب، ازروئے عقل، ازروئے خردمندی جائز اور روا ہے تو اقراری غیر مسلم قادیانیوں کو ازروئے قانون، ازروئے پارلیمان، ازروئے آئین، ازروئے دین غیر مسلم قرار دینا کیوں کر روا نہیں ہے؟

یہ کیسا دورخہ پن اور دوہرا معیار ہے کہ ریاست، ریاست کے چند ادارے اور ان اداروں کی مختلف مسندوں پر فائز چند عہدیدار اور قومی ہیرو قرار دی جانے والی شخصیات تو مقدس بچھڑے ہیں کہ ان کے بارے بے باکانہ رائے کا اظہار کرنے والے کو آئے روز وحشیانہ سزاؤں کا ہدف بنایا جاتا ہے اور اس عمل کو ریاست کی بقا اور استحکام کے لیے ناگزیر تصور کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف دنیائے انسانیت کی سب سے عظیم ترین ہستی خاتم الانبیا والرسل ﷺ کے حوالے سے جب قانون بنتا ہے کہ ان کی ذاتِ ستودہ صفات کی توہین، مہذب دنیا کا سب سے سنگین اور قبیح جرم ہے، لہٰذا اس جرم کی مکمل سزا بھی سنگین ترین یعنی ''سزائے موت'' ہوگی تو بڑے بڑے عقیل وفریس جابروں اور ذہین وفطین آمروں کی رگِ رحمدلی بھی پھڑکنے لگتی ہے اور وہ برداشت اور رواداری کا بھاشن جھاڑنے لگتے ہیں۔

ے تف ہے اس برداشت پر
لعنت ہے اس رواداری پر

جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں پاکستانی عوام، گندی رائے کے اظہار کی اس آزادی کو، تھوکتے ہیں وہ اس لبرل ازم پر، جو انہیں توہین رسالت ﷺ کے ملزمان کو قانونی وعدالتی حوالوں سے کیفر کردار تک پہنچانے کی راہ میں حائل اور حارج ہو۔

دفعہ 295 سی میں ترمیم کرنے کا خواب دیکھنے والے حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ پہلے تمام فوجداری قوانین میں ترمیم کا آرڈیننس جاری کریں اور کسی بھی جرم کے مرتکب کے لیے 'سزائے موت' کی سزا دنیا کے ہر ملک کے قانون میں سے ختم کروائیں۔ جب وہ ایسا کر چکیں تو قرآن و حدیث، اجماع امت اور غازی علم الدین شہید ایسے جلیل القدر شہدا کی سوانح سے اس امر کی شہادت فراہم کریں کہ کیا توہین رسالت ﷺ کے جرم کے مرتکب کے لیے سزائے موت کافی ہے؟

توہین رسالت ﷺ کے جرم کے مرتکب کا انجام کیا ہونا چاہیے؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں کسی وحید الدین خان، کسی فاروق حیدر مودودی، کسی ڈاکٹر مہدی حسن، کسی مبشر حسن، کسی عاصمہ جہانگیر، کسی حنا جیلانی، کسی شیری رحمٰن، کسی جاوید غامدی، کسی کامران خان، کسی ہود بھائی، کسی فارغ البال والعقل مالک، کسی پرویز مشرف سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ جاننے کے لیے ہم غازی علم الدین شہید، غازی عبدالقیوم شہید، غازی عبدالمنان اور غازی عامر نذیر چیمہ شہید کی زندہ قبروں اور پاک تربتوں پر حاضر ہوں گے۔ وہ زندہ قبریں اور پاک تربتیں جو اہل عزم و ہمت کے لیے زیارت گاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان قبروں اور تربتوں کی خاک پاک قیامت تک کے لیے شمع رسالت کے پروانوں کی آنکھ کا سرمہ ہے۔ ان تربتوں کی یہ زندہ خاک آج کے تمام عالم اسلام سے بڑھ کر زندہ و پائندہ ہے۔ یہ تربتیں پیغام دے رہی ہیں کہ: ''جب تک ایک بھی مسلمان زندہ ہے، وہ ناموس رسالت ﷺ کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو قوت سے ختم کر کے رہے گا۔ اس معاملے میں مسلمانوں کو نہ تو کسی دنیوی قوانین تعزیرات کی پروا ہے، نہ پھانسی کے پھندے کی۔

ہمیں امریکہ، آسٹریلیا، روس، برطانیہ، جرمنی، فرانس، سپین، ڈنمارک، ناروے، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ سے کوئی غرض نہیں۔ یہ ممالک کبھی ہمارے آئیڈیل نہیں رہے۔ ان ممالک میں رائج افکار و اقدار اور قوانین و دساتیر سے ہمارا کوئی فکری، نظری، تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، روحانی اور نظریاتی رشتہ نہیں۔ دنیا کے اور ممالک کے تو ہم ٹھیکیدار نہیں، ہمیں کیا کہ ان کے چمن زاروں کی ڈالیوں پر بلبلوں کے نشیمن آباد ہیں یا وہاں الوؤں نے آشیاں بندی کر رکھی ہے۔ ہمیں تو غرض اسلامی جمہوریہ پاکستان سے ہے۔ محمد عربی ﷺ کے نعلین پاک کی مقدس گرد کے صدقے شب قدر کی نورانی ساعتوں میں تخلیق پانے والے اس خطہ پاک سے

ہے۔ ہمارا تعلق تو مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے انقلابی نظریات و افکار کی آغوش سے جنم لینے والی اس دھرتی سے ہے۔ ہمارا رشتہ اگر ہے تو

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اپنی ملت پہ قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

در دل مسلم مقام مصطفیٰ ﷺ ست
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ ﷺ ست

کی محمد ﷺ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کردے

بہ مصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

کے پیغام کو عام کرنے والے حکیم الامت علامہ اقبالؒ اور ان کے خوابوں کی تعبیر اس کشور حسین سے ہے۔

جی ہاں! ہمیں غرض ہے تو اس ملک سے ہے جس کا مقدمہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سربراہ محمد علی جناح قائداعظم نے لڑا، نہ کہ کسی آل انڈیا لبرل پارٹی، آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی یا آل انڈیا سیکولر لیگ نے۔ یہ شخص قائداعظم کہلایا ہی اس لیے کہ اُس کے نام کا پہلا لفظ محمد اور دوسرا علی تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ جب تک وہ ان ہستیوں کے نام اور پیغام پر قوم کو متحد ہونے کی

دعوت نہیں دے گا، کامیاب نہیں ہوگا۔

تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم کی موجودگی میں سینکڑوں اجتماعات میں یہ نعرہ لاکھوں بار گونجا کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ (لا الہ الا اللہ) قائداعظم نے یہ ملک لا الہ الا اللہ کے اغراض ومطالب کی عملی تنفیذ اور جغرافیائی توسیع کے لیے بنایا تھا۔ بقول قائداعظم "ہم پاکستان کو اسلامی قوانین کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔"

1947ء سے قبل ایک قائداعظم تو کیا، کھربوں قائداعظم بھی اگر مل کر برصغیر کے مسلمانوں کو ایک الگ سیکولر یا لبرل ریاست کے حصول اور قیام کی دعوت دیتے تو ان کی پکار پر برصغیر کا ایک مسلمان بھی لبیک نہ کہتا۔ برصغیر کے مسلمان محمد علی جناح کے رُوپ میں اسلام کی فطری پکار پر لبیک کہہ رہے تھے۔ قائداعظم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ ایک الگ سیکولر ریاست کے قیام کے لیے میدان عمل میں اترے ہیں۔

یہ درست ہے کہ قائداعظم تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے تھے لیکن بے مغز، کور بصر اور عقل کے اندھے دانشوروں سے کون کہے کہ اسلام اور رُوح اسلام بذات خود تھیا کریٹک سٹیٹ کے مخالف ہیں۔ اسلامی تاریخ میں کبھی اور کسی بھی دور میں تھیا کریٹک اسٹیٹ قائم نہیں ہوئی۔ یہ تھیا کریٹک سٹیٹ کا تصور سرتا پا عیسائی دنیا کے ہاں پایا جاتا ہے۔ جب قائداعظم یہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں ہوگا تو برطانیہ کے مسیحی سامراج اور اس کے مسیحی وائسرائے کو کھلے لفظوں میں یہ بتا رہے تھے کہ اب پاکستان میں عیسائی نظریات، تصورات، رجحانات ومیلانات، اقدار اور افکار اور تہذیب وثقافت کے غلبے کی کسی بھی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔

ڈاکٹر عامر لیاقت حسین

بے شرم ہڈیوں سے لپٹا احسان فراموش گوشت

55 سالہ ہم جنس پرست سوئڈش کارٹونسٹ لارس ولکس Larse Vile ذہنی مریض ہے نہ سستی شہرت کا طالب...... البتہ مغرب کے اُس مخصوص رویے کا چہرہ اور ترجمان ضرور ہے جہاں تعصب کی شکنوں اور برتری کے زعم کو تہذیب کا جوہر قرار دیا جاتا ہے...... 30 ستمبر 2005ء کو ڈنمارک کے اخبار جیلنڈ پوسٹن کے صفحات پر بکھری ہوئی غلاظت کو شاید اِسی کارٹونسٹ نے چاٹ کر اپنے معدے میں نفرت سے محفوظ کر رکھا تھا اور 19 اگست 2007ء کو اسٹاک ہوم کے مقامی اخبار Nerikes Allenda کے قرطاس اُسی کی الٹی سے سَنے اور بدبو سے بھرے ہوئے تھے...... کیا وجہ ہے کہ اپنی بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کے برہنہ رقص دیکھنے والے...... بے لباس رہنے پر فخر کرنے والے...... شراب اور سؤر کو اپنی غذا کا حصہ بنانے والے اور کتوں کا منہ چوم چوم کر انسانی زندگی کے حیوانی مزے لوٹنے والے یہ چوپایوں سے بدتر انسان وقفے وقفے سے نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخیاں کرتے ہیں......؟ کبھی ملکہ برطانیہ کی جانب سے ملعون رُشدی کو "برٹش نائٹ ہڈ" کا خطاب دیا جاتا ہے تو کبھی عورتوں اور زیر جامے پر (نعوذ باللہ) مقدس کلمات لکھے جاتے ہیں...... کبھی امریکی افواج کی جانب سے افغانستان کے صوبے خوست میں ایسے فٹ بال گرائے جاتے ہیں جن پر سعودی عرب کا پرچم اور کلمہ طیبہ چھپا ہوتا ہے تو کبھی گوانتا ناموبے کے ٹوائلٹس میں (معاذ اللہ) قرآن کریم کے مقدس اوراق شہید کیے جاتے ہیں......! کہیں یہ مسلمانوں کی دینی حرارت اور مذہبی غیرت ماپنے کا پیمانہ تو نہیں......؟ کہ مسلمانوں کے سینے میں جلتی ہوئی آتشِ عشق سرد ہوگئی یا اب بھی بھڑک رہی ہے......؟ مدت سے یہود و نصاریٰ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے عشق کے پیمانے صرف اپنے نبی ﷺ کی محبت سے نہیں بھرے بلکہ گستاخ سے نفرت، جاں نثاری کی ابتدائی منزل ہے...... اور شاید گاہے بگاہے بے ہودہ، گھٹیا، رکیک اور غلیظ حملے کرکے یہ اِسی غیرتِ ایمانی کو جانچتے رہتے ہیں...... کیونکہ ان کے ہاں تو اللہ اور اُس

کے رسولوں کی توہین محض ایک کاروبار اور آزادی اظہار ہے اور یہ اسی آزادئ اظہار کے نام پر نفرت کے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے تہذیب، احترام اور شائستگی کو ہر روز بے دردی سے قتل کرتے ہیں...... ان کے ہاں تو اللہ، رسول اور مقدس کتاب کی توہین کے بعد جاں خلاصی کے لیے باقاعدہ نرخ مقرر ہیں...... مسیح اللہ کو برا کہنے والا امریکہ میں ہے تو جنرل لا کے Chapter 272 کے سیکشن 36 کے مطابق اسے صرف تین سو ڈالر دینے ہیں اور چھوٹ جانا ہے...... یعنی یسوع مسیح کی توہین یہ برداشت کر لیتے ہیں مگر تین سو ڈالر کے عوض...... بے شرمی کی انتہا ہے، سؤر کھاتے ہیں نا اسی لیے...... اور اگر شاتم رسول یا نظریہ تثلیث (Trinity) کا مذاق اڑانے والا برطانیہ میں ہے تو وہاں کے Blasphemy Law کے مطابق پانچ سو پاؤنڈ جرمانے کی ادائیگی کے بعد اُسے یہ کہہ کر چھوڑ دیا جائے گا کہ ''آئندہ ایسا نہیں کرنا ورنہ دوبارہ پانچ سو پاؤنڈ دینے پڑیں گے!'' اور یہاں پر بھی نوٹ لے کر ''توہین آمیز نوٹ'' قبول کر لیا جاتا ہے...... اسی طرح فن لینڈ کے Penal Code کے Chapter 17 کے سیکشن 10، جرمنی کے Penal Code کے آرٹیکل 166، آئرلینڈ کے Irish Consitution، ہالینڈ کے Penal Code کے آرٹیکل 147، نیوزی لینڈ کے Crime Act 1961 کے سیکشن 123، ناروے کے نورویجئین Penal Code کے سیکشن 142، اسپین کے Penal Code کے آرٹیکل 525 اور سوئٹزرلینڈ کے Penal Code کے آرٹیکل 261 میں ''گالی دو تو پیسہ دو'' کا قانون آج بھی یہودا کی ایما پر یسوع مسیح کو سولی پر چڑھانے کا حکم دینے والے بادشاہ پیلاطوس کی اُس ننگی روایت کو تسکین پہنچا رہا ہے کیونکہ اُس نے (مسیحی بھائیوں کے عقیدے کے مطابق کیونکہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں) یسوع مسیح کو قتل کرنے کے بعد بی بی مریم علیہا السلام کو ''خون بہا'' ادا کرنے کی پیش کش کی تھی اور نبی پیدا کرنے والی پاک ماں نے اُسے دھتکار دیا تھا...... مگر یہ تو پیسے لے لیتے ہیں اور پال، پیٹر، جاشوا، لوکس، متی، جیمس اور برناباس کے سینوں پر چھریاں چلاتے ہیں دوسری جانب پاکستان، سعودی عرب اور ایران فخر کرتے ہیں کہ حضور پر نور، شافع یوم النشور، فخر دوجہاں اور نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات بابرکات ہماری نگاہوں کا مرکز ہے اور ان خطوں میں توہین رسالت کرنے والا، بالخصوص بدبخت مسلمان پیسے دے کر نہیں، جان دے کر ہی چھوٹتا ہے...... ہمارے نزدیک ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ اُن ہاتھوں کو قطع کر دیا جائے جو نبی ﷺ کی گستاخی رقم کرتے ہیں...... اُس زبان کو کھینچ لیا جائے جو اہانت

اور تضحیک کی مرتکب ہوتی ہے...... اُن آنکھوں کو نکال لیا جائے جن میں لفظ "محمد ﷺ" دیکھ کر بغض کے ڈورے تیرنے لگتے ہیں...... یہ جذبہ صادق نہ صرف ایمان کی اساس ہے بلکہ خود ایمان ہے کیونکہ جہاں حضور ﷺ سے عشق و محبت، ایمان کا تقاضا ہے، وہیں گستاخ کے ساتھ نفرت اور غیظ و غضب بھی ایمان کا اُبال ہے...... دونوں کو ایک دوسرے جدا نہیں کیا جاسکتا بلکہ حقیقت تو ہے کہ ہم زندہ ہی اس ناموس کی برکت سے ہیں...... جب تک اِس سے وابستگی اور غیرت ایمان کا استنباط ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ہے، تب تک ہم بھی زندہ رہیں گے...... اگر یہ رشتہ کٹ گیا، کمزور پڑ گیا، دراڑ آ گئی یا متزلزل ہوگیا تو سمجھ لیجیے کہ ایمان کمزور ہوگیا، یقین لرز گیا، عقیدے اور عقیدت کا پودا جل گیا اور ہم زندوں سے بدتر ہوگئے...... دل میں نبی آخرالزماں ﷺ کی محبت و عقیدت نہ ہونا بھی ایک طرح سے بے ادبی ہے اور گستاخی کرنا یا گستاخ کے لیے نرم گوشہ رکھنا گناہِ کبیرہ ہے جبکہ اُس کو ٹھکانے نہ لگانا ایک ناقابلِ عفو جرم ہے...... اگر کسی شخص نے شہنشاہ عالمین ﷺ کے عہد مبارک میں توہین کی اور آپ ﷺ نے اُسے معاف فرما دیا تو یہ حسن خلق اور وصف رحمت للعالمین تھا لیکن امت سے کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں...... حضور ﷺ اپنا حق معاف فرما سکتے ہیں لیکن اگر امتی کسی بدزبان کو نظر انداز کردے تو یہ حسن خلق نہیں، بے حمیتی اور بے غیرتی ہوگی۔ لہٰذا کتوں کی زبان چوس چوس کر بڑے ہونے والے ان مغربی دانشوروں کو اب یہ جان لینا چاہیے کہ تواتر سے کی جانے والی یہ گستاخیاں بین المذاہب ہم آہنگی کی اُن کوششوں پر بھی کاری ضرب لگا رہی ہیں جن کے ذریعے شاید مستقبل میں تہذیبوں کے ممکنہ تصادم کو روکا جا سکتا ہے...... ان حالات میں پاکستانی وزیر خارجہ جناب خورشید محمود قصوری کی اِس تجویز کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ "اسلامی ممالک، توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کا معاملہ اقوام متحدہ میں اٹھائیں کیونکہ مغربی میڈیا مسلمانوں کی دل آزاری کے ذریعے نفرتوں کے بیج بو رہا ہے"...... رہی بات سوئیڈش کارٹونسٹ، رُشدی، جیلنڈ پوسٹن کے ایڈیٹر، تسلیمہ نسرین یا ان جیسے دیگر گستاخانِ رسول ﷺ کی...... تو یہ جان لینا چاہیے کہ "بدترین گناہوں کے باوجود اللہ کی نعمتیں ملنے پر بغلیں بجانے والے اِسے اُس کی ڈھیل سمجھیں کیونکہ جس دن رسی کھنچ گئی اور رحمانیت کے بحرِ بیکراں سے قہر کے صرف ایک قطرے نے اِن پر برسنے کی اجازت مانگی تو جہاں یہ ہنستے اور بستے ہیں، وہیں یہ قطرہ ناموسِ رسالت کا شہید بن کران کی بے شرم ہڈیوں سے اُس احسان فراموش گوشت کو علیحدہ کردے گا جو صرف چیل اور کووں کی امانت ہے"......!!

حامد میر

سب سے بڑی سچائی

گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد دہشت گردی کے خلاف نام نہاد عالمی جنگ شروع کرنے والوں کا دعویٰ تھا کہ ان کا ہدف مسلمان نہیں بلکہ صرف چند انتہا پسند ہیں۔ چند انتہا پسندوں کے خلاف شروع ہونے والی اس جنگ کو افغانستان سے عراق منتقل کیا گیا تو مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت میں یہ تاثر تقویت پکڑنے لگا کہ یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں بلکہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہ تاثر ابھرا کہ مغربی ممالک اس جنگ کے نام پر ایک طرف مسلم ممالک کے قدرتی وسائل لوٹنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف انہیں ذہنی غلام بنانے کے لیے ان کے عقیدے پر بھی حملے شروع ہو گئے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد دنیا بھر میں دہشت گردی کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان خلیج بھی کم ہونے کی بجائے وسیع ہو رہی ہے۔ افسوس کہ مغربی ذرائع ابلاغ ان بڑھتے ہوئے فاصلوں کی ذمہ داری ہمیشہ طالبان، القاعدہ یا ''اسلامی انتہا پسندوں'' پر عائد کر کے خود کو بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ مسلم ممالک میں مغربی مفادات کی ترجمانی کرنے والے کرائے کے قلمی سپاہیوں کی بھی کمی نہیں۔ کرائے کے ان قلمی سپاہیوں نے مغرب پر تنقید کرنے والوں یا مغرب کی نفرت میں ہتھیار اٹھا لینے والوں کے لیے ''جہادی'' کی اصطلاح کا استعمال شروع کیا اور اب یہ قلمی گوریلے لفظ ''جہادی'' کو صرف طعنے کے لیے نہیں بلکہ گالی کے لیے بھی استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسلم ممالک میں ''جہادیوں'' کی مخالفت کرنے والے مغرب کے قلمی گوریلے اپنے آپ کو سیکولر اور لبرل کہتے ہیں لیکن ان کے طرزِ فکر کا جائزہ لیا جائے تو یہ انتہا پسندوں سے کم نہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو ایک زمانے میں سرخ انقلاب کے نام پر سوویت یونین سے رقم بٹورا کرتے تھے۔ بعض نے تو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں سرخ انقلاب لانے کے

لیے عسکریت پسندی کا راستہ بھی اختیار کیا۔ آج کل ان میں سے اکثر امریکی حکومت کے منظورِ نظر ہیں اور ہر وقت پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بم برساتے رہنے کا راگ الاپتے ہیں۔ اگر کوئی پاکستانیت کا مارا ہوا صحافی یہ سوال اٹھائے کہ مشرف حکومت نے بھارتی جاسوس کشمیر سنگھ کو تو چھوڑ دیا لیکن اس کے بدلے میں کوئی پاکستانی قیدی کیوں رہا نہیں کروایا تو یہ قلمی گوریلے ایسے صحافیوں کے خلاف آپریشن کلین اپ کرنے کا مطالبہ بھی شروع کر دیتے ہیں۔ پاکستانی عوام کی اکثریت ایک طرف، اور منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے والے یہ چند دانشور دوسری طرف ہیں۔ یہ پوری قوم کو بے وقوف اور اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے ہیں۔ ان کی عقل میں ابھی تک یہ بات نہیں آ رہی کہ مسلم ممالک کے نوجوانوں میں مغرب کے متعلق پیدا ہونے والی انتہا پسندانہ سوچ دراصل لبرل انتہا پسندی کا ردِعمل ہے۔

پچھلے دنوں اسلام آباد کی ایک سفارتی محفل میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ کچھ مغربی سفارتکار ایک پاکستانی ماہر اقتصادیات کے ساتھ ہالینڈ کے ایک فلم ساز کے خلاف ہونے والے مظاہروں پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ یہ پاکستانی ماہر اقتصادیات طویل عرصہ تک امریکہ میں رہے جہاں وہ عالمی بینک میں ملازمت کرتے تھے اور چند سال پہلے ہی پاکستان واپس آئے ہیں۔ مغربی سفارتکار اس امریکہ پلٹ پاکستانی سے کہہ رہے تھے کہ ہالینڈ کے ایک رکن پارلیمنٹ جیٹ ویلڈرز نے قرآن پاک کے خلاف فلم بنا کر آزادیٔ اظہار کا حق استعمال کیا ہے اور پاکستانیوں کو اس فلم کے خلاف جلسے جلوسوں کے ذریعہ اپنی جہالت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ امریکہ پلٹ پاکستانی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ مغربی سفارتکاروں سے کہا کہ یہ مظاہرے بند ہو سکتے ہیں اگر آپ گستاخ ویلڈرز کو پکڑ کر گوانتانامو بے جیل بھیج دیں۔ تمام سفارتکاروں نے اس رائے کو مذاق سمجھ کر ٹال دیا لیکن امریکہ پلٹ دانشور سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا کہ اگر گستاخ ویلڈرز کو گوانتانامو بے نہیں بھیجا جا سکتا تو ایک اور طریقہ ہے۔

مغربی سفارتکاروں نے بڑی دلچسپی سے پوچھا کہ وہ کیا؟ امریکہ پلٹ دانشور بولے کہ آپ ایک جاسوس طیارہ ہالینڈ بھیجیں اور اس طیارے سے میزائل مار کر آپ اپنے گستاخ فلم ساز کو جہنم رسید کر دیں۔ یہ سن کر ایک خاتون سفارتکار سیخ پا ہو گئیں۔ امریکہ پلٹ پاکستانی دانشور نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ کیا گوانتانامو بے جیل اور تمہارے جاسوس طیاروں کے میزائل صرف مسلمانوں کے لیے ہیں؟ مسلمانوں کے محبوب نبی ﷺ اور

قرآن کو برا بھلا کہنا کیا آزادئ اظہار ہے؟ تم لوگ آزادئ اظہار کے اتنے ہی متوالے ہو تو ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کے مبینہ قتلِ عام کی سچائی کے بارے میں سوال اٹھانے پر مغرب میں کیوں پابندی ہے؟ غصے میں سرخ ہونے والی خاتون سفارتکار کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ اپنے سینڈل چٹخاتی ہوئی محفل سے واک آؤٹ کر گئی۔ اس کی طبیعت کسی اسلامی مدرسے کے طالب علم یا جنوبی وزیرستان کے عسکریت پسند کی گفتگو سے خراب نہ ہوئی تھی بلکہ عالمی بینک میں کئی سال تک ملازمت کرنے والے ایک ایسے امریکہ پلٹ دانشور نے اسے لاجواب کیا جس کے دل میں اسلام کے لیے درد باقی تھا۔ مغربی حکومتوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ مغرب کے خلاف نفرت صرف اسلامی مدارس کے طلبہ اور قبائلی علاقوں کے نوجوانوں تک محدود نہیں بلکہ یہ نفرت مسلم ممالک کے علاوہ غیر مسلم ممالک کے ہر طبقے میں پھیل چکی ہے۔

ہالینڈ کے گستاخ فلم ساز جیٹ ویلڈرز کے بارے میں اس کے اپنے ملک کے اخبار ٹیلیگراف نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ پچھلے چند سال میں 40 دفعہ اسرائیل کا دورہ کر چکا ہے اور ہیگ میں اسرائیلی سفارتخانے سے ہدایات لیتا ہے۔ قرآن کے خلاف فلم بنانے کے لیے جیٹ ویلڈرز کو تمام سرمایہ اسرائیل نے فراہم کیا ہے تاکہ اس فلم کے ذریعہ دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا جائے۔ قرآن کے خلاف فلم کا معاملہ ہو یا نبی کریم ﷺ کے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کا تنازعہ ہو، ہمارے ملک میں رہنے والے مغرب کے لکھاری اس لبرل انتہا پسندی کی مذمت میں کچھ لکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ جب تک یہ مذہبی انتہا پسندی کے مقابلے پر لبرل انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے رہیں گے، اس وقت تک معاشرے میں امن قائم نہیں ہوگا۔ ان دوستوں سے ہاتھ باندھ کر گزارش ہے کہ لفظ جہاد کو اپنی طعنہ زنی کے لیے استعمال نہ کریں۔ جہاد کا لفظ بار بار قرآن میں آیا ہے۔ ہالینڈ کے گستاخ فلم ساز جیٹ ویلڈرز نے بھی قرآن میں جہاد کے لفظ پر اعتراض کیا ہے اور ہمارے بعض دانشور بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر لفظ ''جہادی'' کو گالی بنانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ حضرات نام نہاد جہاد کرنے والوں پر ضرور تنقید کریں لیکن لفظ جہاد کی توہین سے گریز کریں کیونکہ اس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

ارشاد احمد حقانی

آزادیٔ اظہار کی آڑ میں اسلام سے عیسائی مغرب کا بغض

ڈنمارک کے اخبار "Jyllands Posten" میں گزشتہ ستمبر کو نبی ﷺ کے جو 12 بے ہودہ اشتعال انگیز اور احمقانہ کارٹون شائع ہوئے تھے، ان کے خلاف عالم اسلام میں جو احتجاج جاری ہے، اس کی شدت اور وسعت نے بعض مغربی مبصرین کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کا ردعمل دنیا کے تمام کونوں میں اس قدر شدید کیوں ہے؟ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اپنے پیغمبر ﷺ کی محض شبیہہ شائع کرنے کے بھی مخالف ہیں، چہ جائے کہ کوئی اخبار ان کے بارہ ایسے کارٹون شائع کر دے جو کارٹون سے زیادہ Caricatures ہیں اور جن میں نعوذ باللہ آپ ﷺ کو ایک دہشت گرد کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان خاکوں کی اشاعت کا اس سے زیادہ کمزور دفاع اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ یہ آزادی اظہار کا ایک مظہر ہیں اور مغربی حکومتیں اپنے اپنے قوانین کے تحت پریس کی آزادی پر کوئی قدغن عائد نہیں کر سکتیں۔ مغربی مبصرین اس حقیقت پر چاہے جس قدر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کارٹونوں کی اشاعت اور پورے یورپ کے متعدد اخبارات میں ان کی دوبارہ اشاعت اس کینے اور نفرت کی آئینہ دار ہے جو عیسائی یورپ مسلمانوں، اسلام، عالم اسلام اور ہادی برحق ﷺ کے بارے میں رکھتا ہے۔ ڈنمارک کے مذکورہ اخبار نے اگر ایک حماقت کر ہی دی تھی تو متعدد یورپی اخبارات کو ان کارٹونوں کی دوبارہ اشاعت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس عمل کی کوئی توجیہہ اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ عیسائی مغرب کے نام نہاد علمی اور سیاسی حلقوں میں اسلام کے خلاف جو نفرت پائی جاتی ہے، وہ اس قدر شدید ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی اہانت کرنے والے خاکوں کو بڑے شوق سے شائع کیا اور دلیل یہ دی کہ وہ آزادی صحافت کے اصول کی حمایت کر رہے ہیں اور مذکورہ اخبار سے اپنی یکجہتی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں۔ زیر

نظر واقعے نے ایک دفعہ پھر اس نفرت اور کینے کو نمایاں کردیا ہے جو جمہوریت اور سیکولرازم کے تمام تر دعوؤں کے باوجود مغربی ذہن اور ضمیر میں جاگزیں ہے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ متعدد یورپی ممالک کے بڑے بڑے ثقہ اخبارات بھی فوری طور پر ان خاکوں کی اشاعت کی ضرورت محسوس کرتے۔ عین ممکن ہے کہ بعض مشتعل ہجوموں نے متعلقہ ممالک کے سفارتخانوں پر حملہ کرکے اور انہیں آگ لگا کر اپنے جذبات کا نامناسب اور غیر معتدل اظہار کیا ہو۔ اس کی بجائے یہ بہتر ہوتا کہ مسلمان اور ان کی تنظیمیں متعلقہ ممالک کا تجارتی مقاطعہ کرنے اور ان کے خلاف اپنے اپنے ملک کی عدالتوں میں مقدمہ درج کرانے کا راستہ اختیار کرتیں۔ بعض ممالک میں مسلمانوں نے یہ راستہ اختیار کیا بھی ہے لیکن مسلمان عوام پیغمبر ﷺ اسلام کے بارے میں عقیدت و احترام کے جو جذبات رکھتے ہیں جب ان کو دانستہ اور شعوری طور پر ٹھیس پہنچائی جائے تو کچھ لوگوں کا قانون اپنے ہاتھ میں لے لینا اور تشدد کے واقعات پر اتر آنا افسوسناک ہونے کے باوجود ناقابل فہم نہ ہونا چاہیے۔ بعض امریکی اور برطانوی مبصرین نے ڈنمارک کے اخبار میں شائع ہونے والے خاکوں کی مذمت بھی کی ہے لیکن صدر بش اور وزیراعظم ٹونی بلیئر نے ڈنمارک کے وزیراعظم کے ساتھ اظہار یکجہتی کرکے اپنے خبث باطن کا ثبوت دے دیا ہے اور یہ بات اب قریب قریب طے سمجھی جانی چاہیے کہ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مسلم اور عیسائی تہذیبوں کے درمیان ایک بنیادی اختلاف بلکہ تصادم کے عوامل پائے جاتے ہیں۔ مغربی ممالک نے ماضی کے بعض واقعات کی طرح اس دفعہ بھی مسلمانوں کو مشتعل کرنے میں پہل کی ہے اور جو لوگ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ مذکورہ کارٹونوں کی اشاعت تہذیبوں کے تصادم کا کوئی اظہار نہیں ہے وہ اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مغرب روشن خیالی، انسانی حقوق، سیکولرازم اور جمہوریت کا علمبردار ہونے کا مدعی ہے لیکن اس کے دہرے معیار زیر نظر واقعے نے بالکل آشکار کردیے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ مسلمان تشدد اور تخریب کاری کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے مغربی ممالک اور ان کے اخبارات کے خلاف زیادہ بہتر تدابیر اختیار کریں۔ مسلمانوں کو اپنے طاقتور اور موثر ٹی وی چینل قائم کرنے چاہئیں۔ جن سے اسلام کی حقیقی تعلیمات کو سامنے لانے میں مدد مل سکے اور جو عیسائی اور مغربی حلقے لاعلمی اور کم فہمی کی وجہ سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے کدورت رکھتے ہیں ان کے رویے میں کچھ اعتدال لایا جاسکے۔

مقام افسوس ہے کہ ڈنمارک کے وزیراعظم Andrs Fogh Rasmussen نے ہفتہ وار ''الاہرام'' کو جو تفصیلی انٹرویو دیا ہے اس میں انہوں نے کارٹونوں کی اشاعت پر صاف اور واضح معافی مانگنے سے گریز کیا ہے اور متعین سوال کے جواب میں صرف آئیں بائیں شائیں کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح صدر بش نے اپنے حالیہ سٹیٹ آف دی یونین پیغام میں یہ کہنا مناسب سمجھا ہے کہ ''ریڈیکل اسلام'' کو شکست دینا ان کی حکومت کی اہم ترجیح ہے۔ صدر بش اور امریکی حکومت کو یہ واضح کرنا چاہیے کہ ''ریڈیکل اسلام'' سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیا ہر اس فرد اور قوم اور حکومت کا اسلام ریڈیکل اسلام ہے جو امریکی استعماری ہتھکنڈوں کا مخالف ہے؟ جبکہ انہیں قدامت پرست لیکن امریکی حکومت کے ہمنوا حلقوں کا اسلام قابل قبول ہے۔ صدر بش کے مذکورہ اعتراف کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ ان کا اصل بغض دین اسلام سے ہے اور وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے ریڈیکل کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں۔ مغربی ڈنمارک میں مسلمانوں کی 25 قبروں کی بے حرمتی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عیسائی بغض کا ایک اور اظہار ہے۔
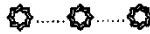
بی بی سی

اظہارِ آزادی کا امتحان

پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں کارٹونوں کی اشاعت کے جواب میں ایران کے ایک اخبار نے ہالوکاسٹ پر مبنی کارٹونوں کے ایک مقابلے کے انعقاد کا اعلان کیا ہے۔ اخبار ہمشاہری کا کہنا ہے کہ اس مقابلے کا مقصد آزادی اظہار کی حدود کی آزمائش ہے جسے مغربی اخبارات پیغمبرِ اسلام ﷺ کے کارٹون شائع کرنے کے جواز میں دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران جرمنی کے ہاتھوں یہودیوں کی نسل کشی کے لیے ہالوکاسٹ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

مسلم دنیا میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں کارٹونوں کی اشاعت کے بعد مسلسل احتجاج جاری ہے اور اسے توہینِ رسالت ﷺ سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ ایران کے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے اخبار ہمشاہری نے سوال اٹھایا ہے کہ: ''کیا مغرب کی اظہارِ آزادی کی وسعت ہالوکاسٹ تک بھی ہے یا پھر آزادی کا یہ اظہار آسمانی مذاہب کی بے حرمتی تک محدود ہے؟'' اخبار نے ایسے کارٹون شائع کرنے کی بات بھی کی ہے کہ جن میں امریکہ اور اسرائیل کے ''جرائم اور لوٹ مار'' کا نقش بھی ہو۔ ایران کے قدامت پسند حکمران ہالوکاسٹ کی ازسرِ نو تشریح کرنے والے مؤرخوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ان مؤرخوں کا استدلال ہے کہ جرمنی کے ہاتھوں یہودیوں کی ہلاکتوں کے معاملے کو سیاسی مقاصد کی غرض سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ گرافکس ایڈیٹر فرید مرتضوی نے جنہوں نے کارٹونوں کے مقابلے کا اعلان کیا، مغربی اخباروں کو چیلنج کیا ہے کہ وہ ایران میں مستقبل میں شائع ہونے والے ہالوکاسٹ پر مبنی کارٹونوں کو بھی اسی طرح شائع کریں جیسے انہوں نے کچھ مغربی ممالک میں پیغمبرِ اسلام ﷺ سے متعلق شائع ہونے والے کارٹون کی دوبارہ اشاعت کی ہے۔

اخبار ہالوکاسٹ پر مبنی بارہ بہترین کارٹون بنانے والوں کو انعام کے طور پر سونے

کے سکے دے گا۔ کارٹونوں کی تعداد بارہ رکھنے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ڈنمارک کے اخبار میں بھی بارہ کارٹون شائع کیے گئے ہیں۔ اخبار کا کہنا ہے کہ اس کا طرزِ عمل انتقامی نہیں اور نہ غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اخبار نے یہ بھی کہا ہے کہ تیرہ فروری کو کارٹونوں کے مقابلے کی مکمل تفصیلات لوگوں کے سامنے رکھ دی جائیں گی۔ یہودیوں کے حقوق کی ایک تنظیم نے ایرانی اخبار کے اعلان کردہ کارٹونوں کے مقابلے کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ ''یہ ہٹلر کے اس فارمولے کی پیروی ہے جس کے مطابق اگر کہیں بھی کوئی گڑ بڑ ہوئی ہے تو اس کے ذمہ دار یہودی ہیں۔''

عبداللہ

آزادیٔ اظہار کے علمبردار یورپ سے 39 سوال

1- کیا مغربی ملکوں میں توہین ادیان، ہتک عزت یا مذہبی دل آزاری کرنے والوں کے خلاف کوئی قانون موجود نہیں؟

2- برطانیہ میں آج تک نافذ العمل توہین عیسائیت قانون (Blasphemy Law) کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ آزادیٔ اظہار پر قدغن نہیں؟

3- 1990ء کی دہائی میں آسٹریا میں بھی ایسا ہی ایک کیس عدالت میں لایا گیا جس میں اوٹو پریمینگر انسٹی ٹیوٹ (Otto Preminger Institute) کو فریق بنایا گیا۔ کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ برطانیہ کے علاوہ دیگر یورپی ممالک میں یہ قانون کسی نہ کسی طرح موجود ہے؟

4- برطانیہ میں موجود قانون کا دائرہ کار صرف چرچ (عیسائیت) کے تحفظ تک کیوں محدود ہے؟

5- برطانوی ماہرین قانون کے مطابق اگر برطانیہ میں دیگر مذاہب کے لوگوں کے لیے کوئی قانون ہے بھی تو اس کی حیثیت ''کسی کی ذاتی شناخت'' ہے نہ کہ ''کسی کے عقائد'' کی۔ اس مذہبی تفریق کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

6- یورپی ممالک کو آئین کے مطابق جہاں ایک طرف آزادیٔ اظہار کا احترام کرنا ہے، وہیں وہ اقلیتوں پر ہونے والے زبانی اور عملی حملے روکنے کے بھی پابند ہیں۔ کیا یہ مشکل ترین کام نہیں؟ کیا انسانی حقوق کے حوالے سے یہ تضاد کا حامل نہیں؟

7- 1989ء میں ایک فلم (Visions of Ecstacy) بنائی گئی جو سینٹ تھیریسا آف ایبے ویلا کے ویژن کے موضوع پر تھی۔ برطانوی بورڈ نے اس فلم کی ریلیز روک دی تھی کیونکہ اس کے نزدیک یہ توہین مذہب (یا چرچ) کے دائرے میں آتی

ہے۔ حالانکہ وہ ثابت بھی نہیں کر سکے تھے۔ فلم سچ مچ توہین آمیز ہے۔ لیکن جیلنڈز پوسٹن نامی ڈنمارک کے اخبار میں توہین آمیز خاکوں کی اشاعت پر ٹونی بلیئر کا ڈنمارک کے وزیراعظم کو فون اور اس کے ساتھ یکجہتی کا اظہار، کیا برطانوی دوغلے پن کو ثابت نہیں کر رہا؟ کیا ان کے نزدیک فلم کا اجرا روکنا اظہار رائے کی آزادی پر قدغن نہیں تھا؟

8- حیران کن بات یہ ہے کہ فلم میکر وینگرو نے 1996ء میں یورپی عدالت میں کیس دائر کر دیا۔ اس نے بھی یہ دعویٰ آزادیٔ اظہار کی بنیاد پر کیا تھا۔ مگر یورپی عدالت نے بھی فیصلہ اس کے خلاف دیا۔ کیا یہ واقعہ اسلام کے حوالے سے یورپی ممالک کے دوغلے طرز عمل کو آشکار نہیں کرتا؟

9- کیا یورپی عدالت میں اس کیس کا دائر کرنا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہاں اس حوالے سے قوانین موجود ہیں؟ لیکن وہ صرف ان کے اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے ہیں؟

10- کیا یورپی عدالت کا برطانوی حکومت کے حق میں فیصلہ دینا یہ ثابت نہیں کرتا کہ انہوں نے مذہبی تعظیم کو آزادیٔ اظہار پر فوقیت دی؟

11- ڈنمارک کے کریمینل کوڈ کے سیکشن 140 کے مطابق "ہر وہ شخص جو ملک میں قانونی طور پر مقیم کسی فرد یا کمیونٹی کے مذہب یا عبادات اور دیگر مقدس علامات کی تضحیک کرے گا، اسے زیادہ سے زیادہ چار ماہ کی قید یا جرمانہ کی سزا دی جاسکے گی۔" کیا جیلنڈز پوسٹن نامی ڈنمارک کا اخبار اس قانون کی زد میں آتا ہے؟

12- کیا جیلنڈز پوسٹن کے خلاف کریمینل سیکشن 140 کے تحت قانونی کارروائی عمل میں لائے جانے کا امکان ہے؟

13- خود ڈنمارک کی حکومت نے اپنی سرکاری ویب سائٹ www.um.dk پر مندرجہ بالا دونوں سوالات کا جواب ہاں میں دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ڈنمارک کی حکومت مذکورہ اخبار کے خلاف قانونی کارروائی کیوں نہیں کر رہی؟

14- ڈنمارک کے وزیراعظم اخبار جیلنڈز پوسٹن کی اس حرکت کا آزادیٔ اظہار کے نام پر دفاع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا وہ اپنے ہی ملک کے قوانین کو سبوتاژ نہیں کر رہے؟ یا پھر ڈنمارک کے مسلمان وہاں کے قانونی شہری نہیں؟

15- ڈنمارک میں رائج کریمنل کوڈ کے سیکشن 266 بی کے مطابق "ایسا کوئی بھی بیان یا سرگرمیاں جرم ہیں جو کسی بھی کمیونٹی کے افراد کے لیے رنگ، نسل، قومیت، مذہب یا جنس کے حوالے سے دل آزاد ہوں۔" کیا جیلنڈز پوسٹن نے مذہب کی بنیاد پر قانونی طور پر مقیم ڈنمارک کی مسلمان آبادی کی دل آزاری نہیں کی؟

16- اپنی سرکاری ویب سائٹ پر ڈنمارک کی حکومت نے تسلیم کیا ہے کہ ذرائع ابلاغ کو آزادئ اظہار کا حق حاصل ہے مگر کسی قانون کو توڑنے کا نہیں۔ کیا جیلنڈز پوسٹن نے کریمنل کوڈ سیکشن 140 اور سیکشن 266 بی کو نہیں توڑا؟

17- اگر ایسا ہے تو پھر وہ آزادئ اظہار کا سہارا کیوں لے رہا ہے اور دیگر یورپی ممالک کے اخبارات اور خود ان کے حکمران انہیں آزادئ اظہار کی پناہ کیوں فراہم کر رہے ہیں؟

18- مندرجہ بالا حقائق کے باوجود ڈنمارک کے وزیر اعظم نے اپنی سرکاری ویب سائٹ پر جیلنڈز پوسٹن کی حرکت پر معافی مانگنے سے انکار کیوں کیا؟

19- ڈنمارک کے آئین میں آزادئ اظہار کے حوالے سے سیکشن 77 موجود ہے۔ جس کے مطابق "ہر شخص کو اپنے خیالات کی اظہار اور [illegible] چھپنے کی مکمل آزادی ہے مگر اپنے خیالات کے حوالے سے وہ کورٹ آف جسٹس کو جواب دہ ہے۔" کیا جیلنڈز پوسٹن بھی کورٹ آف جسٹس کو جواب دہ ہے؟

20- اگر ہاں (جیسا کہ آئین کہتا ہے) تو کیا کورٹ آف جسٹس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے جیلنڈز پوسٹن سے جواب طلب کیا ہے؟

21- اگر ایسا اب تک نہیں ہوا تو کیا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ خود ان ممالک میں بھی آئین اور قوانین پامال کیے جاتے ہیں؟

22- کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آئین اور قوانین امتیازی ہیں؟

23- ڈنمارک اور دیگر یورپی ممالک میں ہولوکاسٹ کے منکرین کے لیے قانون موجود ہے جس کے مطابق ہولوکاسٹ یعنی نازیوں کی جانب سے یہودیوں کے قتل عام کی کہانی کے کسی ایک جزو سے انکار کرنے والے کو 20 سال قید تک کی سزا ہو سکتی ہے۔ کیا یہ قانون یہودیوں کو یورپ میں دوسروں سے نسلی برتری قرار دینے کا ثبوت نہیں؟

-24 ہولوکاسٹ کے منکرین کے لیے قانون بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

-25 کیا ہولوکاسٹ کا یہ قانون آزادئ اظہار پر قدغن نہیں؟

-26 اگر ڈنمارک اور دیگر یورپی ممالک کے مطابق تمام شہریوں کے حقوق برابر ہیں تو کیا ہولوکاسٹ کے لیے علیحدہ سے قانون بنانا اور مسلمانوں کے مذہبی احترام کے لیے قانون نہ بنانا متضاد تاثر نہیں چھوڑتا؟

-27 کیا ہولوکاسٹ کے منکرین کے لیے قانون کی موجودگی اسلام کے حوالے سے بھی ایسے ہی کسی قانون کو رواج دینے کے لیے جواز فراہم کرسکتی ہے؟

-28 اگر ہاں تو کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یورپی ممالک میں اس حوالے سے قانون سازی کی جائے گی؟

-29 بصورت دیگر کیا آپ اس امکان کو رد کر سکتے ہیں کہ مستقبل میں اسی نوعیت کا یا اس سے بھی زیادہ گھٹیا فعل کا اعادہ ہو؟

-30 اگر ایسا ہوا تو کیا یہ تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کو سچ ثابت نہیں کردے گا؟

-31 انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے حوالے سے یورپی کنونشن کے چارٹر (Rome, 4.XI.1950) کے سیکشن 1 آرٹیکل 9 پارٹ 1 اور 2 کے مطابق "ہر شخص کو آزادئ خیالات، شعور اور مذہب کا حق حاصل ہے۔ اس آزادی میں مذہب کی تبدیلی (اس کے یا بطور برادری) اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنا اسی کی تعلیمات عام کرنا شامل ہیں۔ ان آزادیوں پر معاشرے میں موجود قوانین کے دائرہ کار کے اندر عمل کرنا ہوگا تاکہ یہ آزادیاں کسی دوسرے فرد یا کمیونٹی کے تحفظ، امن و امان اور دیگر افراد یا کمیونٹی کے حقوق اور آزادیوں کو سلب کرنے کا ذریعہ نہ بنیں۔" کیا ڈنمارک سمیت دیگر یورپی ممالک نے یورپی یونین کے اس چارٹر کی پاسداری کی ہے؟

-32 کیا انہوں نے آزادی کے لیے دوسروں کی آزادی اور حق پر ڈاکہ نہیں ڈالا؟

-33 یورپی یونین کے اسی چارٹر کے سیکشن 1 آرٹیکل 10 پارٹ 1 اور 2 کے مطابق "آزادئ اظہار کا مطلب یہ ہے کہ ہر کوئی اپنی رائے کے اظہار کے لیے حکومتی بندشوں سے آزاد ہے۔" کیا اس شق سے کہیں بھی یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ

کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے مذہب یا ذاتی زندگی میں مداخلت کرسکتا ہے؟

34- آزادئ اظہار کی اسی شق کے پارٹ 2 میں صاف طور پر یہ الفاظ درج ہیں:
"Since it carries with it duties & responsibilities"
کیا یہ آزادئ اظہار کے ساتھ ساتھ "فرض شناسی اور ذمہ داری" کی شرط عائد نہیں کرتا؟

35- اگر ہاں تو کیا یورپ کے اخبارات نے فرض شناسی اور ذمہ داری کی شرط پوری کی ہے؟

36- اگر یورپی اخبارات نے یہ شرط پوری نہیں کی تو ان کے حکمران آزادئ اظہار کا تحفظ کیوں فراہم کررہے ہیں؟

37- اسی شق میں یہ جملہ بھی درج ہے کہ "آزادئ اظہار کے حوالے سے ملکی قوانین پامال نہیں کیے جائیں گے تاکہ جمہوری روایات، علاقائی سلامتی، قومی مفادات، دوسرے کے حقوق کی پاسداری اور باہمی اعتماد کو نقصان نہ پہنچے۔" کیا کسی بھی یورپی ملک کے اخبارات نے اس حرکت سے قبل مندرجہ ذیل عوامل پر غور کیا؟

38- مندرجہ بالا شق صاف طور پر آزادئ اظہار کو ملکی قوانین کا گھیرا ڈال کر محدود کرتی ہے۔ کیا ڈنمارک کے اخبار نے اپنے ہی ملک کے کریمنل کوڈ سیکشن 140 اور 266 بی کو پامال نہیں کیا؟

39- کیا یورپی اخبارات کے اس فعل نے یورپی ممالک کی جمہوری روایات، علاقائی سلامتی، قومی مفادات، دوسروں کے حقوق کی پاسداری اور باہمی اعتماد کو تباہی کے کنارے لا کھڑا نہیں کردیا؟

(یہ سوال نامہ پالیسی ریسرچ سنٹر اور روزنامہ "امت" نے مشترکہ طور پر تیار کیا)

لیفٹیننٹ کرنل (ر) سفیر احمد صدیقی

آزادیٔ اظہار رائے اور مغرب کا رویہ

گزشتہ ستمبر 2005ء میں ڈنمارک کے اخبار"Jyllands Posten" نے جب ہمارے رسولِ اقدس، ہادی برحق، سرورِ کونین حضرت محمد ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے توہین آمیز خاکے شائع کیے تو ان دنوں عالمِ اسلام نے احتجاجی آواز ضرور بلند کی لیکن جب گزشتہ ہفتے یورپ کے متعدد ممالک کے اخباروں نے ان قابلِ مذمت خاکوں کو دوبارہ شائع کیا تو جکارتا سے لے کر استنبول تک مسلمان نہ صرف سراپا احتجاج بن گئے بلکہ ان کے غم و غصے نے آتش فشاں کا روپ دھار لیا۔ روئے زمین پر مسلمانوں کے جذبہ ایمانی اور عشقِ رسول ﷺ کا لاوا اتنی تیزی سے بہہ رہا ہے اور ایسا ارتعاش پیدا کر رہا ہے کہ مغربی قوتیں فکر مند ہو کر اس سیلِ رواں کو روکنے کی تدابیر پر غور و خوض کر رہی ہیں۔ انہیں شاید یہ احساس ہو گیا ہے کہ ان کی یہ حرکت نہ صرف مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی مذموم کوشش ہے بلکہ ایسی سازشیں تہذیبوں کے درمیان تصادم کا محرک اور موجب بن سکتی ہیں۔

مجھے امید تھی کہ ڈنمارک کی حکومت اپنے ملک کے اخبار جائی لینڈز پوسٹین کی شرانگیزی پر عالمِ اسلام سے غیر مشروط طور پر معافی مانگ کر مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی ہے بلکہ بہت سے اسلامی ملکوں سے اس نے اپنے سفیر واپس بلا لیے ہیں۔ آیئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کے باوجود وہ معافی مانگنے کا غیر منطقی رویہ کیوں اختیار کیے ہوئے ہے۔ جب جارج بش جیسے Hot Headed صدر نے نائن الیون سے پیدا شدہ صورت حال کے بعد مسلمانوں کے خلاف"Crusade" یعنی صلیبی جنگ کا تصور پیش کیا تھا تو انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے جذبات کی رو میں بہ جانے والی Slip Of tongue کہہ کر مسلمانوں کی غلط فہمیاں دور کی تھی۔ ڈنمارک کی حکومت کا کہنا ہے کہ ان

کے ملک میں آزادی اظہار رائے (Freedom of expression) کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اور اخبار چاہے جو لکھیں حکومت اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتی۔ عالم اسلام کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر کے معافی نہ مانگنا یا ان کے زخموں پر پھاہا نہ رکھنا یقیناً ایسا رویہ ڈنمارک کی حکومت کی مسلم دشمنی پر مبنی مجرم ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر مغرب میں آزادی صحافت کی اتنی قدر و منزلت ہے تو یورپ کے سات ممالک میں یہ کہنا غلط اور غیر قانونی کیوں ہے کہ ہٹلر نے 6 ملین یہودیوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا۔ مغرب کے دوہرے معیار کی ایک اور جھلک ملاحظہ کیجیے: لندن میں فنس بری پارک مسجد کے امام ابوحمزہ کو سات سال کی قید سنا دی گئی کہ جج کے خیال میں امام نے اپنے خطبے میں ایسی اشتعال انگیز زبان استعمال کی تھی جس سے سامعین مشتعل ہو کر قتل و غارت گری کے مرتکب ہو سکتے تھے۔ اس کے برعکس ایک برطانوی جج نے گروہی منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلائے جانے والے ایک ملزم گریفن جو کہ ایک بدنام زمانہ متعصب برطانوی شہری ہے، بغیر کسی سزا کے بری کر دیا۔ گریفن نے اسلام کو بدطینت اور فاسد "Vicious & Wicked" مذہب قرار دیا تھا۔

توہین رسالت ﷺ سے متعلق دو تین واقعات کا ذکر کرنا یہاں غیر مناسب نہ ہوگا۔ دو سال قبل ہالینڈ کے ایک فلم پروڈیوسر نے ایک ایسی فلم بنائی جس میں اسلام، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو تمسخر کا نشانہ بنایا گیا۔ ہالینڈ کے ایک مسلمان سے یہ توہین برداشت نہ ہوئی، اس نے اس پروڈیوسر کو بلا تاخیر قتل کر کے عبرت کا نشانہ بنا دیا۔ 80 کی دہائی میں مکروہ شکل سلمان رشدی نے مسلمانوں کی مقدس کتاب کو اپنے شیطانی نظریات کا ہدف بنایا تو پورے عالم اسلام میں اس ابلیس کے خلاف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ملعون آج بھی زیر زمین ہے۔ بنگلہ دیش کی گمراہ خاتون مصنفہ تسلیمہ نسرین نے سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے یہ اعلان کیا کہ نعوذ باللہ قرآن مجید کو "Revise" کرنے کی ضرورت ہے۔ بنگلہ دیش کے سادہ لوح مسلمانوں کے لیے ایسے توہین آمیز بیان برداشت کے قابل نہ تھے۔ لاکھوں فرزندان توحید ہاتھوں میں درانتیاں لے کر تسلیمہ کو قتل کرنے کے ارادے سے گھروں سے نکل پڑے۔ قریب تھا کہ وہ قتل کر دی جاتی، کچھ "غیبی" طاقتوں نے اسے بنگلہ دیش سے نکال کر محفوظ جنت میں پہنچا دیا۔ کہتے ہیں اس نے یہ ذلیل حرکت انہی کے ایما پر کی تھی۔

"Jyllands posten" کے ایڈیٹر فلیمنگ روز سے جب پوچھا گیا کہ کیا

محمد ﷺ کے خاکے بنا کر اس نے مذمت دین (Blasphemy) کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ ڈنمارک کے وکلا اس بات کا تعین ایک ماہ پہلے کر چکے ہیں کہ خاکوں کی اشاعت سے مذمت دین کا آپس میں کوئی واسطہ نہیں۔ اس نے مزید یہ بتایا کہ اس نے Cartoonist سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ اپنے ذہنی تصور کے مطابق محمد ﷺ کی تصویر بنائیں۔ میں نے انہیں ہرگز یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ایسے خاکے بنائیں جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ڈنمارک کے کارٹونسٹ ہی دل میں جانتے تھے کہ جب وہ ایسے اشتعال انگیز کارٹون بنائیں گے تو دنیائے اسلام میں شدید ردعمل ہوگا اور لازمی طور پر اپنے غم و غصے کا اظہار کے لیے وہ تشدد کا راستہ اختیار کریں گے جس سے مذہب اسلام کے خلاف ایک منفی جذبہ ابھرے گا۔ یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک برتنے میں یکا یک تیزی آ جائے گی۔

Jylland posten کے ایڈیٹر انچیف کارستین پوستے کی طرف سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو لکھے گئے ایک بیان میں توہین آمیز خاکوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ ”میں مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے پر معافی مانگتا ہوں۔ ہم نے یہ خاکے دل آزاری کے لیے نہیں چھاپے تھے۔“ دراصل بہت جلد ڈنمارک کی حکومت بھی اس قسم کی معافی مانگے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے اتنی خودسری کا مظاہرہ کرنے کے بعد اخبار کے ایڈیٹر انچیف مصالحتی راستہ اختیار کرنے پر کیوں مجبور ہو رہے ہیں؟ میری دانست میں اس کی وجہ مسلم دنیا کی طرف سے ڈنمارک کی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ ہے۔ ایک سروے کے مطابق اگر صرف اردن جیسے چھوٹے ملک نے ڈنمارک کی مصنوعات کا اگلی گرمیوں تک بائیکاٹ جاری رکھا تو ڈنمارک کو 36 بلین یوروز کا نقصان ہونے کا خدشہ ہے۔ ڈنمارک، سویڈن کی مشترکہ کمپنی جو مشرقِ وسطیٰ کو Dairy Products فراہم کرتی ہے اس کے مندوب کا کہنا ہے کہ ان کی مصنوعات کے بائیکاٹ سے انہیں اب تک 40-50 ملین ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے اور ہر دن 1.6 ملین ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے۔ کمپنی کو اتنا نقصان ہو رہا ہے کہ انہوں نے 170 ملازمین کو نوکری سے فارغ کر دیا ہے۔ نائیجیریا نے ڈنمارک کے ساتھ ہائیڈرو الیکٹرک پلانٹ خریدنے سے متعلق جس کی لاگت 25 ملین ڈالر بتائی جاتی ہے، اپنے مذاکرات ملتوی کر دیے ہیں۔ نائیجیریا ڈنمارک سے 72 نئی بسیں خرید رہا تھا، وہ ٹھیکہ بھی منسوخ کر دیا گیا۔ انڈونیشیا کی درآمدات کی ایسوسی ایشن نے ڈنمارک کی مصنوعات کے

بائیکاٹ کا آغاز کردیا ہے جس سے ڈنمارک کو 74 ملین ڈالر سالانہ کا نقصان ہوگا۔ کہتے ہیں جب توہین آمیز خاکوں کی اشاعت سے مسلمانوں کے جذبات کوٹھیس پہنچی تو مسلم ممالک کے گیارہ سفیروں نے ڈنمارک کے وزیراعظم فوگ رسموسین سے ملاقات کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں کسی بہانے سے ایسی ملاقات سے روک دیا گیا۔ یہاں تک کہ ڈنمارک کے وزیراعظم نے اس سلسلے میں کوئی پریس کانفرنس بھی منعقد نہیں کی۔ ڈنمارک کے وزیراعظم کو اس وقت ٹھنڈے پسینے آنے شروع ہوئے۔ جب دنیا بھر کے مسلمانوں نے یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا شروع کردیا۔ تجارت ڈنمارک کے لوگوں کے لیے خدا کا درجہ رکھتی ہے جب مسلم دنیا کے مال کا بائیکاٹ کرے گی تو ان خودسر لوگوں کے دماغ خود ہی ٹھکانے آجائیں گے۔

مسلمانوں کے خلاف یورپ میں کیا جذبات ہیں اس کی ایک جھلک پیش کرنا انتہائی ضروری ہے۔

قرون وسطیٰ سے یورپ میں مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بوسنیا ہرزگوینا میں سربوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام دنیا کے ضمیر کو جھنجوڑنے کے لیے کافی ہے۔ یورپ میں مسلمانوں کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ان کو سوسائٹی میں مدغم ہونے سے دانستہ طور پر روکا جاتا ہے۔ انہیں Others کی کیٹیگری میں شمار کیا جاتا ہے۔ قارئین! کیا آپ یہ یقین کریں گے کہ پچھلے 20 سالوں سے مسلمان اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن میں ایک مسجد تعمیر کریں لیکن وہاں کی حکومت ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے اور تو اور ڈنمارک جس کی کل آبادی 5.4 ملین ہے اور جہاں مسلمان 2 لاکھ کے لگ بھگ ہیں، ان کا کوئی اجتماعی قبرستان نہیں ہے۔ ڈنمارک کی مسلم دشمنی اور بھی عیاں ہوجاتی جب حالیہ دنوں میں وزیراعظم فوگ رسموسین کی مقبولیت 52.6 فیصد سے بڑھ کر 55.5 فیصد ہوگئی ہے۔ ان کی عوام ان سے بہت خوش ہے کہ وہ دنیائے اسلام سے تن تنہا ٹکر لے رہے ہیں اور معافی وافی نہیں مانگ رہے ہیں۔ کچھ یورپیوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ گاہے بگاہے ان کے عقیدے ان کے ایمان وایقان کی طاقت کی قدر پیمائی کی جائے۔ ان کے مذہب کی طاقت کو کیسے جانچا جاسکتا ہے؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ انہیں مشتعل کیا جائے اور پھر ان کے ردعمل کو ٹھنڈے دماغ سے جانچا جائے۔

آزادی اظہار رائے کی آڑ میں عیسائی مذہب کے ماننے والوں نے دین اسلام سے جس قسم کی نفرت کا کھلم کھلا اظہار کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عیسائی دنیا میں ان خاکوں کو کم ازکم 175 اخباروں میں شائع اور 200 ٹی وی اسٹیشنوں سے نشر کر کے اللہ کے آخری نبی محمد ﷺ کی توہین کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کی کھلی دشمنی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ کوئی اتفاقیہ حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کی کڑیاں قدیم صلیبی جنگوں سے ملائی جاسکتی ہیں۔ ایسا رویہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان کشمکش کی علامات ظاہر کر رہے ہیں جسے تہذیبوں کا تصادم بھی کہہ سکتے ہیں۔

ڈنمارک کے پینل کوڈ سیکشن 266/B کے مطابق کوئی شخص اگر کھلے عام یا اس نیت سے ایسے مواد کی تشہیر کرتا ہے یا ایسے بیانات دیتا ہے یا ایسی اطلاع فراہم کرتا ہے جس سے کسی دوسرے شخص یا گروہ کو اس کے رنگ ونسل، مذہب، عقیدے اور فرقے کی بنیاد پر دھمکی دینا یا توہین کرنا مقصود ہو تو ایسے شخص پر جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے۔ عارضی طور پر حوالات میں بھیجا جاسکتا ہے یا اسے جیل میں قید کیا جاسکتا ہے جس کی مدت 2 سال سے تجاوز نہ کرے۔ اگر ڈنمارک کا پینل کوڈ ایسے جرم کے مرتکب لوگوں کو جیل بھیجنے کی اجازت دیتا ہے تو ابھی تک جائی لینڈز پوسٹن کے کلچر ایڈیٹر فلیمنگ روز جو اس سازش کا مرکزی کردار ہے اور ایڈیٹر انچیف کارستین پوستے جو جیل کیوں نہیں بھیجا گیا ہے؟ انہیں حکومت تحفظ کیوں فراہم کر رہی ہے؟

جائی لینڈ پوسٹن کے خلاف جو بات جاتی ہے اس کا انکشاف ''دی گارڈین'' نے کیا ہے۔ کچھ ہی دن پہلے مذکورہ اخبار نے عیسائیت کے خلاف بنائے جانے والے کارٹون کے خالق کرسٹوفر زیلر سے معذرت کی تھی اور اس کے کارٹونوں کو رد کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایسے کارٹونوں کو دیکھ کر لوگ شاید ہی محظوظ ہوں بلکہ اس کی اشاعت سے تو عیسائی مذہب کے پیروکاروں میں غم و غصے کی لہر دوڑ جائے گی۔ لہٰذا ہم ایسے کارٹونوں کو نہیں چھاپ سکتے ہیں۔ اخبار کے سنڈے ایڈیٹر جنیس کیر کے الفاظ سے ایسا لگتا ہے کہ آزادی اس کا تعلق کسی شعبہ حیات سے ہو، ایسی آزادی ذمہ دار آزادی ہونی چاہیے۔ کسی مفکر نے کیا خوب کہا ہے۔

"Your Liberty Ends Where My Nose Begins."
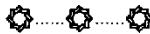
رابرٹ فسک

آزادیٔ اظہار رائے اور مغرب کا غیر اخلاقی روّیہ

اُدھر ڈنمارک کے ایک اخبار نے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے کارٹون شائع کیے اور ادھر متعدد اسلامی ممالک کی حکومتوں نے اپنے سفیر کوپن ہیگن سے واپس بلا لیے۔ سعودی عرب اور شام نے بھی شدید احتجاج کیا۔ خلیجی ریاستوں میں ڈنمارک کی مصنوعات دکانوں سے نکال پھینکی گئیں اور غزہ کے جنگجوؤں نے یورپی یونین اور غیر ملکی صحافیوں کو دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔

ڈنمارک کے جس غیر اہم اخبار میں یہ احمقانہ کارٹون شائع ہوئے، اس کے ''مدیر ثقافت'' فلیمنگ روز نے گزشتہ ستمبر میں کہا تھا کہ ہم مغرب کی سیکولر جمہوریتوں اور اسلامی معاشروں میں تصادم کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں مذکورہ کارٹونوں کی اشاعت نے ثابت کر دیا ہے کہ ڈنمارک کے صحافی ہینس کرسچین اینڈرسن کے ''سچے پیروکار'' ہیں۔ دراصل ہم تہذیبوں کے تصادم کا نہیں، تہذیبوں میں پائے جانے والے بچپنے کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اسے ''سیکولرازم بمقابلہ اسلام'' کے قسم کا مسئلہ نہ سمجھا جائے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے نبی ﷺ پر (وحی کے) الفاظ براہ راست خدا کی طرف سے نازل ہوتے تھے۔ ہم اپنے برگزیدہ افراد اور نبیوں کو بمشکل تاریخی شخصیتیں خیال کرتے ہیں اور ان کی شبیہوں کو مضحکہ خیز حد تک مسخ کر دیتے ہیں۔ ہم اپنے (نام نہاد) انسانی حقوق اور (بے جا) شخصی آزادیوں کے بل بوتے پر ایسا کرتے ہیں۔ درحقیقت مسلمان اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، جبکہ ہم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مسلمان لاتعداد مرتبہ گردش زمانہ کا شکار ہوئے، لیکن انہوں نے اپنے عقائد نہیں بدلے۔ میتھیو آرنلڈ نے جب ''سمندر کی طویل مگر دم توڑتی ہوئی چنگھاڑ'' (Sea's long withdrawing roar) کے عنوان کے تحت نظم لکھی، اس کے بعد اس نے اپنے عقیدے سے منہ موڑ لیا یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ

ہمارے عقائد بھی کہیں کھو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم "عیسائی بمقابلہ اسلام" کی بجائے "مغرب بمقابلہ اسلام" کی بات کرتے ہیں، کیونکہ یورپ میں عیسائیوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ ہم مذاہب عالم (کے نمائندوں) کو اکٹھا کر کے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ ہمیں پیغمبر کا مضحکہ اڑانے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی۔

علاوہ ازیں ہم مذہبی محسوسات پر اپنی ذاتی ریاکاری کو بھی حاوی کر سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کم و بیش ایک عشرہ قبل "عیسیٰ کو (شیطان کی) آخری ترغیب" (The last-temptation of Christ) کے نام سے بنائی گئی ایک فلم میں حضرت عیسیٰ کو کسی عورت کے ساتھ (نعوذ باللہ) جنسی اختلاط کرتے دکھایا گیا تھا۔ پیرس کے جس سینما میں وہ فلم دکھائی گئی، اسے کسی نے آگ لگا دی اور نتیجتاً ایک فرانسیسی نوجوان اپنی جان گنوا بیٹھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تقریباً تین سال قبل ایک بڑی امریکی یونیورسٹی میں مجھے لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے جو لیکچر دیا، اس کا عنوان تھا: "11 ستمبر 2001ء، یہ ضرور پوچھیں کہ وہ کس کا کیا دھرا تھا، لیکن خدا کے لیے یہ دریافت مت کریں کہ ایسا کیوں کیا گیا؟" (September 11, 2001 ask who did it ...... but for God's sake don't ask why) جب میں یونیورسٹی پہنچا تو میرے علم میں لایا گیا کہ یونیورسٹی حکام نے "خدا کے لیے" (For God's sake) کی ترکیب عنوان میں سے حذف کر دی ہے۔ میرے استفسار پر بتایا گیا کہ "ہم بعض اہل عقل وخرد کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔" واہ جی واہ! اس کا مطلب ہوا کہ ہم میں بعض "اہلِ عقل وخرد" بھی پائے جاتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آزادئ اظہار یا بازاری قسم کے کارٹونوں کی اشاعت کے حوالے سے مسلمان ہر صورت میں سیکولرازم کے اچھے پیروکار ثابت ہوں۔ ہمیں ان لوگوں کے بارے میں بھی اتنا ہی فکر مند ہونا چاہیے، جو ہمارے عظیم اور قیمتی مذہب سے وابستہ ہیں۔ میں ان یورپی سیاستدانوں کے (بظاہر) رعب دار دعووں سے بھی محظوظ ہوا، جن کا موقف ہے کہ وہ آزادئ اظہار یا اخبارات پر کوئی قدغن عائد نہیں کر سکتے۔ یہ بھی انتہائی غیر معقول موقف ہے۔ اگر پیغمبر کی بجائے ہم کسی یہودی ربی کا کارٹون شائع کر دیں، جس نے سر پر بم نما ٹوپی پہن رکھی ہو تو یہودیوں کی چیخ و پکار ہماری سماعت سے

ٹکرانے لگتی ہے کہ یہ ''یہودیت کی مخالفت'' ہے۔ مصری اخبارات میں شائع ہونے والے یہود مخالف کارٹونوں کے خلاف اسرائیلی مجسم شکایت بنے نظر آتے ہیں۔

مزید برآں بعض یورپی ممالک مثلاً فرانس، جرمنی اور آسٹریا میں نسل کشی کے واقعات سے انکار قانونا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ مثلاً فرانس میں یہ کہنا قانون شکنی تصور کیا جاتا ہے کہ یہودیوں اور آرمینائی عوام کا قتل عام (ہولوکاسٹ) وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ (ذرا انتظار کریں، جب ترکی یورپی یونین میں شامل ہوگا تو اسے بھی اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑے گا) لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یورپی ممالک میں بعض بیانات جاری کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ مجھے ابھی تک اس امر پر شک ہے کہ ایسے قوانین اپنے مقاصد حاصل کرلیتے ہیں، اگر ''ہولوکاسٹ'' کے انکار سے قانونا روک بھی دیا جائے تو یہود مخالف حلقے یہودیوں کو زچ کرنے کا کوئی اور طریقہ دریافت کرلیں گے۔

مختصر یہ کہ ہم یہود مخالف کارٹونوں کی اشاعت یا ہولوکاسٹ سے انکار کو روکنے کے لیے نہ تو کوئی سیاسی قدغن لگا سکتے ہیں نہ اس حوالے سے بنائے گئے قوانین ہی کارگر ثابت ہوسکتے ہیں۔ (اپنی اس ناکامی کو چھپانے کے لیے) جب ہم مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث بننے والا مواد شائع کرتے ہیں تو ان کا معترض ہونا فطری سی بات ہے۔ ان کے اعتراض کرنے پر ہم سیکولرازم کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کردیتے ہیں۔

اس قابلِ نفرین واقعہ پر ''اسلامی ردعمل'' اکثر مسلمانوں کے لیے باعث پریشانی بنا ہوا ہے۔ اس امر پر یقین کرلینے کی معقول وجوہ موجود ہیں کہ مسلمان اپنے مذہب میں اصلاح کے عنصر کو خوش آمدید کہیں گے۔ اگر اس کارٹون کی اشاعت کے پس پردہ یہ مقصد کارفرما تھا کہ اس معاملے کو قابلِ بحث بنانے والوں کو تقویت ملے اور اگر اس کی اشاعت کے باعث سنجیدہ مذاکرات کی اجازت مل جاتی تو کوئی بھی برا نہ مانتا، لیکن صاف لگ رہا ہے کہ اس کا مقصد ہی طیش دلانا تھا۔ یہ اس قدر مجرمانہ اور غیر اخلاقی تھا کہ شدید ردعمل کا باعث بن گیا۔ یہ وقت سیموئیل ہنٹنگٹن کے ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' سے متعلقہ پرانا کیچڑ اچھالنے کے لیے ہرگز موزوں نہیں۔ ایران میں ایک مرتبہ پھر مذہبی حکومت برسرِاقتدار آچکی ہے۔ جہاں تک عراق کا تعلق ہے، وہاں ہم نے ایک آمر کو معزول کیا اور جہاں آمروں کو معزول کرکے انتخابات کرائے جاتے ہیں، وہاں عام طور پر مذہبی طور پر منتخب حکومت برسرِاقتدار آجاتی ہے۔ ہم نے

بھی یہ خواہش نہیں کی تھی کہ عراق میں مذہبی حکومت آئے، لیکن ہماری خواہشات کے عین برعکس یہ ''حادثہ'' رونما ہو چکا ہے۔

مصر کے حالیہ پارلیمانی انتخابات میں ''اخوان المسلمین'' نے 20 فیصد نشستیں جیت لی ہیں۔ ''حماس'' فلسطین کی حاکم بن چکی ہے اور ان تمام حقائق میں ہمارے لیے ایک پیغام پوشیدہ ہے وہ یہ کہ حکومتیں بدلنے اور مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے نفاذ پر مبنی امریکی پالیسیاں اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہیں۔ ہم نے جن ملکوں کے عوام پر بدعنوان حکمران مسلط کر رکھے تھے، وہاں رائے دہندگان پر اسلام کو ترجیح دے رہے ہیں۔ آگ کے اس جلتے ہوئے الاؤ پر ڈنمارک سے شائع ہونے والے کارٹونوں کو ''انڈیلنا'' واقعتاً خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ زیر بحث کارٹون میں اسلام کو ایک تشدد پسند مذہب کے طور پر اُجاگر کیا گیا ہے، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ کیا ہم چاہتے ہیں کہ اسلام وہی شکل اختیار کرلے جو ہم نے کارٹونوں میں دکھائی ہے؟
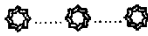
امجد عباسی

آزادئ رائے اور تضحیک مذہب

اسلام، نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو (نعوذ باللہ)! آزادئ رائے، آزادئ صحافت، انسانی حقوق اور سیکولر جمہوریت کے نام پر تضحیک، تمسخر اور تذلیل کا برابر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ اس کا پشت پناہ مغرب ہے اور وہی اس کو تحفظ بھی دیتا ہے۔ بھارتی نژاد ملعون رشدی کے بعد بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین (حال ہی میں ان کی متنازعہ کتاب "دوئی کھنڈت" پر بھارتی مسلمانوں کے ردِعمل کا سامنے آنا) ڈنمارک کے اخبار اور دیگر اخبارات میں شیطانی خاکوں کی اشاعت؛ ولندیزی فلم ساز تھیووان گوخھ کی اسلام میں عورت کے مقام کے موضوع پر اشتعال انگیز فلم کی تیاری اور اس کے شدید ردعمل میں اس کی ہلاکت، جرمنی میں توہینِ رسالت ﷺ پر عامر چیمہ کی شہادت اور اب سوڈان میں ایک عیسائی مشنری اسکول کی ٹیچر گلین گبنز کا اپنی کلاس کے طلبہ کو "............" کا نام (نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ) محمد ﷺ رکھنے کے لیے ورغلانے اور توہین رسالت ﷺ کا مرتکب ہونا، اسی کا تسلسل ہے۔ گلین گبنز کی سزا ختم کروانے اور تحفظ دینے میں بھی برطانیہ کا ہاتھ نمایاں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کی طرف سے توہینِ اسلام اور توہینِ رسالت ﷺ میں کیوں شدت آتی جا رہی ہے، اور دوسری جانب اس سب کچھ کو آزادئ رائے اور انسانی حقوق کے حوالے سے تحفظ دینے کی بات بھی کی جا رہی ہے، نیز اُمت کے اہلِ علم اس مسئلے کا کس انداز سے جواب دیں؟

مغرب میں چند صدیاں قبل انسانی حقوق کا سوال اس وقت سامنے آیا جب یورپ میں سائنس اور مذہب میں چپقلش سامنے آئی۔ اس سے قبل یورپی تاریخ میں انسان کے بنیادی حقوق کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ عیسائیت نے چند یونانی تصورات کو مذہبی تقدس کا مقام دے دیا اور سائنسی حقائق کو جھٹلاتے ہوئے انتہائی اقدامات اٹھائے اور ان عقائد کی خلاف ورزی کرنے پر سائنس دانوں کو پھانسی تک دے ڈالی۔ اس پر شدید ردعمل سامنے آیا اور اہلِ

یورپ نے کلیسا کی بالادستی ختم کرنے کا فیصلہ کیا، نیز انسان کے بنیادی حقوق کے لیے مذہب سے ہٹتے ہوئے قانون سازی کی بنیاد رکھی۔ سائنس کو اُلوہیت کا مقام دے دیا اور تجرباتی سائنس اور تجربہ و مشاہدہ کو علم کی بنیاد ٹھہرایا۔ عیسائیت کے غلط تصورات کی بنا پر مذہب سے بے زار اور بے نیاز ہو کر انسانی زندگی کے معاملات کو طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے نتیجے میں انسان کے بنیادی حقوق کے لیے قانون سازی عمل میں آئی۔ اس کا آغاز انگلستان کے میگنا کارٹا (1215ء) سے ہوا، اور مختلف مراحل سے گزرتا ہوا یہ عمل اقوام متحدہ کے منشور انسانی حقوق (1948ء) پر منتج ہوتا ہے۔

دوسری طرف مغرب اور امریکہ کا اپنے مذموم مقاصد اور مفادات کے حصول کے لیے عدل و انصاف اور حقوق انسانی کی دھجیاں اڑا دینا، اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں افغانستان اور عراق پر حملہ، گوانتاناموبے اور ابوغریب جیل میں تشدد کے انسانیت سوز واقعات، اور ایران پر حملے کی دھمکی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے۔ ایسے میں اقوام متحدہ کے منشور انسانی حقوق، عدل و انصاف اور امن و امان جیسی اقدار پر عمل درآمد ایک سوال بن کر رہ جاتا ہے۔

قانونِ توہین رسالت ﷺ ہی کو لیجیے۔ نیو انسائی کلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق اکثر مشرقی اور یورپی ممالک میں قانونِ توہینِ انبیاؑ (بلاس فیمی لا) کسی نہ کسی صورت میں قابلِ مواخذہ جرم رہا ہے۔ آسمانی صحائف کو ماننے والی اقوام جہاں بھی حکمران رہی ہیں، وہاں توہینِ رسالت ﷺ کی سزا، سزائے موت پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ یورپ، امریکہ اور دیگر سیکولر ریاستوں میں قانونِ توہینِ مسیحؑ (بلاس فیمی لا) اب بھی موجود ہے اور اس حوالے سے ان ملکوں کی اعلیٰ ترین عدالتوں کے فیصلے بھی موجود ہیں۔ برطانیہ میں اٹھارھویں صدی تک توہینِ مسیحؑ کی سزا، سزائے موت تھی مگر بعد میں سزائے موت ختم کر دی گئی، لہٰذا اب اس کی سزا عمر قید ہے۔

اس ضمن میں ایک معروف مثال یورپی یونین حقوق انسانی کی عدالت کا 25 نومبر 1996ء کو برطانیہ کے حق میں دیا جانے والا فیصلہ ہے۔ اس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس سے مجموعی طور پر مغرب کے نکتۂ نظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس مقدمے کے مطابق ایک برطانوی شہری نیگل ونگرو نے حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے ایک فلم دکھانے کی اجازت طلب کی۔ مگر یورپی یونین حقوق انسانی کی عدالت نے اس کی اجازت نہ دی کہ اس سے عیسائیوں

کے جذبات مشتعل ہوں گے اور توہینِ عیسیٰ ہوتی ہے۔ مگر جب اس کیس میں سلمان رشدی کے خلاف توہینِ رسالت ﷺ کا مسئلہ اٹھایا گیا تو اسے خارج از بحث قرار دے دیا گیا (دیکھیے : ناموسِ رسول ﷺ اور قانونِ توہینِ رسالت ﷺ، محمد اسماعیل قریشی، ص 234-239) یہاں مغرب کا دہرا معیار، انسانی حقوق اور اخلاقی اقدار کے تمام تر دعوؤں کے باوجود واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اسلام میں انسانی حقوق کا تصور مغرب سے بہت پہلے 14 سو سال سے موجود ہے اور اس کا خلاصہ نبی کریم ﷺ کا خطبہ حجتہ الوداع ہے۔ اسلام بلا امتیاز مذہب و ملت تمام انسانوں کے حقوق کی نہ صرف ضمانت دیتا ہے، بلکہ قوت نافذہ رکھتا ہے، اور قانونی چارہ جوئی کا حق بھی دیتا ہے۔ دوسری طرف اقوامِ متحدہ کے منشورِ انسانی حقوق کی حیثیت محض ایک اعلان سے بڑھ کر نہیں اور نہ اس کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے کوئی ضمانت دی گئی ہے۔

اسلام نے جہاں رنگ و نسل کے فرق کی بنیاد پر انسانی تفاوت کو مٹایا ہے، وہاں تمام انسانوں کو اولادِ آدم ہونے پر برابر قرار دیا اور نیکی اور تقویٰ کو وجۂ امتیاز ٹھہرایا ہے۔ آزادیٔ اظہارِ رائے کو شہریوں کا بنیادی حق ہی نہیں، بلکہ درپیش مسائل پر اظہارِ رائے کو مغرب کے تصور سے بڑھ کر، حق سے زیادہ فرض ٹھہرایا ہے۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ بھلائی کی دعوت دے اور برائی سے روکے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اسی کا نام ہے۔ اس سے غفلت برتنا نہ صرف نفاق ہے، بلکہ اسے ملت کے زوال کا ایک سبب بھی بتایا گیا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی روش تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ (المائدہ 79:5)

اسلام نے ضمیر اور اعتقاد کی آزادی کا حق دیا ہے۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار کر لے۔ اسلام نے لا اکراہ فی الدین (البقرہ:256) کا اصول دیا ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی قوم کو جبراً مسلمان نہیں کیا، بلکہ ذمی کی حیثیت سے ان کو مذہبی آزادی ہے اور ان کا تحفظ کیا ہے۔ اسلام نے تو مذہبی دل آزاری سے بھی منع کیا ہے۔

ولا تسبو الذین یدعون من دون اللہ (الانعام:108) ان کو برا بھلا نہ کہو جنہیں یہ لوگ اللہ کے ماسوا معبود بنا کر پکارتے ہیں۔

خیال رہے کہ جہاں مذہبی دلآ زاری سے منع کیا گیا ہے وہاں برہان، دلیل اور معقول طریقے سے مذہب پر تنقید کرنا اور اختلاف کرنا آزادئ اظہار کے حق میں شامل ہے۔ خود مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اہلِ کتاب اور دیگر مذاہب کے حاملین سے اگر گفتگو کی جائے تو تحمل اور رواداری کا مظاہرہ کیا جائے اور احسن انداز اپنایا جائے۔

ولا تجادلوا اھل الکتب الا بالتی ھی احسن (العنکبوت 29:46)

اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر احسن طریقے سے۔

اسلام میں رواداری کا تصور یہ نہیں ہے کہ مختلف اور متضاد خیالات کو درست قرار دیا جائے۔ بقول سید مودودیؒ: ''رواداری کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے نزدیک غلط ہیں، ان کو ہم برداشت کریں، ان کے جذبات کا لحاظ کر کے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو، اور انہیں ان کے اعتقاد سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لیے زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اس قسم کے تحمل اور اس طریقے سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا نہ صرف ایک مستحسن فعل ہے، بلکہ مختلف الخیال جماعتوں میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اگر ہم خود ایک عقیدہ رکھنے کے باوجود محض دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے مختلف عقائد کی تصدیق کریں، اور خود ایک دستورالعمل کے پیرو ہوتے ہوئے دوسرے مختلف دستوروں کا اتباع کرنے والوں سے کہیں کہ آپ سب حضرات برحق ہیں، تو اس منافقانہ اظہارِ رائے کو کسی طرح رواداری سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مصلحتاً سکوت اختیار کرنے اور عمداً جھوٹ بولنے میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔''

(تفہیمات، اوّل، ص 114-115)

حقیقت یہ ہے کہ آزادئ رائے، آزادئ صحافت، انسانی حقوق اور لادین جمہوریت جیسی مغربی اقدار بظاہر دل کو بھاتی ہیں، عقل کو اپیل کرتی ہیں لیکن عملاً جب مفادات آڑے آئیں، نسلی و مذہبی تعصب سے واسطہ پڑے، انسانی حقوق اور عدل و انصاف پر زد پڑے تو یہ اقدار غیر جانب داری کے بجائے جانب داری کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ محض عقلِ انسانی کو بنیاد بنا کر آزادئ رائے اور آزادئ صحافت جیسی اقدار کے تحت توہینِ رسالت کا ارتکاب کیا جائے، اور اس کے نتیجے میں خواہ بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان اور مسلمان کی دل آزاری اور فساد کا اندیشہ ہو مگر انسان کسی تحدید پر تیار نہ ہو...... یہی وہ مقام ہے

جہاں انسان اگر ٹھہر کر نہیں سوچتا تو قرآن کے مطابق انسان کی اس روش سے زمین میں فساد برپا ہوسکتا ہے۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم:41) ''خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔'' تہذیبوں کی جنگ کا واویلا بھی مچایا جا رہا ہے اور اسلام کو ہدف بنایا جا رہا ہے، حالانکہ اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو آزادیٔ اظہار کے تحت نہ صرف معقول اور منطقی انداز میں اختلاف رائے کا حق دیتا ہے، بلکہ عقیدے کی آزادی اور تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اس مسئلے کا اصولی حل یہی ہے کہ مغرب نے مذہبی تعصب کی وجہ سے عقل اور سائنس کو جس طرح خدا بنا رکھا ہے اور الوہیت کا درجہ دے رکھا ہے، اس پر نظر ثانی کرے۔ اگر یہ ماضی کے عیسائیت اور اہلِ کلیسا کے غلط نظریات کا ردِ عمل ہے تو اسلام کے حوالے سے ایسا سوچنا مناسب نہیں۔ اسلام ایک روایتی مذہب نہیں، بلکہ ایک دین اور ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو ہر شعبۂ زندگی بہ شمول سائنس کے لیے ہدایات اور رہنمائی رکھتا ہے۔ اصولی طور پر بھی دیکھا جائے تو آزادیٔ رائے، انسانی حقوق اور انسانیت کی فلاح کے لیے اسلام کی تعلیمات زیادہ جامع نہیں جنھیں عقل تسلیم کرنے پر مجبور ہے، جب کہ عیسائیت و دیگر مذاہب کی تعلیمات اس معیار پر پورا نہیں اترتیں۔ اگرچہ روسو نے یہ کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا مگر اسے ہر جگہ زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے، تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے 14 سو سال پہلے یہ فرمایا تھا کہ تم نے انسانوں کو غلام کب سے بنالیا؟ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔ مگر اس جرأت کے لیے خدا سے ڈرنے والا دل اور وحی الٰہی پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کو یہ خدشہ لاحق ہے کہ اسلام اپنی تعلیمات اور منطقی استدلال کی بنا پر غالب نہ آجائے۔ اسلام کی نظریاتی بالادستی اور اسلامی تحریکوں کے تحت احیائے اسلام کے لیے برپا منظم جدوجہد اور قبولِ اسلام کے بڑھتے ہوئے عالمی رجحان کی بنا پر، مغرب کو یہ خدشہ یقین میں بدلتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ بقول اقبال ؎

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر ﷺ کہیں

عرفان صدیقی

یہ تیر صرف ہمارے لیے ہیں!

آج سے کوئی 16 سال قبل برطانوی مورخ ڈیوڈ ارونگ نے آسٹریا میں ایک لیکچر میں یہ کہہ دیا کہ ”یہودیوں کے قتل کے لیے پولینڈ میں گیس چیمبرز کی موجودگی ایک افسانہ ہے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں کے ہاتھوں 60 لاکھ یہودیوں کے قتل کی کہانی بھی درست نہیں۔“ اس افسانوی قتلِ عام کو ”ہولوکاسٹ“ کا نام دیا جاتا ہے اور یہ ایک ایسی متبرک دیومالائی صداقت قرار پائی ہے جس پر ”ایمان“ نہ لانا یا جسے جھٹلانا یا اس پر شک وشبہ کا اظہار کرنا بہت سے مغربی ممالک نے جرم قرار دے رکھا ہے۔ آسٹریا میں اس جرم کی سزا دس سال قید ہے۔ ڈیوڈ ارونگ پہ مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

نومبر 2005ء میں وہ دائیں بازو کے انتہا پسند طلبہ کی دعوت پر لیکچر دینے آسٹریا گیا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ ڈیوڈ ارونگ کو حالات کے تیوروں کا اندازہ ہو گیا۔ اُس نے بی بی سی کو ایک خط لکھا کہ ”گیس چیمبرز کے بارے میں میرے خیالات میں اب تبدیلی آ گئی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک بدترین سانحہ تھا۔“ عدالت میں پیشی کے دوران اُس نے ”60 لاکھ“ تو نہ کہا البتہ تسلیم کیا کہ ”لاکھوں لوگ مارے گئے اور اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ گیس چیمبرز بھی موجود تھے۔“ ارونگ کے اس رویے پر نرمی کا اظہار کرتے ہوئے عدالت نے اُسے تین سال قید کی سزا سنائی اور جیل بھیج دیا۔ ڈیوڈ ارونگ کے وکیل نے کہا کہ اُسے اس فیصلے پر حیرت ہوئی ہے۔ ”شاید عدالت اس فیصلے کے ذریعے دنیا کو پیغام دینا چاہتی تھی لیکن پیغام کافی سخت ہو گیا ہے۔“ وکیل نے فیصلے پر نظر ثانی کی استدعا کرتے ہوئے نرم رویہ اختیار کرنے کے لیے کہا ہے کیونکہ بقول اُس کے ڈیوڈ ارونگ کے خیالات میں اب تبدیلی آ گئی ہے۔

ڈیوڈ ارونگ کو شاید معلوم نہ تھا کہ ”آزادی اظہار رائے“ کا اصل مفہوم کیا ہے؟ وہ کب، کہاں اور کن کے لیے استعمال ہونی چاہیے؟ اور اس خوبصورت ترکش سے نکلنے والے

تیروں کا رخ کن سینوں کی طرف ہونا چاہیے۔ اُسے غالباً اس امر کی اطلاع بھی نہیں ہوسکی کہ مغرب کی کارگہ فکر نے امریکہ میں وضع ہونے والی نئی لُغت پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ اب الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کا وہی مفہوم لیا جاتا ہے جو وائٹ ہاؤس کی دانش گاہ نے متعین کردیا ہے۔ ہم اہلِ شرق تو اچھی طرح جان گئے ہیں کہ امریکہ، یورپ اور مغرب میں ترتیب پانے والی اس نئی لُغت میں درج الفاظ کیا معنی رکھتے ہیں اور انہیں کس مفہوم میں استعمال کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ جب ''غلامی'' کی زنجیروں میں جکڑی کسی قوم کو آزادی دلانے کا اعلان کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سرزمین کم نصیب کو ہلاکت آفریں بموں اور میزائلوں کا نشانہ بنایا جانے والا ہے۔ وہاں آگ اور بارود کی برکھا برسانے کی تیاریاں ہورہی ہیں اور وہاں فلوجہ جیسے مناظر اور ابوغریب جیسی داستانیں رقم ہونے والی ہیں۔ عراق اور افغانستان کے عوام اس ''آزادی'' سے ہمکنار ہوچکے ہیں۔ اب کے پھریرے لہراتا لشکر بے اماں ایران اور شام کے ''محکوموں'' کو ''آزادی'' دلانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ہم اب یہ بھی جان چکے ہیں کہ اس نو تخلیق لُغت میں ''جمہوریت'' کے معنی و مفہوم کیا ہیں۔ اس کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ بندوبست، جمہوریت بلکہ حقیقی جمہوریت کہلاتا ہے جو اپنے عوام کے جذبہ واحساس سے بے نیاز امریکہ سے آئے ہر فرمان کو اپنا دستورالعمل بنانے اور دل و جان سے اسے عملی جامہ پہنانے میں جُت جائے۔ اس کے برعکس ہر وہ نظام غیر جمہوری اور آمرانہ ہے جو بے شک عوام کے ووٹوں سے وجود میں آئے اور جس کے حکمران عوام کی دھڑکنوں میں بستے ہوں لیکن وہ امریکہ کے سامنے گردن جھکانے کے بجائے اپنے قومی و ملکی مفادات کو اولیت دیتا ہو۔ اسی طرح ''انصاف'' کے معنی وہ سزا ہے جو امریکہ کسی فرد یا حکومت کے لیے تجویز کرتا ہے۔ اس طرح انصاف کے تحت امریکہ پہلے ایک مفروضہ تخلیق کرتا، پھر اسے ہولناک جرم قرار دے کر چارج شیٹ جاری کرتا اور اس کے ساتھ ہی حملہ کردیتا ہے۔ بعدازاں اگر یہ مفروضہ سو فیصد غلط نکلے تو بھی اسے انصاف ہی کا ایک پہلو خیال کرلیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ''فوری انصاف'' ناگزیر ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں امریکہ کسی رسمی کارروائی کے خرخشوں میں پڑے بغیر ہی ''مشکوک مجرم'' کا بھرکس نکال دیتا ہے جیسے باجوڑ میں ہوا۔ ''دہشت گردی'' کے معانی بھی اب پوری دنیا پر واضح ہوچکے ہیں۔ طے پاگیا ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کے ذہنوں میں انگڑائی لیتی اور انہی کے

ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہے اور امریکہ کی طرف سے لاکھوں معصوم انسانوں کی ہلاکت دراصل دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے۔

اب ''آزادئ اظہار'' کا مفہوم بھی اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ آشکار ہو رہا ہے۔ اگر ڈیوڈ ارونگ، ''ہولوکاسٹ'' کی شان میں گستاخی کرنے کے بجائے سوا ارب مسلمانوں کے مذہب، عقائد، شعائر یا مقدس شخصیات کی حرمت سے کھیلتا تو پورا یورپ اس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو جاتا۔ ٹونی بلیئر اور جارج بش اس سے اظہار یکجہتی کرتے اور وہ یکا یک محبوبیت و مقبولیت کی معراج کمال پر پہنچ جاتا۔ افسوس کہ وہ ایک برطانوی مورخ ہوتے ہوئے بھی ''آزادئ اظہار'' کے حقیقی معنی و مفہوم کو نہیں سمجھ پایا اور نہ اُسے کسی نے سمجھایا کہ یہ تیر کن سینوں پر چلایا جاتا ہے۔

۞......۞......۞
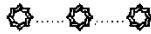
اوریا مقبول جان

ہولوکاسٹ اور آزادیٔ اظہار

واشنگٹن امریکہ کا دارالحکومت ہے لیکن جہاں اس شہر میں دنیا کی اس سپر پاور کی دعویدار مملکت کے تمام بڑے ادارے موجود ہیں، وہیں یہ اپنے بڑے بڑے عجائب گھروں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ یہ عجائب گھر ایک فرانسیسی نواب کے ایسے بیٹے نے بنائے تھے جسے وہ دنیا کے سامنے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ ایک خفیہ شادی کا نتیجہ تھا۔ یہ بیٹا مفلوک الحالی میں امریکہ آیا۔ قسمت آزمائی کی اور اپنا نام Smith,s son یعنی سمو کا بیٹا رکھا۔ اس کی جائیداد سے طرح طرح کے عجائب گھر بنے بڑے بڑے ڈائنوسار کے ڈھانچوں کا میوزیم، دنیا کے پہلے جہاز سے خلائی شٹل والا میوزیم، بڑی بڑی قیمتی پینٹنگز کا میوزیم۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد ان اداروں پر امریکہ کے یہودی چھا گئے اور انہوں نے اسے جنگ عظیم دوم میں مرنے والے یہودیوں کی یادگار کے طور پر ایک ہولوکاسٹ میوزیم بنا دیا۔ اس میوزیم اور دنیا بھر کے میڈیا کے ذریعے انہوں نے یہ شدید ترین پراپیگنڈہ کیا کہ اس جنگ میں مغرب نے 60 لاکھ یہودیوں کو مارا تھا۔ فلمیں بنیں، کتابیں لکھی گئیں، مضمون اور پمفلٹ شائع ہوئے اور امریکہ کی سیاست پر قبضے کی وجہ سے پورے یورپ کو مطعون کیا گیا۔ ان کے عوام اور رہنماؤں کو قصابوں سے تعبیر کیا گیا۔

ہولوکاسٹ کے مرنے والے یہودیوں کو اس قدر مقدس درجہ حاصل ہو گیا کہ ان کے خلاف بات کرنے والا، ان کی چالاکیوں، نمک حرامیوں اور اپنے ہی ملک سے غداری کے بارے میں گفتگو کرنے والے کو نفرت پھیلانے والا قرار دے کر قابل تعزیر بنا دیا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے یورپ امریکہ اور کینیڈا میں ان یہودیوں کی عیاری کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ان کا جو حشر ہوا وہ ایک لمبی داستان ہے۔ میں یہاں صرف ان لوگوں میں سے چند ایک کا ذکر کروں گا جنہوں نے صرف اتنا زبان سے یا قلم سے نکالا کہ یہودیوں نے جو 60 لاکھ تعداد بتائی

ہے وہ غلط ہے بلکہ مرنے والوں کی تعداد تو چند لاکھ سے بھی زیادہ نہیں ہے۔ بعض نے تو صرف اس طرف اشارہ ہی کیا تھا۔ ان سب کو نفرت پھیلانے کے جرم میں سزائیں بھگتنا پڑیں۔

• کینیڈا میلکم روس، ڈوگ کولنز، ارنسٹ زنڈل کو پریس میں سب سے پہلے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور پھر ان کو عدالتوں میں گھسیٹا گیا۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں اور انہیں معاشرے میں نفرت پھیلانے کے جرم میں در بدر ہونا پڑا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے سوال اٹھایا تھا کہ ثابت کیا جائے کہاں کہاں ساٹھ لاکھ یہودی مرے تھے؟

ان میں سے دو ارنسٹ زنڈل اور گریمر روڈلف امریکہ چلے گئے لیکن کچھ عرصے بعد ان دونوں کو امریکہ نے اپنے ملک سے نکال کر جرمنی کے حوالے کر دیا جہاں وہ آج کل نفرت پھیلانے کے جرم میں مقدمے کا سامنا کر رہے ہیں۔ آسٹریا وہ ملک ہے جہاں اسی ہولوکاسٹ کے خلاف بات کرنا جرم ہے وہاں ان کے ایک مشہور صحافی ڈیوڈ ارونگ کو گزشتہ دنوں گرفتار کر لیا گیا کیونکہ وہ اپنی تحریر سے یہودیوں کے اس پراپیگنڈے کو غلط ثابت کر رہا تھا۔ بلجیم کا ایک اور لکھنے والا سیک فرائنڈ دربیک ایسی ہی تحریریں لکھتا تھا کہ اسے ہالینڈ کی حکومت نے گرفتار کیا اور آجکل وہ جرمن کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے ہالینڈ بدری کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ جرمن شہری بھی نہیں لیکن اس کے عالمی وارنٹ جرمن عدالت نے جاری کیے ہیں۔ صرف قانونی کارروائی کی بات نہیں 19 ستمبر 2005ء کو بلجیم کے ایسے ہی ایک لکھنے والے وینسنٹ ریونارڈ کے گھر میں پولیس گھس گئی۔ پورے گھر کو توڑ پھوڑ دیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا اور کہا گیا کہ اسے تب رہا کیا جائے گا اگر وہ پاگلوں کے ڈاکٹر سے معائنہ کروائے اور یہودیوں کے ہولوکاسٹ کے خلاف لکھنا اور بولنا بند کر دے۔

یہ سب تو ان ممالک میں ہوا ہے جو آج سرکارِ دوعالم ﷺ کے توہین آمیز کارٹون چھاپنے پر پریس کی آزادی کا بہانہ بناتے ہوئے کارروائی سے انکار کر رہے ہیں۔ لیکن اس دنیا کے چہرے پر ایک اور طمانچے کا ذکر کروں گا۔ 19 جون 2004ء کو اسرائیل کی کیبنٹ یعنی پارلیمنٹ نے حکومت یہ اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی کسی جگہ بھی کوئی شخص اگر ساٹھ لاکھ کی تعداد کو کم بتانے کی کوشش کرے تو اس پر مقدمہ چلا سکتی ہے اور اس ملک سے اسے نفرت کے جرم ''Hate Criminal'' کے طور پر مانگ سکتی ہے۔ گرفتار کر سکتی ہے، سزا دے سکتی ہے یعنی اس وقت جو لکھنے والے جرمنی اور آسٹریا کی عدالتوں میں مقدموں کا سامنا کر رہے

ہیں وہ کل اسرائیل کی درخواست پر اس کی جیل میں ہوں گے۔ نفرت پھیلانے والے سزا صرف ان لکھنے والوں کو دی جاتی ہے جو یہودیوں کے خلاف لکھتے ہیں۔

یہ تفصیل اس قدر طویل ہے اور کئی سالوں پر پھیلی ہوئی ہے لیکن صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ صرف جنگ میں اپنے ہی ملک سے غداری کے جرم میں اور اپنی عیاریوں کی وجہ سے سزا پانے والے یہودی اتنے مقدس ہیں کہ ان کی تعداد کم کرنے پر نفرت پھیلتی ہے تو وہ قوم جس کے لوگوں کی زندگیوں کا سرمایہ ہی عشقِ رسول ﷺ ہے۔ جو اپنی جان، مال، عزت، آبرو، اولاد اور ماں باپ سے زیادہ ان سے محبت کرتی ہے اس کی توہین نفرت پھیلانے کے جرم میں نہیں آتی۔ کاش کوئی حکمران، کوئی لیڈر، کوئی صاحب اقتدار دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے بتائے کہ جس نے کارٹون چھاپے، اسے اسی قانون کے تحت سزا دیں ورنہ تم ہم سے اجنبی، بیگانے۔ کاش! کوئی پارلیمنٹ سڑک پر نکلنے سے پہلے اسرائیل کی طرح یہ بل منظور کرے کہ توہینِ رسالت ﷺ کا مجرم خود امریکہ میں ہو یا ڈنمارک میں اسے ہمارے حوالے کردو۔ اس بل کو پاس کرنے کے لیے صرف ایک ووٹ چاہیے لیکن اس ووٹ کو ڈالنے کے لیے غیرت، ہمت، جرأت ہی نہیں، عشقِ رسول ﷺ کی دولت بھی ضروری ہے اور اسی میں ہماری آبرو کا راز پوشیدہ ہے۔

رفیق شیخ

اظہار کی آزادی یا شرانگیزی

دنیا کا ایک مسلمہ اصول ہے جو کسی تحریری ضابطے کا محتاج نہیں ہے کہ آزادی کی اپنی ”حدود و قیود“ ہوتی ہیں۔ یہ حدود و قیود انسانی معاشروں، مذاہب، تاریخ، ثقافت، زبان کے دائرے میں آتی ہیں۔ ایک تمدن اور تہذیب جس بات کو اپنے لیے اچھی تصور کرتی ہے، ضروری نہیں دوسری تہذیب و تمدن بھی اسے ایسا ہی سمجھے۔ تاریخ کے اوراق اس صورت حال سے بھرے پڑے ہیں۔ دورِ جدید میں جب دنیا سکڑ کر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی ہے اور جس نے تہذیبوں، اقدار، روایت، زبان اور ثقافت میں سے ”اقدار مشترک“ تلاش کرلی ہیں اور آپس میں طے کرلیا ہے کہ ان اقدار مشترک کا نہ صرف احترام کیا جائے گا بلکہ اس کا تحفظ بھی کیا جائے گا۔ انسانی حقوق کا چارٹر اس کی بڑی مثال ہے، پھر دنیا کے تقریباً تمام ممالک اور خاص طور سے ترقی یافتہ جمہوریت پسند اور جمہوری نظام رکھنے والے ممالک کے اپنے قوانین ان تمام باتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کے چارٹر سمیت ان ممالک کے قوانین میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہر انسان کو اپنی ذات سے متعلق تمام تر آزادی حاصل ہے۔ یہاں تک کہ وہ کون سا مذہبی عقیدہ رکھتا ہے، یا رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی بھی اسے آزادی ہے۔ لیکن انسانی حقوق کے چارٹر سمیت دنیا کے کسی قانون میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کی آزادی میں مداخلت کرے۔ یا دوسرے کے جو عقائد، ایمان، اقدار ہیں اس کی نفی کرے۔ اس کو برا بھلا کہے یا اس کی توہین کرے۔ اس کا صاف مقصد یہ ہے کہ ایک انسان کی آزادی وہاں ختم ہوجاتی ہے جہاں سے دوسرے کی شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ توہین آمیز کارٹون کی اشاعت ”آزادیٔ اظہار“ ہے تو یہ نہ صرف خود انسان کے اپنے بنائے ہوئے قانون بلکہ قدرت کے قوانین کی نفی ہے، جو قابلِ گرفت اور قابلِ سزا جرم ہے۔ دنیا بھر، خاص طور سے یورپ میں ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں جب کسی فوٹوگرافر نے کسی نامور شخص کی تصاویر بنائیں اور اخبار نے انہیں شائع کیا، تو ایسے اخبارات پر ہرجانے کے دعوے دائر کیے گئے۔

عدالتوں نے ایسے اخبارات پر جرمانے عائد کیے۔اب اگر ڈنمارک یا دیگر ممالک کی حکومتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ آزادیٔ اظہار ہے اور ان کے ممالک میں اظہار پر کوئی قدغن نہیں ہے، اس لیے وہ ایسے اخبار کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تو وہ حقائق سے آنکھ چرانے کی بات کرتے ہیں۔

یورپ جسے جمہوریت کی ماں قرار دیا جاتا ہے جہاں انسانی حقوق، شہری آزادی، مذہبی احترام یہاں تک کہ جانوروں کے تحفظ کو بھی سنجیدگی سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں اس قسم کے کارٹون پورے یورپی معاشرے کے مروجہ اقدار کی نفی کرتے ہیں۔ اہلِ دانش اس صورتِ حال کو خالص مذہبی انداز میں بھی دیکھ رہے ہیں اور عالمی منظر نامے کے موجودہ حالات میں بھی اس کا تجزیہ کر رہے ہیں۔

تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے ترقی یافتہ اور جمہوریت پسند ممالک خود کو سیکولر قرار دیتے ہیں، وہاں کے قوانین میں لوگوں کو آزادی ہے حقوق کا بڑا چرچا ہے لیکن یہ سب کچھ صرف حکومتی سطح پر ہے اس حد تک ہے کہ قانون میں کوئی مذہب نہیں لیکن دیکھا جائے تو ہر ملک اور ہر معاشرہ مذہب اور اس کی روایات سے آزاد نہیں ہے۔ آج بھی جب کرسمس آتا ہے تو پورا یورپ اس میں مگن ہو جاتا ہے۔ جب کوئی پوپ دنیا سے جا رہا ہوتا ہے وہ اداس ہو جاتے ہیں اور جب نیا پوپ آ رہا ہوتا ہے اس کے تقدس میں حکمرانوں سے لے کر عوام تک سب احتراماً کھڑے ہوتے ہیں۔ بعض ممالک میں تو حضرت عیسیٰؑ کی شان میں گستاخی کو قابل گرفت جرم قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ تصور کہ ایک سیکولر ملک میں ہر کسی کو آزادی ہے کہ وہ جس طرح چاہے اظہار کرے۔ صریحاً غلط ہے۔ یورپی معاشرہ بھی مذہب سے اتنا لگاؤ رکھتا ہے جتنا کوئی اور معاشرہ امریکہ اور اسرائیل بھی مذہبی رسومات اور روایت سے دور نہیں ہیں بلکہ ان کی جڑیں بھی گہری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میڈیا پر کنٹرول کے باعث جو کچھ دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں وہ کرا دیتے ہیں اور جو کرنا چاہتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں۔ سرد جنگ کے دور میں اہلِ مغرب نے اسلام کو کمیونزم کے مقابلے میں فرنٹ لائن کے طور پر استعمال کیا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اسی اسلام کو اپنے لئے خطرہ سمجھا۔ لہٰذا ان کے نزدیک ضروری ہو گیا کہ وہ اس خطرے کو جس قدر ممکن ہے کمزور کریں۔ عراق اور افغانستان کی جنگ ہو، ایران، فلسطین، شام کو دھمکیاں ہوں یا پھر توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت سب اس کوشش کا ہی حصہ ہیں۔

❂.....❂.....❂

عظیم سرور

یہ ڈنمارک والے کون ہیں؟

غالباً 1983ء کی بات ہے میں شکاگو جارہا تھا۔ اس مرتبہ سستا ٹکٹ اسکینڈے نیویا کی ایئر لائن کا تھا مجھے لندن رک کر شکاگو روانہ ہونا تھا۔ کراچی سے جہاز نے اسلام آباد کا رخ کیا اور پھر پورے افغانستان پر پرواز کرتا ہوا تاشقند کے اوپر سے گزرا۔ میری نشست کھڑکی پر تھی میں نے دیکھا کہ افغانستان میں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ 35 ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے کہیں کہیں کوئی چھوٹا سا گاؤں نظر آتا تھا اس وقت سوویت یونین نے اپنی فوجیں افغانستان میں اتاری ہوئی تھیں واپس آ کر میں نے دوستوں سے کہا روس افغانستان میں کچھ بھی نہ کر سکے گا بس پہاڑوں سے ٹکرا کر لوٹ جائے گا۔ لندن جاتے ہوئے ایک گھنٹے کا پڑاؤ ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن کے ہوائی اڈے پر تھا۔ لندن میں 10 دن قیام کے بعد شکاگو کے لیے روانہ ہوا تو ایک بار پھر کوپن ہیگن آنا ہوا۔ اس مرتبہ ائیرلائن نے ایک دن کے لیے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ یہ ہوٹل سچا فائیو سٹار ہوٹل تھا۔ اس کے کمرے میں دنیا بھر کی کا آرام اور خوبصورت کتابچہ ''ڈنمارک میں رہنے کے آداب'' رکھا تھا۔ یہ کتابچہ انگریزی، ڈینش، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں تھا جو ڈنمارک کے محکمہ سیاحت کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

یہ کتابچہ بہت دلچسپ تھا اس میں ایک باب میں بہت سی ہدایات تھیں۔ کہا گیا تھا اگر آپ ڈنمارک کے قیام کے دوران میں کسی ڈینش کے گھر مہمان بن کر جائیں تو وہاں آپ کو ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔

1- جب آپ کو کوئی ڈینش شخص اپنے گھر بلائے اور وہاں آپ دیکھیں کہ کوئی خاتون گھرداری کے کام میں معروف ہے تو اپنے میزبان سے یہ مت پوچھیں کہ آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا؟ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بغیر شادی کے رہ رہے ہوں۔ آپ کے اس سوال سے ان کے دل کو صدمہ پہنچے گا۔

-2 آپ اگر خاتون خانہ سے بات کریں تو ان کو مسز فلاں کہہ کر نہ مخاطب کریں امکان اس بات کا ہوسکتا ہے کہ وہ ان صاحب کے ساتھ ویسے ہی رہ رہی ہوں۔ آپ کی اس بات سے ان خاتون کو دکھ ہوگا اور آپ اس طرح بداخلاقی کے مرتکب ہوں گے۔

-3 اگر آپ اپنے میزبان کے گھر میں کسی بچے کو دیکھیں تو اس بچے کی ذہانت یا شکل و صورت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے میزبان سے یہ نہ کہیں کہ آپ کا بچہ بہت خوبصورت ہے یا ذہین ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بچہ اس میزبان کا بچہ نہ ہو بلکہ خاتون خانہ کا بچہ ہو۔ اس طرح ایک جانب آپ کے میزبان کو دلی دکھ پہنچے گا اور ہوسکتا ہے معصوم بچے کو بھی صدمہ ہو۔ اس لیے اس سلسلے میں حد درجہ احتیاط سے کام لیں۔

-4 آپ کسی دفتر میں کسی خاتون سے ملیں تو ان سے یہ مت پوچھیے کہ آپ کے شوہر کیا کام کرتے ہیں؟ یا آپ کے شوہر کا نام کیا ہے؟ ہوسکتا ہے وہ خاتون کسی کے بھی ساتھ ایسے ہی رہ رہی ہوں۔ آپ کے سوال کی صورت میں ان کو دکھ پہنچ سکتا ہے۔

-5 اگر آپ کسی بزنس کے سلسلے میں کسی ڈینش سے ملیں اور وہ آپ کو کھانے وغیرہ پر مدعو کرلے تو گفتگو میں احتیاط سے کام لیں۔ کسی سے یہ مت پوچھیں کہ کیا آپ کے والد حیات ہیں؟ ہوسکتا ہے اس کو معلوم ہی نہ ہو کہ اس کا والد کون تھا اس صورت میں زندگی اور موت کی معلومات کیسے ہوسکتی ہیں؟ آپ یہ سوال کرکے اپنے میزبان کو ذہنی اور دلی صدمہ پہنچانے کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔

-6 کسی بھی ڈینش خاتون کو خط لکھتے ہوئے ان کے نام کے ساتھ مسز تحریر نہ کریں کیونکہ اکثر خواتین مسز ہوئے بغیر مسز ہوتی ہیں آپ کے ان کے مسز لکھنے سے ان کو انتہائی صدمہ ہوگا اور وہ دکھی ہوجائیں گی۔

''ہدایت نامہ سیاح ڈنمارک'' پڑھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ الٰہی! یہ کیسا ملک ہے؟ اس ملک کے بارے میں جب یہ سنتے تھے کہ یہ سیکس فری ملک ہے تو اس قسم کا کوئی خیال کبھی نہ آیا تھا کہ معاشرے میں اکثریت ہر اخلاقی بندھن سے آزاد ہوگی۔ پھر یہ خیال آیا کہ یہ لوگ جو کسی سوشل معاہدے کے بغیر میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ کیا انسان کہلانے کے مستحق ہیں؟ جانوروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایسی آزادی ان کے ہاں ہوتی ہے لیکن پھر جانور ایسے معاملات میں نہ حساس ہوتے ہیں اور نہ ان کو کسی بات پر دلی

صدمہ یا دکھ ہوتا ہے۔

ڈنمارک کے 17 اخباروں نے جو خاکے شائع کیے ہیں تو ان کے بارے میں وہ اخبار دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ اظہار رائے کی آزادی ہے۔ اس صورت میں انہیں اس بات کی پروا نہیں کہ اس سے دنیا کی ڈیڑھ ارب آبادی کو دلی اور روحانی صدمہ پہنچتا ہے۔ ڈنمارک کی حکومت بھی اپنے اخبار والوں کو اظہار کا حق دیتے ہوئے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی کہ اس سے دنیا کے مسلمانوں کے جذبات واحساسات کو ٹھیس پہنچے گی۔ بس انہیں اپنے جانوروں جیسی زندگی گزارنے والے لوگوں کے جذبات کا اتنا خیال ہے کہ ہر سیاح کو ''آداب ڈنمارک'' سکھاتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے ہمیں انفرادی طور پر ڈنمارک کے سفارت خانے اور حکومت کو خط لکھ کر یہ بتانا چاہیے کہ ہم ان اخبار کے مالکان، صحافیوں اور خاکے بنانے والوں پر مقدمے دائر کرنا چاہتے ہیں اور ان مقدموں کے لیے ہمیں ان تمام لوگوں کی ولدیت کی ضرورت ہوگی۔ برائے مہربانی ان لوگوں کی ولدیت فراہم کی جائے۔ دوسری صورت میں ہم ان کے ساتھ ''ولد نامعلوم'' لکھیں گے یا نام کے ساتھ انگریزی کا حرف ''B'' یا اردو کا حرف ''ح'' لکھ دیں گے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں ڈنمارک کے سفارت خانے اور حکومت ان خطوں کے کیا جواب دیتے ہیں؟

ہمیں یقین ہے جن لوگوں نے یہ خاکے شائع کیے ہیں یہ سب لوگ اسی قبیل کے فرزند ہوں گے جن کے جذبات کے بارے میں ڈنمارک کا محکمہ سیاحت، ہدایت نامہ شائع کر کے ہوٹلوں اور دفتروں میں سیاحوں کے لیے رکھتا ہے۔

ایک سوال علمائے کرام سے کہ جب ڈنمارک میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو آزادروی کی پیدائش ہیں تو کیا ایسے لوگوں کے ہاتھ کا بنایا ہوا مکھن کھانا حلال ہوگا یا حرام؟

ابو اسامہ عابد

آزادیٔ اظہار اور مغربی میڈیا کا اسلام کے خلاف افسوسناک کردار

میڈیا کے ذرائع بذات خود اچھے یا برے نہیں بلکہ کسی بھی فرد' معاشرہ' قوم و ملک کا استعمال اس کو اچھے یا برے انداز سے ظاہر کرتا ہے۔ موجودہ دور میں عالم کفر نے میڈیا کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ انبیائے کرام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی اور دین اسلام کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کے لیے اس کو استعمال کیا۔ اسلام پر عمل پیرا ملت اسلامیہ کے افراد کو میڈیا کے ذریعہ بنیاد پرست' راسخ العقیدہ اور دقیانوس ایسے ٹائٹل بھی میڈیا کے ذریعہ سے ہی دیئے۔ اسلام اور اہل اسلام کے حقیقی محافظ اور عالم کفر کی ننگی جارحیت اور ان کے مظالم کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے والے مجاہدین کرام' صلاح الدین ایوبی اور یوسف بن تاشفین کے روحانی فرزندوں کے لیے "دہشت گرد" کا "لقب" عام کرنے اور جہاد جیسے عظیم عمل کو "دہشت گردی" کے طور پر باور کرانے کے لیے بھی میڈیا کا ہی استعمال کیا گیا۔ عالم کفر کے اسی جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈہ کی یلغار سے متاثر ہو کر کئی نام نہاد مسلم دانشور زرد صحافت کے علمبردار اور اکثر مسلم ممالک کے سربراہان اور بالخصوص پاکستان کے حکومتی زعماء یورپی نقطہ نظر کے ہمنوا ہو چکے ہیں۔

ذیل میں ہم عالمِ کفر کی میڈیا کے ذریعہ سے اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے ہرزہ سرائی پیش کریں گے۔

جرمن ٹیلی وژن نے 2000ء میں بائرن تھری (بڑا نشریاتی چینل) پر ایک رپورٹ سوڈان کے حوالے سے پیش کی جس میں جنوب کے پیچیدہ مسئلے کو عیسائی مسلمان "صلیبی جنگ" کے طور پر پیش کیا گیا اور رپورٹر نے پرزور انداز میں بتلایا کہ "یہاں اسلامی بنیاد پرست نسل کشی کر رہے ہیں اور عیسائیوں کو غلام بنانے کے لیے زبردستی مسلمان کر رہے ہیں"۔ انہی دنوں R.T.L پر ایک پروگرام Im mamen Allah's Terror پیش

کیا گیا۔ اس کا موضوع تھا ''دنیا کے تمام آزادی پسند لوگوں کے لیے ایک ایسے ''اسلامی بنیاد پرست گروہ'' کا خطرہ جو ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ ان ہی دنوں جرمن ٹی وی پر ''اسلام کی تلوار'' کے نام سے ایک سیریز چلائی گئی جس میں روس کی سابقہ مسلم ریاستوں پر ایک دستاویزی فلم پیش کی گئی۔ یہ دونوں پروگرام ایک نام نہاد ماہر اسلام پیٹر نے تیار کیے۔ دونوں میں بار بار یہ بات پیش کی گئی کہ ''اسلام امن عالم کے لیے خطرہ ہے'' اور اس کے جنونی پیروکار ''امن عالم'' آزادی' عدل' اور مساوات کے دشمن ہیں اور ''مغرب'' کو 'پانی سر سے اونچا ہو جانے سے پہلے' اسلامی طاقتوں پر حملہ کر دینا چاہیے۔

اس طرح میڈیا مہم کو غذا پہنچانے والے وہ ماہرین ہیں جو کسی مسئلہ پر پروڈیوسر کی رائے کی تائید میں اپنے موقف کو بیان کرتے ہیں۔ معروف جرمن مسلمان سکالر ''امام ہابام'' کے مطابق ''اگر آپ کو کسی ایسے سکالر کی ضرورت ہے جو یہ بتائے کہ مسلمانوں کی کاٹنے والی جنونی کالی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ ایک ہاتھ میں کلاشنکوف اور دوسرے ہاتھ میں قرآن لے کر چلتے ہیں تو فکر نہ کریں کوئی بھی رائے کتنی ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو''۔ جرمن ٹی وی ایسے ماہر کو تلاش کر لیتا ہے جو معروضی رائے دینے کی لیے تیار ہو جاتا ہے''۔

جرمنی کی تمام یونیورسٹیوں میں ایسے سکالر اور محققین موجود ہیں جو ''اسلام کے خطرات'' سے آگاہ کرنے کے لیے اور ''بنیاد پرست چیلنج'' کے عنوان سے مقالے لکھ رہے ہیں۔

اسی نہج پر چلتے ہوئے B.B.C امریکن ٹیلی وژن' دیگر یورپی نشریاتی ادارے امریکی ریڈرز ڈائجسٹ اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے دنیا بھر کی دوسری اقوام کے سامنے مسلمانوں کی ایسی خوفناک تصویر کھینچتے ہیں کہ جیسے ''مسلمان تہذیب و تمدن' اخلاقیات' عدل و انصاف اور رواداری سے بالکل ناآشنا ہیں۔

اس ضمن میں امریکی ٹیلی وژن پر ایک صحافی ایمرسن کی تیار کردہ ویڈیو فلم دکھائی گئی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مشرق وسطی میں جو لوگ مسلمانوں کے طرز فکر سے متفق نہیں' مسلمان ان کے خلاف دہشت گردی کرتے ہیں۔ فلم میں بہت زیادہ خون آلود لاشیں دکھائی گئیں اور انتہائی اشتعال انگیز تبصرہ کیا گیا۔ یہاں تک کہا گیا کہ ''امریکہ میں رہنے والے مسلمان بھی اسی قسم کی سوچ رکھتے ہیں۔ امریکہ میں یہودی لابی غالب ہے اور یہودیوں کی اسلام دشمنی واضح ہے۔ امت مسلمہ کے خلاف ہر ایکشن میں ان کی کرم فرمائیاں ہوتی

ہیں۔ دنیا بھر میں ہالی وڈ کی فلموں کا غلبہ و جہ یہ ہے اور ہالی وڈ پر یہودیوں کی اجارہ داری ہے۔ ہالی وڈ کی 50 اعلیٰ ترین فلمیں بنانے والے ڈائریکٹرز' پروڈیوسرز اور مصنفین میں سے 60 فیصد سے زیادہ یہودی ہیں۔ صحافت کے میدان میں رپورٹروں' ایڈیٹروں اور بڑے اخبارات کے چیف ایڈیٹرز و دیگر مناصب پر متمکن افراد میں سے 25 فیصد یہودی ہیں۔ (بحوالہ امپیکٹ مئی 1996 ص 24)

مسلمانوں کے خلاف ویسے تو دنیا بھر میں کافر قوتیں سرگرم عمل ہیں مگر امریکہ ان کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں پر قوت و اقتدار پر در پردہ یہودی قابض ہیں اور مسلمانوں کے خلاف تعصب و نفرت پھیلانے اور نقصان دینے کا کوئی معمولی موقع بھی ہاتھ سے نکلنے نہیں دیتے۔ امریکہ میں یہودی لابی جہاں اس کے لیے پرنٹ میڈیا کو استعمال کر رہی ہے وہیں پر الیکٹرانک میڈیا کو بھی استعمال میں لایا جا رہا ہے۔

اس ضمن میں بہترین مثال ''صیہونی سٹیو ایمرسن'' اور ''کارمون'' کی تیار کردہ فلم Jihad in America ہے۔ فلم کے پروڈیوسر کے سابق اسرائیلی وزیراعظم اسحاق شامیر کے مشیر کے ساتھ خصوصی تعلقات رہے ہیں۔

اس فلم میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بم دھماکہ کے اصل ذمہ دارانہ مسلمانوں کو ظاہر کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ''مسلمان صرف دہشت گردی کرنا چاہتے ہیں''۔ فلم میں مسلمانوں کو کسی تربیتی مرکز میں بھاری ہتھیاروں کی مشق کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور دہشت گردی کی کارروائیوں کے لیے اسلحہ کی سپلائی بھی دکھلائی گئی ہے۔ اس فلم میں تیونس کے مسلم راہنما راشد الغنوی اور عزام کو ''دہشت گرد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے ایک اور فلم حال ہی میں ٹائم وارنر نے Executive Decision کے نام سے ریلیز کی ہے جو کہ امت مسلمہ کو بدنام کرنے کی اب تک کی بدترین کوشش ہے۔ اس میں چیچن مسلمانوں کو دہشت گردوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ فلم کے منظر میں ایک جہاز کے اغواء کو دکھایا گیا ہے' جس میں مہلک اعصابی گیس ہے جو واشنگٹن تباہی کے لیے لائی جا رہی ہے۔ اس کے کچھ مناظر یوں ہیں:

1- ایک شخص قرآن ہاتھوں میں اٹھائے دہشت گردانہ کارروائی کر رہا ہے اور اس کا جواز قرآن سے بیان کر رہا ہے۔

2- دہشت گرد اللہ اکبر ان شاء اللہ کے الفاظ ادا کر رہے ہیں۔

3- دہشت گردوں کا سرغنہ نماز پڑھنے میں مصروف ہے۔

4- دہشت گرد اپنے آپ کو اللہ کی تلوار اور اللہ کے سپاہی کہتے ہیں۔

5- جہاز کے سہمے ہوئے ماحول میں دہشت گردوں کا کمانڈر قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

3۔ امریکہ میں ذرائع ابلاغ کے محاذ پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فضا گرم ہے۔ اپریل 1996ء کو Eye Witness میں پاٹ ڈاسن نے ایک گلی کا ذکر کیا جہاں فحش و عریاں پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ نیوز کاسٹر نے اس گلی کا نام ''مکہ'' بیان کیا ہے۔ اسی طرح ڈزنی فلم زیادہ تر بچوں کے لیے فلمیں اور ڈرامے بنانے والا ادارہ ہے لیکن اسلام اور مسلم دشمنی کے جذبات و احساسات اس ادارے میں بھی موجود ہیں۔ دو سال قبل ادارہ ڈزنی فلمز نے KAZAAM کے نام سے فلم بنائی جس میں بدمعاشوں کا کردار عربوں کے حوالہ سے دکھایا گیا ہے۔ اس فلم میں بدمعاش کا نام شکیل ہے۔ جبکہ ایک اور فلم Father of the Bride کے حصہ دوم میں ایک بدمعاش پڑوسی کا کردار ایک شخص ادا کر رہا ہے جس کا نام حبیب ظاہر کیا گیا ہے اور فلم Kazzam میں بھی ایک بلیک مارکیٹیے کے کردار کے لیے بھی عرب کا انتخاب کیا گیا ہے جس کا نام ملک لیا جاتا ہے۔

اس طرح جہاں الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کے ذریعہ سے اسلام اور مسلمانوں بالخصوص عرب کے مسلمانوں کو بطور دہشت گردوں کے پیش کیا جا رہا ہے وہیں پر اللہ اور اس کے رسولوں اور مقامات مقدسہ کی توہین بھی انہی ذرائع سے کی جا رہی ہے۔

1996ء میں ہفت روزہ نیوز ویک نے انسان کی ابتدائی زندگی اور آرٹ کے نام پر مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ نیوز ویک کے ایڈیٹر نے سرورق پر آدم علیہ السلام اور اماں حوا علیہ السلام کی برہنہ خیالی تصاویر چھاپ دیں۔ مضمون میں اسلام کے ابتدائی حصہ کو انتہائی برے انداز سے پیش کیا گیا۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اور یہ بھی دکھایا ہے کہ کس طرح فرشتہ ان کو قربانی سے روک رہا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں نے اپنے زمانہ تسلط میں اسم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بری طرح مسخ کر دیا۔ مثلاً انگریزی زبان میں محمد Muhammad کو

Mahaund (ماہاؤنڈ) بنا دیا۔ ماہاؤنڈ کا اشتقاق Me-Hound ہے اور می ہاؤنڈ کے معنی ہیں ""؟؟؟؟؟"۔ (استغفر اللہ) اور ماہاؤنڈ کا یہ لفظ بڑی بڑی انگریزی لغات میں موجود ہے۔ نبی ﷺ کے نام کو بگاڑ کر Mohad بھی لکھا جاتا ہے۔ 16 ویں صدی کے ڈرامہ نویس کرسٹوفر مالووکا ڈرامہ ٹمرلین انگریزی ادب میں بڑا مقام رکھتا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی نبی ﷺ کی شان میں انتہائی گستاخانہ کلمات موجود ہیں۔ اسی طرح والٹر سکاٹ کے ناول میں بھی گستاخی آمیز جملے شامل ہیں۔ نیویارک کے سب سے بڑے کتابوں کے سٹور Barness and Noble پر دنیا بھر میں شائع ہونے والی کتب کے نمائش ہوئی۔ اس نمائش میں مذہبی سیکشن پر تقابل ادیان کے موضوع پر دی السٹریٹڈ ورلڈز ریلیجنز اے گائیڈ ٹو آور وزڈم ٹریڈیشن نامی ایک کتاب بھی رکھی گئی جس کے مصنف کا نام "ہوسٹن سمتھ" ہے۔ اس کتاب میں نبی ﷺ کی 5 فرضی تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں۔ ان تصاویر میں آپ ﷺ کو والدہ کی گود میں' غار حرا میں' جبرائیل علیہ السلام کے سامنے' خانہ کعبہ کے سامنے صحابہ کرام کو تبلیغ کرتے ہوئے اور معراج کی رات براق پر سوار دکھلایا گیا ہے۔ اس کتاب کا مصنف امریکہ میں مذہبی تاریخ کا نامور "عالم" گردانا جاتا ہے۔

ملعون سلمان رشدی نے بھی نبی ﷺ کی ذات اقدس پر انتہائی توہین آمیز کتاب لکھی اور اس کے بعد بریکن مکس نے "انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن" کے عنوان کے تحت ایک اور کتاب چھاپی۔ اس کتاب کا مصنف جی ٹی بھیتی ہے جس نے مذکورہ کتاب میں قدسی نفوس کی گستاخی کی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ 509 پر رسول اکرم ﷺ اور صفحہ 541 پر عمر فاروقؓ کی خیالی تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ رسول اکرم اور صحابہ کرامؓ کی شان میں گستاخی کی گئی ہے اور اسلام کو ایک فرسودہ نظام بنا کر پیش کیا گیا۔ دیگر جرائد و کتب مثلاً لندن آبزرور میں نبی ﷺ کی خیالی تصویر کو شائع کیا گیا۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں نبی ﷺ کی خیالی تصویر شائع کر کے ایک شرمناک جسارت کی گئی۔ (یہ کتاب ملک کی ہر بڑی لائبریری میں موجود ہے) اسی نہج پر چلتے ہوئے کرونیکل نامی کمپیوٹر سافٹ ویئر کمپنی نے "انسائیکلو پیڈیا آف ہسٹری" کے نام سے ایک ڈسک جاری کی ہے جس میں نبی ﷺ کو بطور سیاست دان' فوجی سربراہ اور اسلام کے بانی کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے۔ نبی ﷺ کو پرچم تھامے دکھایا گیا ہے اور علی رضی اللہ عنہ کو مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

جو لوگ ''انٹرنیٹ'' کا باقاعدگی کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ قرآن پاک کی چار جعلی سورتیں انٹرنیٹ پر پیش کی جا رہی ہیں۔ ان نام نہاد سورتوں کے نام یہ ہیں جو کہ عالم کفر نے اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کی ہیں:

1- ''سورۃ التجسد'' یہ سورۃ 15 آیتوں پر مشتمل دکھائی گئی ہے۔ یہ سورت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے۔

2- ''سورۃ الایمان'' یہ سورۃ 10 آیتوں پر مشتمل دکھلائی گئی ہے۔ یہ سورت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے متعلق بیان ہے۔

3- ''سورۃ المسلمون'' اس میں گیارہ آیات گھڑ کر دی گئی ہیں اور ان میں نبی ﷺ کی توہین کی گئی ہے۔

4- ''سورۃ الوصایات'' اس میں 16 آیات گھڑی گئی ہیں اور اس میں بھی نبی ﷺ کی توہین کی گئی ہے۔

چند ماہ قبل یعنی 11 ستمبر 2001ء کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کے بعد یورپین ممالک اور امریکہ نے ان تمام صورت حال کا سبب مسلمانوں اور قرآن کو ٹھہرایا اور بغیر کسی تحقیق کے مسلم ملک افغانستان پر چڑھائی کر دی اور اسے تہس نہس کرنے کے بعد قرآن مجید کے خلاف قدم اٹھایا۔ جہاد کی آیات سے خالی قرآن یعنی تحریف شدہ نسخہ قرآنی طبع کروا کر پورے امریکہ میں بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم پھیلا دیا' تاکہ اسلام کی تعلیمات پورے انداز فکر و تدبر سے نئے مسلمانوں میں ترویج نہ پا سکیں اور نہ ہی وہ حکم جہاد سے آشنا ہو سکیں۔ امت مسلمہ کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے پہنچائے گئے نقصان کو اگر ضبط تحریر میں لایا جائے تو یہ کام کئی کتابوں پر مشتمل ہوگا۔ مقصد بیان کرنے کا صرف یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کس انداز سے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے اسلام اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ' قرآن مجید' انبیائے کرام' نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی توہین کر رہے ہیں۔ اگر مسلمان اس توہین پر احتجاج کریں تو شدت پسند ٹھہریں اور اگر اسلام پر عمل پیرا ہوں تو بنیاد پرستی کا لیبل چسپاں کر دیا جائے۔ اگر عالم کفر کی ہرزہ سرائیوں کا جواب جہاد کے ذریعہ سے دیں تو دہشت گرد قرار دیا جائے اور نام نہاد مسلم حکومتوں کے ذریعہ سے زندانوں میں دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ پھر ان کال کوٹھڑیوں کے اندھیروں میں بنیاد پرست مسلمان اپنی زندگی کے آخری دن پورے کرتے ہیں۔

۞......۞......۞

پروفیسر شمیم اختر

آزادیٔ اظہار کے انوکھے مفہوم

عیسائی پروٹسٹنٹ فرقے کے پادری جیری فال ویل نے امریکی ٹیلی وژن سی بی ایس کے ''60 منٹ'' نامی پروگرام میں رسول اللہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں انتہائی گستاخانہ کلمات ادا کیے' جس سے کرۂ ارض پر بسنے والے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے جذبات بہت مجروح ہوئے۔ حیرت ہے کہ امریکی ٹیلی وژن کمپنی سی بی ایس ایسا اشتعال انگیز پروگرام نشر کرتی ہے' جو علم و تحقیق تو کجا جہل اور تعصب پر مبنی ہے۔ اس سے امریکہ کے حکمران طبقے کے اندر کا تعصب باہر آ گیا اور ان کے آئین میں دی گئی مذہبی آزادی کی قلعی کھل جاتی ہے۔

امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں آزادی تقریر کے نام پر شتم رسول کی روایت کوئی نئی نہیں ہے۔ یہ برسوں پرانی ہے اور بار بار کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ یاد رہے کہ جن دنوں شیطان رشدی کے قتل کے فتوے کے بعد کسی چوہے کی طرح بل میں گھسا رہتا تھا تو برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں نے خاتمی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ اس فتوے سے برات کا اظہار کرے، ورنہ یورپی برادری سے اس کے تعلقات معمول پر نہیں آ سکتے۔ چنانچہ صدر خاتمی کی کمزور اور مغرب نواز حکومت نے صلیبی صیہونی ٹولے کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

مغربی عیسائی ممالک کا اصرار تھا کہ سلمان رشدی کو اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے اور اسے اس کے استعمال کا پورا پورا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔ بالفاظ دیگر رشدی اور تمام شاتمین رسول کو ہمارے نبی کے خلاف ہرزہ سرائی کا بھرپور موقع فراہم کیا جائے گا اور مسلمانوں کو رواداری کے نام پر یہ سب دشنام سننا پڑے گا۔ یہ آزادی تقریر کا ایک انوکھا تصور ہے۔ ہم نے تو کتابوں میں پڑھا ہے کہ آزادی اظہار کے خیال کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو جسے چاہے گالی دے دے' اس کے سدباب کے لیے مہذب دنیا میں واضح قوانین موجود ہیں۔

امریکہ کے ایک جج جسٹس ہولمس نے آزادی تقریر کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا کہ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ کوئی شخص ناظرین سے بھرے ہوئے تھیٹر ہال میں ''آگ آگ'' کا شور مچا کر ''بھگدڑ کرا دے''۔ اسی طرح ہتک عزت اور کردار کشی کے انسداد کے لیے سخت قوانین رائج ہیں' جن کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ اگر امریکہ میں کوئی شخص لوگوں کو تشدد کے لیے اکساتا ہے یا انہیں اشتعال دلاتا ہے یا نفرت پھیلاتا ہے تو یہ تعزیری جرم ہے۔

خود برصغیر میں تعزیرات ہند میں تقریر و تحریر میں کسی مذہب کے پیروؤں کے جذبات مجروح کرنے پر سزا دی جاتی ہے لیکن تہذیب کی علمبردار مغربی دنیا میں رائج قانون ایک فرقے کے فرد کو ایک ارب سے زائد مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کا حق دیتا ہے لیکن اس کے خلاف فطری ردعمل کو دہشت گردی اور قابلِ تعزیر جرم قرار دیتا ہے۔ یہ کیسی منطق ہے اور کون سا فلسفہ ہے؟ چنانچہ امریکہ اسلامی تعلقات کی تنظیم کے ترجمان ابراہیم ہوپر نے سی بی ایس کے مندرجہ بالا پروگرام کو الفاظ کی دہشت گردی قرار دیا۔ انہوں نے اس بات پر خاص طور سے اعتراض کیا کہ شاتم رسول فال ویل عیسائی اتحاد کے کنونشن سے واشنگٹن میں دوبارہ خطاب کرے گا اور اس کے ساتھ ایوان نمائندگان کی اکثریتی جماعت کا چیف وہپ Tim Delay اور دوسرے سیاست دان بھی اظہار خیال کریں گے۔ (ڈان 16 اکتوبر 2002ء)

اس سے ایک بات روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ پادری جیری فال ول اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایوان نمائندگان کی اکثریتی جماعت بھی ہے۔ امریکہ میں ہمیشہ صلیبی عناصر کا غلبہ رہا ہے اور جن دنوں وہ اشتراکیت کے خلاف مقدس جنگ لڑ رہے تھے تو امریکہ میں مذہب کا بڑا چرچا تھا۔ انہوں نے تیل کے ذخائر سے مالا مال خلیجی رجواڑوں کو اس مقدس اتحاد میں شامل کر لیا تھا جو افغانستان میں روسی افواج کی موجودگی تک قائم رہا اور جونہی سوویت یونین شکست و ریخت کا شکار ہوا تو صلیبی صیہونی ٹولے کو مسلمانوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ اس کے بعد سے اسلام نے اشتراکیت کی جگہ لے لی اور جس طرح سرد جنگ کے دنوں میں امریکی سی آئی اے چن چن کر آزاد خیال شہریوں کو تنگ کرتی تھی اب مسلمانوں کو ہراساں کر رہی ہے۔ چنانچہ ان کی من حیث القوم عزتِ نفس پامال کرنے کے لیے اس ہستی کو ہدف بنایا جو تمام مسلمانان عالم کے ایمان کا محور ہے یعنی رسول اللہ ﷺ۔

کہنے کو تو ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں' مگر جواباً بھی حضرت یسوع مسیح علیہ السلام

اور حضرت مریمؑ کے تقدس پر آنچ نہیں آنے دیں گے' مگر ساتھ ہی ہم اس جاہل پادری کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ یسوع مسیح نے صرف یہ نہیں کہا کہ اگر کوئی ان کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو وہ مارنے والے کے آگے اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دیں بلکہ انہوں نے ایک موقع پر یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ "میں تلوار لے کر آیا ہوں"۔ انہوں نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ "اپنے لباس کے بدلے تلوار خرید لو"۔ اب اگر ہم ان کے آخری دو اقوال کو سیاق و سباق سے نکال کر ٹیلی وژن پر یہ کہہ دیں کہ نعوذ باللہ حضرت یسوع مسیح خونی' سفاک' شمشیر زن اور دہشت گرد تھے کیونکہ انہوں نے اپنے عقیدت مندوں کو لباس پر تلوار کو ترجیح دینے کی ہدایت کی تھی تو کیا یہ صحیح ہوگا؟ پادری فال ویل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی یسوع مسیح کی طرح اہنسا کا پرچارک کہا ہے جبکہ حضرت موسیٰ کا عصا بذات خود آلۂ تشدد ہے اور فرعون کے خاتمے کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ یہ ہماری کوتاہ بینی بلکہ جہل ہوگا کہ ہم ان پیغمبروں کے بارے میں ہرزہ سرائی کریں۔ اس کے برعکس یہ ہمارا ایمان ہے کہ ہم نبیوں میں تفریق نہیں کرتے' جبکہ عیسائی اور یہودی ہمارے رسول کو نہیں مانتے' بلکہ ان کے خلاف ٹیلی وژن پر دشنام تراشی کرتے ہیں۔

مولانا محمد شفیع چترالی

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے......

اپنی شیطانی کتاب کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کی دل آزاری کرنے والا ملعون سلمان رشدی اپنے مغربی آقاؤں کی گود میں بیٹھ کر آج تک مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی اصل سزا پانے سے تو بچا رہا لیکن قدرت نے اب اسے ایک ایسی سزا دی ہے کہ جس سے اس کو اور اس کے آقاؤں کو صحیح معنوں میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونے لگا ہے۔ اور چشم عبرت رکھنے والوں کے لیے یہ منظر بڑا ہی عبرت انگیز ہے کہ اپنی شیطانی کتاب کے ذریعے دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی دل آزاری کرنے والا ملعون آج خود اپنے بارے میں لکھی جانے والی ایک کتاب کے حوالے سے ''دل آزاری'' کا واویلا کر رہا ہے اور آزادیٔ اظہار کے نام پر اس کی حمایت اور پشت پناہی کرنے والے مغربی حلقے بھی کتاب کے ناشرین کو آزادیٔ اظہار کے ''درست استعمال'' کی تلقین کر رہے ہیں، جس پر وہ اب تک مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ گویا بی مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا ہے اور قدرت نے ''میاں کی جوتی میاں کے سر'' کے مصداق نام نہاد آزادیٔ اظہار کا مسلمانوں اور شعائر اسلام کے خلاف استعمال ہونے والا ہتھیار ہی ملعون رشدی اور اس کے سرپرستوں کے سر پر دے مارا ہے، اسے میرے آقا ﷺ کا ایک اور معجزہ اور اسلام کی حقانیت کا ایک اور بین ثبوت ہی کہا جا سکتا ہے کہ جس پہلو سے میرے آقا ﷺ کی حرمت و ناموس پر حملے کی کوشش کی گئی، اسی پہلو پر اللہ تعالیٰ نے ان کم بخت و کم نصیب گستاخوں کی مزید ذلت و رسوائی کا سامان کرا دیا اور ایک بار پھر شان ''ورفعنالک ذکرک'' دنیا کو دکھا دی گئی، یہ صرف ہم نہیں کہتے خود مغربی حلقے بھی اس صورت حال پر حیرت میں مبتلا ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق معروف اسکاٹس اخبار ''دی اسکاٹس مین'' نے اپنی اشاعت میں سلمان رشدی کے حوالے سامنے آنے والے بعض اہم واقعات کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کتابیں لکھنے والے سلمان رشدی

کو آج ایک ایسی کتاب نے پریشان اور مشتعل کر دیا ہے جس میں خود اس کے کرتوتوں کے متعلق اسی کے سابق محافظ نے لب کشائی کی ہے۔ ''دی اسکاٹس مین'' نے اپنی اشاعت میں سوال اٹھایا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اور قرآنی آیات کے خلاف اپنی تحریروں کے باعث موت کا فتویٰ پانے والا سلمان رشدی یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ اس کی زندگی کے پہلوؤں کو اجاگر کر کے اس کا سابق محافظ رون ایونس، آزادی اظہار کے اصولوں کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے؟

اس قضیے کا قصہ یہ ہے کہ ملعون سلمان رشدی کی حفاظت پر برطانوی حکومت کی جانب سے ماہر اور کہنہ مشق محافظین کو تعینات کیا گیا تھا، جن میں سے ایک محافظ اور کمانڈو ڈرائیور رون ایونس (Ron Evans) بھی تھا، رون ایونس کے حوالے سے برطانوی میڈیا کا کہنا ہے کہ وہ اپنے کام میں پیشہ ورانہ مہارت رکھتا تھا...... اور اس نے سابق برطانوی وزیراعظم جان میجر کے ڈرائیور کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں، اس لیے اس کے سلمان رشدی کے حوالے سے تجربات کافی اہم ہیں۔ رون نے سلمان رشدی کی حفاظت کے دوران گزرے ایام کے دلچسپ تجربات پر On Her Majesty's Service کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں رون نے ملعون سلمان رشدی کی حفاظت کے دوران اس بات کو محسوس کیا کہ مسلمانوں کی مقدس ترین کتاب کے خلاف دل آزار کتاب لکھنے والا لکھاری اپنی عادات وخوارق میں ایک گندہ آدمی ہے، جو اپنی طبیعت میں انتہائی خسیس اور بے حد بددماغ ہے، برطانوی کمانڈو اور ملعون رشدی کے ڈرائیوروں نے اپنی تازہ ترین کتاب میں جو رواں ماہ منظرِ عام پر آ رہی ہے، لکھا ہے کہ سلمان رشدی کی حفاظت کے دوران انہوں نے اسے ایک انتہائی بھدا اور پلید شخص پایا، جو کھانے پینے اور رہنے سہنے میں بھی اپنی بری فطرت کا اظہار کرتا تھا، جبکہ وہ مسلمانوں کے ممکنہ حملوں سے بعض اوقات اس قدر پریشان ہو جاتا تھا کہ ہمیں بلا وجہ ادھر ادھر کھڑا کر دیتا تھا اور کبھی تو حالات اس قدر تنگ کر دیتا تھا کہ ہمیں ہاتھ پیر باندھ کر کسی الماری یا سیڑھیوں کے نیچے بنے ہوئے احاطے میں اسے ڈال دینا پڑتا تھا۔ جس کے بعد اس کی جسمانی اور ذہنی حالت میں بہتری آ جاتی تھی اور ہم اسے کچھ دیر کے بعد کھول کر آزاد کر دیا کرتے تھے۔

ملعون سلمان رشدی کا برطانوی اخبارات سے بات چیت میں کہنا تھا کہ اس کے سابق ڈرائیور محافظ رون ایونس کی کتاب میں اسے ایک کاہل الوجود، بدد ماغ، خسیس، پلید،

بھدے اور بدوضع شخص کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے، جو میری "بے عزتی" کے مترادف ہے، اس حرکت پر میں رون کے خلاف قانونی کارروائی کا حق محفوظ رکھتا ہوں اور میں نے اپنے وکیل Mark Stephens کے ذریعے اس کتاب کی ناشر کمپنی John Blake Publishing Ltd. اور رون کو قانونی نوٹس بھیجا ہے، جس میں اسے کتاب میں سے متنازع ابواب نکال دینے کو کہا ہے۔

رپورٹ کے مطابق معروف برطانوی اخبار گارجین نے اپنی تازہ اشاعت میں سلمان رشدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ایک متنازع کتاب لکھنے والا سلمان رشدی آج خود بھی ایک متنازع کتاب کا شکار بن چکا ہے، جس میں اسے کاہل، بددماغ، خسیس اور کئی دیگر القابات سے نوازا گیا ہے۔ گارجین کا کہنا تھا کہ کتاب متنازع ضرور ہے لیکن اس کے مخاطب مسلمان اور الفاظ سلمان رشدی کے نہیں بلکہ اس کا مخاطب وہ خود اور الفاظ اس کی حفاظت پر تعینات اس کے محافظ کے ہیں۔ گارجین کا کہنا ہے کہ یہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کتاب سے اتنا ہی ناراض ہے؟ جتنا اس کتاب سے مسلمان ناراض تھے، لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اپنے محافظ کی کتاب سے وہ کافی ناراض ہے اور اس نے محافظ رون ایونس کو قانونی خط ارسال کیا ہے جس میں اس سے متنازعہ ابواب واپس لینے کا مطالبہ کیا ہے۔ سلمان رشدی کا استدلال تھا کہ اس کتاب میں اس کی کردارکشی کر کے اس کے سابق محافظ نے آزادیٔ اظہار کا غلط فائدہ اٹھایا ہے، جس پر اسے معذرت طلب کرنی چاہیے۔

برطانوی محافظ رون ایونس کا کہنا تھا کہ سلمان رشدی کی حفاظت پر تعینات محافظین اسے اس کی حرکات اور بلاوجہ حکم چلانے کے سبب "کاہل" اور "واہیات آدمی" کے نام سے پکارتے تھے۔ اپنی معرکۃ الآرا کتاب "On Her Majesty's Servic" میں سلمان رشدی کا گھر قسم ہا قسم کی شرابوں سے بھرا رہتا ہے اور وہ خود بھی شراب کا رسیا اور "دھتی" ہے، لیکن اعلیٰ درجے کی شراب کی وافر مقدار میں ہونے کے باوجود وہ اس قدر گھٹیا اور خسیس آدمی تھا کہ جب کبھی ہم محافظین اس سے شراب کا مطالبہ کرتے تھے، تو وہ ہم سے اس کی قیمت وصول کرتا تھا اور کہتا کہ تم شراب خانے جاکر بھی تو شراب کے لیے رقم ادا کرو گے، اس لیے بہتر ہے کہ مجھ سے شراب لے کر پیو لیکن اس کی قیمت ادا کرو، جو برطانوی 45 پونڈ اور امریکی 95 ڈالر بنتی تھی۔ رون کا کہنا تھا کہ سلمان رشدی اس بات کا بھی لحاظ نہیں رکھتا تھا

کہ جو آفیسرز اس سے ایک آدھ پیگ کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ برطانوی حکومت کی جانب سے خود اس کی حفاظت کے لیے تعینات کیے گئے ہیں۔ رون کے مطابق سلمان رشدی میں مروت نام کو بھی نہ تھی۔

اپنی تہلکہ خیز کتاب میں برطانوی اسپیشل برانچ کے کمانڈو ڈرائیور رون ایونس نے لکھا ہے کہ ملکہ برطانیہ "نائٹ" سے خطاب پانے والا سلمان رشدی اس قدر خسیس اور بددماغ ہوگا، اس کا انہیں اندازہ نہ تھا، رون نے اپنی تلخ یادداشتوں کو مجتمع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار سلمان رشدی کی حفاظت کی ذمہ داریاں پوری کرنے والے چند افسران کو رات گھر جانے میں دیر ہوگئی اور انہوں نے وہ رات اس کے گھر میں گزاری تو سلمان رشدی نے ان سے اس رات کا کرایہ طلب کر لیا اور افسران کی جانب سے اس کرائے کی ادائیگی سے انکار کے بعد اس نے لندن میٹروپولیٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ایک خط لکھا اور اس سے ان افسران کی جانب سے اپنے گھر میں رات بسر کرنے کا کرایہ مانگ لیا، جو فی کس 40 پونڈ تھا۔ رون کا استدلال تھا کہ یہ وہی افسران تھے جو برطانوی حکومت کی جانب سے اس کی حفاظت کے لیے تعینات کیے گئے تھے۔ رون کا کہنا تھا کہ یہ بات برطانوی ٹیکس گزاروں کے سوچنے کی ہے کہ وہ اپنی حکومت کو کیا صرف اس لیے ٹیکس ادا کرتے ہیں کہ وہ سلمان رشدی جیسے خسیس، بددماغ اور کاہل الوجود لکھاریوں کی حفاظت کرتی پھرے؟

رون کو برطانوی حکومت کی جانب سے رشدی جیسے پلید آدمی کی صرف حفاظت پر برطانوی ٹیکس دہندگان کی کمائی صرف کرنے پر اعتراض ہے جبکہ برطانیہ کی ملکہ معظمہ گزشتہ دنوں مذکورہ بالا "اوصاف" کے حامل ملعون رشدی کو باقاعدہ نائٹ ہڈ یعنی "سر" کے خطاب سے نواز چکی ہیں، بکنگھم پیلس میں جب رشدی کو ایوارڈ دیا گیا تو اس وقت بھی اس ملعون نے دل آزاری سے گریز نہیں کیا اور کہا کہ اپنی شیطانی کتاب پر انہیں کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ رون کی تازہ کتاب کے مندرجات کے سامنے آنے کے بعد یہ امر برطانوی حکومت کے لیے بھی باعثِ شرم ہونا چاہیے کہ اس نے ایسے شخص کو برطانیہ کا اہم اعزاز دیا جس میں انسانیت نام کی چیز نہیں ہے، انگریزی ادب میں رشدی کے ناولوں کی حیثیت کا پول بھی ماہرین کھول چکے ہیں اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ رشدی ملعون کی کتابیں بنیادی انگریزی گرامر کے الفاظ سے بھی پرے ہیں۔ اسے "سر" کا خطاب دینے کی واحد وجہ اس کی اسلام دشمنی ہی ہے

اور تازہ انکشافات کے مطابق تو وہ انسانیت کا بھی دشمن ہے، اس کی گندی طبیعت اور غلیظ ذہنیت کے باعث اب تک اس کو تین بیویاں "طلاق" دے چکی ہیں لیکن کمال ہے کہ اس کے باوجود "ملکہ معظمہ" نے اپنے محل میں بلا کر "سر" کا خطاب دیا، اس پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ۔

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے
میخانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

حافظ حسن مدنی

آزادئ اظہار یا جارحیت کا ارتکاب؟

جہاں تک ڈنمارک کے قوانین کا تعلق ہے تو اس حرکت میں اس کے اپنے طے شدہ کئی قوانین کی مخالفت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ڈنمارک کے کریمنل کوڈ کے سیکشن 140 کے مطابق ''ہر وہ شخص جو ملک میں قانونی طور پر مقیم کسی فرد یا کمیونٹی کے مذہب یا عبادات اور دیگر مقدس علامات کی تضحیک کرے گا، اسے زیادہ سے زیادہ چار ماہ کی قید یا جرمانہ کی سزا دی جاسکے گی۔''

غور طلب امر یہ ہے کہ جیلانڈ پوسٹن نامی اخبار اور اس کے ایڈیٹر کو اس قانون سے کیوں بالاتر رکھا جارہا ہے؟ جبکہ ڈنمارک کی سرکاری ویب سائٹ پر خود اس اخبار پر اس قانون کے تحت کارروائی کرنے کا امکان ظاہر کیا گیا ہے، لیکن ابھی تک کسی قانونی اقدام سے گریز کا رویہ زیرِ عمل ہے۔

ایسے ہی ڈنمارک ہی کے پینل کوڈ کے سیکشن 266 بی کے مطابق ''ایسا کوئی بھی بیان یا سرگرمیاں جرم ہیں، جو کسی بھی کمیونٹی کے افراد کے لئے رنگ، نسل، قومیت، مذہب یا جنس کے حوالے سے دل آزار ہوں۔'' ڈنمارک کے یہ اخبارات و جرائد اس دفعہ کی خلاف ورزی کے بھی مرتکب ہوئے ہیں لیکن یہاں بھی قانون کو حرکت میں نہیں لایا جارہا۔

مزید برآں ڈنمارک کے آئین میں آزادئ اظہار کے حوالے سے سیکشن 77 کی رو سے ''ہر شخص کو اپنے خیالات کے اظہار اور انہیں چھاپنے کی مکمل آزادی ہے لیکن وہ اپنے خیالات کے حوالے سے 'کورٹ آف جسٹس' کو ضرور جواب دہ ہے۔''

اگر ان اخبارات کی اس حرکت کو آزادئ اظہار کے زمرے میں لانے کو بھی بفرضِ محال تسلیم کرلیا جائے تب بھی اس 'کورٹ آف جسٹس' نے دنیا بھر کے مظاہروں کے بعد ان اخبارات سے کسی جواب طلبی سے تاوقت کیوں گریز کیا ہے؟

3- ڈینش اخبارات و جرائد کے بعد جب یہ کارٹون مغربی میڈیا میں شائع ہوئے ہیں تو اس امر کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کیا عالمی قوانین اور مغرب کے مسلمہ تصورات مغربی میڈیا کو بھی انہیں شائع کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟

اس سلسلے میں میڈیا ہر جگہ آزادیٔ اظہار کے حق کا تذکرہ کر رہا ہے، یوں بھی مغرب میں اس فلسفے کو بعض وجوہ سے ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ باوجود اس امر کہ اسلام آزادیٔ اظہار کے مغربی تصور کا قائل نہیں لیکن حالیہ خاکے مغرب کے اپنے پیش کردہ تصور پر بھی پورا نہیں اُترتے کیونکہ ہر انسان کو اس حد تک ہی آزادیٔ اظہار حاصل ہوتا ہے جب تک یہ اظہار دوسرے کی حدود میں داخل نہ ہو جائے۔ آزادیٔ اظہار کا مطلب قطعاً نہیں ہے کہ دوسروں کی حدود میں دخل اندازی کی جائے۔ ایک انسان جب آزادیٔ اظہار کے ذریعے دوسروں کے مقدس تصورات و نظریات اور رہنما شخصیات پر تنقید کرے گا تو یہ آزادی کے بجائے کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب کہلائے گا۔ دوسرے کے جذبات سے کھیلنا آزادیٔ اظہار کے بجائے 'دہشت گردی کا ارتکاب' ہے۔ جرمن مفکر ایمانویل کانٹ کا مشہور مقولہ ہے کہ

> ''میں اپنے ہاتھ کو حرکت دینے میں آزاد ہوں، لیکن جہاں سے تمہاری ناک شروع ہوتی ہے، میرے ہاتھ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔''

ایسے ہی

> ''ہر انسان کی آزادی وہاں جا کر ختم ہو جاتی ہے، جہاں دوسرے کی شروع ہوتی ہے''

اس لحاظ سے بھی ان اخبارات کا یہ رویہ آزادیٔ اظہار کے مغربی تصور کے استحصال اور کھلی مخالفت پر مبنی ہے۔ آزادیٔ اظہار کی یہ حد بندی صرف ایک مسلمہ حقیقت نہیں بلکہ یورپی کنونشن کا چارٹر (مجریہ 1950ء روم) اس کو قانونی حیثیت بھی عطا کرتا ہے۔ جس کی رو سے

> ''آزادیٔ خیالات کے ان حقوق پر معاشرے میں موجود قوانین کے دائرہ کار کے اندر ہی عمل کرنا ہوگا، تاکہ یہ آزادیاں کسی دوسرے فرد یا کمیونٹی کے تحفظ، امن و امان اور دیگر افراد یا کمیونٹی کے حقوق اور آزادیوں کو سلب کرنے کا ذریعہ نہ بنیں۔''

مزید برآں اسی چارٹر کے سیکشن 1، آرٹیکل 10 کی شق اول و دوم میں یہ بھی

درج ہے کہ

"آزادیٔ اظہار کے حوالے سے ملکی قوانین پامال نہیں کیے جائیں گے، تاکہ جمہوری روایات علاقائی سلامتی، قومی مفادات، دوسروں کے حقوق کی پاسداری اور باہمی اعتماد کو نقصان نہ پہنچے۔"

"آزادیٔ اظہار کا حق نہایت حزم و احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہیے، اس کے ذریعے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ملک میں معاشرے کی اخلاقی اقدار، دوسروں کی عزتِ نفس اور ان کے بنیادی حقوق کو گزند پہنچائے۔"

آزادیٔ اظہار کا یہ حق 'انٹرنیشنل کنونشن آن سول اینڈ پولیٹکل رائٹس' ICCPR کے ذریعے بھی محدود کر دیا گیا ہے۔

توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کی مخالفت ان متعدد فیصلہ جات سے بھی ہوتی ہے جو ماضی میں مغرب کی مختلف عدالتیں سنا چکی ہیں۔ اس کے باوجود ڈینش حکمرانوں کا یہ عذر 'عذرِ گناہ بدتر از گناہ' کا مصداق اور دیگر حکمرانوں کی ان سے ہم نوائی دراصل اسلام سے دشمنی کا برملا اظہار ہے۔ میڈیا کے بل بوتے پر اسلام کے بارے میں پیدا کیا جانے والا تعصب مختلف مراحل پر اپنا رنگ دکھا رہا ہے اور اس کو اپنے لبرل قوانین کا تحفظ پہنانے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔

یورپی یونین کی ہیومن رائٹس کی اعلیٰ ترین عدلیہ نے سال 1996ء میں برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈز کے توہین مسیح کے مقدمہ میں فیصلہ پر اوپر درج شدہ آرٹیکل 10 کے تحت اپیل کی سماعت کے بعد ایک اہم اور دلچسپ مقدمہ 'ونگرو بنام مملکتِ برطانیہ' میں بڑا معرکہ آرا فیصلہ صادر کیا ہے جو یورپی یونین کے تمام ممبر ممالک پر لاگو ہے۔

یہ کیس ایک ایسی فلم کے بارے میں تھا جس سے حضرت عیسیٰ کی توہین کا تاثر اُبھرتا ہے اور اس کو برطانوی سنسر بورڈ نے اس بنا پر نمائش سے روک دیا کہ اس سے عیسائی شہریوں کے جذبات مشتعل ہونے کا اندیشہ تھا۔ سنسر بورڈ کے اس فیصلہ کے خلاف فلمساز نے برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت 'ہاؤس آف لارڈز' میں اپیل کی، جہاں اس عدالتِ عظمیٰ کے ایک لبرل جج اسکارمین نے یہ قرار دیا کہ "توہینِ مسیح کا قانون برطانیہ کے لئے ناگزیر ہے۔"

اس ہاؤس نے بھی فلم کو نمائش سے روکنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ فلمساز نے پھر اس فیصلہ کے خلاف حکومت برطانیہ کو فریق بناتے ہوئے حقوقِ انسانی کی اعلیٰ ترین عدالت نے اس آرٹیکل کی تشریح کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ ''توہینِ مسیح کے قانون کی بدولت حقوقِ انسانی کا تحفظ برقرار رہتا ہے۔'' اور سابقہ فیصلوں کو برقرار رکھا۔

ہیومن رائٹس کمیشن کے ایک مشہور کیس Faurisson VS France کا عدالتی فیصلہ ملاحظہ ہو:

> ''ایسے بیانات پر جو یہودیت دشمن جذبات کو ابھاریں یا انہیں تقویت دیں، پابندیوں کی اجازت ہوگی، تاکہ یہودی آبادیوں کے مذہبی منافرت سے تحفظ کے حق کو بالا دست بنایا جاسکے۔''

ان خاکوں کی اشاعت کے لئے بہت سے اخبارات نے یہ موقف بھی اختیار کیا کہ سیکولر معاشرے کے نمائندہ ہونے کی وجہ سے وہ مذہبی نظریات کے تحفظ کے پابند نہیں۔ دوسری طرف ان ممالک کے آئین اس امر کی ضمانت بھی دیتے ہیں کہ وہ اپنے ہاں بسنے والوں میں کسی مذہبی امتیاز کو جگہ نہیں دیں گے، لیکن ان ممالک کا عملی رویہ اس دعویٰ کے برعکس ہے۔ ان ممالک میں عیسائیت اور یہودیت کو جو تحفظ حاصل ہے اور قوانین میں ان کی جو ترجیحی حیثیت موجود ہے، اسلام کو یہ تحفظ کسی مرحلہ میں بھی میسر نہیں۔

ڈنمارک اور دیگر یورپی ممالک میں یہودیوں کے جرمنی میں قتل عام کی خود ساختہ تاریخ اور ان کی مظلومیت کو پورا تحفظ دیا گیا ہے۔ اس مزعومہ قتلِ عام (ہولوکاسٹ) میں مقتولین کی تعداد کو 50 لاکھ سے کم بیان کرنا کسی کے مجرم بننے کے لئے کافی ہے۔ حتیٰ کہ اس کہانی کے کسی جز کا بھی انکار کرنا 20 سال تک قید کی سزا کا مستوجب ہے۔ ان ممالک کا یہ قانون مذہبی امتیاز پر واضح دلیل اور آزادیٔ اظہار پر صاف قدغن ہے۔ لیکن چونکہ اس سے یہودیوں کی دل شکنی ہوتی ہے، اس لئے اس کو تو قانونی تحفظ عطا کیا گیا ہے، لیکن مسلمانوں کی دنیا بھر میں اور خود ڈنمارک میں دل شکنی کوئی جرم نہیں۔ یہ تضاد مغربی لبرل ازم کا پورا پول کھولتا ہے......!

برطانیہ میں حضرت عیسیٰ کی توہین پر موت کی سزا موجود ہے اور اس بنا کو عالمی عدالت انصاف بھی مختلف موقعوں پر تسلیم کر چکی ہے گویا وہ برطانیہ کے اس تصورِ قانون کی مؤید

ہے غور طلب امر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی توہین کو آزادیٔ اظہار کے دائرے میں لانا کیوں برطانوی حکومت کو گوارا نہیں۔ علاوہ ازیں برطانیہ کے اس قانون کا دائرہ صرف چرچ کے تحفظ تک ہی کیوں محدود ہے؟ یہ قوانین شہریوں میں عدم مساوات اور مذہبی امتیاز پر واضح دلیل ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی توہین کا ایک کیس آسٹریا میں بھی 1990ء میں زیرِ سماعت لایا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قانون دیگر مغربی ممالک میں بھی موجود ہے۔ اس کیس 'اوٹو پریمنگر انسٹیٹیوٹ بنام آسٹریا' کے فیصلہ میں عدالت نے تحریر کیا کہ

> ''دفعہ 9 کے تحت مذہبی جذبات کے احترام کی جو ضمانت فراہم کی گئی ہے، اس کے مطابق کسی بھی مذہب کی توہین پر مبنی اشتعال انگیز بیانات کو بدنیتی اور مجرمانہ خلاف ورزی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جمہوری معاشرے کے اوصاف میں یہ وصف بھی شامل ہے کہ اس نوعیت کے بیانات، اقوال یا افعال کو تحمل، بردباری اور برداشت کی روح کے منافی خیال کیا جائے اور دوسروں کے مذہبی عقائد کے احترام کو صد فی صد یقینی بنایا جائے۔''

1989ء میں ایک فلم Visions of Ecstasy کو برطانوی سنسر بورڈ نے اس بنیاد پر نمائش سے روک دیا کیونکہ اس میں چرچ کی توہین پائی جاتی تھی۔ حالانکہ بعدازاں وہ یہ ثابت نہیں کرسکے کہ اس میں توہین آمیز اور قابلِ اعتراض چیزیں کہاں پائی جاتی ہیں؟

اس واقعہ میں 'ہمہ قسم کے نسلی امتیاز (یا تعصبات) کے خاتمے پر عالمی کنونشن، ICERD کی بھی صریحاً خلاف ورزی کی گئی ہے۔ جس کی رو سے نسلی برتری، نفرت انگیز تقاریر اور نسلی تعصب کو ابھارنے کے عمل کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ اور اقوام متحدہ پر لازم ہے کہ اس قسم کے قابل تعزیر اقدامات کے ذمہ داروں کو قرارِ واقعی سزا دے۔

ایسے معاشرے جہاں مذاہب کی بنیاد پر تفریق ممنوع ہے، وہاں اسلام کو نظر انداز کرکے دیگر مذاہب کو یہ تقدس عطا کرنا بذاتِ خود قابلِ مؤاخذہ اور مذہبی امتیاز کا مظہر ہے۔ یہ مغرب کی اس منافقت کا پول کھولتا ہے جو آئے روز مذہبی مساوات کا دعویٰ کرتی اور مسلم ممالک کو اس کا درس دیتی رہتی ہے۔ بالخصوص اس وقت جب جمہوری اُصولوں کی دعویدار

حکومتیں اس حقیقت کے علیٰ الرغم اس زیادتی کا ارتکاب کریں کہ یہ دنیا میں پائے جانے والے ڈیڑھ ارب یعنی دنیا بھر کی چوتھائی آبادی کے مذہبی جذبات کا تمسخر اُڑاتا ہے۔

توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کوئی وقتی مسئلہ نہیں کہ اس پر مسلمان اپنے غم وغصہ کا اظہار کر کے اپنا احتجاج ریکارڈ کرالیں اور اسے ہی کافی سمجھیں۔ بلکہ اگر صرف گذشتہ چند برس کی تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ توہینِ اسلام غیر مسلموں کا ایک مسلسل رویہ ہے، جس کا ارتکاب غیر مسلم ایک تسلسل سے کر رہے ہیں اور اس کو کافر حکومتیں لگاتار تحفظ عطا کرتی ہیں۔ اس جرم کے مرتکبین ان کی آنکھ کا تارا اور ان کی عنایتوں کا مرکز ومحور ٹھہرتے ہیں۔

ان واقعات کے بارے میں حسب ذیل اشارے اس مسلسل رجحان کی عکاسی کرنے کے لئے کافی ہیں جس کے تدارک کے لئے اُمتِ مسلمہ کو سنجیدگی سے غور کرنا، اس کی وجوہات تلاش کرنا اور اس کے خاتمے کے لئے ٹھوس اقدامات بروئے کار لانا ہوں گے:

80 اور 90 کی دہائیوں میں سلمان رشدی کی شیطانی آیات اور تسلیمہ نسرین کے ناولوں کی اشاعت اور مغرب میں ان کی ریکارڈ تعداد میں فروخت، بعد ازاں ان دونوں ملعون شخصیات کو مغربی حکومتوں کا سرکاری پروٹوکول پیش کرنا اور ان کے گرد حفاظتی حصار قائم کر کے مقبولِ عام شخصیتوں کا درجہ دینا۔

نواز حکومت کے دوسرے دور میں دو مسیحیوں کا توہینِ رسالت کا ارتکاب اور راتوں رات اُنہیں جرمنی کی حکومت کے تحفظ میں دینے کے لئے پاکستانی ایئر پورٹوں سے باعزت روانگی۔

جنوری 2000ء میں انٹرنیٹ پر ایک حیا باختہ لڑکی کے سامنے مسلمان نمازیوں کو اس حالت میں سجدہ میں گرا ہوا دکھایا گیا کہ وہ اس کی عبادت کر رہے ہیں۔ اس پر ہفت روزہ 'وجود' کراچی میں توجہ دلائی گئی۔

ستمبر 2000ء میں انٹرنیٹ پر قرآن کی دو جعلی سورتیں 'دی چیلنج' کے عنوان سے شائع ہوئیں اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ وہ مظلوم سورتیں ہیں جنہیں مسلمانوں نے اپنے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہوئے قرآن سے نکال باہر کیا ہے۔ معاذ اللہ

اکتوبر 2001ء میں 'دی ریئل فیس آف اسلام' نامی ویب سائٹ پر نبی کریم ﷺ سے منسوب چھ تصاویر کے ساتھ ہتک آمیز مضامین شائع کئے گئے، جس میں اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے یہ تاثر اُبھارا گیا کہ مسلمان اپنے سوا تمام دیگر انسانوں بالخصوص یہود ونصاریٰ کو

واجب القتل سمجھتے ہیں۔ نبی کریمؐ سے تصاویر منسوب کر کے یہ دعویٰ کیا گیا کہ آپ دنیا میں قتل و غارت اور دہشت گردی کا سبب ہیں۔ نعوذ باللہ

نومبر 2004ء میں ہالینڈ شہر ہیگ میں Submission نامی فلم میں اسلامی احکامات کا مذاق اُڑایا گیا اور برہنہ فاحشہ عورتوں کی پشت پر قرآنی آیات تحریر کی گئیں۔ قرآنی احکام کو ظالمانہ قرار دینے کی منظر کشی کرتے ہوئے مغرب میں بسنے والے انسانوں کو یہ پیغام دیا گیا کہ اس دین سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے نتیجے میں وہاں مسلم کش فسادات شروع ہوگئے۔ آخرکار ایک مراکشی نوجوان محمد بوہیری نے اس گستاخ قرآن 'وان گوغ' کو اس کے انجام تک پہنچایا۔

یادرہے کہ اس فلم کا سکرپٹ نائیجیریا کی سیاہ فام مرتد عورت عایان ہرشی علی نے لکھا تھا، جب یہ عورت ہالینڈ میں سکونت پذیر ہوئی تو مسلمانوں نے اس کی سرگرمیوں پر احتجاج کیا، آخرکار ڈچ حکومت نے اس عورت کے تحفظ کے لئے اسے سرکاری پروٹوکول فراہم کردیا۔

جنوری 2005ء میں فُرقان الحق نامی کتاب شائع کر کے اس کو مسلمانوں کا نیا قرآن باور کرانے کی مذموم مساعی شروع کی گئیں۔ 364 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 88 آیات میں خودساختہ نظریات داخل کئے گئے جس کی قیمت 20 ڈالر رکھی گئی۔

مارچ 2005ء میں امینہ ودود نامی عورت نے اسریٰ نعمانی کی معیت میں امامتِ زن کے فتنے کا آغاز کیا اور مغربی پریس نے اس کو خوب اُچھالا۔

مئی 2005ء میں نیوز ویک نے امریکی فوجیوں کی گوانتاناموبے میں توہینِ قرآن کے 50 سے زائد واقعات کی رپورٹ شائع کی جس کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں میں اشتعال پھیل گیا۔

ستمبر 2005ء میں جیلانڈ پوسٹن نامی ڈینش اخبار میں توہینِ رسولؐ کا ارتکاب کیا گیا۔ جس کے بعد وہاں کے کئی جرائد نے اُنہیں دوبارہ شائع کیا۔ بعدازاں فروری 2006ء میں کئی مغربی اخبارات نے ان توہین آمیز کارٹونوں کو اپنے صفحہ اوّل پر شائع کیا۔

نبی رحمت محمد عربیؐ کی شان میں گستاخیوں کا یہ سلسلہ ان چند سالوں پر محیط نہیں بلکہ دشمنانِ اسلام نے آپ کی شانِ رسالت کو ہمیشہ اپنی کم ظرفی اور کمینگی کے اظہار کے لئے نشانہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

عباس اطہر

آزادی اظہار

مغربی دنیا کا ایک بہت بڑا مسئلہ آزادی اظہار ہے۔ جس پر وہ کبھی اپنے "اصولوں" سے دستبردار نہیں ہوتی۔ توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کے بعد اسی اصول کو بنیاد بنا کر معافی مانگنے سے انکار کیا گیا اور آزادی صحافت کو آڑ بنایا گیا۔ میڈیا کی آزادی مغربی دنیا میں بہت مقدس سمجھی جاتی ہے اور اس کا ایک تازہ ترین نمونہ یہ ہے کہ امریکی محکمہ دفاع نے کہا ہے کہ آسٹریلوی ٹیلی ویژن چینل کو عراق کی ابوغریب جیل میں قیدیوں پر مظالم کی تصاویر نہیں دکھانا چاہئیں تھیں کیونکہ اس سے اشتعال بڑھے گا اور غیر ضروری تشدد کی کارروائیاں سامنے آسکتی ہیں۔ جس اصول کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اسی کے تحت دنیا بھر میں احتجاج کے باوجود یورپی یونین نے اپنے میڈیا کی آزادی کو محدود کرنے کے مطالبات مسترد کر دیے ہیں۔ یہ آزادیٔ اظہار اس اعتبار سے بڑی مقدس ہے کہ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے جذبات کی توہین تو آزادیٔ اظہار ہے لیکن یہودیوں کی توہین کو ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔ یہ سوال مسلمانوں نے ہی نہیں خود یورپی صحافیوں نے بھی اٹھایا ہے۔ یہودیوں کے معاملے میں آزادیٔ اظہار کی صورت حال یہ ہے کہ ہر وہ فقرہ یا اشارا جو یہودیوں کو ناپسند ہو، یہود دشمنی قرار پاتا ہے اور یورپ میں دوسرے ہر جرم کی معافی ہو سکتی ہے، لیکن یہود دشمنی کی نہیں۔ یہود دشمنی کا تناظر اتنا وسیع ہے کہ یہ کہنا بھی یہود دشمنی کے زمرے میں آتا ہے کہ ہٹلر نے اتنی تعداد میں یہودی نہیں مارے تھے، جتنے بیان کیے جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سارا رویہ یورپی حکومتوں اور پریس کا ہے۔ عوامی سطح پر آج بھی یہودیوں کے خلاف اتنی ہی نفرت پائی جاتی ہے جتنی ماضی میں تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ حکومتی پابندیوں کے باعث لوگوں کو "جراتِ اظہار" کا ذرا کم ہی موقع ملتا ہے، تاہم لوگوں کا داؤ لگ جائے تو وہ یہودیوں کی قبروں پر غصہ اتار لیتے ہیں۔

یورپ میں یہود دشمنی کو Taboo (شجر ممنوعہ) بنانے کا ذمہ دار امریکہ ہے۔
جنگ عظیم کے خاتمے پر یورپ امریکہ کا مفتوحہ علاقہ بن گیا اور یہود ''مقدس'' قرار پائے۔
اب نائن الیون کے بعد کی دنیا میں فلسطینیوں کو یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ صابرہ اور شتیلہ میں ہزاروں عورتوں اور بچوں کے قاتل شیرون کو ''امن کا چیمپئن'' مان لیں اور یہ بھی قبول کر لیں کہ ان کی جدوجہد آزادی دراصل دہشت گردی ہے جس کا خاتمہ ہونا ضروری ہے۔

یورپ ماضی میں ہمیشہ یہود دشمن رہا۔ یورپ کی یہود دشمنی، یہود عاشقی میں اس طرح تبدیل ہوئی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے مفتوحہ یورپ (جرمنی، آسٹریا وغیرہ) میں تعمیر نو کے دوران سب سے زیادہ خرچہ یہودیوں کے قتل عام اور نازیوں کے مظالم کی کہانیوں پر مبنی فلموں، ٹی وی ڈراموں، کتابوں اور دوسرے لٹریچر پر صرف کیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد پیدا ہونے والی یورپ کی ساری نئی نسل نے پروپیگنڈے کے اس ''طوفان نوح'' کے سائے میں آنکھ کھولی۔ یہ نسل جب جوان ہوئی اور حقائق پر دوسرے زاویے سے نظر ڈالنے کا موقع ملا تو ان کی سوچ کچھ اور ہو گئی لیکن نہ نظر آنے والی امریکی زنجیروں میں جکڑی حکومتیں اور یہودیوں کی ترغیبات کا شکار یورپی میڈیا بدستور یہود عاشقی میں مبتلا رہا۔

Taboo اتنا مضبوط ہے کہ جرمنوں کی کسی حکومت کو آج تک یہ جرأت نہیں ہو سکی کہ وہ دوسری جنگ عظیم میں امریکیوں کے ہاتھوں جرمنوں کے قتل عام کا احوال بیان کر سکے۔ جرمنی کے سرکاری نصاب میں سارا زور یہودیوں کے مظلومانہ قتل عام پر ہے یا پھر نازیوں کے ظالم ہونے پر۔ اب ایک فلم بنی ہے جس میں جرمنوں نے کچھ جرأت سے کام لیا ہے۔ یہ فلم ''ڈریسڈن دی انفرنو'' "Dresden The Inferno" کے نام سے 13 فروری کو جرمنی کے سینماؤں میں نمائش کے لیے پیش کی گئی ہے۔ ڈریسڈن جرمنی کا ایک ہنستا بستا شہر تھا جہاں مشرقی علاقوں سے آنے والے ہزاروں جرمن پناہ گزین بھی آباد تھے لیکن 13 اور 14 فروری 1945ء کو امریکہ اور برطانیہ نے اس پر تاریخ کی بدترین بمباری کی۔ اس بمباری میں پچاس ہزار سے زیادہ شہری ہلاک ہوئے۔ از راہ مروت فلم ریلیز ہونے کی خبر میں یہ تعداد 35 ہزار بتائی گئی ہے۔ اس فلم میں امریکہ کو ظالم دکھانے کی جرأت نہیں کی گئی، صرف معروضی انداز میں ایک محبت کی کہانی کے حوالے سے شہر کی تباہی دکھائی گئی ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ جرمنی میں ایک ایسی فلم بنی ہے جس میں کم از کم یہ تو بتایا گیا ہے کہ ڈریسڈن میں

ہزاروں شہری، امریکی بمباری سے مارے گئے۔ اتنی جرات کرنے کے لیے فلمسٹار کو اپنی فلم میں پہلے تو یہ بتانا پڑا کہ جنگ کے اصل ذمہ دار یعنی اصل ظالم خود جرمن تھے پھر یہ بھی بتانا پڑا کہ امریکہ اور برطانیہ بمباری کر کے ڈریسڈن کے شہریوں کا قتل عام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ (شاید وہ ظلم کا قلع قمع کر رہے تھے) جرمن فلم ناظرین اتنے ذہین تو ضرور ہوں گے کہ وہ فلم کی نمائش کے لیے پیش کیا جانے والا یہ "عذر" اچھی طرح سمجھ لیں۔ اب تک جرمن صرف نازیوں کے مظالم کی فلمیں دیکھتے رہے ہیں۔ پہلی بار وہ امریکی کارروائی کی فلم دیکھ رہے ہیں۔ یہ انقلاب بھی خاصا اہم ہے۔

باقی یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ امریکی اور برطانوی کبھی قتل عام کرتے ہیں نہ قیدیوں کی تذلیل۔ یہ دونوں کام تو تعمیر نو اور قوموں کو آزادی دلانے کے نیک عمل کے دوران خود بخود ہو جاتے ہیں۔ برطانوی فوجی اگر عراقی بچوں کو ٹھڈے مارے مار کر ہلاک کر دیتے ہیں اور ان کی لاشوں پر بھی "ٹھڈا" بازی جاری رکھتے ہیں، تو یہ بھی انسانی حقوق کے احترام کا ایک انداز ہوتا ہے۔ بچوں کے ساتھ ہونے والے ان واقعات کی نئی وڈیو فلم پر دنیا میں شور مچا ہوا ہے اور ٹونی بلیئر نے اس فلم کی تحقیقات کا اعلان بھی کر دیا ہے حالانکہ دونوں عمل ہی غیر ضروری اور بے نتیجہ ہیں۔ نہ تو شور مچانے سے کچھ ہوگا نہ تحقیقات سے "ٹھڈا بازی" رکے گی۔ یہ تو آزادی اظہار کا وہ پہلو ہے جو امریکہ اور یورپ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔

انور یوسف

اسلام پھیل رہا ہے

گزشتہ دنوں ویٹی کن سٹی میں 262 بشپ کا اجلاس ہوا۔ یہ کئی گھنٹے تک سر جوڑے بیٹھے رہے کہ ان حالات میں جبکہ اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے، کیا کرنا چاہیے؟ رومن کیتھولک عیسائیوں کے دنیا بھر سے آئے ہوئے کارڈینیل مجلس کلیسا کے اجلاس میں اسلام کا یورپ میں پھیلاؤ کے موضوع پر ایک فیچر فلم دکھانے پر ناراض ہو گئے تھے۔ کارڈینیل پیٹر ترکسن کی جانب سے ''مسلم آبادی کے پھیلاؤ'' کے عنوان سے یوٹیوب پر 2009ء سے موجود سات منٹ کی فلم دکھانے پر بین الاقوامی بشپ کانفرنس میں ہنگامہ ہو گیا اور عیسائی دنیا کے رہنما پادریوں نے گھانا سے تعلق رکھنے والے بشپ ترکسن سے سخت ناراضی کا اظہار اور شور وغل کیا۔ صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے ''فادر تھامس روزیکا'' نے سوال کیا کہ کس نے پلان کیا؟ یہ کس کا منصوبہ تھا؟ اس کے پیچھے کون ہے؟ اس فلم میں مختلف یورپی ممالک میں آبادی کے اعداد وشمار کے حوالے سے مسلمانوں کی تعداد بڑھنے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثلاً: کہا گیا ہے کہ فرانس صرف 39 سال میں اسلامی جمہوریہ بن جائے گا۔ اعداد وشمار کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ فرانس کی عیسائی خاتون کے اوسطاً 1.8 بچے جبکہ مسلمان خاتون کے 8.1 بچے ہوتے ہیں۔

اجلاس میں شریک ایک بشپ نے کہا کہ وہ پیٹر ترکسن کی جانب سے پیش کردہ رپورٹ کے اعداد وشمار کو مسترد کرتے ہیں۔ فادر روزیکا نے اسلام سے متعلق نامناسب الفاظ استعمال کیے۔ اٹلی کے مسلمانوں کی تنظیم کے نائب صدر یحییٰ پلاوسنی نے گنتی کی جنگ کو خطرناک قرار دیتے ہوئے عیسائیوں سے کہا ہمیں آبادی میں اضافے یا کمی کے معاملے پر ایک دوسرے سے الجھنے کے بجائے مشترکہ چیلنجوں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ یادش بخیر! اکتوبر 2009ء میں بھی اسی طرح کا اجلاس ہوا تھا اور اس کے بعد فورم ''آل ریلیجنز اینڈ پبلک

لائف" نے ایک رپورٹ شائع کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ دنیا کا ہر چوتھا فرد مسلمان ہو چکا ہے اور چند سالوں کے بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔ یہ رپورٹ تین برس کے عرصے میں عرق ریزی سے غیر جانبدارانہ طور پر تیار کی گئی تھی اور دنیا کے 220 ممالک سے مردم شماری کے اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے تھے۔

یہ رپورٹیں جس قدر خوش کن ہیں، اسی قدر ہمارے لیے لمحہ فکریہ یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی دنیا آبادی اور وسائل رکھنے کے باوجود مسلمان پوری دنیا میں عالمی سازشوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم زوال کا شکار ہیں۔ حقیقت یہ ہے عالم اسلام کے زوال کا باعث "اسلام" نہیں بلکہ مسلمانوں کی بداعمالیاں اور حکمرانوں کی اسلامی اقدار سے روگردانیاں ہیں۔ خراب عناصر ہی مسلمانوں کے زوال کا سبب ہیں۔ جب بھی مسلمانوں میں بدعملی، اخلاقی کمزوری در آئی، انہوں نے اپنی تہذیب و ثقافت کو چھوڑا تو ناکامی نے ڈیرے ڈال دیے۔ یہ اٹل حقیقت ہے "اسلام" نظریاتی طور پر ہمیشہ غالب رہا ہے اور رہے گا۔ اسلام میں جو خوبیاں ہیں، وہ کسی اور مذہب میں نہیں۔ اسلام کے بارے میں تو غیر بھی گواہی دیتے ہیں کہ اس میں کوئی خامی نہیں۔ اس کی حقانیت کو غیر مسلم آج بھی جانتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ مانتے نہیں۔ جس طرح ابوجہل نے کہا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ اسلام برحق ہے لیکن ماننے کو تیار نہ ہوا۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو کہ "اسلام" انسان کی انسان پر بالادستی کو قبول نہیں کرتا۔ رنگ، نسل، زبان یا کسی دیگر تفاخر کا سخت مخالف ہے۔

اسلام پاکیزہ زندگی کا نمونہ ہے۔ مذہب و معاشرہ کی تخصیص کے بغیر معاشرہ کے ہر فرد کی عصمت کا حکم دیتا ہے۔ اسلام باہمی آزادانہ رضامندی کے تحت قوموں اور ملکوں کے درمیان معاہدات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ دھوکا دہی، عہد شکنی اور بلیک میلنگ کی سختی سے مذمت اور مخالفت کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جب مسلمانوں نے کسی غیر مسلم طاقت سے عہد شکنی کی ہو۔ دشمن کو معاف کر دینا اسلام کا اہم وصف رہا ہے۔ فتح مکہ کے وقت آپ ﷺ نے خون کے پیاسوں کے لیے معافی کا اعلان کیا۔ 90 سال تک مسجد اقصیٰ عیسائیوں کے پاس رہنے کے بعد جب ایوبی کے ہاتھوں فتح ہوئی تو عیسائی یہ سمجھ رہے تھے کہ اب ہماری خیر نہیں، ہمارے ظلم و جور کا بدلہ ضرور لیا جائے گا لیکن دنیا نے دیکھا کہ ایوبی نے عام معافی کا اعلان کر دیا حتیٰ کہ پوپ اور بادشاہ تک کو معاف کر دیا۔ مسلمانوں کا خاندانی نظام

ایک مثالی نظام ہے۔ اسلام بلاتمیز مذہب، رنگ و نسل انسانی جان کا پوری طرح محافظ ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت نمبر 32 کا ترجمہ ہے: ''جس نے کسی کا ناحق قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی، اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔'' کون نہیں جانتا، اسلام نے دنیا کو جس ہدایت، خیر و برکات اور امن سے شناسا کیا۔ قرآن اور رسول اکرم ﷺ کی مقدس زندگی ہے جس میں قوم، نسل، زبان، رنگ کی بجائے مکمل عالم گیریت ہے اور دنیا اس سے مستفید ہوئی۔ اب آتے ہیں مغرب کی طرف جس کا آج کا مسلمان نہ جانے کیوں دلدادہ ہوا جا رہا ہے؟ مغرب دنیا پر اپنی بالادستی مسلط کرنا چاہتا ہے۔ وہ رنگ، نسل اور غرور کی دیگر کئی بیماریوں کا مریض ہے۔ مغرب بے حیائی کا نمونہ ہے۔ زن و مرد کے آزادانہ اختلاط نے عفت و پاکیزگی کی تمام اقدار کو پامال کر ڈالا ہے۔ مغرب کا خاندانی اور معاشرتی نظام تباہ ہو چکا ہے۔ مغرب کی تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں کسی مغربی ملک نے کسی مسلمان ملک سے کسی معاہدہ کی پاسداری کی ہو بلکہ ہمیشہ معاہدہ شکنی اور دھوکا بازی سے کام لیا ہے۔ مغرب نے آج تک انسانی اقدار اور جان و مال کا احترام نہیں کیا۔ ناگاساکی اور ہیروشیما کے شہروں پر ایٹم بموں کا گرایا جانا، جس کے نتیجے میں لاکھوں انسان ہلاک و معذور ہوئے اور دونوں شہر تباہ و برباد ہوئے، مغرب کا ایسا بھیانک جرم ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

امریکہ، نائن الیون کے بعد عراق اور افغانستان میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو بے دردی سے قتل کر چکا ہے۔ کسی ملک پر ایٹم بم گرنے کا آج بھی خطرہ بدستور موجود ہے۔ ہمیں دکھ اور افسوس نہ ہوتا کہ صرف یہود و ہنود اور طاغوتی قوتیں ہی اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے خاتمے کے درپے ہوتیں۔ دشمن تو ہے ہی دشمن۔ اس کا تو کام ہی سازشیں کرنا، نفرتیں پھیلانا اور کمر میں چھرے گھونپنا ہوتا ہے۔ اس کا یہ طریقہ توازل سے چلا آ رہا ہے اور مسیح موعود تک رہے گا۔ اس کا آغاز شیطان سے ہوا اور دجال پر ختم ہوگا۔ نمرود، فرعون اور ابوجہل سے لے کر آج کے فرعونوں، نمرودوں اور ابوجہلوں تک ہے۔ دشمن کا تو کام ہی قرآن میں تحریف کرنا، اسلام کی تعلیم کو دہشت گردی کہنا اور اسلام کی ابدی تعلیمات سے خوف زدہ کرنا ہے۔ شیطانی قوتوں کا کام ہی اسلام اور مسلمانوں کی اصل تصویر چھپا کر ڈپلیکیٹ تیار کرنا ہے۔ اس کے لیے مستشرقین کے ٹولے تیار کیے گئے۔ پریس اور صحافی

خریدے گئے۔ ایسی کتب اور تحقیقات سامنے لائی گئیں جو تریاق کے نام پر زہر تھیں۔ ان سب کے باوجود پوری دنیا میں اسلام تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ اس وقت بھی مسلمان سب سے زیادہ ہیں۔ یہودی تمام تر سازشوں کے باوجود آدھے فیصد سے بھی کم، کیتھولک عیسائی 17 اور مسلمان 22 فیصد سے زیادہ ہیں۔ یہ گراف بتدریج اوپر ہی جا رہا ہے۔

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی اسلام اور مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں، پہلے سے زیادہ پھیلا۔ دور نہ جائیں! نائن الیون کے بعد جب بش نے کروسیڈی نعرہ مستانہ لگا کر عالم اسلام پر یلغار کی۔ قرآن کو دہشت گردی کی تعلیم کا منبع، ٹوپی ڈاڑھی کو دہشت گردی کی علامت، برقع اور اسکارف کو دقیانوسی اور قدامت پسندی کہہ کر پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔ جہاد کو دہشت گردی کا متبادل قرار دے دیا گیا۔ الحاصل! ہزاروں رکاوٹوں، سازشوں، پروپیگنڈوں اور طعنوں کے باوجود عوام تو عوام بڑے بڑے نامور جوق در جوق اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اسی بنا پر گزشتہ دنوں ویٹی کن سٹی کے اہم ترین کارکن نے چیخ چیخ کر کہا تھا: ''مغرب نے اسلام کو اپنے ذہن پر مسلط کر لیا ہے۔ لوگ تیزی سے اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے کے بعد مسلمان ہو رہے ہیں۔''

چند سال قبل ''نیوز ویک'' نے یہ بات لکھی تھی مغرب میں جس تیزی سے اسلام پھیل رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی رہا تو اس پھیلاؤ کو کسی بھی طریقے سے روکنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے بعد مضمون نگار امریکی تھنک ٹینک، اسٹیبلشمنٹ، سی آئی اے کے منتظمین اور حکام کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسلام کی اصل تعلیمات کے بارے میں پروپیگنڈا کر کے اس کا چہرہ مسخ کرنا ضروری ہے۔ اسلام کا وہ برانڈ فروغ پائے جسے مغربی سرپرستی اور تائید حاصل ہو۔ چنانچہ اس کے بعد بڑی تیزی سے اس پر کام شروع ہو گیا۔ مسلم دنیا کے لیے ایسے ایسے جعلی راہبر سامنے لائے گئے کہ الامان والحفیظ!! پاکستان چونکہ ایٹمی طاقت ہونے کے ناتے ایک اہم ترین اسلامی ملک ہے اور اس کے عوام میں دینی تعلیم پائی جاتی ہے۔ اپنی دینی روایات پر پابندی کے قائل ہیں۔ یہ دین کی سربلندی کے لیے جان دینا قابل فخر سمجھتے ہیں۔

اس کو ختم یا کم کرنے کے لیے نام نہاد حقوق نسواں بل، میراتھن ریس، نیو ایئر نائٹ، لو میرج، ڈاڑھی، چہرے کا پردہ، شعائر کا کھلے عام مذاق، جہاد کو دہشت گردی کہہ کر اسکول کے نصاب سے قرآن کی آیات کا اخراج، بین المذاہب مکالمے کا ڈھنڈورا، شراب نوشی کا

رواج، زنا کاری کے کھلے عام اڈے، نوجوانوں میں نشے کی لت، مخلوط تعلیم کی حوصلہ افزائی، ہر شعبے میں عورتوں بلکہ خوبرو لڑکیوں کی نمائندگی، فحاشی کے فروغ کے لیے مفت فیشن شو، بے ہودہ اشتہارات، ماڈلنگ کے نام پر بے حیائی، ثقافتی پروگرام کی آڑ میں برہنہ ناچ، میڈیا پر ہم جنس پرستی کی کھلے عام دعوت، غیروں کی ثقافت اپنانے کی ترغیب، رشوت، بدعنوانی، جسم فروشی، اسمگلنگ، اغوا جیسے کاموں کو برا نہ کہنا، نوجوانوں کے مابین مذاکروں کے نام پر دین کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، نماز کو یوگا اور ورزش باور کروانا، کھڑے ہو کر الٹے ہاتھ سے کھانے کو اسٹیٹس سمبل، جانوروں کی طرح پیشاب کرنے کو مہذب طریقہ، سلام کی جگہ ہیلو، سور کے گوشت کو بہترین گوشت اور شراب کو روح افزا، دین دار عورتوں کی تضحیک اور فاحشہ اور رنڈیوں کا اکرام............ ایسی سیکڑوں چیزوں کو اپنے پروردہ حکمرانوں اور اپنی پالتو این جی اوز کے ذریعے متعارف بلکہ بھرپور تشہیری مہم چلانا......

نتیجے کے طور پر ہمارے ہاں رشوت، بدعنوانی، شراب نوشی، جسم فروشی، بلیک میلنگ، اسمگلنگ، اغوا اور قتل و غارت اب باعث شرم نہیں بلکہ فخر کا باعث بنتے جارہے ہیں۔ اب تو اپنے بچوں کو یہ سکھانا بھی ناممکن ہوتا جارہا ہے کہ سچائی، اپنی تہذیب و ثقافت، اسلامی اقدار اور دیانت داری کا راستہ عروج کی طرف لے جانے والا ہے۔ اسی کے نتیجے میں مسلمانوں میں ان کے بارے میں شکوک پیدا ہورہے ہیں۔ نوجوان نسل گمراہی کی طرف جارہی ہے۔ مسلمان گھروں کی لڑکیاں غیر مسلم آشناؤں کے ساتھ منہ کالا کروا رہی ہیں۔ بچہ بچہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہوتا جارہا ہے۔ مغربی ثقافت سے متاثر ہوکر نوجوان بوڑھے والدین کو اپنے لیے بوجھ سمجھ رہے ہیں۔ طلبہ اپنے اساتذہ کی پٹائی لگا رہے ہیں۔ ہمارے وزرا غیر ملکی دوروں پر عوام کے پیسوں سے شراب و کباب سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ناچنے والیوں پر پیسے نچھاور کررہے ہیں۔ شراب کو حلال قرار دینے کے بارے میں سوچا جارہا ہے۔ دینی مدارس، علمائے کرام اور ائمہ مساجد کی کھچائی کے بارے میں اطلاعات ہیں۔ حیرت اور افسوس تو صرف اس بات پر ہے کہ غیر تو غیر اپنے بھی دشمنوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

اگر صرف فرانسیسی صدر مسلمان عورتوں کے لیے حجاب پر پابندی لگاتے تو کسی حد تک قابل برداشت تھا لیکن ہمارے مسلمان دانشور بھی اس کے حق میں دلائل دے رہے ہیں۔ ہمارے کاسہ لیس حکمران طاغوتی قوتوں کے اشارہ ابرو پر چل رہے ہیں۔ ہم کیسے

بدنصیب لوگ ہیں اپنے اللہ، رسول ﷺ، مکہ، مدینہ، قرآن، اپنے شاندار ماضی اور بے مثال تہذیب و ثقافت کو چھوڑ کر اپنے آپ کو نام نہاد مہذب، روشن خیال اور ماڈرن ثابت کرنے کے لیے گوروں کے رنگ میں رنگنے کے ہزار جتن کیے جا رہے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کو اللہ نے اپنے رنگ میں رنگنے کا واضح حکم دیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 138 کا ترجمہ ہے: ''اللہ کے رنگ سے بہتر کسی کا نہیں ہو سکتا۔'' دوسری جگہ ارشاد ہے: ''کفریہ طاقتیں تم سے اس وقت تک خوش نہیں ہوں گی جب تک تم ان کا مذہب اور تہذیب و ثقافت قبول نہ کر لو اور یہ سراسر خسارے اور گھاٹے کا سودا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورہ آل عمران کی آیت 64 میں فرمایا: (مسلمانو! یہود و نصاریٰ سے) کہہ دو کہ: ''اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہم تم میں مشترک ہو، (اور وہ یہ ہے) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور اللہ کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں۔'' اٹلی کے مسلمانوں کی تنظیم کے نائب صدر یحییٰ پلاوسنی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ خدا کے پیروکار ہونے کے ناتے ہم سب کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہیے نہ کہ انسانوں کو ایک دوسرے کی آبادیوں سے خوفزدہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اعجاز احمد

مسلمان رسوا کیوں؟

عالمی واقعات و حالات کا تجزیہ کیا جائے تو مسلمان پوری دنیا میں مصائب و مسائل کا شکار ہیں۔ میانمر، کشمیر، فلسطین میں مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے۔ میانمر کی حکومت نے 30 ہزار برمی مسلمانوں کو شہید اور 300 مساجد بند کیں۔ تقریباً ایک لاکھ مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ میانمر میں مسلمانوں کے قتل عام پر اقوام متحدہ اور اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی خاموش تماشائی بنی رہی۔ اسی طرح فلسطین، کشمیر اور دنیا کے دیگر ممالک میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ امریکہ نے پاکستان میں سال 2004ء سے اب تک 311 ڈرون حملوں میں تین ہزار بے گناہ لوگ شہید کیے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے "ظلم کے خلاف جتنی دیر سے اٹھو گے، اتنی ہی زیادہ قربانی دینی پڑے گی۔" مگر مسلمانوں میں اتنی سکت اور طاقت کہاں کہ وہ ظلم اور جبر کے خلاف اٹھیں اور اس کا مقابلہ کریں۔ اگر ہم حالات پر غور کرلیں تو مسلمانوں کے زوال اور ابتری کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں مسلمانوں کا دین سے دوری، حد سے زیادہ مادہ پرستی، تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کی کمی، جہاد سے کنارہ کشی اور اچھے لیڈروں سے محرومی وغیرہ شامل ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گی جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر گرتے ہیں" حاضرین میں سے ایک نے پوچھا "یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ اس لیے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہوجائے گی"۔ فرمایا "نہیں، تمہاری تعداد ان دنوں زیادہ ہوگی لیکن تم ایسے ہوجاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف اور خاشاک کہ سیلاب ان کو بہا لیے جاتا ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رُعب دور کردے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا"، کسی نے پوچھا "یا رسول اللہ ﷺ! وہ کمزوری کیا ہوگی" فرمایا "دنیا! یعنی مادہ پرستی"۔ بدقسمتی سے ہم دین سے کنارہ کش

ہو گئے اور مادہ پرستی کے پیچھے لگے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو دنیا کی تمام مشکلات کا حل اسلام کی پیروی میں ہے مگر بدقسمتی سے دوسرے ممالک اور مذاہب کے لوگ اخلاقی اصولوں پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم اپنے مذہب سے دور بھاگتے ہیں۔ مسلمانوں کا آپس میں اتحاد نہیں اور ہم ان لوگوں سے دوستی اور یاری لگا رہے ہیں جن سے قرآن مجید فرقان حمید نے دوستی نہ کرنے کی سختی سے تاکید کی ہے۔ سورۃ المائدہ میں ارشاد خداوندی ہے: ''اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا، وہ ان میں سے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بے انصافوں کو راہ نہیں دیتا''۔ مگر ان تمام مشکلات اور پیچیدگیوں کے باوجود اسلام تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 9/11 کے واقعے کے بعد غیر مسلموں میں اسلام قبول کرنے کی شرح دوگنی ہوئی۔ دنیا میں اسلام کی شرح نمو میں 21 فیصد اضافہ ہوا۔ سال 1989ء سے شمالی امریکہ میں اسلام کی ترویج میں 25 فیصد، براعظم افریقہ میں 3 فیصد، ایشیا میں 13 فیصد، یورپ میں 143 فیصد جبکہ آسٹریلیا اور چند دیگر ممالک میں اسلام میں 285 فیصد اضافہ ہوا۔ یہاں یہ بھی بات اہم ہے کہ امریکہ میں قرآن مجید فرقان حمید کے انگریزی ترجمے کی فروخت میں دوگنا اضافہ ہوا۔ عالمی سطح پر جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے اس میں ٹونی بلیئر کی 43 سالہ سالی لورن بوتھ، سوئٹزرلینڈ میں مسجد مخالف تحریک کا بانی دانیالستریش، پرتگال کے عالمی فٹ بالر شامروں شا، برطانیہ کے بیرسٹر احمد تھامس، امریکہ کے عالمی موسیقار آرٹ بلیکی، امریکہ کے باکسر براناڈ ہوپ، فرانس کے فٹ بالر انیلکا، فرانس کے فٹ بال کوچ بردونمیتو، جنوبی افریقہ کی سابقہ ملکہ حسن لین مسن، برطانیہ کے باکسر کرس، برطانیہ کے کامیڈین اور ٹی وی سٹار ڈیوڈ چاپ لی، جرمنی کے مشہور سکالر ہیملپے، بھارت کے مشہور گلوکار گوہر جان اور مالدیپ کے شہزادے، قرآن پاک کے انگریزی میں مشہور ترجمہ نگار پاکتیال، اٹلی کے سفیر ماریوسی، امریکہ کے مشہور ناول نگار فائٹ، امریکہ کے مشہور باکسر مائک ٹائی سن، وینزویلا میں سویڈن کے سفیر، گبون کے صدر عمر بانگو، اٹلی کے سفیر ٹارکیٹو، مصر کی مشہور گلوکارہ لیلیٰ مراد، بھارت کے ایک جنرل اور نیپال کی سپر ماڈل لاما پوجا وغیرہ شامل ہیں۔ لاس اینجلس ٹائمز کے مطابق ہیلری کلنٹن کہتی ہیں۔ ''اسلام دنیا میں تیزی سے پھیلنے والا دین ہے''۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق ''حضرت محمد ﷺ تمام پیغمبران کرام اور مذہبی شخصیات میں کامیاب ترین

پیغمبر اور انسان ہیں"۔ ٹورنٹو یونیورسٹی کے اناٹومی کے مشہور زمانہ پروفیسر کیتھ مور کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے پاس جتنا بھی علم، عقل اور فہم ہے، وہ خدائے عزوجل کی طرف سے ہے" کیونکہ جس زمانہ میں آقائے نامدار ﷺ جن چیزوں کا ذکر فرماتے ہیں، اس دور میں وہ دریافت نہیں ہوئی تھیں"۔ تھائی لینڈ کے شیانگ مائی یونیورسٹی کے پروفیسر اور یونیورسٹی کے شعبہ طب کے عالمی سطح پر جانی پہچانی شخصیت کہتے ہیں: "قرآن میں صحت اور طب کے بارے میں 1400 سال قبل جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سائنسی طور پر موجودہ دور میں 100 فیصد صحیح ہے۔ حضور ﷺ نے قرآن مجید فرقان حمید میں جو چیزیں بیان کی ہیں، وہ اس کائنات کے خالق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں"۔ امریکہ کے مشہور خلانورد پروفیسر آرم سٹرانگ کہتے ہیں "مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ قرآن میں اسٹرانومی یعنی سیاروں کے بارے میں 1400 سال پہلے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ دور جدید کے عین مطابق ہے"۔ پروفیسر ڈوگارووٗ کہتے ہیں: "قرآن مجید میں جس فصاحت اور بلاغت سے جو چیزیں بیان کی گئیں، وہ صرف اور صرف اس کائنات کا خالق کرسکتا ہے"۔ دنیا کے 100 مشہور افراد میں شامل مائیکل ایچ ہارٹ کہتے ہیں "دنیا میں کسی بھی سوسائٹی کے لوگوں کے متحد اور مساویانہ رویوں کو پیدا کرنے میں سب سے بڑا کردار اسلام کا ہے"۔ دنیا کے چند مشہور سائنسدانوں میں ایک سائنسدان پروفیسر سیاویڈا کہتے ہیں "جو کچھ قرآن میں ہے، سچ اور حق ہے۔ امریکہ کے سٹلائٹ فوٹوگرافی اور سمندری علوم کے ماہر ایک سائنسدان پروفیسر Hay کہتے ہیں "1400 سال پہلے قرآن میں سمندری علوم کے بارے میں جس سچائی کا ذکر کیا گیا ہے، میری سمجھ سے باہر ہے"۔ گائنی کی ایک پروفیسر انفرائیڈ کہتی ہیں کہ قرآن مجید میں جن جن دھاتوں کا ذکر کیا گیا، ان کی اہمیت کا اندازہ دورجدید میں پیچیدہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے لگایا جاسکتا ہے۔ کینیڈا کے ایک ماہر اطفال اور اناٹومی کے ماہر، جو کہ 200 تحقیقی مقالوں اور 25 کتابوں کے مصنف ہیں، لکھتے ہیں: "محمد ﷺ ایک عام انسان تھے تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ 1400 سال پہلے ایک اُمی انسان نے جو کچھ کہا، وہ موجودہ سائنسی دور میں 100 فیصد صحیح کیوں ہے"۔ شکاگو یونیورسٹی کی گائنی کی پروفیسر جولیا سمپسن کہتی ہیں "قرآن میں گائنی کے بارے میں جس وضاحت اور فصاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب اس سلسلے میں ہماری راہنمائی فرماتا ہے"۔ جارج برناڈ شا کہتے ہیں "کہ حضرت محمد ﷺ جن پر قرآن نازل

ہوا تھا، ہم ان کو انسانیت کا بچانے والا کہہ سکتے ہیں"۔ انٹیلیکچوئل ڈیویلپمنٹ کے ایک سائنسدان جون ویم باپر کہتے ہیں: "تمام وقتوں اور زمانوں کا عظیم لیڈر حضرت محمد ﷺ ہیں"۔

1937ء میں انڈیا کانگریس کی حکومت بنی۔ مہاتما گاندھی نے وزیروں کو سادگی کا مشورہ دیتے ہوئے کہا "میں رام چندر اور کرشن کا حوالہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ تاریخی ہستیاں نہیں۔ میں مجبور ہوں کہ سادگی کی مثال کے لیے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے نام پیش کروں۔ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے مگر انہوں نے فقیرانہ زندگی گزاری"۔

انور غازی

روادار کون؟

امریکہ نے مذہبی پابندیاں عائد کرنے والے آٹھ ممالک کو بلیک لسٹ کر دیا ہے۔ ان میں چین، ایران، اور سعودی عرب سرفہرست ہیں جبکہ پاکستان کو واچ لسٹ میں رکھا گیا ہے۔ امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی عالمی مذہبی آبادی کی رپورٹ برائے 2010ء کی دوسری ششماہی میں جن 8 ممالک کو مذہبی پابندیاں لگانے پر بلیک لسٹ قرار دیا ہے، ان میں چین، سعودی عرب، میانمار، اریٹیریا، شمالی کوریا، ایران اور ازبکستان شامل ہیں جبکہ افغانستان، مصر، عراق، نائیجیریا، روس، تاجکستان، ترکمانستان، وینزویلا، ویتنام اور پاکستان کو واچ لسٹ میں رکھا گیا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کا کہنا ہے ''جب حکومتیں مذہبی آزادی کا احترام کرنے لگیں اور رواداری کی فضا برقرار رکھنے میں قائم رہیں تو ایسے ممالک مستحکم رہتے ہیں۔ اس حوالے سے امریکہ مستحکم ہے۔''

چند سالوں سے امریکہ رواداری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے لیکن کام وہ ایسے کر رہا ہے جو اس میں خلیج پیدا کرنے کا سبب ہے۔ مغرب کے ہاں ہر شخص کو مذہب کی آزادی ہے وہ جیسے چاہے کرے لیکن جب مغربی ممالک میں رہائش پذیر مسلمان اپنے مذہبی شعائر پر پابندی کرتے ہیں تو ان کے خلاف نت نئے قوانین وضع کیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی قانون مسلمانوں کے حق میں جاتا ہے تو اس میں ترمیم کی جاتی ہے۔ گزشتہ دنوں کی رپورٹ ہے، کینیڈا کی حکومت نے باپردہ مسلمان خواتین کو ووٹ کی اجازت نہ دینے کا، بل منظوری کے لیے پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ کینیڈا کی حکومت نے یہ اقدام چیف الیکورل آفیسر کی طرف سے ووٹ دیتے وقت چہرے سے نقاب ہٹانے کو ضروری قرار دینے سے انکار کے بعد کیا۔ انہوں نے موقف اختیار کیا کہ کینیڈا کا موجودہ قانون ووٹ دینے والی مسلمان خواتین کو چہرے سے نقاب ہٹانے کے لیے مجبور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

مغربی ممالک میں آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ مسلمان خواتین کو صرف حجاب پہننے کی بنا پر ملازمتوں سے معطل کیا جاتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے معروف باکسر محمد علی جب اسلام قبول کرتا ہے تو انہیں زبردستی فوج میں بھرتی کرنے کا حکم دیا جاتا ہے؟ آئے دن مسلمانوں کی محترم ترین ہستیوں کے خلاف توہین آمیز خاکے شائع کر کے ان کے جذبات کو مجروح کیا جاتا ہے؟ امریکہ میں مذہبی آزادی تو دیکھیے جب امریکی صدر عیسائیت کی ترویج کے لیے وہائٹ ہاؤس میں "Faith-Based and Community Initiatives" کے نام سے خصوصی ڈیپارٹمنٹ قائم کرتا ہے اور عیسائی مذہبی تنظیموں کو 40 ارب ڈالر دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو روادار کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی مالدار شخص کسی مدرسے کی سرپرستی کرے تو وہ رواداری کا دشمن! یہ تفریق کیوں؟ یاد ش بخیر! 2003ء میں امریکہ کے صدر بش نے دنیا بھر میں عیسائیت کی ترویج کے لیے مشنری تنظیموں کو فنڈ فراہم کرنے کے لیے وہائٹ ہاؤس میں "Faith-Based and Community Initiatives" نامی ڈیپارٹمنٹ قائم کیا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر ''جم توِوی'' کو امریکی سوسائٹی کو کٹر عیسائی مذہبی معاشرے میں تبدیل کرنے کا ہدف سونپا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق انہوں نے 10 ہزار 5 سو 18 عیسائی تنظیموں کو ایک ارب 70 کروڑ ڈالرز فراہم کیے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ امریکہ اربوں ڈالر خرچ کر کے اپنے معاشرے کو مذہبی شدت پسند، تنگ نظر اور انتہا پسند بنانے کے لیے کوشاں نہیں؟ اور یہ کیسا فلسفہ ہے اگر ایک کام امریکی صدر عیسائیت کی ترویج کے لیے کرے تو اچھا ہے لیکن اگر کوئی صاحب ثروت مسلمان، اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے کرے یا کسی دینی مدرسے کو چندہ بھی دے تو اس کی انکوائریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کا رشتہ ناتہ مبینہ دہشت گردی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ کیسی ناانصافی ہے اگر کوئی ''ہولوکاسٹ'' پر لکھے یا بولے تو وہ قابلِ گرفت ہے لیکن اگر کوئی ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی معزز ترین ہستیوں کے بارے میں شرانگیزی کرے تو اس کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ 1988ء میں ''وائی کنگ پبلی کیشنز'' کے یہودی ادارے ''شیطانی آیات'' کے نام سے بدنام زمانہ کتاب لکھیں تو کچھ نہ ہو، لیکن جب ملائیشیا کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد نے دنیا کی صرف 0.23 فیصد آبادی یہودیوں کے بارے میں ذرا الفاظ کہے تو ان کو یورپ و امریکہ کی طرف سے دھمکیاں ملنے لگیں اور ان کے خلاف میڈیا پر پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ یہی نہیں اگر عیسائی،

عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ایک ارب کے قریب ویب سائٹس استعمال کرتے ہوں تو اچھا ہے لیکن اگر مسلمان چند ہزار ویب سائٹس اسلام کی دعوت کے لیے استعمال کریں تو ان کو بین کر دیا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں امریکہ اور مغرب کی یہی دوغلی پالیسی ہے جو ان کے لیے نفرت اور عداوت میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ عالمی طاقتوں کا یہی دہرا معیار ہے جو ان کے رواداری کے دعووں کی قلعی کھول رہا ہے۔

اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس نے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرا کر امن وامان کو ممکن بنایا۔ اسلام تو وہ مذہب ہے جس نے عرب کے پُر تشدد ماحول کو امن کا گہوارہ بنایا۔ عربوں میں جنگیں معمولی باتوں پر شروع ہو کر نسلوں تک چلا کرتی تھیں لیکن اسلام نے یہ لڑائیاں ختم کروادیں۔ اس کے برعکس ان دنوں عیسائیت قیصر روم کی شکل میں فارس سے برسرِ پیکار تھی اور لڑنا لڑانا اس کا طغرائے امتیاز تھا۔ تاریخ میں صلیبی جنگوں کے مذہبی نام پر عیسائیوں نے مسلمانوں کا کتنا خون بہایا، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ اب بھی ان کی طرف سے عالم اسلام، مسلمانوں اور مظلوم قوموں پر ظلم وستم و ناانصافی کا سلسلہ جاری ہے۔ بینیڈکٹ 16 کے گزشتہ دنوں کی ہرزہ سرائی سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ امریکی و یورپی دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں کی طرف سے مذہبی انتہا پسندی کا خاتمہ، مذہبی روا داری اور تمام مذاہب کے احترام و فروغ دینے کے نعروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ آوازیں بلند کرنے والے خود اس پر عمل پیرا نہیں۔ یہ صرف زبانی کلامی رواداری کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اور عملاً فلسطین، لبنان، صومالیہ، بوسنیا، کوسوو، افغانستان، عراق بلکہ پورے عالم اسلام میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو اس میں خلیج پیدا کرنے کا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے آئے دن مذہبی انتہا پسندی اور تعصب میں اضافہ ہو رہا ہے۔

انور یوسف

مجسمۂ آزادی یا مجسمۂ نفرت؟

چار جولائی امریکہ کا یوم آزادی ہے۔ امریکہ میں یہ دن ہر سال جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ اس سال بھی امریکہ کا 233 واں یوم آزادی نیویارک، واشنگٹن، ٹیکساس، کیلی فورنیا، فلوریڈا اور دیگر چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں میں منایا گیا ہے۔ اسی دن 1776ء میں امریکہ نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی تھی۔ یوم آزادی کے موقع پر امریکہ کی استعماری پالیسیوں کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے۔ مظاہرین نے مطالبہ کیا کہ وہ افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلا کر ان کو بھی آزادی دیں۔۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے عقوبت خانوں خصوصاً ابوغریب جیل، بگرام ائیربیس اور گوانتاناموبے میں قید مسلمانوں کو رہا کریں تاکہ وہ بھی آزاد زندگی گزار سکیں۔ نائن الیون کے بعد سے سیکڑوں مسلمان غائب ہیں، ان لاپتا افراد میں پندرہ بیس فیصد افراد کا تو علم ہے کہ وہ کہاں قید ہیں لیکن باقیوں کے بارے میں یہ تک معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ؟ انسانی حقوق کے عالمی برطانوی ادارے UK Prison Rights Group Reprieve نے اپنی سالانہ رپورٹ میں یہ انکشاف کیا ہے کہ امریکہ اپنے مطلوب افراد اور قیدیوں کو کھلے سمندروں میں موجود جنگی اور طیارہ بردار جہازوں کے سیلوں میں رکھتا ہے۔ اس کی ایک وجہ ان کی کھوج میں مصروف عمل انسانی حقوق کے اداروں اور میڈیا سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ دوسرا مقصد ان کی رہائی کے لیے کسی بھی ملک اور خصوصاً امریکہ کی قانونی مدد فراہم کرنے والی بین الاقوامی تنظیموں "Legal Watch Dogs" کی کارروائیوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق قیدیوں کی بیشتر تعداد کو امریکی حکام نے بحر ہند میں رکھا ہے، کئی ایک کو بحر عرب اور افریقی ممالک کے ساحلوں کے قریب رکھا گیا ہے۔

اس بارے میں امریکی بحریہ کے ترجمان ائیر ایڈمرل John Stufflebeem

کا کہنا تھا کہ چند قیدیوں کو وہاں اس لیے رکھا گیا ہے کہ ان کی جانب سے فرار کی کوششوں کو ناکام بنایا جاسکے۔ امریکی جنرل ٹومی فرینک کا اس حوالے سے کہنا ہے امریکی طالبان عبدالحمید جان واکر کو بھی ان جہازوں میں سے کسی ایک پر رکھا گیا تھا۔ اس وقت امریکی طالبان جان واکر امریکی ریاست کیلی فورنیا کی ایک جیل میں 20 سال قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ 2006ء میں امریکی صدر بش نے تسلیم کیا تھا کہ سی آئی اے کے پاس دنیا بھر میں بعض ایسی جگہیں ہیں جنہیں امریکی حکام نے ''بلیک سائٹس'' کا نام دیا ہے۔ امریکہ کے یہ عقوبت خانے تھائی لینڈ، جبوتی، پولینڈ، عراق، گوانتانا موبے اور افغانستان میں ہیں۔

مسلمان معاشرے کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کرنے والی انسانی حقوق کی تنظیمیں اور مغربی میڈیا کہاں ہے؟ وہ استعمار کے انسانیت کش عقوبت خانوں میں ہونے والے بدترین مظالم پر خاموش کیوں ہے؟ امریکہ کی دوغلی پالیسی تو ملاحظہ کیجیے، ایک طرف تو وہ انسانی حقوق اور رواداری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے تو دوسری طرف مبینہ دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کیے گئے مسلمانوں پر ہر طرح کے تشدد کی اجازت دیتا ہے۔ ایک عالمی ادارے کی رپورٹ کے مطابق تشدد میں بجلی کے جھٹکے، جنسی تشدد، کتے چھوڑنے، برہنہ کرنے، خوراک اور نیند سے محروم رکھنے، اکڑوں بٹھانے، ایک فٹ کے ڈبے پر کھڑا کرنے جیسے ناقابل یقین مظالم اور اذیت کے طریقے شامل ہیں۔ آج کے مہذب، روشن خیال، پڑھے لکھے اور آزاد میڈیا کے دور میں ایسے عقوبت خانوں کا وجود عالمی طاقتوں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

اب دھیرے دھیرے ان عقوبت خانوں کے ختم کرنے کے مطالبات بڑھتے جارہے ہیں، کیونکہ ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ انسانی حقوق کے ممتاز ادارے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی یورپی حکومتوں سے کہا ہے کہ وہ امریکہ کے خفیہ اور بدنام عقوبت خانوں کے سلسلے میں امریکہ کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ خود امریکہ کے 300 سے زائد سابق اعلیٰ حکومتی عہدیداروں، وزیروں، دفاعی ماہرین اور فوجیوں نے عراق، افغانستان اور گوانتانا موبے میں قیدیوں پر تشدد کو امریکی پالیسی سے نکالنے کے لیے انتظامی آرڈر کے اجرا کا مطالبہ کیا ہے۔ ان رہنماؤں نے قیدیوں پر تشدد کے خاتمے کے بین الاقوامی قوانین کے مکمل احترام کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ ان کا کہنا تھا: امریکہ جنیوا کنونشن کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے اس حوالے سے اپنے آپ کو بین الاقوامی ذمہ داریوں کا پابند سمجھے۔ انہوں نے

مشترکہ مطالبہ کیا کہ 11 ستمبر کے حملوں کے بعد امریکی صدر نے زیرحراست افراد کے حوالے سے جو انتظامی آرڈر جاری کیا تھا، اسے فوری طور پر منسوخ کیا جائے۔ امریکہ کے یوم آزادی کے موقع پر ہم مسلمان بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سپر پاور اور عالمی امن کے دعویدار ہونے کے ناتے ان عقوبت خانوں کو بند کر کے بے گناہ مسلمانوں کر رہا کرے۔

نیو یارک کی بندرگاہ پر امریکہ کا مجسمۂ آزادی مشعل ہاتھ میں لیے دنیا بھر کے انسانوں کو اپنی آغوشِ پناہ میں آنے کی دعوت دے رہا ہے، جس کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: ''اپنے بے کس، مصیبت زدہ اور غلام عوام کو ہمارے حوالے کیجیے تاکہ وہ آزادی کی زندگی بسر کر سکیں۔'' حقوق انسانی کا دعویدار امریکہ آج بھی ان الفاظ کی صداقت پر یقین رکھتا ہے لیکن اسی کا دوسرا چہرہ یہ ہے کہ افغانستان اور عراق کے بے گناہ عوام کو خاک وخون میں نہلا رہا ہے۔ امریکہ 1776ء سے 2009ء تک 233 سالوں میں 220 مرتبہ سے زائد مختلف آزاد اور خودمختار ممالک اور قوموں پر جارحیت کر چکا ہے۔ افسوس! یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور نہ معلوم کب تک رہے گا؟ اور وہ دنیا کی ہر چیز پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے مختلف حیلے بہانوں سے ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ کیا امریکہ کا ''مجسمۂ آزادی'' جو مظلوم اور غلام قوموں کے لیے آزادی کا پیامبر ہے، رفتہ رفتہ غریب ملکوں اور عوام خصوصاً عالم اسلام اور مسلمانوں کی آزادی چھیننے کی علامت اور نفرت کا استعارہ نہیں بنتا جا رہا؟

پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ

آزادی اظہار اور امریکہ کی مسلم دشمنی

اگست کے پہلے عشرے میں شکاگو کی ایک مضافاتی مسجد سے یہ اطلاع ملی کہ علاقے میں چلنے والے ایک دینی مدرسے پر بندوق سے فائرنگ ہوئی اور اس کے محض دو روز بعد اسی مدرسے سے ایک اور اطلاع یہ ملی کہ دو روز بعد مدرسے پر ایک اور حملہ ہوا، جس میں مدرسے کو تیزابی بم کا نشانہ بنایا گیا۔ اتوار کے روز لبارڈ میں رات کو تراویح کے دوران کالج کی مسجد میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنی گئی۔ نمازی فوراً مسجد سے باہر نکل آئے تاکہ معلوم ہوسکے کہ دھماکا کس نوعیت کا تھا اور کس نے کیا۔ مسجد سے نمازیوں نے سیون اپ کی خالی بوتل دیکھی، جس میں تیزاب بھر دیا گیا تھا اور تیزاب بھری یہ بوتل اسکول کی کھڑکی پر ماری گئی تھی، جس سے دھماکا ہوا اور کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے۔

بوتل میں تیزاب اور کچھ دوسرا مواد بھرا ہوا تھا، جس کی فوری طور پر شناخت نہیں ہوسکی، امریکی اسلامی تعلقات کی کونسل نے بتایا کہ اس نے ایف بی آئی سے کہا ہے کہ وہ نفرت کے اس واقعے کی مکمل تحقیقات کرے، نیز دوسرے وفاقی اور ریاستی اداروں سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس واقعے کی تحقیقات کرے کہ علاقے میں رمضان کے آخری ایام میں اس طرح کی اشتعال انگیز منافرانہ کارروائی کس نے کی اور مدرسے اور مسجد کے پہرے کو مزید موثر کریں تاکہ آئندہ اس طرح کی کوئی کارروائی نہ ہونے پائے اور یہ کہ خدانخواستہ ایسی کوئی کارروائی ہوئی بھی تو اس کے نتیجے میں کوئی نقصان نہ ہوسکے۔

امریکی وفاقی تحقیقاتی ایجنسی ایف بی آئی مارٹن گروو کی مسجد کے باہر جمعے کو ہونے والی مجرمانہ کارروائی کی تحقیقات بھی کر رہی ہے، جس میں مسجد کے باہر گولی چلائی گئی۔ اس جارحانہ کارروائی کے سلسلے میں پولیس 54 سالہ ڈیوڈ کو حراست میں لے چکی ہے اور اس کے

خلاف فائرنگ کے سلسلے میں مقدمہ درج کیا جاچکا ہے۔ اسے 51 ہزار ڈالر کے مچلکے پر حراست میں لے کر مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ فائرنگ کے اس واقعے پر کسی کے زخمی ہونے کی شکایت تو نہیں کی گئی تاہم پولیس کو وقوعے کی رپورٹ ضرور درج کرائی گئی ہے۔

اس قسم کی دہشت گردانہ کارروائیاں اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک سکھ گوردوارے پر بھی فائرنگ ہوئی تھی جس میں متعدد سکھ مارے گئے تھے۔ اگرچہ امریکیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا معاشرہ دنیا کے مہذب ترین معاشروں میں سے ہے جہاں تمام شہریوں کو جان و مال کا مکمل تحفظ حاصل ہے مگر حقیقت حال اس دعوے سے بہت مختلف ہے۔ مسلمان امریکہ کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، مگر یہ بڑی اقلیت ہی سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے۔ پوری امریکی قوم ہی مسلمانوں کی جان و مال کو غیر محفوظ کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔

مسلم اقلیت پوری امریکی قوم کا ہدف نظر آتی ہے۔ نہ صرف امریکہ میں مسلمانوں کی جان و مال کے لیے خطرات بڑھ رہے ہیں، بلکہ امریکہ میں ان کے لیے پرسکون رہائش بھی محال ہوتی نظر آتی ہے۔ یوں تو امریکہ ہر مذہب و ملت اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ حتیٰ کہ امریکی فوج میں سکھ فوجیوں کے لیے سکھوں کی مخصوص پگڑی کو بھی قبول کرلیا گیا ہے، مگر مسلمانوں کی منفرد تہذیب و ثقافت ان کے لیے تاحال قابل قبول نہیں ہوسکی ہے۔ پچھلے دنوں امریکہ کی معروف تفریح گاہ ڈزنی لینڈ کے ایک ریسٹورنٹ کی میزبان خاتون کا معاملہ سامنے آیا ہے، جنہیں مسلمان خواتین کا روایتی اسکارف سر ڈھانپنے کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں مل رہی۔

لاس اینجلس کی ایک عدالت میں دائر کیے جانے والے مقدمے میں متاثرہ خاتون کا موقف ہے کہ وہ اپنے سر کو اسکارف سے ڈھانپ کر کام پر پہنچیں تو ان سے کہا گیا کہ یہ اسکارف اتارنا ہوگا یا ریسٹورنٹ کے عقبی حصے میں گاہکوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر کام کرنا ہوگا، اگر یہ دونوں صورتیں قبول نہ ہوں تو گھر چلی جائیں۔

یہ تنازعہ 2010ء سے چل رہا ہے۔ جب مذکورہ مسلم خاتون کو امریکی شہریت کے لیے دیے جانے والے امتحان کے دوران معلوم ہوا کہ وہ کام کے دوران حجاب کا استعمال کر

سکتی ہیں اور انہوں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر اگلے روز ہی سے حجاب پہننا شروع کردیا۔ وہ ریسٹورنٹ پر ڈھائی سال سے کام کر رہی تھیں مگر انہیں حجاب کی سہولت والی رعایت کا علم نہیں تھا۔ اس رعایت کا علم ہونے کے بعد جب انہوں نے اسکارف کا استعمال شروع کیا تو ریسٹورنٹ کی انتظامیہ سے ان کا اختلاف شروع ہوگیا اور بالآخر انہیں عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔ سات مرتبہ انہیں بلاتنخواہ ریسٹورنٹ سے رخصت کر کے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ انہوں نے 2010ء میں ملازمت کے مساوی مواقع والے کمیشن میں اپنی ملازمت کے حوالے سے شکایت درج کرائی تھی اور اب پچھلے ہفتے ہی انہیں اپنے قضیے کے بارے میں مقدمہ درج کرانے کا حق ملا تھا۔

مذکورہ خاتون کے وکلا کا کہنا ہے کہ ان کی مؤکلہ کو اپنے ہمکاروں سے بھی بہت کچھ سننے کو ملتا ہے۔ ان پر دہشت گرد، اونٹ اور نہ جانے کیا کیا آوازے کسے جاتے ہیں۔ اس خاتون نے متعدد بار اپنے مینیجروں سے ان غلط حرکات کی شکایت کی مگر کسی نے ان کی شکایت پر کان نہیں دھرا۔ اوقات کار میں ان کے ساتھی کارکن مسلسل انہیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتی کہ میرا اسکارف ڈزنی لینڈ کے لیے کس طرح کسی قسم کے ضرر کا باعث ہے کہ جس کی وجہ سے میں اسکارف نہیں پہن سکتی، جبکہ سفید رنگ کا یہ اسکارف ڈزنی لینڈ کے یونیفارم کا ہم رنگ ہے اور کسی قسم کے خلل کا باعث نہیں۔ پھر بھلا اس کی اس شدت سے مخالفت کیوں؟

مسلمان امریکہ کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور اوپر سے نیچے تک امریکی معیشت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ مسلم اقلیت کسی بھی طرح امریکہ پر بوجھ نہیں ہے، بلکہ امریکہ کو کما کر دے رہی ہے۔ پھر دوسری اقلیتوں کے مقابلے میں سب سے بڑی امریکی اقلیت کے ساتھ یہ امتیازی رویہ کیوں ہے؟ یہ محض امریکہ کی تنگ نظری اور تعصب کے سبب ہے۔

امریکہ کو اپنی شہری آزادیوں پر بڑا ناز ہے اور فخر ہے، بلکہ وہ اس معاملے کو اپنے اور پوری دنیا میں مابہ الامتیاز گردانتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا امریکی مسلمان امریکہ کے شہری نہیں؟ اگر امریکا کا قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ رکھنے والے مسلمان آئینی طور پر وہاں کے شہری ہیں تو پھر دیگر مذاہب کے ماننے والے شہریوں کی طرح انہیں حقوق کیوں حاصل نہیں

ہیں؟ انہیں اپنے دینی شعائر کے ساتھ آزادی سے زندگی بسر کرنے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ مسلم اقلیت کے ساتھ امتیازی سلوک اور رویے سے تو یوں لگتا ہے جیسے امریکہ میں مسلمان ہونا جرم ہو۔ امریکہ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا مسلمانوں کے ساتھ امتیازی رویہ ہی مسلم دنیا میں اس کی ساکھ خراب کرنے کا باعث ہے۔ اگر وہ مسلم دنیا میں اپنے خلاف نفرت کا خاتمہ چاہتا ہے تو اسے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی بند کرنا ہوگی اور مسلمانوں کے دل جیتنے کے اقدامات کرنا ہوں گے اور اس کے سب سے اولین حق دار امریکی مسلمان ہیں۔

سعید نوابی

کیا عیسائیت یہی کہتی ہے؟

میں الزام نہیں لگانا چاہتا، میں تو دلائل سے بات کرنا چاہتا ہوں! اعتراض یہ ہے کہ ہر ایرا غیرا ہاتھ دھو کر اسلام کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ ان کے کان بہرے، آنکھیں اندھی، دماغ مفلوج اور دل سیاہ ہو چکے ہیں؟ انہیں حق بات سنائی دیتی ہے نہ سچ نظر آتا ہے، ان کے دماغ میں بھلی سوچ جنم لیتی ہے نہ دل صحیح غلط کا تعین کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جرأت، جذبہ حب الوطنی اور دینی حمیت سے عاری یہ مداری ہر ٹاک شو، پریس کانفرنس، انٹرویو، کارنر میٹنگ، ہر جلسہ اور ہر ریلی میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے ہیں۔ میں سخت الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا، لیکن آپ ہی بتائیں جب یہ ایجنٹ ایک مشن اور منصوبے کے تحت اسلام، پاکستان اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی بھرپور مہم چلا رہے ہوں تو کیا ہمیں یہ کہنے کا حق بھی نہیں کہ لوگو! ان کی باتوں پر مت یقین کرو، یہ جھوٹے ہیں، یہ ملک وقوم کے خیر خواہ نہیں، بلکہ اصل ظالمان ہیں، ان کی اسلام اور پاکستان دشمنی آپ کھلی آنکھوں دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی بم دھماکا ہو، کہیں آگ لگے، گولی چلے، کوئی اغوا ہو، کہیں راکٹ گرے، یہ بلا تحقیق فوراً اسلام پر حملہ کرتے ہیں، گھوم پھر کر ان کا سارا نزلہ اسلام پر گرتا ہے، یہ کہتے ہیں کیا معصوم اور بے گناہ لوگوں کو مارنا ہی اسلام ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہی کام ہیں؟ کیا قرآن میں یہی لکھا ہے؟ کیا اسلام یہی درس دیتا ہے؟ یہ کیسا اسلام ہے اور یہ کیسے مسلمان ہیں؟ اس قسم کے متعصبانہ، گمراہ کن اور زہریلے جملے ان کی گفتگو کا لازمی جزو بن چکے ہیں۔

ٹھیک ہے آپ دہشت گرد کہیں، ظالم کی گردن دبوچیں، بے گناہ اور معصوم انسانوں کا خون بہانے والوں کو الٹا لٹکا دیں، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، اس جہاد میں ہم آپ کے ساتھ ہیں لیکن میں معذرت کے بغیر واضح، دوٹوک اور کھلے الفاظ میں کہتا ہوں اصل دہشت گردوں، ظالموں اور قاتلوں کے خلاف دو جملے کہنے کی آپ میں سکت نہیں بلکہ سچ تو یہ

ہے آپ ظالموں کے جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ پشاور، لاہور یا کراچی میں دھماکا ہو تو آپ فوراً اسلام پر حملہ آور ہوتے ہیں، عین اسی لمحے پاک وطن پر امریکی ڈرون حملہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں کئی معصوم اور بیگناہ مسلمان شہید ہو جاتے ہیں لیکن مجال ہے اس ظلم اور دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے کبھی آپ نے کہا ہو، دیکھیں جی، ڈرون حملے کر کے یہ معصوم اور بیگناہ مسلمانوں کو شہید کر رہے ہیں۔ کیا یہی عیسائیت ہے؟ کیا عیسائیوں کے یہی کام ہیں؟ کیا بائبل میں یہی لکھا ہے؟ کیا عیسائیت یہی درس دیتی ہے؟ یہ کیسی مسیحیت ہے اور یہ کیسے مسیح ہیں؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کوئی یہ کہے، سب ڈرتے ہیں، اگر کسی ایک آدھ کی زبان سے یہ جملے نکل جائیں تو قیامت برپا ہو جاتی ہے اور شور مچ جاتا ہے، دیکھیں جی، یہ مذہبی تعصب کو ہوا دے رہے ہیں، یہ شدت پسند ہیں، یہ بنیاد پرست ہیں۔

میں آپ کو تھوڑا ماضی میں لیے چلتا ہوں تاکہ آپ جان سکیں کہ یہ پروپیگنڈا کیا ہو رہا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے؟ 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی، کل 16 ممالک نے اس جنگ میں حصہ لیا جن میں سے 15 غیر مسلم اور صرف ایک ترکی مسلم ملک تھا۔ یہ جنگ سربیا کے ایک قوم پرست کے ہاتھوں آسٹریا اور ہنگری کے ولی عہد فرانس فرڈی عینڈ کے قتل سے شروع ہوئی۔ ایک شخص کے قتل سے شروع ہونے والی جنگ 1918ء میں جب ختم ہوئی تو 85 لاکھ 28 ہزار 8 سو 31 انسان زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، 6 سال جاری رہنے والی اس جنگ میں 27 ممالک نے حصہ لیا جو سب کے سب غیر مسلم تھے۔ اس جنگ کے دوران 6 اگست 1945ء کو امریکا نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا جس سے ایک لاکھ انسان جل کر راکھ بن گئے پھر 9 اگست 1945ء کو یہی عمل ناگاساکی پر دہرایا گیا جہاں آن کی آن میں 48 ہزار انسان موت کے منہ میں چلے گئے۔ 15 اگست 1945ء کو دوسری جنگ عظیم جب ختم ہوئی تو ایک کروڑ 49 لاکھ 43 ہزار 5 سو انسان اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

کیا آپ کو معلوم نہیں 3 کروڑ 50 لاکھ انسانوں کی موت کا ذمہ دار ''عظیم ہٹلر'' مسلمان نہیں بلکہ ایک متعصب نسل پرست عیسائی تھا، اس کی خواہش تھی یہودیوں کا وجود حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ یہودیوں کے علاوہ اس نے روسیوں اور خانہ بدوشوں کی ایک بڑی تعداد کا قتل عام بھی کیا۔ ایسے لوگوں کو بھی گولی ماردی جاتی جو نسلی طور پر کم تر ہوتے، قتل گاہیں

اس طرح تعمیر کی گئی تھیں جس طرح کاروباری مراکز بنائے جاتے ہیں۔ ان قتل گاہوں میں مقتولین کی درجہ بندی ہوتی تھی، مقتولین کی قیمتی اشیا اکٹھی کر لی جاتیں اور لاشوں کو صابن بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

85 لاکھ 63 ہزار انسانوں کی موت کا ذمہ دار ''بہادر شہنشاہ نپولین'' کا مسلمان ہونا بھی کہیں سے ثابت نہیں۔ رحم، انصاف، مساوات، اخوت اور آزادی کو نوع انسانی کی ترقی کے لیے زہر قاتل سمجھنے والا پتھر دل ڈکٹیٹر فسطائی پارٹی کا بانی بینٹو مسولینی، یورپ کے مہذب معاشرے کا ایک ''مثالی انسان'' بھی یقیناً مسلمان نہ تھا۔ دنیا جانتی ہے چنگیز خان اور ہلاکو خان جیسے ''رحم دل'' اور ''انسانیت کا درد'' رکھنے والے فاتحین کا بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ 1964ء میں امریکا ویت نام جنگ شروع ہوئی، 1973ء میں اس جنگ کے اختتام تک 47 ہزار 3 سو 55 انسانی جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ ان تمام جنگوں کا سب سے بھیانک پہلو یہ تھا کہ ان میں لاتعداد عورتوں اور بچوں کو جان بوجھ کر ہلاک کیا گیا، شہری علاقوں میں اندھا دھند میزائل اور گولے داغ کر املاک کو تباہ کر دیا گیا۔

پرانی تاریخ چھوڑیں، صرف بیسویں صدی کا جائزہ لیں تو انسانی حقوق کے علمبرداروں اور امن کے داعیوں کا مکروہ چہرہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ 27 دسمبر 1979ء کو لیونڈ بریژنیف کے دور حکومت میں روس نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ اسلامی ملک افغانستان پر حملہ کر دیا، تمام اخلاقی حدود توڑتے ہوئے شہری علاقوں پر بم برسائے گئے، جس سے لاکھوں بے گناہ مرد، عورتیں اور بچے شہید ہو گئے۔ 7 اکتوبر 2001ء میں امریکا اور اس کے حواری عیسائی ملکوں نے نائن الیون سے وابستہ واقعات کی آڑ میں افغانستان پر حملہ کر دیا، اسکولوں، ہسپتالوں اور مسجدوں پر بموں کی بارش کی گئی جس سے لاتعداد، بچے، عورتیں اور مرد شہید ہو گئے۔ بے گناہ افغانیوں پر ڈیزی کٹر بم استعمال کرنے والا حقیقی دہشت گرد امریکا اور اس کے حواری آج بھی یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اتنے بے گناہ لوگوں کا خون کیوں بہایا گیا اور تاحال یہ دہشت گردی کیوں جاری ہے؟ یہی امریکا اسلامی ملک عراق میں ظلم کی داستانیں رقم کر رہا ہے، ابوغریب جیل میں امریکی درندوں نے جو کچھ کیا اس سے یقیناً ابلیس بھی شرما گیا ہوگا، لیکن کیا کہیں عیسائیوں، یہودیوں کے تمام تر مظالم، دہشت گردی اور سفاکیت کے باوجود کوئی صحافی، دانشور، کالم نگار، اینکر پرسن، وزیر، مشیر یا سفیر یہ نہیں کہتا دیکھو جی! کیا

عیسائیت اور یہودیت یہی ہے؟ کیا عیسائیوں اور یہودیوں کے یہی کام ہیں؟ کیا بائبل میں یہی لکھا ہے؟ کیا عیسائیت اور یہودیت یہی درس دیتی ہے؟ یہ کیسی یہودیت اور مسیحیت ہے اور یہ کیسے یہودی ہیں اور یہ کیسے مسیح ہیں؟ پھر قارئین! آپ ہی بتائیں یہ وزیران، مشیران، سفیران، حادثاتی لیڈران، جعلی پیران اور ذہنی غلامان، ظالمان ہیں یا نہیں؟ جو تصویر کے صرف ایک رخ پر ہی قناعت کر کے اپنے سارے ہنر کو ایک ہی طبقے کے خلاف آزماتے ہیں اور بڑی طاقت کے سامنے ان کی زبانیں گنگ، ان کے تبصرے خاموش اور ان کے چہرے بے بسی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔

اوریا مقبول جان

فاشسٹ اور لبرل

ابلاغ عامہ کے شعبے میں یونیورسٹی کے اساتذہ جمع تھے۔ میں ایک لیکچر کے لیے وہاں گیا تھا۔ وہاں اس ملک کی ایک بزرگ اور مشہور پروفیسر بھی موجود تھیں۔ وہ ثقافتی معاملات میں گفتگو کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ زبان و بیان انتہائی شستہ ہے۔ لاہور کی تہذیب پر ان کا بہت کام ہے۔ لیکچر سے پہلے دفتر میں بیٹھے ہوئے پاکستانی معاشرے کے زوال پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یہاں پر موجود بددیانتی، معاشرتی اونچ نیچ، حکمرانوں کی بداعمالیاں اور کرپشن پر بات چلی تو ان خاتون کے منہ سے ایک ایسا فقرہ نکلا جو ان جیسی پڑھی لکھی خاتون سے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے روانیٔ بیان میں ان ساری بداعمالیوں کے ذکر پر جھٹ سے کہا: ''یہ ہے ان کا اسلام!''

میں وہاں تو ان کے احترام کی وجہ سے چپ رہا، لیکن جب لیکچر کے بعد ایک طالبہ نے سوال کیا: ''یہ لبرل فاشسٹ کیا ہوتا ہے؟'' تو وہ سارا درد اُمڈ کر میرے الفاظ میں آ گیا جو اس فقرے سے میں نے محسوس کیا تھا۔ یہ لبرل فاشسٹ صرف پاکستان میں ہی پائے جاتے ہیں جو خود کو سیکولر اور لبرل کہلاتے ہیں لیکن ان کا سارا زورِ کلام اس ایک فقرے پر ٹوٹتا ہے: ''یہ ہے اسلام'' دنیا میں کہیں بھی کوئی قاتل، چور، ڈاکو، بددیانت شخص نظر آئے یا اس کے ظلم کی داستان بیان ہو تو کوئی نہیں کہتا: ''یہ ہے عیسائیت!'' یا ''یہ ہے یہودیت!'' بلکہ اسے اس شخص کا انفرادی فعل سمجھ کر اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں ''سیریل کلر'' یعنی ایک ترتیب سے اور ایک ہی وجہ سے کئی سو قتل کرنے والے افراد کی فہرست میں سب سے پہلا نام ''جیک دی ریز'' کا ہے جو لندن میں ایک خاص جنون کے تحت شہر کی طوائفوں کو قتل کیا کرتا تھا۔

1888ء میں لندن میں آباد 62 بازارِ حسن اس کی شکار عورتوں کی کٹی پھٹی لاشوں سے سجنے لگے۔ وہ اپنے خنجر سے اپنی اخلاقیات نافذ کر رہا تھا، لیکن کسی نے بھی اس کے مذہب

عیسائیت کو کسی تبصرے میں موضوع گفتگو نہ بنایا۔ 1888ء سے آج تک ایسے جنونی قاتلوں کی تعداد امریکا اور یورپ میں ہزاروں میں گنی جاتی ہے۔ کوئی بیوٹی پارلر کوئین رکلر ہے تو کوئی ریور سائیڈ، کلر، کوئی فری وے کلر ہے تو کہیں الزبتھ بتھوری جیسی اخلاقیات نافذ کرنے والی عورتیں ہیں، جو فاحشہ عورتوں کو قتل کر کے ان کے خون میں نہاتی تھی، لیکن کیا کسی نے ان افراد کے اعمال کی وجہ سے اس مذہب کو وہاں کے کلچر کو یا اس ملک کو گالی دی؟ مگر آپ کو یہ رواج اور یہ رسم صرف پاکستان میں ملے گی۔ کوئی ایک ایسی خبر پڑھ لیں۔ کوئی واقعہ ان لوگوں تک پہنچ جائے، آپ جملوں کی تکرار دیکھیے۔ ''یہ ہے ان کا اسلام''! یہ بنا ہی غلط تھا۔ یہ ملک نہیں رہ سکتا!'' اس سارے شدت پسند رویے کے باوجود یہ سب لوگ خود کو لبرل اور سیکولر کہلاتے ہیں۔ سیکولر کی جو عرف عام میں تعریف کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ تمام مذاہب کا احترام کرتا ہے لیکن آپ یہاں کے ان مخصوص لبرل کہلانے والے گروہوں میں بیٹھ کر دیکھیں۔

سب سے بے ضرر لوگ تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ ان کے لوٹے، بستر ے، ٹخنوں سے اونچی شلوار اور ماتھے کے محراب تک کا اس طرح تمسخر اڑاتے ہیں کہ نفرت کا لاوا اُبل اُبل کر سامنے آ رہا ہوتا ہے۔ لطیفوں کا ایک انبار ہے جو ان کی گفتگو میں نمایاں ہوتا ہے۔ کسی نے اپنے عقیدے کے مطابق اگر بے تراش بڑھی ہوئی ڈاڑھی رکھ لی ہے تو یہ اسے ایسی بے وقوفی اور احمقانہ پن سے تعبیر کرنے لگتے ہیں، لیکن وہی ڈاڑھی اگر فیڈل کاسترو، کارکس مارکس یا اینگلزر رکھے یا آئن اسٹائن اپنے بال بڑھائے تو اس میں انہیں حسن نظر آتا ہے۔ یورپ میں حشیش یا چرس پیتے ہپی انہیں انسانی دکھوں اور آلام سے تنگ آ کر ایک تصوراتی دنیا میں گم خوبصورت انسانوں کا گروہ لگتا ہے، لیکن پاکستان کے ملنگ، درویش سڑکوں پر عمر بسر کرنے والے کریہہ اور بدنما نظر آتے ہیں۔ ان ملنگوں میں سے اگر کسی سے کوئی حرکت سرزد ہو جائے تو سارے ملنگوں کو کریمنل، چور، اچکے اور اٹھائی گیرے کہنے لگتے ہیں۔ مغرب میں صرف امریکا میں ہر دو منٹ میں ایک خاتون تشدد کا شکار ہوتی ہے۔ ہر سال ہزاروں عورتوں کو ان کے سابق شوہر یا بوائے فرینڈ بے وفائی کے نام پر قتل کرتے ہیں۔ وہاں ان سب کو ایک انفرادی فعل کے طور پر لیا جاتا ہے، لیکن یہاں کاروکاری ہو یا جنسی تشدد، تبصرے کی تان آ کر اسلام اور پاکستان پر ٹوٹتی ہے۔

کیا یہ لبرل شدت پسند ہمارے معاشرے میں شروع سے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں!

جس قدر تحمل، بردباری اور قوتِ برداشت پاکستان کے علمی، ادبی اور نظریاتی لوگوں میں تھی، ان کی مثال ممکن نہ تھی۔ پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والوں میں کون تھا جو لبرل یا سیکولر نہیں تھا، لیکن انہی لوگوں میں اشفاق احمد جیسے لوگ بھی اسی احترام سے دیکھے جاتے اور سنے جاتے تھے۔ کوئٹہ سے جب بھی کبھی لاہور آیا تو ادیبوں، شاعروں کو اپنے گھر کھانے پر جمع کیا۔ کیسے کیسے بڑے نام کہ جن کے ذکر سے ادب کی دنیا روشن ہے، لیکن کیا مجال کہ کسی کے عقیدے یا نظریے کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔ یہ وہ دور تھا جب ان لوگوں میں کوئی مصیبت کا شکار ہوتا تو نظریاتی وابستگی ایک طرف رہ جاتی اور انسانیت اور انسانی تعلق سب پر فوقیت حاصل کر جاتا۔ یہ سب لوگ انسان کا احترام کرتے تھے۔ اس کی آزادیٔ رائے کا، اس کے عقیدے کا، اس کے لباس کا اور اس کی تراش خراش کا بھی۔

آج کا لبرل اور سیکولر وہ ہے جس نے مشرف دور میں جنم لیا۔ جس نے یہ سیکھا کہ کلچر کے نام پر اپنے نفسانی جذبات کو جنسی تسکین دے سکتے ہو، دے لو۔ یہ بظاہر حقوق نسواں کے علمبردار ہوتے ہیں لیکن کسی فیشن شو یا کیٹ واک کے دوران ان کے عورتوں کے اعضا پر تبصرے سنیں تو طبیعت متلانے لگتی ہے۔ ان کے نزدیک عورت وہاں صرف ایک بازار ہوتی ہے۔ ان کے سرخیلوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے 70 کے الیکشن کے دوران ایک رقص کرتی عورت کے دھڑ پر ایک مشہور شخص کا چہرہ لگا کر چھاپا اور صحافت میں ''شرافت'' کا ایک نیا باب رقم کیا تھا۔ مشرف دور نے ہم سے لبرل لوگوں کے تحمل چھین کر تعصب کو جنم دیا ہے۔

آپ پاکستان کے طول و عرض میں گھوم جائیں، آپ کو تحمل اور برداشت نظر نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ مشرف دور نے ایسے لبرل رویے کو جنم دیا ہے جو جامعہ حفصہ میں مرنے والی عورتوں کی چیخیں نہیں سنتا۔ ڈرون حملوں میں مرنے والے ایک ہزار شہریوں کا قتل اسے بے چین نہیں کرتا۔ کئی لاکھ بے گھر لوگ اسے نظر نہیں آتے، لیکن اگر کوئی ڈاڑھی والا کسی جرم میں پکڑا جائے، تو فوراً کہہ اُٹھے گا: ''یہ ہے ان کا اسلام! یہ ملک ہی غلط بنا تھا۔ یہ اب ٹوٹ جائے گا۔'' میرے ملک کا لبرل یا سیکولر نہ لبرل ہے اور نہ سیکولر بلکہ کسی اور سے نہیں، صرف اسلام سے نفرت کرتا ہے۔ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، کہ اسے بدنام کرے۔ فیصلہ پنچایت کرے، گالی اسلام کو، قتل، چوری، بددیانتی سیاست دان، بیوروکریٹ یا جرنیل کرے، گالی پاکستان بلکہ نظریہ پاکستان کو۔

انصار عباسی

سیکولرز کی منافقت اور لبرل فاشزم کا مظاہرہ

ریٹرننگ افسر کی طرف سے کالم نگار اور مسلم لیگ ن کے سابق ایم این اے ایاز میر کے کاغذات نامزدگی رد کیے جانے پر میں نے اس فیصلہ کے حق میں اپنی رائے کیا دی کہ لبرل فاشسٹ اور ٹُھی گروپ سے تعلق رکھنے والے ایک مخصوص گروہ نے مجھ پر دھاوا بول دیا۔ ان میں ایک تو اس قدر جذباتی ہوگیا کہ اس نے مجھے ''شیطان'' تک کہہ دیا۔ آزادی رائے کے علَم بردار مجھے میری رائے دینے پر گالیاں بک رہے ہیں۔ میرا جرم یہ تھا کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ جو شخص یہ کہے کہ وہ شراب پیتا ہے اور وہ اسلامی نظریہ پاکستان کی مخالفت بھی کرتا ہو تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے مطابق وہ ممبر پارلیمنٹ نہیں بن سکتا۔ ایاز میر سے نظریاتی اختلافات اپنی جگہ مگر یہ خوبی ان میں ضرور ہے کہ وہ اگر شراب پیتے ہیں تو کھل کر اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اظہار بھی ایسا کھلا کہ اپنے کالموں میں بھی اپنے اس شوق کو بیان کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کرتے۔ ایاز میر نے تو پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر یہ بھی مطالبہ کر دیا تھا کہ شراب کی پابندی کو ختم کیا جائے۔ مجھے اس بات پر مکمل یقین ہے کہ اپنی نااہلی کے خلاف اپیل کے وقت الیکشن ٹریبونل کے سامنے ایاز میر اپنے سچ پر قائم رہیں گے ورنہ منافقت کی یہاں تو کوئی کمی نہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ اپنے آپ کو سیکولر کہنے والے، پاکستان کے اسلامی آئین کی مخالفت کرنے والے، اس ملک کے اسلامی نظریہ کا انکار کرنے والے جب الیکشن لڑنے کے لیے میدان میں اترتے ہیں تو یہ حلف اُٹھاتے ہیں کہ وہ اسلامی نظریہ پاکستان کی حفاظت کریں گے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی نظریہ پاکستان ہی اس ملک کے قیام کا سبب بنا۔ یہی نہیں اس منافقت کا کھلا اظہار اہم سیاسی عہدوں مثلاً وزارتوں، وزارت اعلیٰ وغیرہ کے حصول کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ میری خواہش ہی رہی کہ کسی ایسے اصول پسند اور جرأت مند سیکولر کو دیکھوں جو اس منافقت سے پاک ہوتے ہوئے اعلیٰ

سیاسی عہدہ یا پارلیمنٹ کی ممبر شپ اس لیے قبول نہ کرے کیونکہ وہ پاکستان کے اسلامی نظریہ کو نہیں مانتا، اس لیے کہ وہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس جرأت کا مظاہرہ بھی ایاز میر صاحب ہی کردیں۔ اس کام کے لیے انہیں کاغذات نامزدگی میں اسلامی نظریہ پاکستان کے حلف پر دستخط کرتے ہوئے اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا۔

ایاز میر کے برعکس ان کے حمایتیوں میں اسلام اور نظریہ پاکستان سے چڑنے والوں کی ایک بڑی تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کے رویے میں منافقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جو امریکی اور دوسرے مغربی سفارتخانوں میں شراب کے جام اڑاتے ہیں، کچھ سیاستدانوں سے اسی حوالے (مفت شراب کی فراہمی) سے تعلق رکھتے ہیں مگر اُن میں اتنی جرأت نہیں کہ اس بارے میں سچ بول سکیں۔ وہ تو اتنے کاری گر ہیں کہ تاثر یہ دیا گویا کہ ایاز میر کو ان کی نظریہ پاکستان کے متعلق رائے پر نااہل قرار دیا گیا ہے جب کہ چار صفحات پر مشتمل فیصلہ کے مطابق ن لیگ کے رہنما کو ریٹرننگ افسر نے شراب پینے کی وجہ سے نااہل قرار دیا تھا۔ بحث یہ کی جارہی ہے کہ قرآن اور سنت رسول ﷺ کی کس تفسیر کو مانا جائے اور یہ کہ یہاں تو مسلمان کئی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اسلام مخالفت کے بہانے ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ ورنہ سوال تو سیدھا ہے کہ کیا اسلام، آئین پاکستان اور ہمارا قانون شراب پینے کی اجازت دیتا ہے۔ کسی فرقہ سے پوچھ لیں، جواب ایک ہی ہوگا کہ کوئی شرابی، کوئی زانی، کوئی بدکردار شخص، کوئی اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والا مسلمانوں کی رہنمائی کا اہل نہیں ہوسکتا۔

مجھے اس معاملہ میں اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ مگر سیکولر اور لبرل طبقہ کی یہ کیسی جنونیت اور عدم برداشت ہے کہ چونکہ میری رائے اُن کی رائے سے نہیں ملتی، اس لیے پاکستان کے اسلامی آئین، نظریہ پاکستان اور آرٹیکل 62 اور 63 کے ساتھ ساتھ مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک اینکر پرسن تو ایسا جذباتی ہوا کہ اشارتاً میرا حوالہ دے کر اپنے ایک مہمان صحافی پر زور دیا کہ "name the devil" (شیطان کا نام لو)۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ پاکستان اور اسلام کو جدا نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ پاکستان کے آئین کے مطابق اسلامی نظریہ پاکستان کا کوئی مخالف پارلیمنٹ کے اندر داخل نہیں ہوسکتا۔ میں تو قرآن اور نبی ﷺ کی سنت کی بات کرتا ہوں، میں تو آئین پاکستان کا حوالہ دیتا ہوں۔ میرا جرم یہ ہے کہ نہ تو میں

مفت کی شراب پینے والے کسی گروپ کا ممبر ہوں نہ کبھی رہا۔ میرا یہ بھی جرم ہے کہ میں لبرل فاشسٹوں اور اسلام سے شرمندہ رہنے والے ایک بااثر طبقہ سے گھبرانے والا نہیں۔ میرے لیے تو یہ سب قابل ترس ہیں کہ بات تو برداشت اور آزادی اظہار رائے کی کرتے ہیں مگر ایک شخص کی رائے کو سننے کی سکت نہیں رکھتے۔ ان کے تو چیمپئن تک ڈائیلاگ سے بھاگ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی

سیکولرازم کا اصل مطلب

آج کل دنیا میں بظاہر سیکولرازم کا بڑا چرچا ہے، اور ہمارے نالائق، نااہل اور جاہل حکمران اور بااثر لوگوں کا طبقہ جنہیں حالات کا کچھ پتا نہیں، جنہوں نے کبھی دنیا کے معاملات کو آنکھ کھول کر نہیں دیکھا، وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں واقعی سیکولرازم کا بڑا چرچا ہے اور واقعتاً مغربی دنیا سیکولرازم کی علمبردر ہے اور مذہبی معاملات میں وہ غیر جانبدار ہے۔ انہوں نے ہمارے بااثر طبقے کو سیکولرازم کا ترجمہ بتایا ہے: ''مذہبی غیر جانبداری'' حالانکہ اس کا یہ مفہوم کبھی تھا، لیکن اگر آج یہ مفہوم مان لیا جائے تو مغرب ایک منٹ کے لیے بھی غیر جانبدار نہیں ہے، وہ انتہائی تعصب کے ساتھ عیسائیت کے معاملے میں جانبدار ہے، اور انتہائی متعصبانہ انداز سے اسلام سے دشمنی کے وہ تمام مظاہر اور شرائط وعناصر اس میں موجود ہیں جو ایک انتہائی متعصب انسان میں ہو سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کے بااثر طبقے نے اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھ لیا کہ ایک جدید انسان کو مذہبی غیر جانبدار ہونا چاہیے، لہٰذا وہ غیر جانبدار ہے، اس کی نظر میں آپ اور آپ کا اسلام اور عیسائیت سب برابر ہے، وہ آپ کو ایک سطح پر رکھے گا، بلکہ وہ عیسائی کو زیادہ اہمیت دے گا، اس لیے کہ اس کے پیچھے انگریز ہے اور آپ کے ساتھ اس کا رویہ غیر ہمدردانہ نہیں بلکہ ایک طرح کا معاندانہ ہوگا، اس کا اگر تجربہ کرنا چاہیں تو آپ کر کے دیکھ لیں کہ کسی عیسائی کے خلاف جا کر پولیس میں رپورٹ درج کروائیں کہ اس نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا ہے، صرف آپ جا کر سادہ سی شکایت درج کروائیں، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں کے بااثر طبقوں کا رویہ آپ کے بارے میں کیا ہے۔ پوری حکومت آپ کی، پولیس آپ کی، عدالت آپ کی، سارے کے سارے جتنے بھی ادارے ہیں، وہ اس کا ساتھ دیں گے اور آپ کو مجرم سمجھیں گے، آپ کے لیے جان بچانا، عزت بچانا مشکل کر دیں گے۔ پاکستان کے جس گوشے میں جائیں، تجربہ

کر کے دیکھ لیں، یہاں کسی عیسائی کی مسلمان اگر نکسیر بھی پھوڑ دیں کہ اس نے توہین رسالت کی ہے، اس جرم میں اگر کوئی عام مسلمان شہری جذبات میں آ کر اسے پتھر مار دے، دھکا دے دے اور اس کے نتیجے میں دیوار سے اس کی ناک لگ جائے، اور نکسیر پھوٹ جائے تو اگلے دن پوری دنیا اس طرح ہلتی ہوئی نظر آئے گی جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا۔ لیکن عیسائی مسلمانوں کا قتل عام بھی کر دیں، ابھی 24 بچوں کو چینی گورنمنٹ نے مار ڈالا، آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا، لیکن کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی، کسی اخبار میں، کسی معروف چینل پر، بی بی سی اور سی این این پر چھوٹی سے چھوٹی خبر بھی آپ نے نہیں دیکھی۔ 24 بچے، 12، 13، 14 سال کے اور انہیں کھڑا کر کے گولی سے مار دیا، لیکن کچھ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس اگر پاکستان کے کسی گاؤں میں، دیہات میں، سیالکوٹ میں، گوجرانوالہ میں، کسی عیسائی کی نکسیر پھوٹ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے، اس کی مثال دینے کی ضرورت نہیں، یہ روز کے مشاہدات ہیں۔

قابل غور امر یہ ہے کہ یہ سب محض اتفاق نہیں ہے، دنیا میں کوئی چیز اتفاق نہیں ہوتی بلکہ ہر چیز کے پیچھے ایک سلسلۂ اسباب ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کے نتائج ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اسباب و نتائج اور علت و معلول کے سلسلے میں منسلک کیا ہے، ہر واقعے کے پیچھے اسباب ہوتے ہیں اور ہر واقعے کے نتائج ہوتے ہیں، کوئی واقعہ ہو اور آپ یہ سمجھیں کہ اس کے اسباب نہیں تھے، یہ بالکل غلط بات ہے۔ ہر واقعے کے پیچھے اسباب اور نتائج ہوتے ہیں۔ وہ نتائج کیا ہیں، مسلمانوں میں افسوس کہ ہم نے نہ کبھی دیکھا کہ اس واقعے کے پیچھے اسباب کیا تھے، کب سے اس واقعے کے اسباب تیار کیے جا رہے تھے اور اس کے نتائج کیا ہوں گے، ہم یہ کبھی نہیں سوچتے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے حکمرانوں کو اس سے دلچسپی رہتی ہے کہ اگر کوئی ہنگامہ ہو گیا اور 50، 100 اُدھر کے آ گئے اور 50، 100 اِدھر کے آ گئے، تو معاملے کو ختم کر دیا جائے اور کوئی گولی وغیرہ نہ چلے، امن و سکون رہے۔ لیکن اس کے پیچھے کیا ہو رہا ہے، ان کے کیا عزائم ہیں، کیا ارادے ہیں اس پر کوئی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، نہ کسی کو دلچسپی ہے، نہ کسی کے پاس وقت ہے، نہ کسی میں اتنی صلاحیت ہے کہ ان مسائل پر غور کرے، ان کو سوچے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔"

جمیل احمد عدیل

کیا یہ سیکولرازم ہے؟

قرآن مجید کی سورۃ یٰسین میں ارشاد ربانی ہے:

یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ

ترجمہ: صد افسوس ان بندوں پر، نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کرنے لگ گئے۔ (یٰسین:30)

بلاشبہ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ بے خبروں کو جب بھی کوئی خدا کا فرستادہ نتائج کی حتمیت کا شعور دینے کے لیے آیا، اس کا جی بھر کر تمسخر اُڑایا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اللہ نے جتنے بھی رسول اور نبی مبعوث فرمائے، پیامِ حق پہنچانے کے بدلے وہ کسی اجرت، کسی معاوضے کے طلبگار ہوئے؟ ناممکن ہے کہ کسی نے کوئی عوضانہ مانگا ہو۔ انہوں نے تو اپنے اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنا ایک ایک لمحہ مصلوب کرا لیا مگر ایک قدم پیچھے ہٹنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ اور جو کچھ ان رُسل اور انبیا نے دیا اس کا خلاصہ صرف اور صرف قوانین خداوندی کا ادراک ہے کہ اے بھلے لوگو! یہ کائنات ایک عظیم حکیم کے ترتیب دیے گئے نظام کے تحت کام کر رہی ہے۔ اگر تم اپنی زندگیوں کو اس سسٹم سے ہم آہنگ کر لو گے تو تمہارے لیے آسانیاں پیدا ہو جائیں گی، اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اسی زندگی میں مہلک نتائج تمہیں اس طرح پکڑ لیں گے کہ تم اس شدید ایذا سے بلبلا اٹھو گے۔ وہ صورت حال تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہو گی۔

اب رہے وہ قوانین خداوندی تو آؤ انہیں پرکھ کر، تجربے میں لا کر خود ہی دیکھ لو اور ہمارے دعاوی کو سکون کے ساتھ آزما لو، یہ ہو نہیں سکتا کہ نتیجہ دعوے کے برعکس نکلے۔ ایسا ہی ہوتا آیا ہے، سدا ایسا ہی ہو گا، یہی ہماری صداقت کو جانچنے کا پیمانہ ہے۔ تم پر کسی نوع کا کوئی جبر نہیں ہے، تمہاری مرضی ہے، سلامتی کو قبول کر لو گے تو سلامتی عطا ہو جائے گی، نہیں تو نہیں۔

لیجیے! اس سنجیدہ تعلیم میں بھلا کسی ایسے ردِّ عمل کی معمولی سی بھی گنجائش ہے جو استہزا، ٹھٹھے، تمسخر، ہنسی اور مذاق پر مبنی ہو؟ ہرگز نہیں۔ لیکن عقلِ انسان کا ماتم کریں کہ انعام ایسے عوام تو اوئے اوئے!! کے نعرے لگاتے ہی ہیں، تالیاں پیٹ کر اور سیٹیاں بجا کر اپنی اسفل ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہی ہیں، اچھے خاصے تعلیم یافتہ، عمر رسیدہ، معاشرے کے مکرم افراد، جہاندیدہ اصحاب بھی اس لایعنی عمل کا حصہ بن کر اسی صف میں آن کھڑے ہوتے ہیں جو گھٹیا سوچ کے مالکوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک کون سا ایسا پیغمبر گزرا ہے جسے حق گوئی کے "جرم" کی پاداش میں دیگر تکلیفوں کے ساتھ ذہنی اذیت میں سے نہیں گزرنا پڑا؟ نہیں جناب! کوئی ایسی مقدس ہستی نہیں گزری جسے عوامی کٹ حجتیوں اور پھبتیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پیغمبرانِ حق نے اپنی وضع نہیں بدلی تو ان کے مخاطبین نے بھی اپنی خُو میں تغیر پیدا نہیں کیا۔ سچ پیش کرنے کے عمل کا ردِّ عمل ہمیشہ سے بازاری جگتیں بھی رہا ہے۔

یہ مضحکہ خیز رویہ ایک تاریخ رکھتا ہے۔ سلسلۂ انبیا کے آخر میں جب اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے پیارے انسان کو مبعوث فرمایا تو انہیں کج فہم لوگوں نے سب سے زیادہ ستایا۔ ان کے دور کے وہ ذہنی مریض جنہوں نے چھچھورے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کو مکہ کی گلیوں میں مذاق کا ہدف بنایا، ان کی لایعنیت وہیں ختم نہیں ہوگئی بلکہ ڈیڑھ ہزار برس بیت جانے کے باوجود ان اجلاف کی معنوی اولاد آج بھی دنیا میں موجود ہے اور ہر حیلے بہانے سے اپنے منفی پن، خبثِ باطن اور کینے کا اظہار کرتی ہی رہتی ہے۔ درآں حالیکہ آپ ﷺ کی پاکیزہ شخصیت، آپ ﷺ کی بیحد مفید تعلیمات...... سب کچھ مسلم الثبوت کے درجے پر فائز ہو چکا ہے۔ مسلمان گھرانوں میں جنم لینے والے فدائیوں کی محبتیں تو اپنی جگہ، غیر مسلموں کے آنگنوں میں آنکھیں کھولنے والوں کی معروضی تحقیق کے نتیجے میں جب آنکھیں کھلی ہیں تو انہوں نے ضخیم کتب تصنیف کر کے دنیا کے سامنے یہ اعتراف کیا ہے کہ آپ ﷺ صادق تھے، آپ ﷺ امین ہیں۔ آپ ﷺ کے اُجلے کردار پر حرف گیری کے لیے انہیں ایک نکتہ بھی فراہم نہیں ہو سکا۔ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی آخری کتاب یعنی قرآن مجید میں انہیں خلاف واقعہ ایک شعشہ بھی دکھائی نہیں دیا۔ انفس و آفاق کی تمام سمتوں پر محیط اس سے بہتر ضابطہ انہیں کسی لائبریری سے نہیں مل سکا۔

یہ سب کیسے ہوا؟ صرف اور صرف غیر جانبداری، بے تعصبی اور ذہنی دیانت کے سبب۔ جو بھی معروضی اساس پر آپ ﷺ کی حسین شخصیت، آپ ﷺ کے دل نواز پیغام کا جائزہ لے گا، اس سے ہٹ کر نتیجہ اخذ کر ہی نہیں سکتا۔ جہاں عصبیت باطن میں فساد مچائے ہوئے ہوگی، وہاں زبانیں اور قلم تاریکیوں کو ہی اُگلیں گے۔ اِن دنوں آپ ﷺ سے محبت کا تعلق محسوس کرنے والا ہر شخص اپنے سینے میں زخمی دل لیے پھر رہا ہے کہ فرانس کے ایک اخبار میں حضور خاتم النبیین ﷺ کی دلآویز شخصیت کو کیری کیچر کے ذریعے پیش کرنے کی ناپاک جسارت ہوئی ہے۔ نہ صرف اخبار فرانسوا سواغ میں یہ مذموم حرکت ہوئی ہے بلکہ اٹلی، جرمنی اور سپین کے اخبارات لاسٹیمپا، ڈائی ویلٹ اور ایل پیریڈیکو وغیرہ کے صفحات بھی ایسی ہی اہانت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ پیرس سے شائع ہونے والے اخبار فرانسوا سواغ کے ذمہ داروں نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ ان کیری کیچرز کی اشاعت کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ایک سیکولر معاشرے میں مذہبی کٹرپن کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس جواز پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ کیا اسے "سیکولرازم" کہتے ہیں؟ آخر دنیا کا وہ کون سا معاشرہ ہے جس کی اخلاقی قدروں میں دوسروں کی واجب التکریم شخصیت کا احترام موجود نہیں ہے؟ مغرب کے پیشہ ور متعصبین کو بھی مہذب قرار دینے کا جو پروپیگنڈہ اِک عرصے سے کیا جا رہا ہے، یہ دلیل اس کی قلعی کھول دینے کے لیے نہایت کافی ہے۔ اس آزادی کو کوئی غلام صفت ہی آزادی سے موسوم کر سکتا ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ پوری دنیا کسی شخصیت اور اس کے نظریات سے صد فی صد متفق ہو جائے۔ اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن سوال اس اختلاف کے اظہار کا ہے۔ اگر ایسی ہی چھوٹ بنام "پیدائشی آزادی" ہر فرد کو مل جائے تو پھر خدارا!! انصاف سے بتایئے کہ کس طرح کے سماج وجود میں آئیں گے؟ دنیا کیا فساد سے لبالب بھر نہیں جائے گی؟

سو یہ بنیادی نکتہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر آپ دوسرے کی دل آزاری کے مرتکب ہوں گے تو پھر دوسرا کسی نہ کسی طرح تو اپنے ردِّعمل کا اظہار کرے گا۔ اقوامِ مغرب کے بعض شریروں کی جانب سے مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی یہ پہلی قابلِ مذمت کوشش نہیں ہے۔ ماضی گواہ ہے کہ یہ لوگ اپنے بطون کی خباثت کے اظہار کے لیے ایسی متعدد کوششیں کر چکے ہیں۔ پھر انہیں اس سے ملا کیا؟ کیا اُن کی اِن حرکات سے مسلمان اپنے عقائد اور

عقیدتوں سے معاذ اللہ! منحرف ہو کر اُن کے ہم خیال اور ہم نوا بن گئے ہیں؟ نہیں، کوئی گناہگار سے گناہگار مسلمان بھی انہیں ایسی مکروہ حرکات پر شاباش نہیں دے سکتا۔ الٹا اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کسی ایسے ردِّ عمل پر اُتر آئے گا جسے پھر یہ پوری دنیا کے سامنے مشتہر کرتے پھریں گے، لو جی! یہ مسلمان تو ہیں ہی بنیاد پرست، دہشت گرد!

مسئلے کا حل وہ شعور ہے کہ لاکھ اختلاف ہو مگر اس کا اظہار ناشائستہ نہ ہو اور شائستگی کے معیارات دکھاوے پر مبنی نہ ہوں، نہ داخلی تضادات کا شکار ہوں، مثال کے طور پر مغرب کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں کوئی فرد، دوسرے کو گھور کر نہیں دیکھ سکتا کہ اس عمل کو نجی زندگی میں مداخلت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح شخصی آزادی کا پرچم بلند کر کے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ روئے ارض پر ایسا جنت نظیر معاشرہ ممکن نہیں۔ لیکن یہ ناقابل فہم تناقض ہے کہ ایک جانب عام انسان اس قدر مکرم، دوسری طرف وہ پاکباز، راستباز شخصیت ؐ جس پر اربوں لوگ اپنی جان نثار کرنے کے لیے مستعد رہتے ہوں، اسے میڈیا میں اہانت کا نشانہ بنانے کو معمول کی بات قرار دیا جائے، یہ بے عقلی نہیں، بدعقلی کی انتہا ہے۔ اہل مغرب کو اس طرزِ احساس پر شرم سے ڈوب مرنا چاہیے...... لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنے سماج سے مغرب والوں نے غیرت اور حمیت کے آسمانی معیاروں کو خارج کر کے خود کو ہلاکت کے ہاویہ میں گرا لیا ہے وگرنہ اللہ کے رسول ؐ کی توہین ایسا اقدام ہے کہ اس پر نہ رکنے والی بارشِ سنگ مقدر بن جائے تو یہ مقامِ تعجب نہیں۔

✿......✿......✿

محمد عطاء اللہ صدیقی

رسول اللہ ﷺ کو "سیکولر" کہنے کی جسارت

سیکولر ازم ایک مذہب دشمن نظریہ ہے۔ ایک سیکولر ذہن رکھنے والا شخص الہامی تعلیمات کے مقابلے میں عقلی ہدایت کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہے۔ مغرب میں سیکولر ازم کا نظریہ عیسائی چرچ کے خلاف ردعمل کے طور پر سامنے آیا مگر جدید دور میں سیکولر طبقہ تمام مذاہب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ سیکولر ازم کے مختلف اصطلاحی معنوں میں سے معروف ترین وہ تصور ہے جس کے رو سے چرچ اور ریاست' یا مذہب اور سیاست کا دائرہ کار بالکل الگ سمجھا جاتا ہے۔ سیکولر ازم کی رو سے مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ اجتماعی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیمات سیکولر ازم کے برعکس ہیں۔ اسلام مذہب اور ریاست کی تفریق کا قائل نہیں ہے' لہٰذا ایک مومن یا راسخ العقیدہ "سیکولر" نہیں ہوسکتا۔ ایک مومن مسلمان خدائی تعلیمات کے مقابلے میں عقلی تعبیرات کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ آج کل کے سیکولر دانشوروں کے افکار و اعمال کا جائزہ لیا جائے تو سیکولر ازم' لادینیت اور الحاد کا ہم معنی نظریہ ہے۔ مگر پاکستان کے لادینیت پسندوں کی جسارت ملاحظہ ہو کہ وہ اسلام کے نام پر بننے والی مملکت پاکستان میں اسلام کی بجائے "سیکولر ازم" کا نفاذ چاہتے ہیں۔

بعض صحافیوں کی گستاخانہ جسارتیں اب اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ عام مسلمان تو ایک طرف خود رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو بھی "سیکولر" کہنے سے باز نہیں رہتے۔ روزنامہ "پاکستان" میں معروف عالم دین مولانا سرفراز نعیمی کا انٹرویو شائع ہوا ہے' انٹرویو لینے والے صحافی افضال ریحان نے من جملہ دیگر سوالات کے ان سے یہ بھی سوال کر ڈالا

"اگر یہ کہا جائے کہ نبی اکرم ﷺ دنیا کے سب سے بڑے سیکولر انسان تھے تو آپ اس کی وضاحت کیا فرمائیں گے" ("سنڈے میگزین" 28 اکتوبر 2001ء)

مولانا سرفراز نعیمی صاحب نے اس کا یوں جواب دیا: "اگر Secular سے مراد

Non-religious or Temporal کے معنی ہیں تو یہ بات مکمل طور پر غلط ہے کیونکہ خود حضور اکرم ﷺ مذہب اسلام کے داعی ہیں اور اسلام بذات خود ایک دین (Religion) ہے اس کا اپنا ایک System of Faith and Worship ہے اس لیے یہ کہنا کہ حضور نبی اکرم ﷺ سیکولر تھے' درست نہیں ہے۔"

حضور اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ منزہ و مقدس تھی' آپؐ سراپا روحانیت تھے' آپؐ روحانی رفعتوں پر فائز تھے جہاں مادی الائشوں کا گزر تک نہ تھا۔ آپؐ کے بارے میں یہ خیال رکھنا' سوچنا کہ آپؐ سیکولر تھے' آپ ؐ کی سخت توہین کے مترادف ہے۔ مندرجہ بالا سوال کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ افضال ریحان صاحب جناب رسالت مآب ﷺ کو دنیا کا سب سے بڑا سیکولر انسان (نعوذ باللہ) سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑا جھوٹ یا رسالت مآب ﷺ کے بارے میں تہمت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

یورپ کا بڑے سے بڑا سیکولر دانشور بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا پوپ کو کبھی "سیکولر" نہیں لکھے گا کیونکہ وہ سیکولر ہونے کا مطلب بخوبی سمجھتا ہے۔ اگر کوئی یہ حرکت کرے تو پڑھنے والے یہی سمجھیں گے کہ یہ شخص یا تو سیکولرازم کا مفہوم نہیں سمجھتا یا پھر حضرت عیسیٰ اور پوپ پر گھٹیا زبان درازی اور بہتان طرازی کر رہا ہے۔ پاکستان میں قانون توہین رسالتؐ 295-c نافذ ہے مگر اس کے باوجود گستاخان رسول کی غلیظ زبان درازیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کبھی "فرنٹیئر پوسٹ" میں کسی دریدہ دہن یہودی کا سخت قابل اعتراض خط شائع ہوتا ہے' تو کبھی کوئی عیسائی آپ ؐ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہہ گزرتا ہے اور پھر کبھی "پاکستان" جیسے دائیں بازو کے اخبار میں جناب رسول اکرم ﷺ کو "دنیا کا سب سے بڑا سیکولر انسان" کہنے کی ناپاک جسارت سامنے آتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک اسلامی ریاست میں ناموس رسالت آخر اس قدر عدم تحفظ کا شکار کیوں ہے کہ اسلام دشمنوں کو اس کی پامالی میں ذرا برابر خوف محسوس نہیں ہوتا۔ ہم دعوے تو عشق رسول ﷺ کے کرتے ہیں مگر یہ دعوے محض زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں ہیں۔ ناموس رسالت ﷺ مسلمانوں کے لیے بنیادی عقیدہ اور مذہبی اساس کا درجہ رکھتی ہے مگر ہمارے دلوں میں اس کی اہمیت کا وہ احساس باقی نہیں رہا جو سچے محبان رسول میں ہونا چاہیے۔ ہماری اس کمزوری کا احساس رسول ﷺ کے دشمنوں کو بھی ہے' ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی آپ ؐ کی ذات اقدس کے متعلق اخبارات میں گستاخانہ کلمات کی

اشاعت کی جرأت کر سکے۔

پاکستان میں لادینیت پسندوں کو یہ شکایت ہے کہ پاکستان کے ساتھ "اسلامی جمہوریہ" کا سابقہ کیوں لگا ہوا ہے، ہمیں یہ شکایت ہے کہ پاکستان کے "اسلامی جمہوریہ" ہونے کے باوجود یہاں "سیکولرازم" کی عملداری کیوں ہے؟ پاکستان محض قانونی طور پر ہی "اسلامی" ریاست کیوں ہے، عملی طور پر کیوں نہیں؟

پاکستان کے لادینیت پسندوں کو جب بتایا جاتا ہے کہ سیکولرازم ایک مذہب دشمن نظریہ ہے جس کی ایک اسلامی ریاست میں ہرگز گنجائش نہیں ہے تو وہ مختلف تاویلات پر اتر آتے ہیں، انہوں نے سیکولرازم کی خانہ زاد اور من چاہی تعریفیں وضع کر رکھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سیکولرازم کا مطلب "لادینیت" نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ریاستی غیر جانبداری، تحمل، رواداری اور مذہبی آزادی وغیرہ ہیں۔

وہ دل میں تو سمجھتے ہیں مگر بظاہر یہ تسلیم نہیں کرتے کہ سیکولرازم کی اصل روح مذہب دشمنی ہی ہے۔ مندرجہ بالا خوش کن تراکیب انہوں نے عوام الناس کو دھوکہ دینے کے لیے وضع کر رکھی ہیں، ورنہ ان کا اصل ہدف پاکستان میں اسلامی شریعت کی بالادستی کا قانون عملی طور پر ختم کرنا ہے۔ وہ ملائیت اور بنیاد پرستی کے پردے میں اسلام کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ خالص اسلام کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ ترقی پسند اور لبرل اسلام کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی اصل روح مغربی تہذیب میں مضمر ہے، البتہ اس میں وہ اسلام کا صرف "تڑکا" لگانا پسند کرتے ہیں۔ پاکستان کے لادینیت پسند جس قدر چاہیں سیکولرازم کے فریب انگیز مطالب وضع کرتے رہیں، سیکولرازم کا صرف وہی مطلب قابل قبول ہے جو اہل مغرب نے بیان کیا ہے۔ انگریزی زبان کی کوئی معروف لغت یا انسائیکلوپیڈیا ایسا نہیں ہے جس میں سیکولرازم کا وہ مطلب بیان کیا گیا ہو جو ہمارے لادینیت پسند بیان کرتے ہیں۔ تمام کلاسیکل لغات میں سیکولرازم کو مذہب دشمن نظریہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دو چار سالوں میں چند ایک لغات ایسی شائع ہوئی ہیں جس میں سیکولرازم کا مطلب جزوی طور پر روشن خیال وغیرہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ مگر یہ اس اصطلاح کا محض جزوی مطلب ہے۔ وہاں بھی اصل مطلب وہی ہے جو کلاسیکل لغات میں ملتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند معروف ڈکشنریوں میں سے سیکولرازم کی تعریف یہاں درج کر دی جائے۔

1- آکسفورڈ ڈکشنری میں سیکولرازم کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے "یہ نظریہ کہ اخلاقیات کی بنیاد صرف اس مادی دنیا میں انسانیت کی فلاح کے تصور پر قائم ہونی چاہیے' خدا پر ایمان یا اخروی زندگی کے متعلق تمام تر تصورات کو اس میں سرے سے کوئی عمل دخل نہ ہو"۔

2- Lobiter کی ڈکشنری آف ماڈرن ورلڈ میں سیکولرازم کی تعریف دو حصوں میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

(i) "دنیوی روح یا دنیوی رجحانات وغیرہ بالخصوص اصول وعمل کا ایسا نظام جس میں ایمان اور عبادت کی ہر صورت کو رد کر دیا گیا ہو"۔

(ii) "یہ عقیدہ کہ مذہب اور کلیسا کا امور مملکت اور عوام الناس کی تعلیم میں کوئی عمل دخل نہیں ہے"۔

3- نیو تھرڈ ورلڈ ڈکشنری میں سیکولرازم کی تعریف ان الفاظ پر مبنی ہے۔

"زندگی یا زندگی کے خاص معاملہ سے متعلق وہ رویہ جس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دین یا دینی معاملات کا حکومتی کاروبار میں دخل نہیں ہونا چاہیے یا یہ کہ کسی مذہبی معاملات کو نظام حکومت سے دور رکھا جائے۔ اس سے مراد حکومت میں خالص لادینی سیاست ہے' دراصل سیکولرازم اخلاق کا ایک اجتماعی نظام ہے"۔

4- انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (جلد نو پندرھواں ایڈیشن) میں سیکولرازم کی وضاحت ملاحظہ کیجئے۔

"سیکولرازم سے مراد ایک ایسی اجتماعی تحریک ہے جس کا اصل ہدف اخروی زندگی سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر دنیوی زندگی کی طرف مرکوز کرانا ہے' قرون وسطیٰ کے مذہبی میلان رکھنے والے افراد میں دنیاوی معاملات سے متنفر ہو کر خداوند قدوس کے ذکر اور فکر آخرت میں انہماک اور استغراق کا خاصا قوی رجحان پایا جاتا تھا۔ اس رجحان کے خلاف ردعمل کے نتیجہ میں نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں سیکولرازم کی تحریک انسان پرستی (ہیومن ازم) کے ارتقاء کی شکل میں رونما ہوئی۔ اس وقت انسان نے انسانی ثقافتی سرگرمیوں اور دنیاوی زندگی میں اپنی کامیابیوں کے امکانات میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لینی شروع کی۔ سیکولرازم کی جانب یہ پیش قدمی تاریخ جدید کے تمام عرصہ کے دوران ہمیشہ آگے بڑھتی رہی اور اس تحریک کو اکثر عیسائیت مخالف اور مذہب مخالف (Anti-Religion) سمجھا جاتا رہا"۔

مندرجہ بالا تعریفوں میں سے کیا کوئی ایک بھی ایسی ہے کہ جس کی روشنی میں اسلام اور سیکولرازم کے درمیان کوئی قدر مشترک تلاش کی جا سکے؟ کیا پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق یہ تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ایسی تحریک برپا کرنا چاہتے تھے جس میں خدا پر ایمان یا اخروی زندگی کے تصور کو کوئی عمل دخل نہ ہو؟ کیا آپ ﷺ کی تعلیمات کا اصل ہدف لوگوں کی توجہ اخروی زندگی سے ہٹا کر دنیوی زندگی کی طرف مبذول کرانا تھا؟ یا کوئی بدبخت آپ کے تصور حکومت کے بارے میں خیال بھی ذہن میں لاسکتا ہے کہ جس میں مذہب کو الگ کر دیا گیا ہو۔ اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو پھر رسالت مآب ﷺ کے ادنیٰ پیروکار کی حیثیت سے ہم یہ دریافت کرنے کا پورا حق رکھتے ہیں کہ افضال ریحان یا ان جیسے کسی نام نہاد ''روشن خیال'' کو یہ حوصلہ اور جرأت کیسے ہوئی کہ وہ حضور اکرم ﷺ کو دنیا کا سب سے بڑا ''سیکولر انسان'' کہے؟

کیا مجیب الرحمٰن شامی صاحب جو ایک اسلام پسند صحافی ہیں' بتانا پسند کریں گے کہ روزنامہ ''پاکستان'' میں توہین رسالت ﷺ پر مبنی ایسے کلمات کی اشاعت ان کے اخبار کی باقاعدہ پالیسی ہے یا پھر اسے محض ایک صحافیانہ فروگزاشت سمجھا جائے؟ مگر چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ اس فروگزاشت سے اپنے آپ کو بری الذمہ کیسے قرار دیتے ہیں؟ حریت فکر اور اظہار رائے کی آزادی اپنی جگہ' مگر اس کا دائرہ توہین رسالت تک وسیع کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

مجیب الرحمٰن شامی صاحب کی زیرادارت نکلنے والے کسی اخبار میں رسالت مآب ﷺ کو پہلی دفعہ ''سیکولر'' نہیں کہا گیا۔ آج سے تقریباً تین سال پہلے جمل نیازی نے انٹرویو کے دوران جاوید احمد غامدی سے بھی اس طرح کا سوال پوچھا تھا جو ہفت روزہ ''زندگی'' میں شائع ہوا تھا۔ راقم الحروف کی یادداشت کے مطابق یہ محض دو ایسے واقعات ہیں جن میں کسی اخبار نے رسالت مآب ﷺ کے بارے میں اس طرح کے کلمات شائع کیے ہوں۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے اخبار یا رسالہ میں اس طرح کے سوالات شائع ہوتے ہیں؟[1]

❁......❁......❁
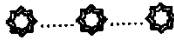
[1] (یاد رہے کہ رسول کریم ﷺ کو سیکولر کہنے کی ناپاک جسارت متنازعہ کالم نگار ڈاکٹر جمل نیازی نے دوبارہ اپنے کالم ''نجم سیٹھی اور خاتون صحافی آمنے سامنے'' (مطبوعہ روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، 9 اپریل 2013ء) میں کی۔ افسوس ہے کہ اسلام اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے دعویدار اخبار میں یہ گستاخانہ کالم شائع ہوا ہے۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ مرتب)

محمد ہاشم جاوید

آزادی اظہار کے پردے میں اسلام دشمنی

مغرب میں آزادی اظہار کا تعلق اس کی تہذیب کے ارتقا سے ہے جو اسکو اس معاشرت کا بنیادی عنصر بناتی ہے۔ تاریخی طور پر جب یورپ میں کلیسا کی حکمرانی تھی تو اس کے خلاف بولنے کے بہت برے نتائج نکلا کرتے تھے، گلیلیو (Galileo) کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ صدیوں کا وچ ہنٹ (Witch Hunt) کلیسا کے مظالم کی ایک چھوٹی سی مثال ہے جس نے مغربی اقوام کو آزادی اظہار پر پابندی اور ظلم و جبر کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسی لئے مغربی اقوام نے اپنے قوانین اور آئین میں آزادی اظہار کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ امریکہ کے قیام کے بنیادی مقاصد میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک یورپ سے بھاگ کر آئے ہوئے ان مسافروں (Pilgrims) کی بدولت وجود میں آیا جو یورپ میں کلیسا کے ظلم وستم سے تنگ آ کر نئی دنیا میں پناہ لینے آئے تھے۔ لہٰذا یہاں انہیں تحریر وتقریر، مذہب اور تمام عقائد پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہوگئی۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بھی آزادی رائے کے قانون کو مطلق آزادی حاصل نہیں مثلاً جہاں نفرت آمیز، نسلی، جنسی و سیاسی تنقید، تحریر وتقریر کی عمومی طور پر پوری آزادی ہے، وہاں فحاشی، بچوں سے متعلق جنسی مواد اور کوئی ایسی تحریر وتقریر جو امن عامہ کے لئے لازمی خطرے کا باعث ہو، قانوناً منع ہے۔ اور تو اور گالی دینے پر بھی آپ کو قانوناً جرمانہ ہو سکتا ہے۔ آپ امریکی صدر کی شان یا ہجو میں جو چاہے، کہیں لیکن کسی بھی قسم کی پر تشدد دھمکی آپ کو فوراً جیل کا منہ دکھا سکتی ہے۔ من الحیث المسلم اب آپ یہ سوچ رہے ہونگے کہ تشدد پر ابھارنا جرم لیکن مقدس ہستی کا مذاق اڑانا جرم نہیں، یہ کیسا انصاف ہے؟ لیکن بدقسمتی سے یہی وہ اختلاف اور تفاوت ہے جو مغرب اور اسلامی اقدار کو آزادی اظہار کے بارے میں جداگانہ تشخص دیتا ہے۔

کینیڈا میں پچھلے سال کسی ریپ کیس کے دوران جب کوئی پریس کانفرنس ٹائپ کی

کہانی ہوئی تو ایک پولیس افسر نے یہ ایک ایسی بات کہہ دی جسکا مطلب کچھ ایسے تھا: ''اگر عورتیں رنڈیوں کی طرح کپڑے پہننا بند کر دیں تو ایسے کیس کم ہو جائیں گے'' بس پولیس والے کا یہ کہنا تھا کہ پورے ٹورانٹو کی عورتیں سڑکوں پر نکل آئیں۔ کچھ نے آدھے کپڑے پہنے ، کچھ نے اپنے پچھواڑے دکھائے اور کچھ نے چھاتیاں ، کچھ نے تو سب کچھ ہی اتار دیا۔ آخر کار اس پولیس افسر کو معافی مانگنی پڑی۔ پورے شہر سے ایک شخص بھی کھڑا نہیں ہوا کہ بھئی یہ تو آپکا آزادی اظہار رائے کا حق ہے تو آپ کیوں معافی مانگتے ہیں۔

کچھ دن پہلے بھی ایک ایسی ہی کہانی ہوئی۔ راب فورڈ جو ٹورانٹو کے میئر ہیں، انکی بھتیجی نے اپنے ٹوئٹر کے اکاونٹ پر لکھ دیا کہ کہ عورتوں کو چاہیے: ''رنڈیوں کی طرح کپڑے نہ پہنیں'' اس پر بھی پورے میڈیا پر کھڑاک کھڑا ہو گیا، کوئی میڈیا چینل ایسا نہیں تھا جس نے اس مسئلے پر کوئی رپورٹ نہیں کی یا کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس نے اس پر مضمون نہیں لکھا، اور آخر کار کرسٹا فورڈ کو بھی یہ بات کہنے پر معافی مانگنی پڑی اور پورے ملک میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو کھڑا ہوا کہ مس کرسٹا فورڈ یہ آپکا آزادی اظہار رائے کا حق ہے، آپ کیوں معافی مانگتی ہیں۔

اوپر کے ان دو واقعات کے بعد، ہولوکاسٹ، اینٹی سیمیٹ ازم (Anti Semitism) اور ہٹلر وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا، ان واقعات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر چیز کی حدود کی طرح آزادی اظہار رائے کے حق کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں اور وہ اس جگہ ختم ہو جاتی ہیں جہاں کسی کو آپ کی رائے سے دکھ ہو، اور یہ چیز ہم نے سیکھ لی ان دو واقعات سے جہاں کچھ ایسی خواتین کو دکھ ہوا جو ویسے کپڑے نہیں پہنتی تھیں اور انکا ریپ ہوا تھا، وہیں آدھے، چست اور جالی دار کپڑے پہننے والی خواتین کو پولیس افسر اور کرسٹا فورڈ کی رائے سے دکھ ہوا۔

کچھ عرصے سے مسلسل ایسے ہو رہا ہے کہ مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے، کبھی تو انکے نبی (ﷺ) کی تصویریں بنائی جاتی ہیں، کبھی تو آپ انکی مذہبی کتاب کو جلانا چاہتے ہیں، کبھی آپ ان کے نبی پر فلمیں بنانا چاہتے ہیں، اور پھر اسکو آزادی اظہار رائے کا نام دے کر پوری قوم بن کر اسکا دفاع بھی کرتے ہیں۔ جب مسلمان احتجاج کرتے ہیں اسکو وائیلنٹ ایکٹ (Violent Act) کا نام دیا جاتا ہے، یہ کیا وجہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے عمل کو فریڈم آف ایکسپریشن (Freedom of Expression) کا نام نہیں دیتے۔ اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب پورا بحیثیت

معاشرہ ایک منافقت کا شکار ہے۔ انکے ہاں، ہر وہ چیز جو انکو بری لگے گی، وہ چاہے صحیح بھی ہو، اسکے خلاف احتجاج ہوگا جو جائز ہوگا۔

کچھ دن پہلے لیبیا میں ایک ہجوم نے امریکی ایمبیسی پر حملہ کر کے انکے ایک سفیر کو ہلاک کر دیا، سب جانتے ہیں کہ کسی سفیر کو قتل کرنا جائز نہیں، کسی ایسے شخص کو جس نے اس کام میں شمولیت اختیار کی، قتل کرنا جائز نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟؟؟ یہ وہ پانی ہے جو ہانڈی میں ابل رہا تھا، اب وہ باہر نکل رہا ہے۔ لیبیا میں یہ انارکی امریکیوں نے ہی پھیلائی تھی، کچھ ہی دن پہلے مغربی میڈیا اس بات پر خوش ہو رہا تھا جب لیبیا کے لوگوں نے اپنے صدر کو قتل کیا، آج وہی لیبیا والے ایک امریکی سفیر کو قتل کر رہے ہیں، یہ وہی امریکی تھے جو دو دن پہلے انکی مدد کر رہے تھے اپنی حکومت سے نجات دلانے میں آج یہ ہی امریکی ہیں جن کو ان لوگوں نے مارا ہے، جن پر اپنا غصہ نکالا ہے۔

منتظر الزیدی تو آپکو یاد ہی ہوگا، کچھ زیادہ پرانی بات نہیں ہے، یہ وہ صحافی ہے جس نے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش پر فقط ایک جوتا پھینکا تھا، مغرب نے اسکے فریڈم آف ایکسپریشن کا جواب بڑے اچھے انداز سے دیا، اسکو نہ صرف مارا گیا بلکہ گارجین کے مطابق رہائی کے دن اسکا ایک دانت بھی ٹوٹا ہوا دیکھا گیا، قید کے دوران کی ایک اخباری رپورٹ کا کہنا ہے کہ وہ اتنا زخمی تھا کہ عدالت میں بھی پیش نہیں ہو سکا۔

لیلیٰ العطار کے بارے میں بھی جان لیں جسکے گھر پر امریکی آرمی نے اس وجہ سے بمب برسا دیے کیونکہ اس نے ایک ہوٹل کے دروازے پر جارج ڈبلیو بش سینئر کی تصویر بنائی تھی اور سب لوگ اس پر جوتے رکھ کر جاتے تھے۔ اب اتنے انتہا پسند لوگ ہمیں یہ سب سکھائیں کہ ہم نے احتجاج کیسے کرنا ہے تو اسکو دوغلا پن ہی کہا جا سکتا ہے۔

آیئے اب میں اور آپ مغربی معاشرے سے پوچھتے ہیں کہ لیلیٰ العطار اور برطانوی شہزادے کی بیوی کی تصویریں شائع کرنے والوں کی آزادی آرٹ یا آزادی صحافت کہاں ہے؟ یا منتظر الزیدی کی اظہار کی آزادی کہاں ہے؟ کرسٹا فورڈ اور پولیس والے کی آزادی اظہار رائے کہاں ہے؟؟؟

مغرب کو پتہ ہے کہ مسلمانوں کو کہاں اور کیسے زک پہنچانی ہے۔ یہ پتھر پھینکتے ہیں اور ہاتھ چھپا جاتے ہیں۔ جب بھی مغرب سے ایسا واقعہ ہوتا ہے (مغربی میڈیا اور حکومتوں

کے مطابق) چند افراد کی حرکت ہوتی ہے۔ تو آخر کیا وجہ ہے کہ ایسے چند افراد کو ایک ایسے قانون کی چھتری مہیا کر دی جاتی ہے جو ان قوموں کی اکثریت کے نمائندے بناتے ہیں؟ انکے اسی جمہوری اصولوں کے مطابق ہمیشہ ہی مغرب سے کیوں ایسا ہوتا ہے کہ "چند افراد" دنیا کی نصف آبادی کا، ان کی الہامی کتاب کا، انکے نبی کریم ﷺ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) آخر کیوں؟ یہ بتایا جائے کہ یہ کونسے جمہوری اصول کے تحت جائز ہے؟؟ ایسے تضحیک اور توہین آمیز مواد کی اشتعال انگیزی کے پھیلاؤ کے لیے انہی کے ادارے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اور دنیا کی نصف آبادی کی طرف سے ایسے مواد کو مغرب کے اور مغرب میں قائم ترسیلاتی ادارے ایسے مواد کے ہٹائے جانے کے جائز مطالبے کو رعونت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔

یہ ایک اچانک رونما ہونے والا واقعہ نہیں۔ جدید تاریخ میں مغرب سے اس شرانگیز اور تکلیف دہ حرکات کا سلسلہ نصف صدی سے جاری ہے۔ تو کیا وجہ ایک چڑیا تک کا درد رکھنے والے، اپنے ملکوں میں پائے جانے والے حشرات الارض تک کے لیے قانون سازی کرنے والے، کیونکر مسلمانوں کی دلی تکلیف کو چڑیا کے درد کے برابر نہیں جانتے۔ حشرات الارض کے لیے قانون سازی کرنے والے دنیا کی تقریباً نصف آبادی کے مسلمانوں کو انسان سمجھتے ہوئے ان کی مذہبی دل آزاری روکنے کے لیے کوئی قانون یا ضابطہ وضع کرنے کو تیار نہیں؟ کیوں؟ مسلمان ردعمل میں احتجاج کرتے ہیں جبکہ عمل ہمیشہ مغرب سے ہوتا ہے۔ تو پھر کون انتہا پسند اور فرعون ہوا؟

امریکی حکومت اور امریکی وزارتِ خارجہ کی طرف سے بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ اس گستاخانہ فلم سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں لیکن مسلم ممالک کے عوام اس حکومتی موقف کو عذر لنگ سے تعبیر کرتے ہیں اور یوں سارے مسلم ملکوں میں امریکا کے خلاف پہلے سے موجود نفرت میں اور شدت آجاتی ہے۔ مغربی ملکوں میں دین اسلام کے خلاف آئے دن کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کی جاتی ہے جو مسلم ملکوں میں بھونچال پیدا کر دیتی ہے۔

اس حوالے سے ترقی یافتہ مغربی ملک اس موقف کو دہراتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے معاشروں میں چونکہ اظہار رائے کی آزادی ہے، اس لیے اس آزادی کے خلاف کوئی کارروائی ممکن نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی فکر اور آزادی اظہار رائے کے بغیر

کوئی ملک منطقی طور پر ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور ہم بھی آزادی فکر، آزادی اظہار رائے کو معاشرتی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں لیکن خود مغربی سیاسی مفکرین کا اس حوالے سے یہ اصرار ہے کہ آزادی فکر و اظہار انسانی معاشروں کے اندر فساد اور نفرتوں کا سبب بنتے ہیں تو ایسی آزادیاں انسانوں کے اجتماعی مفادات کے لیے فائدے کے بجائے نقصان کا باعث بن جاتی ہیں۔

امریکا دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی اور فوجی طاقت ہے، اس حوالے سے اس سپر پاور پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ آزادی فکر و اظہار کو اتنی چھوٹ نہ دے کہ یہ آزادی دوسری قوموں کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے اور اس شدّت پسندی میں اور اضافہ ہو جائے جس سے ساری دنیا پہلے ہی پناہ مانگ رہی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش جونیئر کے دوسرے دور حکومت میں مَیں نے اخبارات میں پڑھا تھا۔ کسی اخبار نے امریکہ کی اُس دَور کی وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس (Condoleezza Rice) کا ایک کارٹون بنایا تھا اور اس کارٹون میں اُس کے پیٹ سے ایک نیا مشرق وسطیٰ جنم لیتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ تب مغرب اس اقدام کے خلاف چیخا، امریکہ دھاڑا اور آزادی اظہار رائے کی بتق کو بھول گیا۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ لیکن خاتون وزیر خارجہ کی بے عزتی برداشت نہ کی۔ دوسری جنگ عظیم اور دیگر جنگوں میں ان امریکی اور اتحادی فوجیوں اور افسروں نے جاپان، کوریا میں ہزاروں اور دیگر ممالک کے اعداد و شمار ملا کر لاکھوں برہنہ عورتوں کو چند پونڈ اور ڈالرز کے عوض بیچا اور ان نشے سے دُھت فوجیوں نے عورتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا۔

مسلمانوں میں خواندہ اور ان پڑھ ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ چودہ صدیاں گزر گئیں لیکن آج تک کسی مسلمان نے کسی مقدس کتاب کی بے حرمتی نہیں کی۔ کبھی کسی جاہل نادان نے بھی کسی نبی یا رسول کی گستاخی کا اقدام نہیں کیا۔ اُن پر بہت سے سخت ادوار بھی آئے اور گزر گئے۔ لیکن ان کے ایمان نے ایسی کوئی ہرزہ رسائی گوارا نہ کی۔ کیونکہ انہیں مدنی تاجدار پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف سے یہ تربیت ملی کہ کسی بھی نبی کی شان مت گھٹاؤ۔ بلکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ تمام انبیا کرام علیہم السلام معصوم ہیں، گناہوں سے پاک ہیں۔ اور ان کو اللہ عز وجل نے بے شمار معجزات سے نوازا۔ ان کے معجزات کا تذکرہ

قرآن مجید میں موجود ہے۔ مسجدوں میں سینکڑوں خطبے دوسرے نبیوں کی شان بیان کرنے پر ہوتے ہیں۔ مسلمان بچے بچپن ہی سے حضرت مریم علیہا السلام کی پاکیزگی کی شان کو مسجدوں میں سنتے ہیں اور یہ ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ قرآن پاک کی انیسویں سورت کا نام مریم ہے۔ اس سورۃ میں جس طرح حضرت مریم کی پاکیزگی بیان کی گئی۔ تورات اور انجیل میں بھی اتنے زور سے حضرت مریم کا دفاع موجود نہیں بلکہ اُن کی اپنی مذہبی کتابوں میں تحریف کی وجہ سے دوسرے نبیوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہوئی ہیں کہ اہل سلام کے نزدیک وہ بھی گستاخی ہے۔ جبکہ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے ساتھ دیگر تمام الہامی مذہبوں کو اپنے ایمان کا حصہ جانتے ہیں۔ اور ہم اپنے نبی کی تعریف بھی خوب بیان کرتے ہیں اور یوں مسلمانوں کے ایمان کو مزید مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ وہ کبھی گستاخی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اُن کے ہاں ایسی سوچ کا خواب میں آ جانا بھی محال ہے۔ انسانی تاریخ مسلمانوں کے ہاتھوں ایسی کوئی گستاخی ثابت نہیں کر سکتی۔ ان کی گواہی ہے کہ اگر دنیا کے کسی بھی شخص نے ایسی بد معاشانہ حرکت کی تو پھر وہ زمین کے اوپر نظر نہ آیا۔ اس سے پہلے چاہے اس کا کوئی بھی مذہب یا عقیدہ تھا۔ گستاخانہ حرکت کے بعد گستاخ قرار پایا اور اپنے انجام کو پہنچا۔

اب یہ کیسے ممکن ہے مسلمانوں کی ایمان کی جان نبی آخرالزمان ﷺ کی ذات پر کوئی شقی القلب حرف اُٹھائے اور ان کی غیرتِ ایمانی کو جوش نہ آئے۔ دراصل تمام مسلمان ایک قوم ہیں۔ امتِ واحدہ ہیں۔ فکری طور پر ایک اُمت ہیں۔ وہ جنوبی ایشیا کے ہوں، مشرقِ وسطیٰ، وسطِ ایشیائی ریاستوں کے ہوں، جنوب مشرق اور مشرقِ بعید کے یا چین و روس کے، آسٹریلیا و انٹارکٹیکا کے، یا پھر ساحلِ نیل کی پٹی کے، افریقہ کے ہوں یا یورپ کے، امریکہ کے ہوں یا کینیڈا کے وہ آپس میں ایک جسم کی مانند ہیں۔ ان کے ایمان کی روح رحمۃ للعٰلمین کا عشق ہے۔ ان کے دل مکے اور مدینے کے نام سے دھڑکتے ہیں۔ ان میں کوئی معمولی فسق و فجور ہوتو ہو لیکن مدنی آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں کمی نہیں۔ وہ سراپا محبت قوم ہیں۔ ان کا دین امن کا سب سے بڑا عَلَم بردار بھی ہے۔ اور اس کا عملی نمونہ بھی صرف مسلمان قوم نے دکھایا۔ آؤ کبھی دیکھو! اُس عظیم فاتح مکہ ﷺ کا فاتحانہ

ندا زیعنی وہ شفقت سے فرمادینا۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔

اپنی زندگی کے بدترین دشمنوں کو عام معافی کا اعلان!

اور اس پر عمل بھی!

اپنی بیٹی کے قاتل کو بھی معافی!

اے دنیا میں امن کے جھنڈے اٹھانے والو!

لے کر آؤ اپنی تاریخ سے ایسی کوئی مثال!

کھلا چیلنج ہے۔

اداریہ روزنامہ ''اسلام''

آزادیٔ اظہار اور برداشت کے مغربی فلسفے کی حقیقت

نسل پرستی کے خلاف اقوام متحدہ کی عالمی کانفرنس، ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کی تقریر کے دوران مغربی سفارتکاروں کی ہلڑبازی کے باعث بدمزگی کا شکار ہوگئی۔ تقریر کے خلاف یہودیوں کے حامی مغربی ممالک کے سفارتکاروں نے کانفرنس سے واک آؤٹ کیا، اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری اور یہودی نواز مغربی رہنماؤں نے ایرانی صدر کی تقریر کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ پیر کو شروع ہونے والی 5 روزہ کانفرنس میں جب ایرانی صدر نے تقریر شروع کی تو شدید ہلڑبازی کی گئی۔ احمدی نژاد نے مقبوضہ فلسطین میں اسرائیلی حکومت کو مکمل نسل پرست اور ظالم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہودیوں نے یورپ اور امریکہ سے فلسطین میں آ کر نسل پرستی پر مبنی حکومت قائم کی۔ احمدی نژاد کی جانب سے اسرائیلی مظالم کو حوالہ دینے پر یورپی یونین کا وفد بھی ہال سے باہر نکل گیا تاہم وہاں موجود شرکا کی بڑی تعداد نے ایرانی صدر کی تقریر کو سراہا۔ تقریر کے دوران 2 افراد کو ایرانی صدر پر حملہ کرنے کی کوشش پر پولیس نے حراست میں لے لیا۔

یہ انہی ''مہذب''، ''ترقی یافتہ'' اور ''لبرل'' مغربی ممالک کا طرز عمل ہے جو ساری دنیا کو ''برداشت''، ''آزادیٔ اظہار'' اور ''جمہوری حقوق'' کا درس دیتے نہیں تھکتے۔ ایرانی صدر اپنے ساتھ کسی قسم کے ہتھیار، اسلحہ یا ''کوڑے'' لے کر جنیوا نہیں گئے تھے، انہیں وہاں دنیا میں نسل پرستی کے خلاف بس ایک تقریر کرنا تھی جس سے اتفاق کرنا کسی پر لازم نہیں تھا۔ اقوام متحدہ کے ایک رکن ملک کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے یہ ان کا جمہوری حق تھا کہ وہ جنیوا فورم کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ اختلاف رائے کو سننا اور برداشت کرنا خود اقوام متحدہ کے چارٹر کا بھی حصہ ہے۔ اسی چارٹر کو سامنے رکھتے ہوئے مغرب دو سال قبل ڈنمارک کے ملعون اخبارات کی جانب سے توہین رسالت ﷺ کے بدترین جرم کو حمایت و اعانت کرتا رہا۔ اب صرف اس بنا پر کہ نسل پرستی کے خلاف عالمی کانفرنس میں ایرانی صدر کی

جانب سے اسرائیل پر تنقید کی گئی، مغربی ممالک کے سفارتکاروں نے نہ صرف اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقدہ کانفرنس کو سبوتاژ کر دیا بلکہ ایرانی صدر پر جسمانی حملے کی بھی کوشش کی گئی اور واویلا مچا دیا گیا کہ ایرانی صدر نے ''ہولوکاسٹ'' کو ڈراما قرار دے کر گویا کہ غضب ڈھا دیا ہے۔ یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ ایرانی صدر نے کانفرنس کے دوران جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی اشتعال انگیز بات کی ہو اور اس پر مغربی سفارتکاروں نے واک آؤٹ کرنے کا اپنا ''جمہوری حق'' استعمال کیا ہو، بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نسل پرستی کے خلاف کانفرنس کو سبوتاژ کر دیا گیا تاکہ اس پلیٹ فارم پر اسرائیل کی نسل پرست حکومت کے ''کارناموں'' کا تذکرہ بھی نہ کیا جائے۔ چنانچہ صہیونی لابی کے ہاتھوں یرغمال امریکی حکومت نے پہلے ہی اس کانفرنس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا تھا اور آسٹریلیا، اٹلی، ہالینڈ اور جرمنی نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ ان ممالک کے نزدیک ایرانی صدر ''ہولوکاسٹ'' کے انکار کے ''مجرم'' ہیں گویا کہ ہولوکاسٹ کے یہودی ڈرامے پر ایمان لانا پوری انسانیت پر واجب ہے اور جو اس پر ایمان لانے کو تیار نہ ہو، اسے اقوام متحدہ کے کسی فورم پر بات کرنے کا حق بھی حاصل نہیں۔ یورپی ممالک نے کانفرنس میں شرکت کے لیے اپنے سربراہوں کی [illegible]ے معمولی درجے کے سفارتی نمائندے بھیجے تاکہ یورپی سربراہوں کے کان ''مقدس اسرائیل'' کے خلاف باتیں سننے کے ''گناہ'' سے آلودہ نہ ہوں اور پھر ان مندوبین نے صدر احمدی نژاد کی تقریر شروع ہونے سے قبل ہی کانفرنس میں ہنگامہ مچا دیا تاکہ ایرانی صدر بات ہی نہ کر سکیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی قوموں میں سچ سننے اور حقائق تسلیم کرنے کا کتنا حوصلہ پایا جاتا ہے اور مٹھی بھر یہودی لابی نے کس طرح مغربی معاشرے کو احساس جرم میں مبتلا کر کے فکری طور پر یرغمال بنایا ہوا ہے۔

ایرانی صدر محمود احمدی نژاد پوری اسلامی دنیا کے نمائندے نہیں ہیں اور بدقسمتی سے ایران کے ساتھ ایسے کئی پیچیدہ مسائل لگے ہوئے ہیں جن کی بنا پر وہ اسلامی دنیا سے تنہائی کا شکار ہے۔ تاہم ایرانی صدر کی بیان کردہ اس حقیقت سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا کہ اسرائیل کا وجود ہی عالمی طاقتوں بالخصوص مغرب کی نسل پرستانہ سوچ کی مرہون منت ہے۔ یہودی عقیدے کے طور پر وہ اپنے علاوہ کسی کو انسان نہیں سمجھتے اور ان کے نزدیک مخالف مذہب بالخصوص اسلام کے ماننے والوں کو قتل کرنا یہاں تک کہ ان کے بچوں اور خواتین کو بھی تہ تیغ

کرنا عین عبادت ہے۔ غزہ پر اسرائیلی جارحیت کے دوران یہودی ربیوں کا یہ "فتویٰ" عالمی میڈیا میں شائع اور نشر ہوا تھا کہ اسرائیلی فوج کو مسلمان بچوں اور خواتین کو مارنے کا حق حاصل ہے۔ اب ایسی ریاست کو "نسل پرست" کہنا تو بہت ہی مہذب اور نہایت محتاط تعبیر ہے ورنہ جو القاب دنیا بھر کے یہودی جرمن نازیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں، درحقیقت ان کی اولین اور اصل مصداق وہ خود ہیں۔ اسرائیل کی پوری تاریخ بدمعاشی، غنڈہ گردی، سفاکیت اور زندگی سے بھری ہوئی ہے اور دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں ہے جو صیہونیوں کی جبلت اور خصلت میں شامل نہ ہو۔ امریکہ کی جانب سے صیہونیت کی حمایت شاید اسی بنا پر ہے کہ خود امریکہ کا اپنا وجود بھی نسل پرستی کی اینٹوں پر قائم ہے۔ امریکہ کی بنیاد لاکھوں ریڈ انڈینز کی لاشوں پر رکھی گئی تھی اور امریکیوں نے افریقہ کے سیاہ فام باشندوں کو جانوروں کی طرح جہازوں میں بھر بھر کر امریکہ لے جا کر ان کے ساتھ کئی صدیوں تک جس طرح کا غیر انسانی سلوک روا رکھا، وہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی شرمناک باب ہے۔ یہ ابھی صرف پچاس ساٹھ برس قبل کی بات ہے جب امریکہ میں کالوں کو گوروں کے برابر میں بیٹھنے، ان کی عشرت گاہوں میں آنے، یہاں تک کہ عبادت گاہوں میں ان کے ساتھ عبادت میں شریک ہونے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ امریکہ لاکھ کوششوں اور ایک افریقی النسل آدھے کالے شخص کو اپنا صدر منتخب کرنے کے باوجود شدید احساس جرم کے عذاب سے نہیں نکل سکا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی عالمی فورم پر اس موضوع پر بات کرنے کو بھی تیار نہیں ہے۔ امریکہ نے آٹھ سال قبل ہونے والی نسل پرست مخالف کانفرنس کا بھی بائیکاٹ کیا تھا اور اب بھی اس نے صیہونیت کے دباؤ میں فرار کا راستہ اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی ہے۔ کیا اس اقدام کے بعد اب امریکہ اور مغرب کو "برداشت" اور "آزادیٔ اظہار" جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے کچھ شرم محسوس ہوگی؟

✿.....✿.....✿

اداریہ روزنامہ "جسارت" کراچی

آزاد خیالی اور آزادی اظہار کے جنازے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرانس نے، جسے مغربی ملکوں خاص طور پر مغربی یورپ میں، آزاد خیالی اور آزادی اظہار کے حوالے سے رہنما اور علامت کی حیثیت حاصل ہے، اپنی تاریخی حیثیت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے، اس کا ثبوت وہاں سے آزاد خیالی اور آزادی اظہار کے جنازوں کے اٹھنے کا وہ عمل ہے جو مسلسل وسعت اختیار کر رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل فرانس کی حکومت نے بوسنیا ہرزیگووینا کے صدر علی عزت بیگووچ کی اسلام اور مغرب سے متعلق کتاب پر پابندی عائد کردی تھی، پھر علی میاں ندوی اور بعض دوسرے مسلم مفکرین کی کتابوں کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی عائد کیے جانے کی خبر آئی۔ اس کے بعد وہاں مسلم طالبات کے اسکارف اوڑھنے کے مسئلہ نے ایک طوفان برپا کردیا اور فرانس کے محکمہ تعلیم نے اسکارف کو فرانس کے سیکولر طرز تعلیم کی روایت کے لیے خطرہ قرار دیتے ہوئے اسکارف اوڑھنے پر پابندی عائد کردی اور اب خبر آئی ہے کہ فرانس کی حکومت نے علامہ یوسف قرضاوی کی کتاب "اسلام میں حلال اور حرام کا تصور" کے فرانسیسی ایڈیشن پر پابندی عائد کردی ہے۔ فرانس کی حکومت کا کہنا ہے کہ کتاب کا لب ولہجہ مغرب کے خلاف ہے اور اس سے عوام کے جذبات بھڑک سکتے ہیں اور امن عامہ کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کتاب فرانس میں 1991ء میں شائع ہوئی تھی، لیکن فرانس کی حکومت کو اس وقت کتاب کے خطرناک مواد کا خیال نہیں آیا۔ کتاب کے ناشر نے پابندی کے سلسلہ میں یہی نکتہ اٹھاتے ہوئے عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، مسئلہ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ کتاب کا فرانسیسی زبان میں ہونے والا ترجمہ صرف نو ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی فرانس کی حکومت نے اسے امن عامہ کے لیے ایک خطرہ قرار دیا ہے۔

مسلم دانشوروں اور مفکرین کی کتابوں پر لگنے والی پے در پے پابندیوں کو دیکھتے

ہوئے خیال آتا ہے کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جس سے فرانس کی حکومت خوفزدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ علامہ قرضاوی کی کتاب جو بنیادی طور پر عربی میں لکھی گئی تھی، فرانس میں آباد عرب باشندوں کے لیے فرانسیسی میں ترجمہ نہیں ہوئی ہوگی۔ علامہ قرضاوی کی بیشتر کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہمیں یاد پڑتا ہے کہ یہ کتاب بھی انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عرب دنیا سے تعلق رکھنے والے مسلمان اسے پڑھیں گے تو عربی میں پڑھیں گے اور جو مسلمان عربی سے واقف نہیں ہیں، وہ اس کے انگریزی ایڈیشن سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے کتاب کا فرانسیسی ترجمہ بنیادی طور پر مقامی لوگوں کے لیے کیا گیا ہوگا اور یہی اصل خطرے کی بات ہے۔ فرانس کی حکومت کا کہنا کہ کتاب کا لب ولہجہ مغرب کے خلاف ہے، بنیادی طور پر ایک غلط دلیل ہے، اگر کتاب محض مغرب کے خلاف لب ولہجے کی حامل ہوتی تو اس میں خطرے کی کوئی بات نہ تھی، بلکہ فرانس کی حکومت اسے ایک مثال کے طور پر پیش کر کے اپنے عوام کو مسلمانوں کی مغرب دشمنی کا یقین دلا سکتی تھی، لیکن بات یہ ہے کہ کتاب میں حلال وحرام کے اسلامی تصور کے ذریعہ مغربی فکر کی گمراہیوں کو مدلل طریقے سے واضح کیا گیا ہے اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ فرانس کا کوئی بھی غیر جانبدار شخص کتاب سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا، چنانچہ فرانس کی حکومت کا اصل خوف سچائی اور اسے قبول کر لیے جانے کا خوف ہے۔ مغربی دنیا مکالمے اور گفتگو کی روایت کی علمبردار بنتی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ ہم دلیل کی بنیاد پر بات کرتے ہیں اور مسلمانوں کو تشدد کی زبان کے سوا کوئی زبان آتی ہی نہیں۔ تاہم محسوس یہ ہو رہا ہے کہ وہ تاریخ کے ایک اہم موڑ پر جس چیز سے سب سے زیادہ خوفزدہ نظر آتے ہیں، وہ مسلمانوں کے ساتھ سنجیدہ مکالمے کا امکان ہے۔ مسلم دنیا کے خلاف ان کے شدید پروپیگنڈہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ مکالمے اور گفتگو کی فضا ہی پیدا نہ ہونے دو، بلکہ اس کے ہر امکان کو مسمار کر دو اور مسلمانوں کو اتنا بے اعتبار کر دو کہ ان کی بات کو اگر کوئی سنے بھی تو اس پر اعتبار نہ کرے۔ مغربی حکومتیں جیسی بھی ہوں، لیکن وہ رائے عامہ کو نظر انداز کر کے کچھ نہیں کر سکتیں اور یہ حقیقت ہے کہ مغربی ملکوں کی رائے عامہ کی اکثریت مسلمانوں کے خلاف ابھی تک کوئی شدید رائے نہیں رکھتی، البتہ مغربی ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈے کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف شدید یا منفی رائے رکھنے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔

فرانس کی حکومت اسلامی کتب پر جو پابندیاں عائد کر رہی ہے بظاہر وہ ایک عام

اور معمولی سی بات ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ معاملہ بہت اہم واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔
آندرے ژید نے، جو فرانس کے ممتاز ناول نگاروں اور نقادوں میں سے ایک ہے اور جس نے ادیبوں، شاعروں اور عام فرانسیسی نوجوانوں کی کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ایک جگہ لکھا ہے۔
"اس کتاب کو پھینک دے اور باہر آجا، میری تمنا بس اتنی ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے دل میں باہر آنے کی خواہش پید ہو جائے، کہاں سے باہر آنے کی؟ اپنے شہر سے، اپنے خاندان سے، اپنے کمرے سے، اپنے خیالوں کی دنیا سے۔"
فرانس کی حکومت کو شاید یہی خطرہ ہے کہ فرانس کے عوام اگر مسلم دانشوروں کی تحریریں پڑھ کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آگئے تو کیا ہوگا؟

اداریہ ہفت روزہ "ضرب مومن" کراچی

رواداری کے دعویدار کہاں ہیں؟

دنیا میں ازل ہی سے خیر اور شر کی قوتیں مدمقابل رہی ہیں۔ ہمیشہ سے حق اور باطل کے درمیان جنگ رہی ہے۔ معرکۂ روح و بدن میں اللہ پامردی سے لڑنے والے مومنین کا ساتھ دیتا ہے اور شیطان کو یورپ کی مشینیں ہی کافی ہوتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے برسوں پہلے کہا تھا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفی ﷺ سے شرار بولہبی

کفر پھونکوں سے چراغ محمدی ﷺ کو بجھانا چاہتا ہے لیکن اس میں وہ جتنا آگے بڑھتا ہے، اس چراغ کی روشنیاں مزید توانا ہوتی جاتی ہیں۔ جیسے جیسے دن گزرتے جارہے ہیں عالم کفر کی جانب سے اس چراغ کو بجھانے کی کوششیں بڑھتی جارہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، آسٹریا جیسے حقوق انسانی کے چیمپئن ہونے کے دعویداروں کے چہرے سے نقاب بھی الٹتا جارہا ہے۔ حقوقِ نسواں کے غم میں گھلنے والوں کی پرتیں اترتی جارہی ہیں۔ "دہشت گردی کے خلاف جنگ" دراصل کس کے خلاف ہے؟ یہ حقیقت بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ یہ بھی راز نہیں رہا کہ ایک عورت کو کوڑے مارنے پر چیخ و پکار کرنے والا میڈیا، مصری خاتون کے بھری عدالت میں قتل پر کیوں چپ سادھ لیتا ہے؟

31 برس کی مروا شربینی کو گزشتہ ہفتے جرمن شخص ایلکس ڈبلیو نے جرمن عدالت میں جج کے سامنے 18 بار چاقو مار کر شہید کردیا تھا۔ شربینی اسکارف پہنتی تھی جس پر ایلکس اسے "دہشت گرد" کہتا تھا۔ خاتون نے ایلکس کے خلاف مقدمہ دائر کردیا۔ جرمن ججوں نے ایلکس کو قصوروار پاکر 50 ہزار ڈالر کا جرمانہ کیا۔ اس فیصلے کے خلاف ملزم نے اپیل دائر کررکھی تھی۔ اس مقدمے کی سماعت کے دوران جب شربینی اپنے خاندان سمیت عدالت میں موجود

تھی، ملزم نے خاتون پر حملہ کردیا۔ اس کے شوہر نے جب اس کو بچانے کی کوشش کی تو جرمن پولیس اہلکاروں نے اس پر فائر کھول دیا جس سے وہ شدید زخمی ہوگیا اور اطلاعات کے مطابق ملزم کو پاگل قرار دے کر رہا کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شربنی 3 ماہ کی حاملہ تھیں۔ حملے کے وقت ان کا 3 سالہ بیٹا بھی موجود تھا جو اپنی ماں کو قتل ہوتے دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ ''شہیدۃ الحجاب'' کو اسکندریہ میں سپرد خاک کردیا گیا۔ ان کے جنازے میں اعلیٰ مصری اہلکاروں نے شرکت کی۔ واضح رہے کہ جرمن کا آئین ہر شخص کو آزادی دیتا ہے۔

اس چھوٹے سے واقعے نے مغرب اور اس کے باشندوں کی ''انسان دوستی'' کا پردہ چاک کردیا ہے۔ مسلمان ممالک میں سیکولرازم، مغربیت کو رواج دینے کے لیے دولت کے منہ کھول دینے والے یہ مغربی ممالک خود مسلمانوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ عورتوں کے حقوق کے علمبردار بننے والے خاتون کو بھری عدالت میں قتل ہوتا دیکھتے رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بچانے والے شوہر کو گولی ماردی اور اب مغرب کے نزدیک ''عظیم'' کارنامہ انجام دینے والے اس کے قاتل کو بچانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مسلمان ملک میں مسلمانوں کے ہاتھوں کسی مغربی خاتون کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا تو پوری دنیا تڑپ اٹھتی لیکن شربنی کا جرم یہ تھا کہ وہ مسلمان تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ باحجاب تھی۔ اس کے لیے تمام طعنے اس نے سہے اور پھر اس کے لیے شہید ہوگئی۔ ابھی تک نہ کسی مسلم سربراہ نے اس پر کوئی سخت ردعمل دیا ہے اور نہ عالمی برادری کی طرف سے کوئی توانا آواز آئی ہے کیونکہ یہ واقعہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اس سے قبل مقبوضہ کشمیر میں 2 کشمیری طالبات کی عصمت دری کا واقعہ بھی دنیا نے ٹھنڈے پیٹوں ہضم کرلیا۔ فرانس کے صدر نکولس سرکوزی کا کہنا ہے کہ فرانس جیسے جمہوری معاشرے میں کسی عورت کو برقع پہننے یا ستر پوشی کی اجازت نہیں ملے گی۔ برطانوی وزیر خارجہ جیک اسٹرا کے مطابق حجاب باہمی تعلقات میں رکاوٹ ہے۔ بیلجیم میں شناختی کارڈ کے اجرا کے لیے خواتین کا ننگے سر ہونا لازم قرار دینے پر غور کیا جا رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل غزہ پر اسرائیلی جارحیت میں فاسفورس بمباری سے 250 معصوم بچوں اور خواتین کو شہید کیا گیا۔ ہزاروں فلسطینی تہہ خاک ملا دیے گئے لیکن اقوام متحدہ میں مذمتی قرارداد پیش ہوئی بھی تو امریکہ اسے ویٹو کرتا رہا۔

مغربی ممالک کی یہ منافقت، یہ دورنگی، مسلمانوں کے ساتھ یہ برتاؤ، مسلمانوں کی

مذہبی علامات پر یہ تنقیدیں، مسلمانوں میں تیزی سے یہ احساس جنم دے رہی ہیں، کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کھلی جنگ پر اتر آئے ہیں۔ایک طرف امریکی صدر بارک اوباما مغربی دنیا کے نمائندے بن کر عالم اسلام سے نئے تعلقات کی ابتدا کرنے کی خواہش کرتے ہیں تو دوسری طرف مظلوم فلسطینیوں کے مقابلے میں اسرائیل کی حمایت کی جاتی ہے۔ مظلوم کشمیریوں کے بجائے ظالم بھارت کا ساتھ دیا جاتا ہے۔گوانتانا موبے میں قرآن پاک کی توہین کی جاتی ہے۔زبان کی توپوں کا رخ حجاب کی طرف مڑا رہتا ہے۔شہیدۃ الحجاب کے وحشیانہ قتل پر اس کے قاتل کو چھڑوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔کشمیری طالبات کی عصمت دری پر چپ لگ جاتی ہے۔ان اسلام مخالف اقدامات کے ہوتے ہوئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ عالم اسلام مغرب سے دوستی کی سطح پر بات کرے۔کیا امریکی صدر مسلمانوں کے مسائل حل نہ کرانے اور انہیں زچ کیے رکھنے جیسے نئے تعلقات کی ابتدا چاہتے ہیں؟ یہاں ہم مسلم حکمرانوں سے گزارش کریں گے کہ وہ مسلمان ممالک کے سربراہان ہیں، مغربی نہیں۔ چنانچہ جب مغرب ہماری تہذیب کا اپنے ممالک میں قلع قمع کرنے پر اُتر آیا ہے تو کم از کم ہمیں مغربی تہذیب وثقافت کا طوق گلے سے اُتارنے کے لیے عملی اور انقلابی قدم اُٹھانا پڑے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف کفریہ ممالک تیزی سے اکٹھے ہورہے ہیں۔ مسلمان ممالک کا اتحاد وقت کی ایسی ضرورت بن گیا ہے جسے ضروری نہ سمجھا گیا اور عمل کی طرف قدم نہ بڑھایا گیا تو اس کا اندیشہ ہے کہ یہ اندرونی انتشار ہمیں لے ڈوبے گا۔ چنانچہ اس طرف غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ عالمِ اسلام کی پہلی ایٹمی قوت پاکستان اور سعودی عرب کے حکمرانوں کو اس سلسلے میں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔

اداریہ ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی

کیا آزادی فکر صرف یورپ کا حق ہے؟

حالیہ چند ہفتوں کے دوران میں دو واقعات ایسے ہوئے ہیں، جن کی آڑ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غوغہ آرائی اپنی شدت پر ہے۔ انسانی حقوق کی نگہبانی کی نام نہاد تنظیمیں آزادی اظہار رائے کا ماتم کر رہی اور مسلمانوں کو مجموعی طور پر حریت فکر کا قاتل و مخالف قرار دے رہی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اور خود عالم اسلام کے اندر اسلام اور ملت اسلامیہ کا چہرہ مسخ کرنے کی ایک نئی مہم شروع ہوگئی ہے۔

مذکورہ دو واقعات میں پہلا واقعہ تو عالم اسلام کے عظیم اسکالر اور ممتاز دینی شخصیت شیخ محمد الغزالی کی وہ شہادت ہے جو انہوں نے ایک مصری عدالت میں دی ہے۔ معروف اسلام دشمن دانشور فرج فودہ کے قتل کیس میں عدالت نے شیخ محمد الغزالی کو بعض فقہی مباحث کی وضاحت کے لیے عدالت میں پیش ہونے کی درخواست کی تھی۔ شیخ نے عدالت میں اپنی رائے دی کہ اگر اسلامی حکومت اور اسلامی شریعت قائم و نافذ نہ ہو، کسی مرتد کو اسلام کے مطابق سزا دینے کا اہتمام نہ ہو اور کوئی مسلمان مرتد کی دل آزار باتوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے اسے قتل کردے تو یہ ناجائز نہیں ہے۔ واضح رہے کہ یہ شیخ کا کوئی ایسا فتویٰ نہیں ہے، جو جذبات کی آگ بھڑکانے اور فتنوں کی جوت جگانے کے لیے نیم ملا قسم کے لوگ فٹ پاتھوں پر کھڑے ہو کر دیتے ہیں اور فساد کو ہوا ملتی ہے۔ عدالت کے استفسار پر شیخ محمد الغزالی نے اپنے علم و فہم کی بنیاد پر ایک رائے دی ہے، لیکن اس مخصوص ماحول و حالات کے تحت استفسار کے جواب میں دی گئی اس رائے پر ایک طوفان کھڑا کردیا گیا ہے۔ انسانی حقوق کے حوالے سے سرگرم تقریباً تمام عالمی تنظیموں نے شیخ کے خلاف بیانات جاری کیے ہیں اور ان کے موقف کو آزادی رائے کو کچلنے کے لیے ایک عالمانہ سند ظاہر کرکے مذمت کی جارہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ محمد الغزالی کے لیے تو عدالت کے اندر کھڑے ہو کر عدالت کے استفسار پر

بھی اپنی رائے کے اظہار کی اجازت نہیں۔ پروپیگنڈہ کرنے والے اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ جس آزادی اظہار کے لیے وہ واویلا کر رہے ہیں، شیخ نے بھی تو محض اس کا استعمال کیا ہے۔ شیخ کو وہ حق استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے، لیکن اسلام کے اصول و مبادی اور عقائد و روایت کا مذاق اڑانے والوں کے لیے اس حق کو خاص کیا جا رہا ہے۔ تازہ اطلاع کے مطابق، مصر کے مفتی اعظم شیخ طنطاوی نے ایک فتویٰ کی صورت میں یہ کہہ کر شیخ محمد الغزالی کی رائے کی توثیق کر دی ہے کہ فقہ اسلامی میں مرتد کے قاتل کی کوئی سزا بیان نہیں کی گئی ہے۔ اسٹیٹ زیادہ سے زیادہ جو کارروائی کر سکتی ہے، وہ ملکی قانون سے متجاوز ہو کر انارکی پھیلانے کے جرم میں مرتد کے قاتل کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے۔

۞......۞......۞

اثر جون پوری

مت کرو مجبور ہم کو

تف ہے اہل دہر اس آزادیٔ اظہار پر
جو عمل کیچڑ اُچھالے سید ابرار پر
اب خدائی فیصلے کے منتظر ہیں اہل حق
حملہ آور پیروئے ابلیس ہے
فرض ہے فی الفور امراض علاج
قرض ہے یہ اک، شہ ابرار پر
دشمنانِ شاہ دیں کا ہو مسلسل بائی کاٹ
ہے گراں وار معیشت مجمع کفار پر
ہستی پُر نور کی توہین پر خوں روئے گا
پیش ہوگا شاتم ختم الرسلؐ جب نار پر
کر رہے ہیں ہم زباں پر اور قلم پر اکتفا
مت کرو مجبور ہم کو زور پر تلوار پر
پھر مقابل اہلِ حق کے، ملت واحد ہے کفر
ہے جبھی چشم عنایت موت کے حق دار پر
احتجاج عالم اسلام ہے فطری عمل
شیر نر بپھرے نہ کیوں، روباہ کی ابلکار پر
حال ہمدردانِ ملت ماورائے فہم ہے
تند خو اپنوں کے حق میں، رحم دل اغیار پر
میرے بازو، میرا سر، جب تک سلامت ہے اثرؔ
کوئی کیوں انگلی اٹھائے گا مرے سرکارؐ پر

عالمِ اسلام میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب
قادیانیت
ثبوت حاضر ہیں!
قادیانیوں کے بدترین کفریہ عقائد وعزائم پر مبنی عکسی شہادتیں
محمد متین خالد
ہوشربا انکشافات
سنسنی خیز واقعات
ناقابلِ تردید حقائق
قادیانیت پر مکمل انسائیکلوپیڈیا
حیرت انگیز معلومات
سارے راز بے نقاب
بند کتابوں کی کھلی کہانی
ہر گھر اور لائبریری کی ضرورت
یہ ایک ایسی تاریخی وتحقیقی کتاب ہے
جو قادیانیوں کی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں اور گستاخیوں کے مستند دستاویزی ثبوت لیے ہوئے ہے۔
جسے 10 سال کی شبانہ روز انتھک محنت کے بعد مکمل کیا گیا ہے
جس میں قادیانی کتب اور اخبارات ورسائل کے 50 ہزار سے زائد صفحات کھنگالنے کے بعد قادیانیوں کے مذموم عقائد وعزائم کے تحریری ثبوت یکجا کر دیے گئے ہیں۔
جس کے مطالعے سے ہر قادیانی اپنے عقائد کی سچی اور بھیانک تصویر دیکھ کر راہِ ہدایت پا سکتا ہے۔
جو سادہ لوح مسلمانوں کو فتنۂ ارتداد سے بچانے کے لیے ایک مؤثر ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے۔
جس کا مطالعہ علماء، خطباء، وکلا، اساتذہ اور طلباء کو فتنۂ قادیانیت کے خلاف مضبوط دلائل اور ٹھوس معلومات کا ذخیرہ فراہم کرے گا۔
جسے قادیانیت کے خلاف ہر عدالتی مقدمہ، بحث اور مناظرہ میں مستند حوالے کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔
جسے تمام مکاتبِ فکر کے جید علمائے کرام اور نامور اہلِ علم و دانش کی خواہش اور سرپرستی میں تیار کیا گیا۔
ایک ایسی دستاویز جس کا مدتوں سے انتظار تھا
پڑھیے اور تحفظ ختم نبوت کے لیے آگے بڑھیے!
www.KitaboSunnat.com

گفتگو ہو یا مباحثہ، تقریر ہو یا مناظرہ
قادیانیوں کو لاجواب کیجئے!
محمد متین خالد
ایک شاہکار کتاب جس کے مطالعے سے آپ قادیانیوں کو ہر موضوع پر آسانی سے شکست دے سکتے ہیں۔
قادیانی نعرہ "محبت سب کے لیے نفرت کسی سے نہیں"! کی نقاب کشائی
قادیانیوں کی آئینی اور شرعی حیثیت
قادیانیوں سے مناظرہ کیسے کریں؟
ایک فیصلہ کن مباہلہ
قادیانی راسپوٹینوں کے عبرت ناک انجام
قادیانی نبیوں کے بھیانک حالات اور ان کی بربادی کے ہوش ربا واقعات
کہانیوں سے زیادہ دلچسپ، حقائق سے زیادہ سبق آموز اور دلائل سے زیادہ اثر انگیز
ایک ایسی کتاب جسے آپ بار بار پڑھنا چاہیں
کارکنانِ تحفظ ختم نبوت کے لیے خصوصی رعایت

قادیانیت برطانوی سامراج کا خود کاشتہ پودا

قادیانی مذہب کے عقائد و عزائم، انگریز کی حمایت اور جہاد کی ممانعت پر مبنی ناقابلِ تردید اور ہوش رُبا عکسی شہادتیں

- The Arrival of British Empire in India نامی رپورٹ کیا ہے؟
- آنجہانی مرزا قادیانی ملہمی سے نبوت تک کیسے پہنچا؟
- یہود و نصاریٰ اور قادیانیوں کے باہمی گٹھ جوڑ کے پس پردہ کون سے عوامل کارفرما ہیں؟
- مرزا قادیانی نے اپنی جماعت کو انگریز کا خود کاشتہ پودا کیوں تسلیم کیا؟
- مرزا قادیانی نے انگریز کی حمایت میں خدا تعالیٰ سے کیا عہد کیا تھا؟
- معروف ہندو دانشور ڈاکٹر شنکر داس نے قادیانیت کی حمایت کیوں کی؟
- غازی علم الدین شہیدؒ کے بارے قادیانی جماعت کا موقف کیا ہے؟
- ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی کو کن ''خدمات'' کے عوض نوبیل پرائز ملا؟
- مرزا قادیانی نے برطانوی ملکہ وکٹوریہ کو ''ستارہ قیصرہ'' نامی خط میں کیا لکھا؟
- باؤنڈری کمیشن میں قادیانیوں نے کیا نقطہ نظر پیش کیا؟
- سابق وزیر اعظم لیاقت علی خان کے قتل کا اصل راز کیا ہے؟
- پاکستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے پیچھے سچی کہانی کیا ہے؟
- 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں قادیانیوں نے کیا گل کھلائے؟

قادیانیت کا اصل چہرہ پہچاننے کے لیے تلخ اور چونکا دینے والے حقائق و انکشافات پر مشتمل یہ کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔ اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کو شناخت کرنا اور ان کے عزائم کو ناکام بنانا ہر محبِ وطن پاکستانی کا فرض ہے۔ یہ کتاب یقیناً آپ کی رہنمائی کرے گی۔

معروف اہلِ [illegible] جناب مرزا [illegible] کی گرانقدر تقاریظ کے ساتھ

ایک ایسی کتاب جو مسلمانوں کی بے حسی اور بے بسی کا نوحہ کرتے ہوئے، ان کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے، ان کی دینی غیرت و حمیت کو جگاتے ہوئے، انہیں احساس ندامت کے ساتھ رلاتے ہوئے اور انہیں ان کی ذمہ داریوں کا فریضہ یاد دلاتے ہوئے ایک ولولہ تازہ اور ضرب کلیمی عطا کرتی ہے۔

پڑھیے اور تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے لیے آگے بڑھیے۔ شفاعت رسول ﷺ آپ کی منتظر ہے۔